

دین میں نماز

بہ جواب

حدیث نماز

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی برکاتہم
دامت

بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، گلور

وفیلقہ حضرت اقدس مولانا مفتی مظفر حسین صاحب انوار اللہ مرقدہ



دلیل نماز

بہ جواب

حدیث نماز

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم

و خلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

فہرست مضامین

صفحہ	عناوین
۲۱	تقریظ
۲۶	تمہید
	نماز میں سکون و اطمینان اور سنن کا لحاظ
۳۶	ترک سنت کا حکم
۳۸	ترک واجب کا حکم
۳۸	مسلک حنفیہ پر بہتان تراشی
۴۰	فقہاء کے کلام میں جواز و صحت کے معنی
۴۳	صلاة القفال کی حقیقت
	طہارت و پاکی
۴۵	کیا خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے
۴۶	خون سے وضو ٹوٹ جانے کے دلائل
۴۶	پہلی حدیث
۴۸	دوسری حدیث
۵۰	حنفیہ کی تیسری دلیل
۵۲	ایک شبہ کا جواب
۵۲	خون سے وضو نہ ٹوٹنے کے دلائل

- ۵۳ دلائل مذکورہ کا جائزہ
- ۵۴ حضرت عمرؓ کا عمل
- ۵۵ امام احمدؒ کے عمل سے استدلال کا جواب
- ۵۶ ایک حدیث اور اس پر کلام
- ۵۸ ایک اہم حدیثی بحث

تیمم کا طریقہ

- ۶۰ حنفیہ کے دلائل
- ۶۳ ایک ضرب اور ہتھیلیوں تک مسح والی حدیث کا جواب
- ۶۵ مؤلف ”حدیث نماز“ کا ایک مغالطہ
- ۶۶ حدیث دانی یا غلط فہمی؟
- ۶۷ استدلال یا غلط فہمی؟
- ۶۸ امام ترمذی کا طرز عمل
- ۶۹ روایت حدیث تقلید کے منافی نہیں
- ۷۲ حضرت ابن عباسؓ کا ایک قیاس
- ۷۴ امام ابوحنیفہ کا مسلک کیا تھا؟

صلوٰۃ

- ۷۷ زبان سے نیت کی بحث
- ۷۷ کیا زبان سے نیت کے الفاظ کا ثبوت ہے؟
- ۷۸ عدم ثبوت دلیل جواز ہے
- ۷۸ بعض فقہاء نے بدعت کیوں کہا؟
- ۷۹ تلفظ بالنیۃ کی اصل پر لطیف استدلال

- ۸۰ زبان سے نیت کرنے کا استحباب
- ۸۲ ایک شبہ اور جواب
- ۸۴ مؤلف کے بیانات کی طرف رجوع
- ۸۸ ایک شبہ اور جواب

پاؤں سے پاؤں ملانا

- ۸۹ تسویہ صنف اور جمہور کا مذہب
- ۹۰ پاؤں سے پاؤں ملانے کا معنی
- ۹۲ الزاق کعب کے حقیقی معنی مراد نہیں

دوپیروں کے درمیان کا فاصلہ

- ۹۷ چار انگل سے تحدید مراد نہیں
- ۱۰۱ مراد حد کی تفسیر

تکبیر تحریمہ

- ۱۰۴ حنفیہ کا مسلک اور ان کی دلیل
- ۱۰۷ لفظ ’اللہ اکبر‘ فرض یا واجب؟

تکبیر تحریمہ میں ہاتھ کہاں تک اٹھائیں؟

- ۱۱۰ کانوں تک ہاتھ اٹھانے کی روایات کی ترجیح
- ۱۱۲ ایک عرض
- ۱۱۳ تکبیر تحریمہ کے وقت کانوں کو چھونا
- ۱۱۳ محاذات کے معنی

قیام میں ہاتھ کہاں باندھیں؟

- ۱۱۷ ائمہ کے مذاہب
- ۱۱۸ سینہ پر ہاتھ باندھنے کی روایات کی تحقیق
- ۱۱۸ پہلی حدیث
- ۱۲۰ دوسری حدیث
- ۱۲۱ تیسری حدیث
- ۱۲۲ کیا ابن خزیمہ نے اس کی تصحیح کی ہے؟
- ۱۲۳ پہلی علت: مؤمل ضعیف ہے
- ۱۲۴ دوسری علت: اضطراب
- ۱۲۵ تیسری علت: شذوذ
- ۱۲۶ شاذ یا منکر؟
- ۱۲۶ روایت مذکورہ ناقابل احتجاج ہے
- ۱۲۷ فائدہ
- ۱۲۷ علامہ کشمیریؒ کا ارشاد
- ۱۲۸ حضرت ابن عباس کی روایت
- ۱۲۹ حضرت ابن عباس کی دوسری روایت
- ۱۳۱ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی روایات کی تحقیق
- ۱۳۲ پہلی حدیث
- ۱۳۷ سماعِ علقمہ کا ثبوت
- ۱۴۰ اضطرابِ متن کا رفع
- ۱۴۱ علامہ نیمویؒ کا رجحان اور اس کا جواب

- ۱۴۳ دوسری حدیث
- ۱۴۳ حدیث کی سند پر بحث
- ۱۴۵ حدیثِ علیؑ کا رفعِ حکمی
- ۱۴۶ تیسری حدیث
- ۱۴۷ چوتھی حدیث
- ۱۴۷ پانچویں حدیث
- ۱۴۹ ترجیحِ مذہبِ حنفی
- ۱۵۰ مؤلفِ ”حدیث نماز“ کے بعض بیانات کا جائزہ
- ۱۵۰ حوالہ یاد ہو کہ
- ۱۵۱ تردید یا تائید
- ۱۵۲ تضعیف یا توثیق
- ۱۵۳ انتباہ
- ۱۵۴ ابن امیر الحاج کی تقلید
- ۱۵۵ جھوٹ کا بدترین نمونہ
- ۱۵۷ جھوٹ کا دوسرا نمونہ
- ۱۵۷ تقلیدِ محض
- ۱۵۸ محشی ہدایہ کی غلط فہمی
- ۱۶۰ حدیثِ علیؑ مرفوعِ حکمی ہے
- ۱۶۰ کتب حدیث کی درجہ بندی - ایک علمی بحث
- ۱۶۵ ایک شبہ اور جواب
- ۱۶۸ کیا یہ کتابیں صحیح ہیں؟

۱۶۹	عورت سینے پر ہاتھ باندھے
۱۷۰	عورت و مرد کی نماز کا فرق
۱۷۵	مرزا مظہر جان جاناں کی تقلید
۱۷۶	آخری فیصلہ

دعائے استفتاح یعنی ثناء

۱۷۷	پہلی حدیث اور اس پر بحث
۱۷۸	امام ابو داؤد کے اشکال کا جواب
۱۷۹	حافظ ابن حجر کے اشکال کا جواب
۱۸۰	دوسری حدیث اور اس پر کلام
۱۸۱	تیسری حدیث اور اس پر کلام
۱۸۳	حضرت عمر کا عمل اور اس پر بحث
۱۸۹	فائدہ مہمہ
۱۹۰	صاحب نور الہدایہ کا تسامح

قرأت خلف الامام

۱۹۵	فاتحہ خلف الامام کے بارے میں ائمہ کے مسالک
۱۹۷	وجوب فاتحہ کے دلائل کا علمی جائزہ
۱۹۷	پہلی دلیل کا جائزہ
۱۹۹	لفظ ”فصاعداً“ کی تصحیح
۱۹۹	امام بخاری کا نقد اور اس کا جواب
۲۰۰	لفظ ”فصاعداً“ کے شواہد
۲۰۱	فقہی بحث

- ۲۰۲ روایت جابر کی تحقیق
- ۲۰۴ یحییٰ بن سلام کی توثیق
- ۲۰۶ یحییٰ بن سلام کی رفع میں متابعت
- ۲۰۷ ایک شبہ اور جواب
- ۲۰۸ دوسری دلیل کا جائزہ
- ۲۱۰ ”اِقْرَأْ بِهَا فِي نَفْسِكَ“ کا معنی
- ۲۱۲ تیسری دلیل کا جائزہ
- ۲۱۳ حدیث مذکور ناقابل احتجاج ہے
- ۲۱۳ سند کا اضطراب
- ۲۱۵ اضطرابِ متن
- ۲۱۷ محمد بن اسحاق کا حال اور تفرّد
- ۲۱۸ مکحول کا معنی
- ۲۱۸ ایک شبہ کا جواب
- ۲۱۸ حدیث کی فقہی بحث
- ۲۲۱ چوتھی دلیل کا جائزہ
- ۲۲۲ پانچویں دلیل کا جائزہ
- ۲۲۴ چھٹی دلیل کا جائزہ
- ۲۲۵ علامہ شوکانی کے بیان کا جواب
- ۲۲۷ کیا یہ حدیث متواتر ہے؟
- ۲۲۸ مؤلف کی غلط فہمی
- ۲۳۱ امام بخاری کے نقد کا جواب
- ۲۳۱ سورہ فاتحہ رکن نماز ہے یا واجب؟

- ۲۳۵ ایک حدیثی تحقیق
- ۲۳۶ لاء نفی کا معنی علامہ شوکانی کا جواب
- ۲۳۹ جسے رکوع مل گیا اسے رکعت مل گئی
- ۲۴۴ حافظ ابن حجر کا بیان
- ۲۴۵ شاہ ولی اللہ کے حوالے کی حقیقت
- ۲۴۶ حضرت شیخ جیلانی کا حوالہ
- ۲۴۶ احناف پر علامہ شوکانی کی تعریض اور اس کا رد
- ۲۴۹ حکایت امام محمدؒ
- ۲۵۰ حضرت نظام الدین اولیاء کی تجویز
- ۲۵۲ قرأت خلف الامام پر وعید
- ۲۵۴ سری نمازوں میں قرأت خلف الامام کا استحباب
- ۲۵۵ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا فتویٰ
- ۲۵۶ شاہ عبدالعزیز دہلوی کا ذکر
- ۲۵۸ فتویٰ مذکور پر نقد
- ۲۶۲ ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ
- ۲۶۵ مزید حوالے
- ۲۶۶ امام محمد کے مذہب کی تحقیق
- ۲۶۸ امام عبداللہ بن المبارک کا مذہب
- ۲۶۹ امام اعظم کے مذہب کی تحقیق
- ۲۷۲ ایک اہم بات

- ۲۷۳ کیا تمام صحابہ کرام قراءت خلف الامام کرتے تھے؟
- ۲۷۶ حضرت حماد کا حوالہ
- ۲۷۵ حضرت ابن مسعود کے مذہب کی تحقیق
- ۲۷۷ حضرت ابن عباس کا مذہب
- ۲۷۹ حضرت عبداللہ بن الزبیر کا مسلک
- ۲۸۰ حضرت عبداللہ بن عمر کا فتویٰ و مذہب
- ۲۸۲ حضرت عمر کا فتویٰ
- ۲۸۳ دیگر صحابہ و تابعین کی روایات
- ۲۸۷ حدیث میں قرأت خلف الامام سے نہی آئی ہے
- ۲۸۹ ایک لطیفہ
- ۲۸۹ علامہ ابن الہمام کا حوالہ یاد دھو کہ
- ۲۹۰ التفات
- ۲۹۱ علامہ عبدالحی کی عبارت کا مطلب
- ۲۹۲ جھوٹا اور غلط حوالہ
- ۲۹۳ إذا صح الحدیث فهو مذہبی
- ۲۹۴ کیا یہ حدیث متواتر ہے؟
- ۲۹۴ محدث سبذمونی کی روایت
- ۲۹۶ قرأت خلف الامام سے فسادِ صلوة؟
- ۲۹۷ احناف کے دلائل
- ۲۹۷ پہلی دلیل: آیت شریفہ
- ۲۹۹ احناف کا طریق استدلال
- ۳۰۰ امام بیہقی کے اعتراض کا جواب

- ۳۰۲ امام بخاریؒ کے اعتراضات
- ۳۰۳ جماعت مدینہ میں یا مکہ میں
- ۳۰۶ سلف کا اتفاق
- ۳۰۸ زبردستی وزیادتی؟
- ۳۱۱ مؤلف کی عجیب زیادتی
- ۳۱۲ دو آیات میں تعارض کا جواب
- ۳۱۵ ایک شبہ اور جواب
- ۳۱۷ مؤلف کی ایک غلطی کا ازالہ
- ۳۱۹ سلکاتِ امام کی بحث
- ۳۲۰ علامہ ابن تیمیہ اور سلکاتِ امام کی بحث
- ۳۲۲ حضور ﷺ نے نماز کی اصلاح کی
- ۳۲۴ مؤلف کی نا فہمیوں کا جواب
- ۳۲۷ مؤلف کے تحقیقی جواب کا جائزہ
- ۳۲۸ احناف کی دوسری دلیل
- ۳۳۰ احناف کی تیسری دلیل
- ۳۳۱ کیا امام کے پیچھے صرف زور سے قرأت منع ہے؟
- ۳۳۲ چہ فرمود؟
- ۳۳۳ حضرت ابو ہریرہؓ کا مسلک
- ۳۳۵ حوالہ کے نام پر ایک اور دھوکہ
- ۳۳۶ امام ابوداؤدؒ کی جرح کا جواب
- ۳۳۸ احناف کی چوتھی دلیل
- ۳۴۳ شبہ اور جواب

۳۴۴	افادہ
۳۴۸	ضعف و ارسال کی بحث
۳۴۹	کیا ابوحنیفہ ضعیف ہیں؟
۳۵۴	ارسال کا جواب
۳۵۵	حدیث مرسل کی مقبولیت
۳۶۱	احناف کی پانچویں دلیل
۳۶۳	افادہ راقم
۳۶۵	مؤلف کا اعتراض اور جواب
۳۶۷	سوال قرأت کا یا جہر کا؟
۳۶۹	مقتدی کا قرأت نہ کرنا ہی اصل ہے
۳۶۹	بے موقعہ حوالہ
۳۷۲	انتباہ
۳۷۴	مؤلف ”حدیث نماز“ کی ایک اور خام خیالی
۳۷۵	ایک اور اہتدلال پر نظر
	مسئلہ آمین بالجہر والسر
۳۷۸	آمین بالجہر کی پہلی دلیل
۳۸۳	آمین بالجہر کی دوسری دلیل
۳۸۸	آمین بالجہر کی تیسری دلیل
۳۹۱	آمین بالجہر کی چوتھی دلیل
۳۹۳	افادہ راقم
۳۹۳	جہر کی پانچویں دلیل

۳۹۵	جہر آمین کی چھٹی دلیل
۳۹۷	جہر کی ساتویں دلیل
۳۹۹	ایک نظر میں جائزہ
۴۰۱	انتباہ
۴۰۱	اخفاء آمین کے دلائل
۴۰۲	پہلی دلیل
۴۰۳	اخفاء آمین کی دوسری دلیل
۴۰۴	اخفاء آمین کی تیسری دلیل
۴۰۶	علامہ عبدالحی صاحب کے بیان کی حقیقت
۴۰۷	محدثین کے اقوال کا درجہ
۴۰۹	حدیث وائل میں اختلاف و ترجیح
۴۱۰	شعبہ کی خطا کا جواب
۴۱۴	روایت شعبہ کی تصحیح
۴۱۴	دونوں روایات میں تطبیق
۴۱۶	ترجیح روایت
۴۱۸	روایت شعبہ کی وجہ ترجیح
۴۱۹	اخفاء کے معنی کی تحقیق
۴۲۱	مؤلف ”حدیث نماز“ کی بدفہمی
۴۲۳	منقطع و معلق کی تعریفات
۴۲۴	حضرت ابن مسعود کی روایت کی تحقیق
۴۲۶	دیگر صحابہ کا مسلک

۴۲۷

آیات کا جواب دینا رفع یدین کا مسئلہ

۴۳۳

ائمہ کے مسالک

۴۳۴

مؤلف ”حدیث نماز“ کے بعض بیانات پر تبصرہ

۴۳۴

نور الہدایہ وعین الہدایہ کی عبارت کا حوالہ

۴۳۵

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے حوالے کی حقیقت

۴۳۶

حضرت شاہ ولی اللہ کا حوالہ

۴۳۸

علامہ عبدالحی لکھنوی کا حوالہ

۴۴۱

کیا رفع یدین کی احادیث زیادہ ہیں؟

۴۴۳

چند اور حوالے

۴۴۵

امام اعظم کے مسلک کی تحقیق

۴۴۷

امام اعظم اور امام اوزاعی کا مناظرہ

۴۵۰

تحقیق یا ہانک

۴۵۱

ایک اور استدلال پر نظر

۴۵۳

علامہ عینی کے حوالہ کی حقیقت

۴۵۴

رفع یدین سے نماز فاسد نہیں ہوتی

۴۵۵

ایک اور جھوٹ

۴۵۵

امام مالک کا مسلک

۴۵۶

کیا رفع یدین منسوخ ہے؟

۴۵۸

علامہ سندھی کے شبہ کا جواب

۴۵۹

رفع یدین کے دلائل کا جائزہ

- ۴۵۹ حدیث ابن عمر پر بحث
- ۴۶۰ حدیث ابن عمر میں اضطراب
- ۴۶۱ ایک حدیثی فائدہ
- ۴۶۲ دوسرا جواب
- ۴۶۳ تحقیق مذہب ابن عمرؓ
- ۴۶۴ مذکورہ روایت پر چار اعتراضات کے جوابات
- ۴۶۸ ایک اور روایت سے تائید
- ۴۷۰ ابن عمر کی دو روایات میں تطبیق
- ۴۷۵ تیسرا جواب
- ۴۷۶ ایک حدیث کی تحقیق
- ۴۷۸ حدیث مالک بن الحویرث پر کلام
- ۴۷۸ ایک من گھڑت اصول
- ۴۸۱ حدیث مالک کا جواب
- ۴۸۲ سجدہ کے وقت رفع یدین
- ۴۸۴ انتہا
- ۴۸۵ ترک رفع کے دلائل
- ۴۸۵ حدیث کی صحت
- ۴۸۸ حدیث مذکور پر پہلا اعتراض اور جواب
- ۴۸۸ حدیث پر دوسرا اعتراض اور جواب
- ۴۹۱ تیسرا اعتراض
- ۴۹۲ بر سبیل تذکرہ
- ۴۹۳ تفریق پر ایک نظر

۴۹۳	عاصم بن کلیب پر جرح کا جواب
۴۹۴	حدیث پر چوتھا اعتراض و جواب
۴۹۸	حدیث پر پانچواں اعتراض و جواب
۴۹۹	حدیث پر چھٹا اعتراض و جواب
۵۰۲	ابن مسعودؓ پر بھول کا الزام اور جواب
۵۰۳	پہلے نسیان کا جواب
۵۰۵	دوسرا نسیان اور جواب
۵۰۶	تیسرا نسیان اور جواب
۵۰۷	چوتھا نسیان اور جواب
۵۰۹	پانچواں نسیان اور جواب
۵۱۱	چھٹا نسیان اور جواب
۵۱۳	ساتواں نسیان اور جواب
۵۱۴	انتباہ
۵۱۵	مؤلف کا امام محمد پر الزام
۵۱۶	ترک رفع یدین کی دوسری دلیل
۵۱۸	ترک رفع یدین کی تیسری دلیل
۵۲۲	ایک حدیثی اہم فائدہ
۵۲۳	ترک رفع یدین کی چوتھی دلیل
۵۲۵	ترک رفع یدین کی پانچویں دلیل
۵۲۸	حضرت عمرؓ کا عمل

- ۵۲۹ حضرت ابو بکرؓ کا مسلک
- ۵۳۲ حضرت علیؓ کا عمل
- ۵۳۵ اصحاب علی و ابن مسعودؓ کا عمل
- ۵۳۶ راویانِ رفع یدین کی تعداد پر کلام
- ۵۳۷ رفع یدین نہ کرنے والے صحابہ و تابعین
- ۵۴۱ امام بخاریؒ کے ایک دعویٰ پر نظر
- ۵۴۳ رفع یدین کا ثواب
- رکوع و سجدے و قومہ و جلسہ کا حکم اور ان کی دعائیں
- ۵۴۸ رکوع و سجدے کی دعاؤں کا درجہ
- ۵۵۰ سجدہ کا طریقہ
- ۵۵۳ سجدے میں جانے کی کیفیت
- ۵۵۸ جلسہ استراحت
- ۵۶۵ علامہ لکھنوی کے ایک حوالے میں خیانت
- ۵۶۸ سجدے کے بعد کھڑے ہونے کا طریقہ
- ۵۷۴ عورت کی نماز
- ۵۷۵ نماز میں بیٹھنے کا طریقہ
- ۵۷۷ تشہد میں انگلی کا اشارہ

- ۵۸۲ انگلی کے حرکت دینے کا مسئلہ
۵۸۷ نماز کے بعد اوراد و اذکار کرب کریں

اوقات صلوة

- ۵۹۵ فجر کا مستحب وقت
۵۹۵ اگر سنت فجر چھوٹ جائے تو!
۵۹۸ قبل فجر لیٹنے کا حکم
۶۰۵ وقت ظہر
۶۱۰ نماز عصر
۶۱۰ نماز مغرب
۶۱۰ قبل مغرب نفل کا حکم
۶۱۲ نمازِ عشاء
۶۱۳ رکعات وتر
۶۱۶ عین الہدایہ کا حوالہ
۶۱۶ دعاء قنوت
۶۲۲ قنوت رکوع سے پہلے یا بعد؟
۶۲۴ عشاء سے قبل نفل نماز

نماز تراویح اور رکعات

- ۶۲۶ مؤلف ”حدیث نماز“ کی الزام تراشی
۶۲۷ آٹھ رکعت کی روایت کی تنقید

- ۶۳۰ حضرت عمرؓ اور بیس رکعات تراویح
- ۶۳۲ حضرت علیؓ اور بیس رکعات
- ۶۳۳ دیگر صحابہ سے بیس رکعت کا ثبوت
- ۶۳۴ بعض علماء کے حوالے اور مؤلف کی خیانت
- ۶۴۰ علامہ ابن الہمام کی رائے پر نقد
- ۶۴۱ ڈوبتے کو تینکے کا سہارا
- ۶۴۲ بیس رکعت کی مرفوع حدیث
- ۶۴۳ امام ابوحنیفہ کا ایک استدلال
- ۶۴۴ آٹھ رکعت کی دلیل اور اس کا جواب
- ۶۴۹ رمضان میں رسول اللہ ﷺ کی نماز
- ۶۵۰ بیس رکعت تراویح سنت مؤکدہ ہے
- ۶۵۱ بیس رکعت پر اجماع صحابہ و اجماع امت
- ۶۵۳ اہل حدیث کون؟



باسمہ تعالیٰ

تقریظ

بحرالعلوم حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی دامت برکاتہم
(استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند)

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيدنا محمد وعلى
آله وصحبه أجمعين، وبعد:

اس میں شک نہیں کہ احکام شرعیہ کا اصل سرچشمہ قرآن کریم ہے، اس کے بعد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بلکہ سنت نبوی درحقیقت قرآن کریم کی تفسیر و تشریح ہے، اس سے صرف نظر کر کے قرآن کریم کی مراد اور مطلب تک پہنچنا ممکن ہی نہیں ہے، تیسرے نمبر پر اجماع امت بھی احکام شرعیہ کی ایک مستقل دلیل ہے جس کا دلیل شرعی ہونا قرآن کریم اور صحیح احادیث سے ثابت ہے، لیکن یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ ادلہ شرعیہ کی حیثیتیں اپنے ثبوت اور دلالت مراد کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں، چنانچہ بعض دلیلیں ثبوت اور دلالت دونوں اعتبار سے قطعی ہوتی ہیں۔ بعض کا ثبوت تو قطعی اور ہر شک و شبہ سے بالاتر ہوتا ہے مگر مراد پر ان کی دلالت ظنی ہوتی ہے، اس مراد کے علاوہ دوسری مراد کا بھی ان میں احتمال ہوتا ہے۔ بعض کا ثبوت تو ظنی ہوتا ہے مگر معنی مرادی پر ان کی دلالت صریح اور قطعی ہوتی ہے، اور بعض دلیلیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنے ثبوت اور دلالت مراد دونوں میں ظنی ہوتی ہیں۔ اس کا لازمی مطلب یہ ہوا کہ ان دلائل سے ثابت ہونے والے احکام بھی یکساں حیثیت

کے نہیں ہوں گے۔ دلیل کی نوعیت ثبوت اور قوت دلالت کے فرق سے احکام بھی ایک جانب فرض، واجب، سنت، مستحب اور مباح کے قبیل سے ہوں گے تو دوسری طرف حرام، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی اور خلاف ادب وغیرہ کے قبیل سے۔ اسی طرح ان دلائل میں بسا اوقات تعارض بھی معلوم ہوتا ہے جو دلیل کی نوعیت ثبوت اور قوت دلالت کے فرق سے راجح مرجوح کا تعین کر کے زائل کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے مذکورہ بالا فرق مراتب کا لحاظ کرتے ہوئے ان دلائل سے احکام شرعیہ کا استنباط کرنا ہر کہ و مہ کے بس کی بات نہیں ہے، اس کے کچھ شرائط ہیں جو ائمہ مجتہدین متبوعین میں بدرجہ اتم مہیا تھے، جنہوں نے اپنی پوری محنت اور صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف اور متعارض نصوص پر مجموعی نظر ڈالی، اور ان میں باہم تطبیق، نسخ اور ترجیح کے اصول کا استعمال کرتے ہوئے فروعی مسائل میں حکم شرعی مستنبط کرنے کی کوشش کی، اور قرآن و حدیث کی روشنی میں استنباط مسائل کے اصول بھی وضع کیے۔ ائمہ اربعہ متبوعین کے علاوہ بھی مکاتب فقہی کا وجود ہوا، مگر اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور سے صرف ان چار مکاتب فقہی کو قبولیت عامہ اور دوام عطا فرمایا، اور بقیہ ان ہی میں ضم ہو گئے، چنانچہ پوری امت ائمہ اربعہ کے مستنبط کئے ہوئے اصول پر متفق ہو گئی۔

قطع الثبوت و تعطی الدلالة دلیلوں کے علاوہ جو بھی دلائل ہیں ان سے احکام شرعیہ کے استنباط کے وقت فقہاء کے مابین اخلاف ہونا ناگزیر ہے اور یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ ایک فقیہ نے دلیل کی روشنی میں جو احکام شرعیہ استنباط کیا وہ بہر حال ظنی ہوگا اور قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ وہی حق ہے اور اس کے برخلاف دوسرے فقیہ نے جو حکم مستنبط کیا وہ سراسر باطل ہے۔

امت اور اس کے علماء کے درمیان جب اختلاف ہوتا ہے تو اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل حال ہوتی ہے تو لوگ آپس میں اس اختلاف کو گوارا کرتے ہیں اور کوئی کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں صحابہ کے درمیان بہت سے مسائل میں اختلاف ہوا۔ اور ہر ایک نے اس کو گوارا کیا۔ کسی نے کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کی اور ”الامن رحم ربک“ کے مصداق ہوئے، اور اگر اللہ کا رحم ان پر نہیں ہوتا تو اس اختلاف میں وہ لوگ آپس میں ایک دوسرے پر قولاً و عملاً ظلم و زیادتی کرتے ہیں، لڑائی جھگڑا کرتے ہیں، ایک دوسرے کی تضلیل، تفسیق اور تکفیر کرتے ہیں، جس سے وہ اختلاف مذموم بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے متعلق فرمایا: ﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوْتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾ (آل عمران: ۱۹)

اجتہادی مسائل میں اختلافات دورِ صحابہ میں بکثرت رونما ہوئے، ہر ایک نے اپنے اپنے اجتہاد پر عمل کیا مگر کسی نے ایک دوسرے کی تفسیق یا تضلیل نہیں کی، بلکہ خود نبی کریم ﷺ کی زندگی میں بھی اس کی نظیریں موجود ہیں، غزوہٴ احزاب کے معاً بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بنو قریظہ کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ ”لایصلین أحدکم العصر الا فی بنی قریظہ“ کہ تم میں سے کوئی بھی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ پہنچ کر۔

راستہ میں عصر کا وقت ہو گیا، بعض حضرات نے نماز قضا ہونے کے اندیشہ سے نماز راستہ ہی میں پڑھ لی، اور آنحضرت ﷺ کے قول کو بنو قریظہ جلد پہنچنے کی تاکید پر محمول کیا، اور بعض حضرات نے ارشاد نبوی کو اس کے ظاہر پر محمول کرتے ہوئے نماز قضا ہونے کی پروا نہیں کی اور بنو قریظہ ہی میں پہنچ کر نماز عصر ادا کی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے فریقین میں سے ہر ایک کی تصویب فرمائی اور کسی کی تغلیط نہیں فرمائی۔ (بخاری و مسلم)

چاروں فقہی مسالک بھی صدیوں سے مسلم چلے آرہے ہیں، ان میں مسائل و دلائل کے اختلاف کے باوجود کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہیں تھی کہ فلاں مسلک یا فلاں مکتبہ فکر طریقہ رسول ﷺ کے خلاف ہے، بلکہ چاروں مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کو رسول اللہ ﷺ کا تابعدار جانتے اور سمجھتے تھے، مگر تیرہویں صدی ہجری میں جب ایک نئی جماعت جو خود کو ”اہل حدیث“ کہتی ہے وجود میں آئی تو اس جماعت نے ان تمام فروعی اختلافات میں اپنے اختیار کردہ مسئلہ کو قطعی قرار دے کر اس کے خلاف عمل کرنے والوں کی تکفیر، تفسیق اور تصلیل کی طرح ڈال دی، اس جماعت کے اہل سنت و الجماعت سے الگ ہو کر ضلالت و گمراہی میں پڑنے کی بنیادی وجہ ان لوگوں کا ادلہ شرعیہ کا فرق مراتب کو ملحوظ نہ رکھنا ہے، اور اپنے اختیار کردہ ہر مسئلہ کو قطعی سمجھنا اور دوسرے پہلو کو اختیار کرنے والوں کی تصلیل و تفسیق کرنا ہے، اسی وجہ سے گمراہ فرقوں کی دیگر خصوصیات بھی اس فرقہ میں در آنے لگیں، من جملہ ان خصوصیات کے اپنے نظریہ کے مخالف علماء و ائمہ کی جانب غلط باتوں کا انتساب اور ان کی کتابوں میں اپنی طرف سے الحاق کر دینا ہے۔

اسی طرح ایک کتاب کا علمی جائزہ لیا ہے مکرم و محترم مفتی محمد شعیب اللہ خان زید مجرہ نے، کتاب مذکور کے مصنف نے فقہاء کرام خصوصاً حنفیہ کے بعض مسائل کو بزعم خود مخالف قرآن و سنت قرار دینے کی ناکام کوشش کی تھی، اور سیدھے سادھے مسلمانوں کو باور کرانا چاہا تھا کہ حنفی کتابوں کے مسائل ان کے اماموں کی ذاتی آراء ہیں اور قرآن و سنت سے ان کا واسطہ نہیں ہے، مفتی محمد شعیب اللہ خاں صاحب کو اللہ

تعالیٰ نے علمی بصیرت کے ساتھ خدمت خلق کا جذبہ بھی عطا فرمایا ہے، چنانچہ آپ نے اپنی محنت و صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے مذکورہ کتاب کا ٹھوس دلائل پر مبنی علمی جائزہ پیش کیا ہے، جس سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ فقہی مسائل تمام تر کتاب و سنت سے ہی ماخوذ و مستنبط ہیں، ان پر عمل کرنے میں ہی کامیابی ہے، ان سے انحراف خود کو گمراہی کے دلدل میں پھنسانے کے مترادف ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول بخشے اور عام مسلمانوں کے حق میں مفید و نفع بخش بنائے، آمین، فقط

نعمت اللہ العظمیٰ غفرلہ

خادم تدریس دارالعلوم دیوبند

۲۴ صفر المظفر ۱۴۳۰ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تمہید

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء والمرسلين ، وعلى آله وصحبه أجمعين ، أما بعد:

آج سے تقریباً پچیس سال قبل، ۱۴۰۲ھ کی بات ہے کہ احقر جامعہ مقفاح العلوم جلال آباد میں زیر تعلیم تھا، اور رمضان کی تعطیلات میں اپنے وطن بنگلور آیا ہوا تھا کہ اہل حدیث مسجد (جو مسجد چار مینار کے نام سے معروف ہے) کے امام و خطیب مولانا عبدالمتین جو ناگڈھی کی ایک کتاب ”حدیث نماز“ نظر سے گزری، مولانا نے اس میں وضاحت کی ہے کہ انھوں نے یہ کتاب ہسور کے حنفی لوگوں کے کسی پرچے کے جواب میں لکھی ہے، اور اس میں انھوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ”میں نے اہل حدیثوں کی نماز کے تمام مسائل کو حنفی مذہب کی کتابوں اور فقہاء حنفیہ کے فتوؤں سے ثابت کر دیا ہے“۔ اور اس کتاب پر بعض اہل حدیث حضرات نے تقریظات بھی لکھی ہیں اور اس بات کو سراہا ہے کہ مولانا عبدالمتین صاحب نے حنفی مسلک کی کتابوں سے خود ان کے خلاف اہل حدیث لوگوں کا مسلک ثابت کر دیا ہے۔

راقم الحروف نے اس کتاب کو پڑھا، کتاب کیا ہے؟ مسلک اہل حدیث کی ترجمانی، ان کے طریقہ نماز کی صحت ثابت کرنے کی ایک کوشش، اور اس کے ساتھ

ساتھ احناف کی نماز اور ان کے مسلک کی تردید، اور علماء حنفیہ کے اقوال سے اس پر بے موقعہ استدلال اور ان کی جانب غلط انتساب، اور بہت سی غلط فہمیوں اور غلطیوں کا ایک مجموعہ، اور دروغ بافیوں اور افترا پردازیوں کا ایک پلندہ۔ مگر افسوس کہ تقریظ لکھنے والے حضرات میں سے کسی نے اس بات کی زحمت گوارا نہیں کی کہ حنفی فقہاء کے حوالجات کی تحقیق بھی فرمالیتے اور تقریظ لکھنے سے قبل اپنی ذمہ داری کو پورا کرتے۔ یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ کسی بھی شخص کو اپنے مسلک اور اپنے دلائل کے پیش کرنے کا پورا پورا حق ہے اور اسی طرح بہ ضرورت دوسرے مسلک کا جواب دلائل کی روشنی میں دینے کا بھی مکمل حق ہے، مگر یہ حق کسی کو نہیں کہ کسی کے مسلک کی غلط ترجمانی کرے اور ان کے ائمہ و علماء کی جانب غلط باتیں منسوب کرے۔ مگر بہت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ مولانا عبدالمتمین صاحب نے اپنی کتاب ”حدیث نماز“ میں جگہ جگہ مسلک احناف کی دیدہ و دانستہ غلط ترجمانی کی ہے اور مزید یہ کہ علماء حنفیہ کی جانب بہت سی ایسی باتیں منسوب کی ہیں جو انھوں نے نہیں فرمائی۔

اسی طرح یہ بات بھی کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ نماز و روزہ وغیرہ بہت سے فروعی احکام میں صحابہ کے بھی آپسی اختلافات تھے اور ائمہ کرام میں بھی تھے، مگر ان حضرات کے اس اختلاف کو اور اس کی بنا پر بنے ہوئے متعدد مسالک کو ہماری آپسی رنجش و نفاق کی بنیاد نہیں بنانا چاہئے، یہ مسالک اور اختلافات دلائل کی بنیاد پر ہیں اور ہر ایک کے پاس اپنے اپنے دلائل موجود ہیں، مگر جب اس میں بے اعتدالی و حدود سے تجاوز کیا جاتا ہے اور دلائل کے بجائے رذائل کا استعمال ہوتا ہے تو امت میں انتشار پیدا ہوتا اور اس کے نتیجے میں اس کا شیرازہ بکھرتا جاتا ہے۔ مولانا عبدالمتمین صاحب اپنے دلائل دینے پر اکتفاء کرتے تو کوئی مضائقہ نہیں تھا مگر انھوں نے اپنی اس کتاب ”حدیث نماز“ میں اس سے تجاوز کرتے ہوئے مسلک حنفیہ کو بالکل

ضعیف ولا اصل قرار دینے اور ائمہ حنفیہ و علماء کی عبارات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی بے جا جسارت کی ہے اور اس غلط روش کو اختیار کیا ہے۔

الغرض جب ماہ شوال میں احقر جامعہ مفتاح العلوم، اپنی طالب علمانہ سرگرمیاں جاری کرنے کے لئے روانہ ہوا تو اس رسالہ کو اپنے ساتھ لیتا گیا اور میرے شفیع استاذ حضرت مولانا مفتی نصیر احمد صاحب علیہ الرحمۃ صدر مفتی جامعہ مفتاح العلوم کی خدمت میں اس تبصرے کے ساتھ پیش کیا جو اوپر عرض کیا گیا۔ حضرت الاستاذ نے اس کو لیکر مختلف مقامات سے دیکھا، اور پھر فرمایا کہ تم اس کا جواب لکھ دو، احقر نے اپنی بے بضاعتی و تہی دامنی کا عذر پیش کیا تو فرمایا کہ نہیں، تم کو یہ کام کرنا چاہئے، اور مزید ہمت دیتے ہوئے فرمایا کہ میرا یہ پورا کتب خانہ تمہارے لئے کھلا ہوا ہے، جب چاہے یہاں سے کتابیں لو اور استفادہ کرو اور محققانہ انداز پر جواب تیار کرو۔

احقر نے ”الأمر فوق الأدب“ کے تحت تعمیل حکم کا عزم و ارادہ کر لیا، یہ سال میرا دورہ حدیث شریف کا سال تھا، میں نے اسی سال درسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اللہ کا نام لیکر یہ کام بھی شروع کر دیا اور اسباق کے علاوہ سارا وقت اسی میں لگاتا اور روزانہ جو کچھ جواب لکھتا حضرت الاستاذ کی خدمت میں اس کو پیش کرتا اور آپ کی اصلاحات و ہدایات کی تعمیل کرتا، دورہ حدیث کا سال طلبہ کے لئے بڑا سخت ہوتا ہے اور اس میں سارے ہی اوقات درس میں مصروف ہو جاتے ہیں، تاہم اللہ تعالیٰ کے بے پایاں احسان و کرم اور حضرت الاستاذ کی توجہات و دعاؤں کی بدولت یہ کام شوال کے اوخر سے شروع ہو کر شعبان کے اوخر تک دس ماہ کی مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچ گیا، والحمد لله علی ذلك۔

ایک طالب علم کے لئے یہ کام ظاہر ہے کہ آسان نہیں تھا، سب سے بڑا مسئلہ

میرے لئے یہ تھا کہ میرے پاس کتابیں نہیں تھیں جن سے رجوع کیا جاتا، اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاذ کی برکت سے ایک تو جامعہ مفتاح العلوم کے کتاب خانے سے استفادہ کی راہ کھول دی اور دوسرے خود حضرت الاستاذ کے کتب خانے سے جو دار الافتاء کی کتب پر مشتمل تھا اس سے انتفاع کی سبیل نکال دی، اور تیسرے دارالعلوم دیوبند کے بے مثال کتب خانے سے بھی ضرورت کے وقت رجوع کرنے کا موقعہ عطا فرمایا، اس طرح یہ مسئلہ حل ہو گیا اور میں اس دشوار گزار وادی سے باسانی گزر گیا۔

میں نے اس کتاب میں چند امور کا لحاظ رکھا:

(۱) ایک تو اس بات کا اہتمام کیا کہ مولانا عبدالمتین صاحب جو ناگدھی نے جس مسئلہ کو چھیڑا ہے، اس میں دونوں طرف کے دلائل کو ذکر کیا جائے اور ان دلائل پر عالمانہ کلام کیا جائے اور احادیث پر محدثانہ کلام بھی کیا جائے تاکہ دلائل کی حقیقت و درجہ سمجھا جاسکے۔

(۲) دوسرے یہ کہ مولانا عبدالمتین صاحب نے جو باتیں نقل کی ہیں یا خود کہی ہیں، ان کا بھرپور علمی جائزہ لیا جائے، تاکہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے، لہذا میں نے اس میں کوئی مداہنت گوارا نہیں کی، بلکہ کھل کر ان کی علمی گرفت کی ہے اور حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۳) مولانا عبدالمتین صاحب نے چونکہ متعدد مواقع پر علماء کے حوالے دینے میں غلط بیانی سے کام لیا ہے لہذا اس پر بھی ہم نے مفصل کلام کر کے یہ بتایا ہے کہ علمی دنیا میں یہ بات کس قدر معیوب ہے کہ علمی باتوں میں خیانت و دھوکہ سے کام لیا جائے۔

(۴) ہر بات کو حوالے کے ساتھ پیش کیا ہے، کوئی بات بے حوالہ نہیں بیان کی

ہے تاکہ حق کے متلاشی کو سمجھنے میں اور حق کو پانے میں آسانی ہو، اور رجوع کرنے والے کو بھی سہولت ہو۔

بہر کیف جب اس کتاب کا مسودہ تیار ہو گیا تو یہ تیار شدہ مسودہ میرے پاس رکھا رہا اور دیگر مصروفیات میں لگ کر اس کی طرف کوئی توجہ بھی نہ رہی، اور پھر اس اثناء میں میرے بعض دوسرے رسائل شائع ہوئے تو استاذ محترم حضرت مفتی نصیر احمد صاحب علیہ الرحمہ نے دو چار مواقع پر یاد دہانی بھی کی اور ایک مرتبہ فرمایا کہ بھائی شعیب اللہ! وہ اہل حدیث پر ہماری سرپرستی میں لکھا گیا مسودہ کیا ہوا اور اس کو اب تک کیوں نہیں شائع کیا؟ دوسری کتابیں تو شائع کر دی اور وہ شائع نہیں کی؟ احقر نے عرض کیا کہ شائع کرنے کی سہولت نہیں ہوئی۔ ان شاء اللہ العزیز اس کی کوشش کروں گا کہ جلد شائع ہو جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر و مقدر ہے، اسی وقت وہ کام ہوتا ہے، بندہ ایک بات سوچتا ہے اور اللہ کے یہاں دوسری بات طے ہوتی ہے، چنانچہ احقر کے اب تک پچاس کے قریب رسائل و کتابیں مختلف موضوعات پر چھپ گئیں مگر یہ سب سے پہلی لکھی ہوئی کتاب پچیس برس گزر جانے کے باوجود چھپ نہیں سکی اور استاذ محترم کا اس بیچ وصال بھی ہو گیا۔

جب میری اس کاوش کا بعض علماء کرام کو علم ہوا تو ان کی جانب سے اصرار ہوا اور خود مجھے بھی اس کا احساس تھا کہ اس کو شائع کرنا چاہئے، لیکن دل یہ کہتا تھا کہ اس کتاب کو ایک نظر اول تا آخر دیکھ لینا چاہئے؛ کیونکہ یہ اس وقت لکھی گئی ہے جب کہ ابھی طالب علمی کا دور تھا اور ذہن میں پختگی نہیں تھی، لہذا ممکن ہے کہ کسی جگہ اصلاح یا ترمیم یا ترتیب و تہذیب جدید کی ضرورت محسوس ہو، مگر مصروفیات کے ہجوم اور عدیم الفرستی کی وجہ سے اب میرے لئے یہ کام آسان نہیں رہا تھا، درس و تدریس،

تصنیف و تالیف، جامعہ کا اہتمام، دعوتی اسفار، اور واردین و صادرین سے ملاقات، وغیرہ امور نے اس طرح گھیر رکھا ہے کہ وقت نکالنا مشکل ہے، یہ سوچتے سوچتے بھی ایک دو سال گزر گئے اور کام التواء ہی میں پڑا رہا، پھر یہ سوچا کہ اگر وقت فرصت کا انتظار کیا جائے گا تو شاید یہ کام کبھی بھی نہ ہو سکے گا اور اسی انتظار میں وقت چلا جائے گا، لہذا جو جو وقت ملتا جائے اسی میں کچھ کچھ نظر ثانی کا کام اور ضروری ترمیم و اصلاح کا کام کرتے رہنا مناسب ہوگا، چنانچہ بنام خدائے مہربان اسی طور پر نظر ثانی کا کام شروع کر دیا گیا اور الحمد للہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔

نظر ثانی کے موقعہ پر میں نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ:

(۱) چونکہ یہ کتاب لکھتے وقت بعض اصل مراجع و کتابیں مل نہیں سکیں، اس لئے کسی دوسری کتاب سے اس کا حوالہ پیش کیا گیا تھا، مگر اب اصل کتابیں مل گئیں تو ہم نے اصل کتابوں ہی کے حوالے درج کر دئے ہیں۔

(۲) جن کتابوں کے حوالے دئے گئے ہیں حتی الامکان کوشش کی ہے کہ اصل کتاب سے دیئے جائیں، ہاں جو کتاب نہ مل سکی اس کا حوالہ جس کتاب سے دیا گیا ہے اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۳) حوالجات کو از سر نو دیکھا گیا اور صفحات و جلد نمبر کو حتی الامکان صحیح درج کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ رجوع کرنے والوں کو دقت نہ ہو۔

(۴) قدیم مسودے میں حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے ایک یا دو کتابوں پر اکتفاء کیا گیا تھا، لیکن نظر ثانی کے وقت اس بات کی کوشش کی گئی کہ حدیث اگر متعدد کتابوں میں ہے تو ہماری رسائی جہاں تک ہے ان سب کا حوالہ ذکر کیا جائے۔

(۵) بعض مواقع پر احادیث پر کلام یا کسی مضمون کی تقویت کے لئے علماء کا کلام درج کیا گیا تھا، وہاں مزید حوالے مل جانے پر ان حوالوں کا بھی اضافہ کر دیا گیا تاکہ

مزید تقویت ہو جائے۔

(۶) بہت سے مضامین قدیم مسودے میں ایسے بھی آگئے تھے جو محض علمی و دقیق فنی مسائل پر مشتمل تھے، اور دراصل طالب علمانہ ذوق اور زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کی حریصانہ ذہنیت کا نتیجہ تھے، مگر نظر ثانی میں ہم نے اس کتاب کے مخاطبین کو نظر میں رکھتے ہوئے ان مضامین کو حذف کر دینا مناسب سمجھا، لہذا بہت سے اس قسم کے مضامین کو نکال دیا گیا۔

(۷) بعض جگہ محسوس ہوا کہ مضمون تشنہ ہے، لہذا وہاں اس تشنگی کو ختم کرنے کے لئے ضرورت کے مطابق مواد میں اضافہ کیا گیا، تاکہ کوئی بات ادھوری و نا مکمل نہ رہے۔

(۸) جب یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت الفاظ و عبارات کے استعمال کا وہ سلیقہ نہیں تھا جو ہونا چاہئے، اسی طرح عبارات کے پیش کرنے میں طالب علمانہ دقیق انداز اختیار کیا گیا تھا، جس میں عوامی ذہن کو بالکل سامنے نہیں رکھا گیا تھا، لہذا نظر ثانی میں اس کی رعایت کی گئی کہ الفاظ و عبارات کو تسہیل و توضیح و خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا جائے۔

الغرض ان رعایتوں کے ساتھ اس کتاب کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لہذا یہ کتاب اصل مسودے، مواد اور مضامین کے لحاظ سے میری ابتدائی تحریرات میں سے ہے اور ترتیب و تہذیب و اضافات کے لحاظ سے جدید کہلا سکتی ہے۔

ہمارے اس جواب کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ نماز کے وہ طریقے جو دیگر ائمہ نے اختیار کئے ہیں وہ غلط ہیں، جیسا کہ اہل حدیث لوگوں کا شیوہ ہے کہ وہ سب کو غلط کہتے اور صرف اپنے اختیار کردہ طریقہ ہی کو صحیح قرار دیتے ہیں، بلکہ ہماری اس کوشش

کا مقصد ہی یہ بتانا ہے کہ دلائل کی بنیاد پر قائم یہ تمام طریقے شریعت میں مقبول ہیں اور ان میں اختلاف کوئی گمراہی نہیں اور ان میں سے ایک ہی طریقہ متعین نہیں، بلکہ ان سب کی گنجائش ہے، ہاں کسی کے نزدیک کوئی طریقہ زیادہ پسندیدہ ہے، لہذا اس نے اس کو اختیار کیا اور دوسرے کے پاس دوسرا طریقہ رائج تھا، لہذا اس نے اس دوسرے طرز کو اپنایا، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہاں دوسروں کو غلط قرار دینا جیسا کہ مؤلف ”حدیث نماز“ مولانا عبدالمتمین صاحب اور ان کے ہم مسلک لوگوں کا طریقہ ہے، یہ تمام سلف صالحین کے طریقے کے خلاف ایک بدعت ہے، اور اس بدعی طرز عمل نے امت میں انتشار و افتراق کی ایک فضا پیدا کر دی ہے، اور روز روز ان مسائل پر جھگڑے ہونے لگے ہیں۔ اس لئے ہم نے اس جو ابی کتاب میں یہ بتایا ہے کہ دلائل کی بنیاد پر قائم تمام طریقے شریعت میں جائز ہیں، اختلاف صرف رائج و مرجوح کی تعیین میں ہے، اس لئے کسی کو بھی برا بھلا کہنا جائز نہیں۔

اس جگہ یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ اس کتاب کی نظر ثانی و ترتیب و تہذیب میں میرے عزیز مولانا محمد یاسین حفظہ اللہ تعالیٰ / استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، نے میرا بڑا تعاون کیا، مراجع و مصادر سے رجوع کرنے، متعلقہ مضامین و مواد کو تلاش کرنے، اور مسودے کی تصحیح وغیرہ امور میں ان کا تعاون میرے کام میں آسانی و سہولت کا باعث ہوا، اسی طرح میرے عزیز مولانا محمد زبیر احمد حفظہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی تصحیح و کمپوزنگ و سیٹنگ کرانے میں متعلقہ افراد سے کام لیتے ہوئے اس کو تکمیل تک پہنچانے میں نمایاں کام انجام دیا، میں تہہ دل سے ان دونوں کا مشکور و ممنون ہوں اور ان کے حق میں دعاء گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی مساعی جمیلہ کو قبول کرے اور انہیں علمی و عملی ترقیات سے بھرپور حصہ عطاء فرمائے۔ آمین۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ اس کتاب کو اپنے دربار عالی میں شرف قبول سے نوازے اور راہ حق و اعتدال دکھانے میں اس کو موثر بنائے۔ آمین۔

فقط

۲۹ رمضان ۱۴۲۹ھ ہجری

محمد شعیب اللہ خان

مطابق ۳۰ ستمبر ۲۰۰۸ عیسوی

مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

<http://mujahid.xtgem.com>

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نماز میں سکون و اطمینان اور سنن کا لحاظ

”حدیث نماز“ نامی رسالہ کی ابتداء میں مؤلف کتاب مولانا عبدالمتمین صاحب جو ناگڈھی نے اسلام کے پانچ ستون، اور ان میں نماز کی اہمیت پر آسان پیرایے میں ترغیبی کلام کیا ہے، پھر آگے چلکر انھوں نے ایک عنوان ”نمازی کا خدائی استقبال“ قائم کر کے اس کے تحت دو چیزوں کو بیان کیا ہے۔ ایک تو نماز کی فضیلت، دوسرے نماز کو بے ڈھنگے انداز سے پڑھنے پر وعید و مذمت، اور ان دو باتوں میں کسی مسلمان کو کوئی اختلاف نہیں، اور نہ کسی مسلک میں اس سے اختلاف کیا گیا ہے، سب لوگ یہ مانتے ہیں کہ نماز میں سکون و اطمینان اور سنتوں کا لحاظ و رعایت لازم ہے، اس کے بغیر نماز ناقص و ناکارہ ہوتی اور غیر مقبول قرار پاتی ہے، مگر صاحب ”حدیث نماز“ کی بعض تعریضات و کنایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حنفیوں کی نماز کو مورد وعید و عتاب خیال کرتے ہیں اور ان تمام احادیث کو جن میں ایسی نماز پر وعید آئی ہے جو بری طرح ادا کی گئی ہو وہ حنفیوں کی نماز پر منطبق کرتے اور ان کی نمازوں کو ان احادیث کا مصداق قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ وہ بعض احادیث کو جو بری طرح نماز پڑھنے اور خلاف آداب پڑھنے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، لکھ کر اپنی کتاب ”حدیث نماز“ میں لکھتے ہیں:

”لیکن ایسی نماز جو رسول اللہ ﷺ نے سکھائی تھی بہت جلد فراموش کر دی گئی، بعضوں نے اپنی سستی کی وجہ سے، بعضوں نے اپنے مسلک

کی رو سے، الخ (حدیث نماز: ۲۰)

سوال یہ ہے کہ یہ کس کا مسلک ہے جس کی طرف مولف ”حدیث نماز“ اشارہ کر رہے ہیں؟ جبکہ ہماری دانست کے مطابق کوئی مسلک بھی ایسا نہیں جو کسی کو بے ڈھنگے طریقہ پر اور سنن و آداب کے خلاف نماز کی تعلیم دیتا ہو، یہ غالباً اس طرف اشارہ ہے کہ فقہاء حنفیہ و دیگر تمام فقہاء کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ آداب و سنن کے ترک کر دینے سے نماز ہو جاتی ہے، اگرچہ کہ ناقص ہوتی ہے، گویا صاحب ”حدیث نماز“ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ احادیث میں تو آیا ہے کہ سنن و آداب کے ترک کرنے سے نماز نہیں ہوتی، لیکن احناف و دیگر فقہاء اس کے خلاف صحت نماز کے قائل ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ اشکال و اعتراض احناف و دیگر فقہاء پر وارد نہیں ہوتا؛ کیونکہ صحت نماز و قبولیت نماز میں فرق ہے، ان احادیث میں قبول نہ ہونا مراد ہے اور ہم اسی کے قائل ہیں، یہ مراد نہیں کہ آداب و سنن کے ترک کرنے سے نماز ہی نہیں ہوتی اور باطل ہو جاتی ہے، یہ معنی ان احادیث کا جمہور کے خلاف ہے، اور کسی کے نزدیک بھی ترک سنت سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

ترک سنت کا حکم

اسی لئے علامہ قرطبی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

”وروي عن علي بن زياد من أصحاب مالك أنه قال: من ترك سنة من سنن الوضوء أو الصلاة عمداً أعاد ، وهذا عند الفقهاء ضعيف ، وليس لقائله سلف ولا له حظ من النظر ولو كان كذلك لم يعرف الفرض والواجب من غيره“ (امام مالک کے اصحاب میں سے امام علی بن زیاد سے مروی ہے کہ جس نے وضو یا نماز

کی سنتوں میں سے کسی سنت کو ترک کر دیا وہ اس کو لوٹائے، یہ فقہاء کے نزدیک ضعیف ہے اور اس کے قائل کا کوئی سلف یعنی پیشرو نہیں ہے اور نہ اس کو نظر و فقہ میں سے کوئی حصہ حاصل ہے، اور اگر بات ایسی ہوتی تو فرض و واجب غیر فرض و غیر واجب میں امتیاز نہ ہو سکتا) (تفسیر القرطبی: ۹۱/۶)

اور بعینہ یہی بات ابن عبدالبر الممالکی نے فرمائی ہے کہ امام مالک کے بعض اصحاب نے یہ کہا کہ جس نے وضو یا نماز کی سنتوں میں سے کسی سنت کو ترک کر دیا وہ اس کو لوٹائے، مگر یہ بات فقہاء کے نزدیک ضعیف ہے اور اس کے قائل کا کوئی پیشرو نہیں ہے اور نہ اس کو نظر و فقہ میں سے کوئی حصہ حاصل ہے، اور اگر بات ایسی ہوتی تو فرض و واجب کا غیر فرض و غیر واجب سے امتیاز نہ ہو سکتا۔ (کما فی التاج والاکیل: ۴۳/۲)

اس سے معلوم ہوا کہ تمام ہی فقہاء کا یہ مسلک ہے کہ سنن کے ترک سے نماز باطل نہیں ہوتی اس لئے لوٹانے کی ضرورت نہیں، تو اس پر اعتراض کا مطلب یہ ہوا کہ جمہور بلکہ تمام ہی سلف پر اعتراض ہے، اب مؤلف ”حدیث نماز“ کو سوچ لینا چاہئے کہ وہ صحیح روش پر ہیں یا تمام علماء کی روش و مسلک صحیح ہے؟

ہاں ترک سنت سے نماز میں قصور و نقص آتا ہے، اس لئے حضرات علماء اس کی تاکید کرتے ہیں کہ سنت کی پوری رعایت کی جائے، اور اس میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ نیز علماء فقہ نے لکھا ہے کہ ترک سنت سے گناہ بھی لازم آتا ہے، امام شامی نے تلویح سے نقل کیا ہے کہ سنت مؤکدہ کا ترک حرام کے قریب ہے اور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے محرومی کا مستحق ہے، نیز شامی نے لکھا ہے کہ ترک واجب یا

سنت سے گناہ ہوتا ہے۔ (فتاویٰ شامی: ۱۰۴/۱)

ترک واجب کا حکم

اسی طرح جو امور واجب ہیں وہ تو احناف کے نزدیک اور زیادہ مؤکد ہیں، اور ان کا اہتمام اور زیادہ چاہئے؛ کیونکہ واجب کے ترک سے بھی نماز و عبادت میں نقصان و عیب پیدا ہو جاتا ہے، اور اس طرح عیب دار نماز پڑھنا جائز نہیں، اسی لئے فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کسی نے نماز کا کوئی واجب بھولے سے چھوڑ دیا تو اسے سجدہ سہو کرنا پڑے گا اور اگر عمداً چھوڑ دیا تو اسے نماز لوٹانا پڑے گا۔ معلوم ہوا کہ حنفیہ کے نزدیک واجب کا ترک جان بوجھ کر ہو تو وہ سجدہ سہو سے معاف نہ ہوگا بلکہ اس کو وہ نماز دہرائی ہوگی۔ اب مؤلف ”حدیث نماز“ سے سوال یہ ہے کہ انہوں نے یہ اشارہ کس کی جانب کیا ہے؟ کہ بعض لوگ مسلک کی وجہ سے ان چیزوں کو چھوڑتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی ایسا نہیں تو اس تعریض کا کیا حاصل؟

مسلک حنفیہ پر بہتان تراشی

اسی طرح مؤلف ”حدیث نماز“ مولانا عبدالمعین صاحب نے یہاں علامہ ابن قیم کی کتاب ”اعلام الموقعین“ کے حوالے سے ایک مناظرہ کا حصہ نقل کیا ہے اور اس طرف تعریض کی ہے کہ احناف کے نزدیک سنن و آداب کی رعایت کے بغیر نماز ادا ہو جاتی ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی نماز کو باطل قرار دیا ہے۔ ہم اولاً اس مناظرہ کو نقل کرتے ہیں پھر اس کا جواب دیں گے۔

”اور پھر وہ نماز جو آپ حضرات (مقلدین) نے صحیح اور جائز رکھی ہے وہ کیسی ہے؟ وہ یہ ہے کہ نمازی ایک چھوٹی سے آیت ﴿مُدَّهَا مَتَّانٍ﴾

کافارسی ترجمہ: ”دو برگ سبز“ پڑھ دے یعنی ”دوہری پیتیاں“ کہہ لے تو اس کی قرأت بھی ہوگئی اور قیام بھی، اور پھر رکوع میں جھک کر صرف ایک سانس لے لے تو رکوع بھی ہو گیا پھر رکوع سے اٹھ کر ذرا کمر اونچی کر دے جیسی تلوار خمیدہ ہوتی ہے تو قومہ بھی ہو گیا اور اگر نہ چاہے تو اتنا اٹھنا بھی ضروری نہیں، یونہی رکوع سے سجدہ میں گر پڑے، رکوع بھی ہو گیا، اور سجدہ میں اگر ہاتھ پاؤں زمین پر نہ لگائے اور گھٹنے بھی اگر زمین سے نہ لگائے اور پیشانی بھی زمین پر نہ رکھے صرف ناک کی ہڈی سے زمین کو چھو لے تو سجدہ بھی ہو گیا، پھر التحیات اور تشهد نہ پڑھے صرف اتنی دیر بیٹھ جائے، پھر کوئی حرکت نماز کو توڑ دینے والی کر دے یعنی ہوا چھوڑے یا گوز مار دے یا قہقہہ مار کر ہنس پڑے یا اور کوئی ناقض نماز حرکت کر دے تو نماز پوری ہوگئی۔ (استغفر اللہ) اس کو نقل کر کے صاحب حدیث نماز نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس نماز کو باطل قرار دیا اور حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے جس نماز کے غلط ہونے کا فتویٰ دیا ایسی نماز کو بعض لوگوں نے اور بعض کتابوں میں جائز اور صحیح قرار دیا ہے۔

(حدیث نماز: ۲۴-۲۵)

صاحب ”حدیث نماز“ نے اس عبارت میں حنفیہ کے خلاف جو لکھا ہے، اس کو ایک معمولی جاہل مسلمان بھی پڑھ کر سمجھ سکتا ہے کہ اس میں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں اور بہتان تراشی کے علاوہ کوئی حقیقت نہیں؛ کیونکہ دنیا کا کوئی بھی حنفی کسی کو یہ نہیں کہتا کہ مذکورہ طریقہ پر نماز پڑھنا چاہئے اور یہ مذہب حنفی کا طریقہ ہے، اس جھوٹ و بہتان کا مولف ”حدیث نماز“ کو خدا کے یہاں جا کر ضرور جواب دہ ہونا ہے، اس

کے بعد اب سنئے کہ حنفیہ کے نزدیک بھی ایسی نماز باعثِ گناہ اور موجبِ عذاب و عتاب ہے۔ اور مؤلف ”حدیث نماز“ کا حنفیہ پر یہ اعتراض مسلکِ احناف سے اور ان کی اصطلاحاتِ فقہیہ سے عدم واقفیت یا تعصب پر مبنی ہے؛ کیونکہ کسی حنفی عالم کا یہ فتویٰ نہیں کہ اس مذکورہ صورت سے نماز پڑھنا حلال و جائز ہے اور اس پر کوئی گناہ و عذاب نہیں، بلکہ فقہاءِ حنفیہ نے تصریح کی ہے کہ اس طرح نماز پڑھنا حرام اور سختِ معصیت ہے، اور جس نے اس طرح نماز پڑھی اس نے بدترین جرم کا ارتکاب کیا۔ ہاں البتہ وہ حضرات یہ ضرور کہتے ہیں کہ اگر کسی نے اپنی بدبختی اور نالائقی سے اس طرح نماز ادا کی تو نماز اس کے ذمہ سے اتر گئی مگر مقبول نہیں ہوئی۔

حاصل یہ کہ احناف نے جو ایسی نماز کو جائز کہا ہے یا صحیح قرار دیا ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس طرح نماز پڑھنا حلال ہے، بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ مکلف سے فرض کا ذمہ اتر گیا۔ البتہ اس نماز کا دہرانا اور اس کو سنن و آداب کے ساتھ پڑھنا ضروری ہوگا۔

فقہاء کے کلام میں جواز و صحت کے معنی

وجہ یہ ہے کہ فقہاء کرام کے کلام میں لفظِ جواز دو معنوں میں استعمال ہوا ہے، ایک حلال و مباح ہونے کے معنی میں، دوسرے کسی کام کے منعقد ہوجانے کے معنی میں، اس سے قطع نظر کہ اس کام سے گناہ ہوگا یا نہیں، فقہاء کے کلام میں لفظِ جواز پہلے معنی کی طرح دوسرے معنی میں بھی بکثرت استعمال ہوا ہے۔

مثلاً فقہاء نے لکھا ہے:

(۱) ”فإن أبدل التكبير بالله أجل أو الرحمن جاز“ (کہ اگر تکبیر تحریمہ

کے وقت (اللہ اکبر) کے بجائے کوئی (اللہ اجل) یا (اللہ الرحمن) وغیرہ الفاظ استعمال کرے تو اس کی نماز جائز ہے۔ (شرح وقایہ مع حاشیہ چلپی: ۳۸)

حالانکہ خود فقہاء نے لکھا ہے کہ: ”وصح شروعہ أيضاً مع کراهة التحريم بتسييح و تهليل“ (کہ سبحان اللہ اور لا الہ الا اللہ کہہ کر نماز شروع کرنے سے نماز کا شروع ہونا کراہت تحریمی کے ساتھ صحیح ہوگا) (درمختار مع شامی: ۲۸۳/۱) معلوم ہوا کہ فقہاء نے خود اس کو مکروہ بھی قرار دیا ہے۔

(۲) اسی طرح خطیب جمعہ کا خطبہ بغیر وضوء کے دیدے تو فقہاء نے اس کو جائز بھی قرار دیا ہے اور مکروہ بھی بتایا ہے، چنانچہ امام قدوریؒ اس کے بارے میں فرماتے ہیں: ”یکره و جاز“ (کہ خطبہ جائز ہو جائے گا اور مکروہ ہوگا) (مختصر القدوری: ۳۶) اور شامیؒ نے نقل کیا ہے کہ: ”جاز و یائثم“ (کہ یہ خطبہ جائز ہو جائے گا اور خطیب گنہگار بھی ہوگا) (شامی علی الدر المختار: ۱۵۰/۲)

اس جگہ غور طلب بات یہ ہے کہ فقہاء نے ایک کام کو جائز بھی بتایا اور مکروہ و ناجائز بھی، یہ کیوں اور کیسے؟ بات وہی ہے جو اوپر عرض کر چکا ہوں کہ فقہاء کے کلام میں جواز کے ایک معنی یہ ہیں کہ یہ کام منعقد ہو گیا، ذمہ سے ساقط ہو گیا، اس سے قطع نظر کہ یہ کام حلال و مباح تھا یا ناجائز و حرام۔

مزید تقویت کے لئے حوالہ بھی لیجئے، علامہ بدر الدین العینیؒ نے ”البنایۃ شرح الہدایۃ“ میں لکھا ہے کہ: ”ولفظة ”يجوز“ تارة تطلق على معنى يحلّ، وتارة تستعمل بمعنى يصحّ، وتارة تصلح لهما“ (کہ ”يجوز“ کا اطلاق کبھی حلال ہونے کے معنی میں اور کبھی اس کا استعمال کام کے صحیح ہو جانے کے معنی میں اور کبھی ان دونوں معنی کے لئے درست ہوتا ہے) (البنایۃ: ۲۰۵/۱)

اسی طرح علامہ نووی شافعی ”المجموع شرح مہذب“ میں فرماتے ہیں:

”ولفظة ”يجوز“ تارة يستعملونها بمعنى يحل ، وتارة بمعنى يصح ، وتارة تصلح للأمرين“ (فقہاء ”يجوز“ کا لفظ کبھی حلال ہونے کے معنی میں اور کبھی کام کے صحیح ہو جانے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہ کبھی ان دونوں معنی کے لئے درست ہوتا ہے) (المجموع: ۱۱۹/۱)

علامہ عبدالحی لکھنوی فرماتے ہیں:

”يجوز قد يقال بمعنى يصح وقد يقال بمعنى يحل ، كذا في شرح المہذب للنووي، ولذلك تراهم يطلقون على الصلوة المكروهة ونحوها ”جاز ذلك أو صح ذلك“ ويريدون به نفس الصحة المقابل للبطلان من غير القصد إلى الإباحة أو نفي الكراهة ، ولهذا فسر الشراح والمحشون كثيراً قولهم ”جاز و صح“ بقولهم: أى مع الكراهة ، كما لا يخفى على وسيع النظر“ (خلاصہ مطلب: لفظ ”جائز“ کبھی صحیح کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی حلال کے معنی میں بولا جاتا ہے، علامہ نووی نے شرح مہذب میں اسی طرح لکھا ہے، اسی لئے فقہاء مکروہ نماز پر جائز و صحیح کا اطلاق کرتے ہیں اور اس سے ان کی مراد محض صحیح ہو جانا ہوتا ہے جو بطلان کے مقابل ہے، حلال ہونا یا مکروہ نہ ہونا مراد نہیں ہوتا، اسی لیے شرح اور حواشی نگار حضرات نے فقہاء کے قول ”جاز اور صح“ کی تفسیر کرتے ہوئے ”یعنی مع الکراهة“ لکھا ہے) (مقدمة عمدة الرعاية: ۱۵)

ان عبارات سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ فقہاء کی زبان میں جائز کا لفظ کبھی

حلال ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو کبھی صرف بطلان کے مقابلہ میں صحیح ہونے کا معنی دیتا ہے، جو کراہت کو بھی شامل ہے۔

اس تفصیل و تشریح کو پیش نظر رکھنے والے کو حضرات فقہاء کرام کی عبارات پر کسی شبہ کی گنجائش نظر نہیں آئے گی؛ کیونکہ ان فقہاء نے یہ نہیں لکھا ہے کہ نماز اس طرح بے ڈھنگے طریقے پر پڑھنا چاہئے بلکہ یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بے ڈھنگا نامعقول آدمی اس طرح پڑھے گا تو اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ اس سے نماز ادا ہو جاتی ہے مگر خلاف سنت ہونے کی وجہ سے مکروہ بھی ہوتی ہے۔ اس میں آخر کیا اشکال ہے؟

صلاة القفال کی حقیقت

یہاں بطور تنبیہ یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ یہ حنفیہ کی نماز کا جو مذاق اس طرح اُڑایا گیا ہے، اس کی بنیاد ایک جھوٹا واقعہ ہے، جس میں امام الحرمین شافعی کی روایت سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ سلطان محمود نے امام قفال مروزی شافعی کو حکم دیا کہ شافعی و حنفی دونوں مذاہب کے مطابق ایسی دو رکعتیں پڑھ کر دکھائیں جس سے کم درجہ جائز نہ ہو، امام قفال نے پہلے تو امام شافعی کے مذاہب کے مطابق دو رکعتیں کامل طہارت کے ساتھ باقاعدہ وضو کر کے، پاک لباس پہن کر، قبلہ رو، باادب، خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جن میں نماز کے کل ارکان کو بحسن و خوبی ادا کیا، نہ کسی فرض کو چھوڑا نہ سنت کو نہ کسی مستحب کو، اس طرح کامل و مکمل طور پر نماز شافعیہ پڑھ کر دکھائی اور سلطان محمود سے کہا کہ یہ ہے شافعی طریقہ نماز۔ اور جب حنفی طریقہ کے مطابق نماز دکھائی تو امام قفال نے کتے کی دباغت دی ہوئی کھال پہن کر، اس کا چوتھائی حصہ

نجاست میں ملوث کر کے، کھجور کی نیبڈ سے وضو کیا، پھر نماز شروع کی تو ”اللہ اکبر“ کی جگہ فارسی میں ”خدائے بزرگ تراست“ کہا اور قرآن سے ایک چھوٹی آیت: ”مُدَّهَا مَّتَّان“ کا فارسی ترجمہ ”دو برگ سبز“ پڑھ دیا، اور بغیر اطمینان و سکون کے جلدی جلدی رکوع و سجدہ کیا اور آخر میں گوز مار کر نماز ختم کی، اور بادشاہ سے کہا کہ یہ ہے حنفی نماز کا طریقہ“

یہ واقعہ تاریخی لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اور درحقیقت جھوٹ کا پلندہ ہے اور بلا ریب کسی دشمن دین و عقل کا گھڑا ہوا ہے اور بقول علامہ حبیب الرحمن اعظمی محدث کے ان امور کی نسبت قتال و امام الحرمین کی طرف بہتان و افتراء ہے، اور یہ قصہ طلسم ہو شربا کی داستان اور گل بکاؤلی کے قصہ سے زیادہ وقیع نہیں۔ غور تو کرو، آخر یہ کتنی بڑی بے انصافی ہے کہ شافعی مذہب کی جائز نماز دکھاتے وقت تو کوئی مستحب بھی نہ چھوڑا اور حنفی مذہب کی جائز نماز پڑھی تو واجبات بلکہ فرائض تک کا ناس مار دیا۔ حنفی مذہب میں یہ کہاں ہے کہ فرائض کے ترک سے نماز ہو جاتی ہے، حنفی مذہب میں تو واجب کے قصد ترک سے بھی نماز لوٹانا واجب ہے۔ (مقالات ابو المآثر: ۲۰۰/۱/۱)

اس واقعہ میں مذہب حنفیہ کے ساتھ جھوٹ و مکر سازی کی فن کاری کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور فریب دہی و بہتان طرازی کا معاملہ کیا گیا ہے اور علمی لحاظ سے اس میں جو جو خیانتیں کی گئیں ہیں ان کا تفصیلی ذکر محدث شہیر حضرت علامہ حبیب الرحمن اعظمی نے اپنے ایک مقالہ میں کیا ہے اس کے لئے دیکھئے مقالات ابو المآثر، اور اسی میں ہے کہ اس صلاۃ قتال کی تردید میں امام ملا علی قاری نے بھی ایک رسالہ بنام: ”تشیع الفقہاء الحنفیۃ بتشیع السفہاء الشافیۃ“ لکھا ہے۔

طہارت و پاکی

﴿﴾ کیا خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ﴿﴾

پیشاب و پاخانہ کی راہ کے علاوہ بدن کے کسی اور حصہ سے خون یا کوئی اور نجاست نکلنے سے وضو باقی رہتا ہے یا ٹوٹ جاتا ہے؟ اس مسئلہ میں ائمہ و علماء کا اختلاف ہے، صحابہ کرام میں حضرات عشرہ مبشرہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت ابوالدرداء، حضرت ثوبان رضی اللہ عنہم اجمعین، اور بہت سے تابعین جیسے سعید بن المسیب، علقمہ، عطاء بن ابی رباح، قتادہ، اور بقول امام خطابی اکثر فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور یہی امام ابو حنیفہ اور علماء حنفیہ کا قول ہے۔ (دیکھو: البناۃ: ۲۵۹/۱، المغنی لابن قدامہ: ۱۲۸/۱، شرح المہذب: ۶۲/۲، السعایۃ: ۲۰۴/۱)

اور بعض صحابہ جیسے حضرت ابن عباس، ابن ابی اوفی، جابر بن عبداللہ، ابو ہریرہ، عائشہ رضی اللہ عنہم، اور بعض ائمہ جیسے امام شافعی، امام مالک، طاؤس، قاسم بن محمد وغیرہ کے نزدیک پیشاب، پاخانہ کی راہ کے علاوہ بدن کے کسی اور حصہ سے خون یا کوئی نجاست نکلے تو ناقض وضو نہیں ہے۔ (البناۃ: ۲۶۰/۱، شرح المہذب: ۶۲/۲، السعایۃ: ۲۰۴/۱)

صاحب ”حدیث نماز“ نے اس مسئلہ کو بھی اپنی کتاب ”حدیث نماز“

میں چھیڑا ہے اور لکھا ہے کہ:

”جسم سے نکلنے اور بہنے والے خون کے متعلق یہ روایت سنن دار

قطنی میں ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز حافظ تمیم الداریؓ سے روایت

کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”الوضوء من کل دم سائل“ (ہر بہنے والے خون سے وضو لازم آتا ہے) خود امام دارقطنی اس روایت کو بیان کر کے کہتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں یزید بن خالد اور یزید بن محمد نہایت مجہول راوی ہیں..... اور عمر بن عبدالعزیز نے نہ تمیم داری سے سنا اور نہ ان کو دیکھا، ایک اور روایت جو ”منقحی“ میں ہے جس میں نکسیر کے خون پر وضو کرنے کا بیان ہے۔ امام شوکانی نے اس کو بھی نہایت ضعیف، مرسل اور منقطع السند ثابت کیا ہے۔ (حدیث نماز: ۳۸)

راقم الحروف کہتا ہے کہ صاحب ”حدیث نماز“ نے اولاً تو تمام روایات پر جو اس باب میں ہیں، کلام نہیں کیا، بلکہ صرف دو روایات پر بحث کی ہے، حالانکہ علماء احناف کے دلائل اور بھی ہیں۔ ثانیاً یہاں جن دو روایات پر صاحب رسالہ نے کلام کیا ہے اور ان کو ضعیف، مرسل اور منقطع کہا ہے، یہ بھی صحیح نہیں۔

خون سے وضو ٹوٹ جانے کے دلائل

اس لئے ہم اولاً ان دو روایات کو پیش کر کے مؤلف ”حدیث نماز“ کے اعتراضات کا جواب دیں گے، پھر اس سلسلہ کی دیگر روایات ذکر کریں گے۔
پہلی حدیث:

﴿ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ : الْوُضُوءُ مِنْ كُلِّ دَمٍ سَائِلٍ ﴾ (دارقطنی: ۱۵۷/۱)

(نصب الراية: ۳۷/۱)

(حضرت تمیم داریؒ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ہر ایسے خون سے وضو ہے جو بہنے والا ہو)

یہ حدیث دو صحابہ ایک حضرت تمیم داری دوسرے حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے، تمیم داری کی حدیث کو دارقطنی نے اپنی ”سنن“ میں اور زید بن ثابت کی حدیث کو ابن عدی نے ”الکامل“ میں روایت کیا ہے۔ مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس روایت کے بارے میں دو اعتراضات کئے ہیں: ایک یہ کہ امام دارقطنی نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس روایت کی سند میں یزید بن خالد اور یزید بن محمد نہایت مجہول راوی ہیں دوسرا یہ کہ اس کے راوی عمر بن عبدالعزیز نے نہ تمیم داری سے سنا اور نہ ان کو دیکھا، لہذا یہ روایت منقطع ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت انہی الفاظ سے دوسری سند کے ساتھ ابن عدی نے ”الکامل“ میں حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے۔ اور اس کے تمام رجال ثقہ ہیں، سوائے احمد بن الفرغ کے کہ ان پر علماء نے کلام کیا ہے، مگر ابن ابی حاتم نے ”کتاب العلل“ میں کہا کہ (محله عندنا الصدق) ”ان کا محل ہمارے نزدیک صدق ہے“، یعنی یہ سچے لوگوں میں سے ہیں۔ (نصب المرایہ: ۱/۳۷۷)

اور حافظ ابن حجر نے ”تہذیب التہذیب“ میں ان کا ذکر کیا ہے اور ان کے متعلق توثیق و تضعیف دونوں نقل کی ہے، ابو حاتم سے نقل کیا ہے کہ ان کا محل صدق ہے اور ہم نے ان سے حدیث لکھی ہے، ابو احمد سے نقل کیا ہے کہ یہ جب عراق آئے تو اہل عراق نے ان سے حدیث لی اور وہ ان کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے، اور مسلمہ بن قاسم سے نقل کیا ہے کہ یہ مشہور ثقہ ہیں، اور لکھا ہے کہ ابن عدی نے عبدالملک بن محمد سے نقل کیا ہے کہ محمد بن عوف، احمد بن الفرغ کی تضعیف کرتے تھے اور اس کے باوجود ان کی حدیث لیتے تھے، اسی طرح اور لوگ بھی ان کی احادیث لیتے تھے۔ (تہذیب التہذیب: ۱/۵۹۱)

اس سے معلوم ہوا کہ احمد بن الفرغ متفق علیہ ضعیف راوی نہیں ہیں بلکہ بعض نے ان کی توثیق بھی کی ہے لہذا یہ حسن الحدیث ہوں گے؛ کیونکہ مختلف فیہ راوی حسن الحدیث ہوتا ہے، اس لیے یہ روایت حسن ہوگی۔ اور اس حسن حدیث کی تقویت دارِ قطنی کی ضعیف روایت سے ہوگئی۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ دارِ قطنی کی اس روایت میں جن دوراویوں کو مجہول قرار دیا گیا ہے، یہ بھی درحقیقت سب کی رائے نہیں ہے؛ کیونکہ بعض محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، اور ظاہر ہے کہ جو راوی مجہول ہو اس کی توثیق نہیں کی جاسکتی۔ علامہ عبدالحی لکھنوی ”السعایہ شرح شرح الوقایہ“ میں لکھتے ہیں کہ محدث عبدالحق دہلوی نے ”فتح المنان“ میں فرمایا کہ: یزید بن خالد اور یزید بن محمد کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے اور محدثین نے ان کی توثیق کی ہے جیسا کہ امام ذہبی کی ”الکاشف“ میں ہے۔ (السعایہ: ۱/۲۰۷)

اور ظاہر ہے کہ جہالت دوسروں کی توثیق کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ لہذا یہ وصف جہالت ختم ہو گیا۔ رہا یہ کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حضرت تمیم داری سے نہیں سنا، اس میں کوئی حرج نہیں؛ کیونکہ اس کی دوسری سند متصل اوپر گزر چکی، اور یہ روایت تائید کے لئے ہے، اور تعدد طرق کی وجہ سے اس حدیث میں قوت بھی آگئی، لہذا اس حدیث سے دلیل لینا درست ہو گیا۔

دوسری حدیث

﴿عَنْ عَائِشَةَ مَرْفُوعًا مَنْ أَصَابَهُ قَيْءٌ، أَوْ رُعَافٌ، أَوْ قَلَسٌ، أَوْ مَدِيٌّ فَلْيَنْصَرِفْ، فَلْيَتَوَضَّأْ، ثُمَّ لِيَبْنِ عَلَى صَلَوَتِهِ وَهُوَ فِي ذَلِكَ لَا يَتَكَلَّمُ﴾
(سنن ابن ماجہ: ۸۵/۱، سنن دارِ قطنی: ۱۵۴/۱)

(حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس کو قے ہو یا نکسیر پھوٹے یا قلنس ہو) کھانا وغیرہ حلق تک آجائے (یا مذی پہنچے) (یعنی آجائے) تو وہ لوٹ جائے اور وضو کر کے پھر اپنی نماز پوری کرے، جبکہ اس درمیان میں بات چیت نہ کرے) مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس حدیث کو ”لمنتقی“ کے حوالے سے نقل کر کے لکھا ہے کہ علامہ شوکانی نے اس حدیث کو ”نیل الوطائر“ میں ضعیف، مرسل اور منقطع ثابت کیا ہے۔ (حدیث نماز: ۳۸)

میں کہتا ہوں کہ علامہ شوکانی کی یہ بات مسلم نہیں؛ کیونکہ اس روایت پر بعض محدثین نے اگرچہ کلام کیا ہے اور اس روایت کو مرسل قرار دیا ہے، ایک تو اس لئے کہ ابن جریج کے بہت سے اصحاب حفاظ اس روایت کو ابن ابی ملیکہ سے حضرت عائشہؓ کے واسطے کے بغیر نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں، اور ابن جریج کے صرف ایک شاگرد اسماعیل بن عیاش اس روایت کو متصلاً یعنی حضرت عائشہؓ کا واسطے لگا کر روایت کرتے ہیں، دوسرے اس لئے کہ اسماعیل بن عیاش متکلم فیہ راوی ہیں۔ لہذا اس حدیث کو بعض محدثین نے منقطع اور ضعیف قرار دیا ہے۔

مگر دوسرے محدثین نے اس کا جواب دیا ہے، چنانچہ محدث شہیر علامہ ابن الترمذی نے فرمایا ہے کہ اسماعیل بن عیاش کی ابن معینؒ وغیرہ نے توثیق کی ہے اور یعقوب بن سفیانؒ نے کہا کہ ثقہ اور عادل ہیں اور یزید بن ہارونؒ نے کہا کہ میں نے ان سے زیادہ حافظہ والا نہیں دیکھا۔ (الجوہر النقی: ۵۲۱)

رہا یہ کہ یہ روایت مرسل ہے، اور سوائے اسماعیل کے کسی نے اس کو متصلاً بیان نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب اسماعیل بن عیاش کا ثقہ ہونا معلوم ہو گیا تو ان کا تفرّد مضرب نہیں؛ کیونکہ محدثین نے تصریح کی ہے کہ ثقہ و قابل اعتبار راوی اگر کسی

بات کو زائد بیان کرے تو اس کی زیادتی مقبول ہے، اور رفع اور وصل بھی روایت میں ایک زیادتی ہے۔

علامہ نوویؒ ”مقدمہ شرح مسلم“ میں فرماتے ہیں:

”صحیح مسلک وہی ہے جس کو محدثین، فقہاء اور اصحابِ اصول میں سے محققین نے کہا ہے اور خطیب بغدادیؒ نے اس کی تصحیح کی ہے کہ صحت کا حکم متصلاً و مرفوعاً بیان کرنے والے کی روایت پر لگایا جائے گا، اس کے خلاف کرنے والے یعنی وصل و رفع نہ کرنے والے خواہ تعداد میں اس سے زیادہ ہوں، یا اتنے ہی ہوں، یا زیادہ حافظے والے ہوں، اس لیے کہ

یہ ثقہ کی زیادتی ہے اور وہ مقبول ہوتی ہے“۔ (مقدمہ شرح مسلم: ۱۶)

پس اسماعیل بن عیاش نے جو موصولاً و مرفوعاً روایت کیا ہے، یہ صحیح ہے، اور اس اصول کے تحت موصول و مرفوع بیان کرنے والے کی روایت قابلِ ترجیح ہوگی۔ اس کے علاوہ مرسل بھی احناف بلکہ جمہور کے نزدیک لائق احتجاج اور حجت ہے۔ لہذا اس حدیث کو رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس تفصیل سے مؤلف ”حدیث نماز“ کے اعتراض کا جواب مدلل طور پر ہو گیا۔

حنفیہ کی تیسری دلیل

مؤلف ”حدیث نماز“ نے تو حنفیہ کی صرف ان دو دلیلوں کو پیش کیا ہے حالانکہ احناف نے اور بھی متعدد دلائل سے استدلال کیا ہے۔ ہم ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ: ”أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ حُبَيْشٍ

أَتَتْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي أُسْتَحَاضُ فَلَا أَطْهَرُ،
فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِنَّمَا ذَلِكَ عِرْقٌ، وَلَيْسَتْ بِالْحَيْضَةِ، فَإِذَا
أَقْبَلَتِ الْحَيْضَةَ فَدَعِي الصَّلَاةَ، وَإِذَا أَدْبَرَتْ فَاعْسَلِي عُنْكَ الدَّمَ
وَصَلِّي“ (حضرت فاطمہ بنت ابی حمیشؓ حضرت نبی کریم ﷺ کے پاس آئیں اور
عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے استحاضہ کا خون جاری رہتا ہے، میں پاک نہیں ہوتی،
کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ فرمایا کہ نہیں، یہ (خون) تو رگ کا خون ہے، حیض نہیں
ہے (کہ نماز معاف ہو جائے)، لہذا جب حیض آئے تو نماز کو چھوڑ دو اور جب حیض
ختم ہو جائے تو خون کو دھو کر نماز پڑھ لو، ہشام (راوی) نے کہا کہ میرے باپ
(حضرت عروہ) نے کہا کہ: ”پھر ہر نماز کے لیے وضو کر حتیٰ کہ وہ وقت آجائے۔
(بخاری: ۳۶۱۱، ترمذی: ۳۳۳۱، نسائی: ۴۱۱۱-۴۲۲)

اس حدیث میں جو آخری جملہ حضرت عروہؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ ”پھر ہر نماز کے
لیے وضو کر“، اس میں محدثین نے کلام کیا ہے کہ یہ جملہ عروہ پر موقوف ہے، یا نبی
کریم ﷺ کا فرمودہ ہے۔

”انوار الباری شرح بخاری“ میں ہے کہ ابن الترمذی نے خود بیہقی کے حوالہ
سے بھی مذکورہ زیادتی کا رفع سات محدثین کبار کی روایت سے ثابت کیا ہے، اور
لکھا کہ علامہ ابن رشد نے اپنے فوائد میں ذکر کیا کہ ”بہت سے اہل حدیث نے اس
زیادتی کو صحیح قرار دیا ہے“، پھر دوسری جگہ لکھا ہے کہ ابو عمر بن عبد البر نے بھی اس کی
تصحیح کی ہے۔ (انوار الباری: ۹۸/۸)

الغرض اس آخری جملہ مرفوعہ سے ثابت ہوا کہ اگر خون نکلے تو وضو کرنا ضروری
ہے۔ اور اس میں ہر نماز کے وقت وضو کا حکم معذور ہونے کی وجہ سے ہے جس سے

یہاں بحث نہیں۔ ہمیں صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اگر یہ ناقض نہ ہوتا تو آپ ہر نماز کے وقت وضو کے لوٹانے کا حکم نہ فرماتے۔

ایک شبہ کا جواب

اگر کوئی شبہ کرنے لگے کہ یہ خون استحاضہ خارج من السبیلین (پیشاب، پاخانہ کی راہ سے خارج) ہونے کی وجہ سے ناقض ہے اور اس میں کلام نہیں، کلام تو پیشاب، پاخانہ کے راستے کے علاوہ سے خون نکلنے میں ہے کہ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود ہی وضو کے ٹوٹ جانے کی علت بیان فرمادی ہے کہ یہ رگ کا خون ہے، چنانچہ فرمایا کہ ”إِنَّمَا ذَلِكَ عَرَقٌ“۔ لہذا جہاں بھی یہ علت پائی جائے حکم اس پر دائر ہوگا، چاہے پیشاب، پاخانہ کی راہ سے ہو یا کسی اور جگہ سے ہو۔ اگر یہ وضو کا ٹوٹنا پیشاب، پاخانہ کی راہ سے نکلنے کی وجہ سے ہوتا تو آپ اسی کا ذکر کرتے، لیکن جب اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ خون کا ذکر کیا تو صاف معلوم ہوا کہ خون ہی کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی احادیث ہیں، بعض ضعیف، بعض حسن، یہ سب مل ملا کر قوی ہو جاتی ہیں، تفصیل کے لیے (بذل المحمود: ۱۷۸/۱) دیکھی جائے۔

خون سے وضو نہ ٹوٹنے کے دلائل

یہ تو احناف کے دلائل پر کلام تھا، دوسرے حضرات جو خون سے وضو ٹوٹنے کے قائل نہیں ہیں ان کے دلائل صاحب ”حدیث نماز“ نے ذکر نہیں کئے، صرف یہ لکھا کہ صحابہ کرام اکثر جنگوں میں شریک رہتے اور زخم کھا کر نماز پڑھتے اور خون بھی بہتا رہتا، اس سے معلوم ہوا کہ خون سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح امام احمد کا عمل نقل

کیا کہ جب عباسی خلفاء کے حکم سے امام احمدؒ کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جاتے تھے تو پیٹھ لہولہان ہو جاتی تھی، ایک مرتبہ جب جلا دہٹا تو امام موصوف ایک قریبی گھر میں ظہر کے وقت پہنچے اور ابن سماعہ کی امامت میں نماز پڑھی، تو آپ پر اعتراض کیا گیا کہ آپ نے خون بہتے ہوئے نماز پڑھی، کیا یہ درست ہے؟ تو فرمایا کہ حضرت عمرؓ نے نماز پوری کی حالانکہ ان کے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ (حدیث نماز: ۳۸-۳۹)

مؤلف ”حدیث نماز“ نے خون سے وضو نہ ٹوٹنے کے یہی دلائل لکھے ہیں، اس میں کوئی مرفوع حدیث نہیں ہے، بلکہ دو باتیں ذکر کی ہیں: ایک صحابہ کا عمل کہ وہ جنگوں میں زخم کھا کر اسی زخم کے بہنے کی صورت میں نماز پڑھتے تھے، دوسرے امام احمد کا عمل کہ انہوں نے زخم سے خون نکلنے کی حالت میں نماز پڑھی اور حضرت عمرؓ کا حوالہ دیا۔

دلائل مذکورہ کا جائزہ

اب ذرا ان دلائل کا جائزہ لیجئے، صحابہ کرام کا زخموں کے ساتھ نماز پڑھنے کا ذکر امام بخاری نے تعلیقاً حضرت حسنؓ کے حوالے سے کیا ہے، حضرت حسن کہتے ہیں: ”مَا زَالَ الْمُسْلِمُونَ يُصَلُّونَ فِي جَوَاحِثِهِمْ“ (کہ مسلمان اپنے زخموں میں برابر نماز پڑھتے چلے آئے ہیں)۔ (بخاری، باب من لم ير الوضوء إلا من المنخرجين: ۲۹/۱)

اس کا جواب یہ ہے کہ زخموں میں نماز پڑھنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کے زخم سے خون بھی نکلتا رہتا تھا، ہو سکتا ہے کہ زخم ہو اور سوکھا بھی نہ ہو مگر خون نہ نکلے، بلکہ خون رکا ہو، لہذا اس سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ حضرات صحابہ خون نکلنے کی

حالت میں نماز پڑھتے تھے، دوسرے اگر اس کا مطلب یہی ہے کہ ان زخموں سے خون نکلتے ہوئے بھی وہ حضرات نماز پڑھتے تھے تو بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ خون اتنا تھا جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؛ کیونکہ خون سے وضو اس وقت ٹوٹتا ہے جبکہ خون بدن سے نکل کر بہہ جائے، ورنہ وضو نہیں ٹوٹتا، ہو سکتا ہے کہ ان کے زخموں سے خون نکلا ہو مگر بہنے کے قابل نہ ہو، اس لئے ان حضرات نے وضو نہ کیا ہو۔ جب یہ احتمالات موجود ہیں تو اس سے استدلال باطل ہے۔

حضرت عمرؓ کا عمل

رہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل کہ ان کو جب نیزہ مارا گیا تو زخم سے خون نکلا، اور زخم کے بہتے ہوئے انہوں نے نماز پڑھی، اس کا مؤلف ”حدیث نماز“ نے کوئی حوالہ نہیں دیا، اس لیے پہلے حدیث کا حوالہ ہم سے لیجئے، پھر اس کا جواب ملاحظہ کیجئے حضرت مسور بن مخرمہ فرماتے ہیں کہ وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں اس رات کو گئے جس میں آپ کو نیزہ مارا گیا تھا، (ایک روایت میں یہ ہے کہ مخرمہ نے فرمایا کہ میں اور ابن عباسؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے) اور آپ کو نماز صبح کے لئے بیدار کیا، تو آپ نے فرمایا کہ ہاں! جو نماز چھوڑ دے اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں، ”فَصَلِّ عُمَرُ وَجُرْحُهُ يَنْعَبُ دَمًا“ (پھر حضرت عمر نے نماز پڑھی اور آپ کے زخم سے خون بہہ رہا تھا) (موطا مالک: ۱۳، دارقطنی: ۵۲۲، مصنف عبدالرزاق: ۱۵۰۱، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۶۳۶)

یہ ہے پوری حدیث اور اس کے الفاظ، مگر اس سے مؤلف ”حدیث نماز“ کا خون سے وضو نہ ٹوٹنے پر استدلال صحیح نہیں، ایک تو اس وجہ سے کہ غیر مقلدین کے نزدیک حضرات صحابہ کا قول و عمل حجت نہیں، جب حجت نہیں تو اس کو پیش کرنا کیا

معنی؟ دوسرے اس لیے کہ حضرت عمرؓ اس وقت معذور تھے؛ کیونکہ مسلسل خون نکل رہا تھا، جیسا کہ اس وایت کے الفاظ ” یتعب دماً “ سے معلوم ہوتا ہے؛ کیونکہ اس کے معنی ہیں ”خون جاری تھا“ جیسا کہ علامہ زرقانی نے شرح مؤطا میں تصریح کی ہے۔
(شرح الزرقانی علی المؤطا: ۱۲۲۱)

لہذا حضرت عمرؓ اس وقت معذور تھے اور اس کی وجہ سے آپ کا وضو خون نکلنے کے باوجود باقی تھا، جیسا کہ معذورین کا حکم ہے۔
حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا علیہ الرحمہ اس حدیث کی شرح میں اپنی مایہ ناز شرح مؤطا میں لکھتے ہیں:

” وَلَمَّا كَانَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ دَخَلَ فِي حُكْمِ الْمَعْدُورِينَ عِنْدَ الْحَنْفِيَّةِ وَالْمَالِكِيَّةِ مَعًا فَمَا بَطَلَتْ صَلَاتُهُ بِخُرُوجِ الدَّمِ . (اوجز المسالك: ۱/۴۶۷)
(یعنی جب حضرت عمرؓ حنفیہ و مالکیہ دونوں کے نزدیک معذورین کے حکم میں داخل ہو گئے تو خون نکلنے سے ان کی نماز باطل نہیں ہوئی) (اسی طرح وضو بھی باطل نہیں ہوا)

اور معذور کا حکم یہ ہے کہ اسے صرف نماز کے وقت آنے پر وضو کرنا پڑتا ہے، اور ایک نماز سے دوسری نماز تک اس کا وضو باقی رہتا ہے، اس دوران خون نکلنے سے اس کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے اس وقت وضو نہیں کیا۔ لہذا اس سے یہ استدلال کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، صحیح نہیں۔

امام احمدؒ کے عمل سے استدلال کا جواب

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام احمد

بن حنبلؒ کے عمل کو بھی اپنے دلائل میں ذکر کیا ہے، ہم کیا مؤلف ”حدیث نماز“ سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ کا عمل بھی دلیل شرعی ہے؟ جس سے آپ نے استدلال کیا ہے۔ اگر حنفی لوگ امام ابوحنیفہؒ کے قول سے استدلال کریں تو آپ کے نزدیک اس سے کفر یا شرک لازم آتا ہے؛ کیونکہ ایک امتی کی بات مان لی، تو آپ کے اس طرز عمل سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

ایک حدیث اور اس پر کلام

اب ہم ان حضرات کی سب سے قوی دلیل بیان کرتے ہیں جس سے وہ خون سے وضو نہ ٹوٹنے پر استدلال کرتے ہیں، پھر اس کا جواب بھی دیا جائے گا۔

وہ روایت یہ ہے جس کو امام بخاریؒ نے تعلقاً اور امام ابوداؤدؒ نے موصولاً ذکر کیا ہے کہ غزوہ ذات الرقاع کے موقع پر ایک صحابی کو جو نماز پڑھ رہے تھے، ایک مشرک نے تیر مارا، اور تین مرتبہ مارا، مگر وہ صحابی برابر نماز میں رہے اور رکوع و سجدہ کر کے نماز ختم کی اور دوسرے اپنے ساتھی کو جگایا تو ساتھی نے دیکھا کہ انصاری صحابی پر خون ہے تو کہا سبحان اللہ! تم نے مجھے اسی وقت کیوں نہ جگایا، جب کہ اول ہی دفع اس نے تیر مارا تھا؟ تو صحابی نے کہا کہ میں سورت پڑھ رہا تھا، اس کو قطع کرنا اچھا نہیں سمجھا۔ (ابوداؤد: ۲۶۱، بخاری: ۲۹۱)

اس روایت سے یہ لوگ استدلال کرتے ہیں کہ ایک صحابی نے نماز پڑھی حالانکہ خون بہہ رہا تھا، معلوم ہوا کہ یہ ناقض نہیں، مگر اس روایت سے استدلال بچند وجوہ صحیح نہیں ہے:

۱- اولاً: تو یہ ایک صحابی کا واقعہ ہے اور مرفوع قولی روایات سے خون کا ناقض

ہونا اور معلوم ہو چکا، لہذا صحابی کا یہ عمل احادیث مرفوعہ کے مقابلہ میں حجت نہیں۔

۲- **ثانیاً:** یہ واقعہ جزئیہ ہے، جو کلی احکام کے برابر نہیں ہو سکتا۔

۳- **ثالثاً:** اس کے دور او یوں پر علماء محدثین نے کلام کیا ہے، ایک عقیل، کہ یہ مجہول ہیں، دوسرے محمد بن اسحاق کہ یہ مختلف فیہ ہیں، اگرچہ بہت سے حضرات نے ان کی عدالت اور ثقاہت کو ترجیح دی ہے، مگر بعض کی رائے ان کے بارے میں نہایت سخت ہے، حتیٰ کہ امام مالک ان کو دجال و کذاب فرماتے ہیں۔ (دیکھو تہذیب التہذیب: ۳۶۹/۹-۳۷۰) اسی لیے امام بخاری نے بصیغہ تمریض اس کی روایت کی ہے، لہذا حدیث ضعیف ہے۔

عقیل کی جہالت کا ”صاحب عون المعبود“ نے جواب دیا ہے، وہ یہ کہ مجہول العین راوی کے سلسلہ میں تحقیق یہ ہے کہ اگر ائمہ جرح و تعدیل میں سے کوئی اس کی توثیق کر دے تو اس کی جہالت مرتفع ہو جاتی ہے، اور عقیل بن جابر کی ابن حبان نے توثیق کی ہے، اور ان کی حدیث کی ابن حبان، ابن خزیمہ، اور حاکم نے تصحیح کی ہے، لہذا ان سے جہالت مرتفع ہو گئی۔ (عون المعبود: ۲۳۲۱)

مگر یہ جواب صحیح نہیں ہے، جیسا کہ ”بذل الجہود“ میں حضرت اقدس شیخ خلیل احمد سہارنپوری نے اس پر تعقب کیا ہے؛ کیونکہ ابن حبان کی جانب توثیق کی نسبت کرنا صحیح نہیں؛ کیونکہ ابن حبان نے عقیل کی توثیق نہیں کی ہے، اور نہ کسی نے نقل کیا کہ ابن حبان نے ان کی توثیق کی ہے۔ ہاں ابن حبان نے ان کا ذکر ”کتاب الثقات“ میں کیا ہے، لیکن ان کا ”کتاب الثقات“ میں کسی کا ذکر توثیق کو مستلزم نہیں؛ کیونکہ ابن حبان نے بہت سے غیر ثقہ روایوں کو بھی ”کتاب الثقات“ میں ذکر کر دیا ہے، اسی طرح ابن حبان، حاکم اور ابن خزیمہ کا حدیث کی تصحیح کرنا

محدثین کے نزدیک توثیق نہیں ہے، بلکہ توثیق وہ ہے جو صراحۃً ہو، اور رہا حاکم کا اس حدیث کو صحیح کہنا تو ان کی تصحیح کا حال یہ ہے کہ وہ اس سلسلہ میں تساہل میں معروف ہیں، اور ضعیف بلکہ موضوع احادیث کی بھی تصحیح کر دیتے ہیں۔ (ملخصاً من بدل المجہود: ۱۲۱/۱)

ایک اہم حدیثی بحث

احناف نے اس حدیث کا ایک جواب یہ دیا ہے کہ یہ ایک صحابی کا واقعہ ہے، معلوم نہیں نبی کریم ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی یا نہیں، اگر ہوئی ہوتی تو نماز لوٹانے کا حکم دیا، یا نہیں؟ اس پر صاحب ”عون المعبود“ نے لکھا کہ علامہ عینی نے ”شرح ہدایہ“ میں اس روایت کو پیش کر کے اس میں یہ زیادتی نقل کی ہے کہ یہ بات نبی کریم ﷺ کو پہنچی، آپ نے ان دونوں صحابیوں کو بلایا، اور نہ ہی وضو کا حکم دیا اور نہ نماز کے اعادہ کا حکم دیا۔ (عون المعبود: ۷۸/۱)

راقم کہتا ہے کہ میں نے ”بنیہ شرح ہدایہ“ دیکھی، اس کے بعض نسخوں میں یہ زیادتی موجود ہے، لیکن سوال تو اس زیادتی کی صحت میں ہے، اور علامہ عینی کا زیادتی کو نقل کرنا صحت کی دلیل نہیں ہو سکتا، جب کہ اس روایت کے دیگر طرق میں حضور اکرم ﷺ کے اطلاع پانے کا کوئی ذکر نہیں ملتا، چنانچہ یہ روایت امام احمد نے (مسند: ۳/۳۲۳) میں ابن المبارک نے (الجهاد: ۱۴۹) میں، اور ابو داؤد نے (سنن: ۲۶/۱) میں، ابن خزیمہ نے اپنی (صحیح: ۲۴/۱) اور ابن حبان نے (صحیح: ۳۷۵/۳) میں اور حاکم نے (المستدرک ۲/۲۵۸) میں، دارقطنی نے (سنن: ۱/۳۲۳) اور بیہقی نے (سنن: ۱۴۰/۱) میں روایت کیا ہے، اور کسی کی روایت میں مذکورہ زیادتی نہیں ہے، اس لیے ہم بے سند اس زیادتی کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں، اور روایت کا ضعیف ہونا پہلے معلوم ہو چکا ہے۔

تیمم کا طریقہ

تیمم کا طریقہ کیا ہے؟ اس میں ائمہ کے مختلف مذاہب و مسالک ہیں، اور ان میں سے دو مسلک عام و مشہور ہیں، ایک یہ کہ اپنے ہاتھوں کو پاک مٹی پر دو دفعہ مارے اور پہلی ضرب سے چہرہ کا مسح کرے اور دوسری ضرب سے ہاتھوں کا کہنیوں تک مسح کرے۔ اور دوسرا مسلک یہ ہے کہ صرف ایک مرتبہ زمین پر ہاتھ مارے اور اس ایک ضرب سے ہی ہاتھوں کا کلائیوں تک اور چہرہ کا مسح کرے۔

اور یہ دونوں مسلک صحابہ و تابعین و ائمہ میں معتبر و مستند مانے گئے ہیں اور ان حضرات سے اس پر عمل بھی نقل کیا گیا ہے، چنانچہ خود مولف ”حدیث نماز“ نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے اور علامہ نووی کے حوالے سے اس سلسلہ میں متعدد صحابہ و تابعین و ائمہ کا نام لیا ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

”تیمم کس طرح کیا جائے اس کے بارے میں دو مسلک بہت مشہور ہیں، علامہ نووی ”شرح مسلم جلد اول ص ۱۶۰“ پر لکھتے ہیں:

(۱) علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عمر، حسن بصری، شععی، سالم بن عبد اللہ، سفیان ثوری، امام مالک اور ابوحنیفہ رحمہم اللہ اور دوسرے اہل رائے و قیاس کہتے ہیں کہ دو ضرب سے تیمم کرے یعنی مٹی پر ہاتھ مارے اور ہاتھوں پر مٹی اڑانے کے لیے پھونک مارے، پہلی مرتبہ ہاتھ مار کر چہرے پر ملے اور دوسری مرتبہ ہاتھ زمین پر یا مٹی پر مار کر ہاتھوں پر کہنیوں تک ملے۔ حنفی مسلک یہی ہے مگر تحقیق ہم آگے پیش کر رہے ہیں۔

(۲) عبداللہ بن عباس، عمار بن یاسر، عطاء، مکحول، اوزاعی، امام احمد بن

حنبل، اسحاق، ابن المنذر اکثر محدثین اور عام اصحاب حدیث کے یہاں تیمم اس طرح ہے کہ صرف ایک ضرب یعنی صرف ایک مرتبہ مٹی پر ہاتھ مارے اور دونوں ہتھیلیوں پر پھونک مارے تاکہ مٹی اڑ جائے اور بقیہ مٹی چہرے اور دونوں ہاتھوں پر پہنچوں تک مل لے۔ (حدیث نماز: ۴۰)

اگر اسلاف سے رشتہ ہو اور ان پر اعتماد ہو تو بات اسی پر ختم ہو جاتی اور امت کے لیے دونوں مسالک میں سے کسی پر بھی عمل کی گنجائش سمجھی جاتی ہے؛ کیونکہ اسلاف کرام کا عمل اس بات کے اطمینان کے لیے کافی ہے کہ دین اسلام میں دونوں طریقوں کی اہمیت ہے، مگر اس کو کیا کیجئے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس جگہ بھی اپنی روش کے مطابق ایک مسلک کو صحیح اور حق اور دوسرے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے، اس لیے ہمیں بھی اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کی ضرورت معلوم ہوئی۔

حنفیہ کے دلائل

ہم مؤلف ”حدیث نماز“ کے بیانات کا جائزہ لینے سے قبل اس سلسلہ میں حنفیہ کے دلائل کا ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں:

(۱) ﴿عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: التِّيمُّمُ ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ وَضَرْبَةٌ لِلذَّرَاعَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ﴾ (مستدرک حاکم: ۲۸۸/۱، سنن دارقطنی: ۱۸۱/۱، سنن ابیہقی: ۳۱۹/۱)

(حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تیمم چہرے کے لیے ایک بار مارنا ہے اور کہنیوں تک ہاتھوں کے لیے ایک بار مارنا ہے)

اس حدیث کو حاکم نے صحیح الاسناد قرار دیا ہے، اور حافظ ذہبی نے بھی ان کی موافقت کرتے ہوئے اس کی سند کو صحیح کہا ہے اور دارقطنی نے کہا کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ ہاں ابن الجوزی نے اس کے راوی عثمان بن محمد کی وجہ سے اس کو ضعیف کہا ہے مگر ابن الجوزی سے اس میں غلطی ہوئی ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر، ابن دقیق العید سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں، کیونکہ عثمان بن محمد میں کسی نے بھی کلام نہیں کیا ہے۔ (تلخیص الحییر: ۱۵۲/۱)

رہا ابن دقیق العید اور دارقطنی وغیرہ کا یہ کہنا کہ یہ روایت مرفوعاً شاذ ہے اور موقوفاً صحیح ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ثقہ راوی مرفوعاً بیان کرے تو جمہور کے نزدیک یہ ثقہ کی زیادتی ہے جو کہ مقبول ہوتی ہے۔ لہذا یہ حدیث مرفوعاً ثابت ہے۔ (۲) حضرت جابرؓ ہی سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا، اور عرض کیا کہ مجھے جنابت لاحق ہوئی، میں مٹی میں لوٹ پوٹ ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”اَضْرِبْ هَكَذَا وَ ضَرْبَ بِيَدَيْهِ الْأَرْضِ، فَمَسَحَ وَجْهَهُ، ثُمَّ ضَرْبَ بِيَدَيْهِ، فَمَسَحَ بِهَا إِلَى الْمَرْفَقَيْنِ“ (اس طرح مار، اور یہ کہہ کر آپ نے زمین پر اپنے دونوں ہاتھ مارے، پھر اس سے چہرہ کا مسح کیا، پھر اپنے ہاتھ مارے، اور ہاتھوں کا کہنیوں تک مسح کیا) (مستدرک: ۲۸۸/۱، سنن دارقطنی: ۱۸۲/۱، سنن البیہقی: ۳۱۹/۱، شرح معانی الآثار: ۸۷/۱)

امام بیہقی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے، ان دو احادیث سے معلوم ہوا کہ تیمم میں دو ضرب ہیں: ایک سے چہرے کا اور دوسرے سے کہنیوں تک ہاتھوں کا مسح کرنا ہے، اور یہی بعینہ حنفیہ کا مسلک ہے۔

(۳) ﴿عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: التَّيْمُّمُ ضَرْبَتَانِ،

ضَرْبَةُ لِلْوَجْهِ وَضَرْبَةُ لِلْيَدَيْنِ إِلَى الْمَرْفَقَيْنِ ﴿ (مستدرک: ۲۸۷/۱، سنن دارقطنی: ۱۸۰/۱، معجم کبیر طبرانی: ۲۷۸/۱۲)

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تیمم دو دفعہ مارنا ہے، چہرے کے لیے ایک بار مارنا ہے اور کہنیوں تک ہاتھوں کے لیے ایک بار مارنا ہے)

اس حدیث کو بعض محدثین نے حضرت ابن عمر پر موقوفاً روایت کیا ہے اور بعض نے رسول اللہ ﷺ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، دارقطنی، ابن ابی شیبہ، وغیرہ حضرات نے فرمایا کہ اس کا موقوف ہونا زیادہ صحیح ہے، لیکن اگر اس کو موقوف بھی مان لیں تب بھی اصل مسئلہ پر اس سے کوئی فرق نہیں آتا؛ کیونکہ صحابی کا ایسا قول یا فعل جو محض عقل و رائے سے معلوم نہیں کیا جاسکتا، وہ مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔ (دیکھو: نزہۃ النظر: ۸۸)

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابن عمر نے کبھی یہی بات اپنے فتوے کی طور پر بیان کی ہو اور رسول اللہ ﷺ کا حوالہ نہ دیا ہو اور کبھی یہی بات جو انھوں نے حضور ﷺ سے سنی تھی آپ کے حوالہ سے بیان کیا ہو، اس طرح دونوں مرفوع و موقوف روایات صحیح ہو سکتی ہیں۔

چنانچہ حضرت علامہ خلیل احمد محدث سہارنپوری نے ”بذل المجہود“ میں فرمایا کہ: ”هذه الرواية الموقوفة في حكم المرفوع ، لأنه لا مدخل فيه للرأى والاجتهاد، أو يقال إن ابن عمر أفتى من نفسه مرة فلم يرفعه و رفعه مرة۔ (بذل المجہود: ۱۲۴/۲)

ان احادیث سے مسلک حنفیہ واضح طور پر ثابت ہوتا ہے، اس سلسلہ میں دلائل

تو اور بھی ہیں مگر یہ تین بھی کافی ہیں۔

ایک ضرب اور ہتھیلیوں تک مسح والی حدیث کا جواب

اب رہی یہ بات کہ ”بخاری“ و ”مسلم“ وغیرہ میں جو حضرت عمارؓ سے حدیث آئی ہے، وہ اس کے خلاف ہے، اس کا کیا جواب؟ اس سوال کے جواب سے پہلے پوری حدیث ملاحظہ کیجئے۔

حضرت عمار بن یاسرؓ فرماتے ہیں کہ: مجھے اللہ کے نبی ﷺ نے کسی کام کے لیے بھیجا، مجھے جنابت لاحق ہوگئی، میں نے پانی نہیں پایا، پس میں چوپائے جانور کی طرح مٹی میں لوٹ پوٹ ہوا، پھر میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ ”إِنَّمَا يَكْفِيكَ أَنْ تَضَعَهُ كَذَا ، فَضْرَبَ بِكَفِّهِ ضَرْبَةً عَلَى الْأَرْضِ ، ثُمَّ نَفَضَهَا ثُمَّ مَسَحَ بِهَا ظَهْرَ كَفِّهِ بِشِمَالِهِ أَوْ ظَهْرَ شِمَالِهِ بِكَفِّهِ ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ“ (تمہیں اتنی بات کافی ہے، یہ کہہ کر آپ ﷺ نے زمین پر اپنی دونوں ہتھیلیاں ماریں، پھر ان میں پھونک ماری، پھر اپنے بائیں ہاتھ سے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت کا مسح کیا یا (داہنی) ہتھیلی سے بائیں کی پشت کا مسح کیا، پھر دونوں ہتھیلیوں سے چہرہ کا مسح کیا) (بخاری: ۵۰۷۱، مسلم: ۱۶۱۸۱)

اس حدیث میں صرف ایک بار زمین پر ہاتھ مارنے کا اور صرف کفین یعنی گٹوں تک مسح کرنے کا ذکر ہے، اور اسی حدیث سے دوسرے بعض ائمہ نے اپنے مسلک پر استدلال کیا ہے، جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے، مگر امام مالکؒ، امام سفیانؒ، ثوریؒ، امام ابو حنیفہؒ اور دوسرے ان کے ہم مسلک لوگوں نے اس حدیث کے متعدد جوابات دئے ہیں، ایک تو یہ کہ اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے حضرت

عمارؓ کو تیمم کا مکمل طریقہ نہیں سکھایا ہے بلکہ صرف یہ بتانے کے لیے کہ غسل کا تیمم بھی وضو کے تیمم کی طرح ہی ہوتا ہے، یہ فرمایا کہ اس کے لیے بھی اتنا ہی کافی ہے۔ الغرض اس حدیث میں تیمم کا طریقہ نہیں سکھایا گیا ہے بلکہ غسل و وضو کے تیمم میں فرق نہ ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس حدیث میں تیمم کا صرف اشارہ ہے جبکہ دوسری احادیث میں تیمم کا طریقہ صراحت کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ دو ضرب کے ساتھ اور کہنیوں تک ہونا چاہئے، اور یہ ظاہر ہے کہ صراحت کے ساتھ آئی ہوئی بات ماننا زیادہ بہتر ہے نہ کہ اشارہ والی بات؛ کیونکہ اشارہ کو سمجھنے میں غلطی ہو سکتی ہے۔ تیسرے یہ کہ دو ضرب اور کہنیوں تک مسح والی احادیث پر عمل کرنے میں ایک ضرب والی اور گٹوں تک مسح والی روایات پر بھی خود ہی عمل ہو جاتا ہے؛ کیونکہ دو ضرب میں ایک ضرب تو ہے ہی اور کہنی تک مسح میں گٹے تو آ ہی جاتے ہیں، اس کے برخلاف ایک ضرب والی اور گٹوں تک مسح والی روایت پر عمل کرنے سے دوسری روایات پر عمل نہیں ہوتا، لہذا احتیاط اسی میں ہے کہ دو ضرب والی اور گٹوں تک مسح والی روایات پر عمل کیا جائے۔

ان وجوہات سے ہمارے علماء نے حضرت عمارؓ کی حدیث کے مقابلہ میں دیگر احادیث پر عمل کیا ہے، اس کا نام ترک حدیث نہیں ہے بلکہ عین عمل بالحدیث ہے؛ کیونکہ اس میں تمام روایات جمع ہو جاتی اور سب پر عمل ہو جاتا ہے، اسی لئے امام شافعی جیسے محدث و فقیہ کہتے ہیں کہ: کہنیوں تک مسح کی روایت کا رسول اللہ ﷺ سے ثبوت ہو چکا ہے اور یہی قرآن اور قیاس سے زیادہ مشابہ و مناسب ہے؛ کیونکہ کسی چیز کا بدل اسی کے مثل ہوتا ہے۔ (حکاہ البیہقی فی السنن الکبریٰ: ۱/۳۲۵)

مؤلف ”حدیث نماز“ کا ایک مغالطہ

یہاں مؤلف ”حدیث نماز“ نے علامہ احمد علی حنفی شارح بخاری کا ایک حوالہ دیا ہے، جس سے مقصود حدیث عمارؓ سے اپنے مسلک پر استدلال کے لیے تائید حاصل کی جائے، مگر افسوس کہ مؤلف نے یہاں جس انداز سے حوالہ دیا ہے اس سے تو ان کے علمی مغالطہ کا اندازہ ہوتا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ مؤلف نے لکھا ہے کہ:

”شارح بخاری مولانا احمد علی حنفی سہارنپوری مرحوم نے اس حدیث کی تشریح ”بخاری ص: ۵۰۶، حاشیہ: ۲“ پر یوں کی ہے: وَفِيهِ دَلِيلٌ صَرِيحٌ عَلَى أَنَّ التَّيْمَمَ ضَرْبَةٌ وَاحِدَةٌ لِلْوَجْهِ وَالْكَفَّيْنِ جَمِيعًا“ (اس حدیث میں اس بات کی صاف دلیل ہے کہ تیمم منہ اور پہنچوں تک دونوں ہاتھوں کے لیے ایک ہی ضرب ہے)، پھر بعد میں اپنے مسلک کے لیے اس حدیث میں تاویل بھی کی ہے جس کی ضرورت ہی نہیں؛ کیونکہ حدیث کے الفاظ بالکل واضح ہیں۔ (حدیث نماز: ۴۲)

مؤلف نے اس میں ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ گویا مولانا احمد علی سہارنپوری نے اس حدیث کی یہی تشریح قابل اعتبار سمجھی ہے، حالانکہ علامہ احمد علی نے اس قول کے بعد فوری طور پر اس کا جواب جمہور علماء کی جانب سے نقل کیا ہے، اور وہی بات فرمائی ہے جو ہم نے ابھی اوپر ذکر کی ہے کہ اس حدیث میں تیمم کی تمام باتیں ذکر کرنا مقصود نہیں۔ مگر مؤلف نے اس جواب کا ذکر نہیں کیا، اور جس بات کو علامہ نے رد کر دیا تھا اسی کو یہاں نقل کر کے لوگوں کو مغالطہ میں ڈال دیا، کیا علمی دیانت داری اسی کا نام ہے؟

حدیث دانی یا غلط نہیں؟

اس کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام ابو داؤد کے حوالے سے یہ بات ذکر کی ہے کہ انہوں نے دو ضرب والی روایت کے راویوں کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ بعض کو شک ہو، بعض نے راویوں کے نام میں گڑبڑ کی اور بعض نے سند میں، اور پھر یہ فرمایا کہ ”وَلَمْ يَذْكُرْ أَحَدٌ مِنْهُمْ الضَّرْبَتَيْنِ إِلَّا مَنْ سَمَّيْتُ“ (دو ضرب کا بیان کسی نے نہیں ذکر کیا سوائے ان گڑبڑ کرنے والے راویوں کے جن کا میں نے نام لیا ہے)۔ (حدیث نماز: ۴۲)

راقم کہتا ہے کہ مؤلف کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فن حدیث سے واقفیت نہیں رکھتے، اور اسی وجہ سے وہ امام ابو داؤد کی عبارت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امام ابو داؤد نے یہاں حضرت عمار بن یاسرؓ کی وہی حدیث جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، دوسری سند سے بروایت امام زہریؓ نقل کی ہے اور ان کے اس طریق میں دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے اور کہنیوں تک یا کندھوں تک مسح کرنے کا ذکر ہے، مگر چونکہ یہ بات حضرت عمارؓ سے صحیح ترین روایات سے ثابت شدہ حقیقت کے خلاف ہے، اس لیے امام ابو داؤد نے حضرت عمارؓ کی اس حدیث کو ضعیف قرار دیا، اور یہ کہا ہے کہ حضرت عمارؓ کی اس حدیث میں دو ضرب کا ذکر کرنے والے راوی شک یا اضطراب سے دوچار ہوئے ہیں، اور اس حدیث میں دو ضرب روایت کرنے والے صرف وہی راوی ہیں جن کو میں نے ذکر کیا ہے۔

چنانچہ علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے ”عمون المعبود شرح ابو داؤد“ میں امام ابو داؤد کے اس بیان کی تشریح یوں کی ہے کہ: ”وَلَمْ يَذْكُرْ أَحَدٌ مِنْهُمْ أَى مِنْ رُوَاةِ الزُّهْرِيِّ فِي هَذَا الْحَدِيثِ (الضَّرْبَتَيْنِ إِلَّا مَنْ سَمَّيْتُ) أَى ذَكَرْتُ اسْمَهُ“

وَهُمْ يُونُسُ وَابْنُ إِسْحَاقَ وَ مَعْمَرٌ فَإِنَّهُمْ رَوَوْا عَنِ الزُّهْرِيِّ لَفْظَ الضَّرْبَتَيْنِ
 ، وَ مَا عَدَاهُمْ كَصَالِحِ بْنِ كَيْسَانَ وَاللَيْثِ بْنِ سَعْدٍ وَ عَمْرٍو بْنِ دِينَارٍ وَ
 مَالِكِ بْنِ أَبِي الذُّبَيْبِ وَ غَيْرِهِمْ فَكُلُّهُمْ رَوَوْهُ وَلَمْ يَذْكُرْ أَحَدٌ مِنْ هَؤُلَاءِ
 ضَرْبَتَيْنِ“۔ (عمون المعبود: ۳۵۳/۱)

اسی طرح علامہ خلیل احمد محدث سہارنپوری نے ”بذل المجہود“ (۱۹۲۱) میں کہا
 ہے، خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوداؤد کی یہ بات مطلق نہیں ہے، بلکہ یہ صرف حدیث عمار
 میں امام زہری کے اصحاب سے متعلق ہے، رہا دو ضربوں کا اس حدیث کے علاوہ
 دوسری احادیث میں ذکر تو امام ابواؤد نے اس کی نفی ہرگز نہیں کی ہے، اور یہ بات ان
 کے کلام سے اخذ کرنا ایک طرف فن حدیث سے ناواقفیت کی دلیل ہے تو دوسری
 طرف یہ امام ابوداؤد پر بہتان بھی ہے۔

استدلال یا غلط فہمی؟

مؤلف نے اس کے بعد علامہ عبدالحی لکھنوی کی ایک عبارت سے اپنے باطل
 خیال کی تائید حاصل کرنے چاہی ہے، اس کے لیے وہ عبدالحی لکھنوی کی کتاب
 ’حاشیہ شرح الوقایہ‘ کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں، وہ یہ کہ علامہ نے لکھا ہے کہ:
 ”تیمم دو ضرب ہیں: ایک چہرے کے لیے اور ایک کہنیوں تک ہاتھوں
 کے لئے، اس حدیث کو حاکم، ابن عدی، دارقطنی، بزار نے روایت کیا ہے اور
 اس کی اکثر سندیں ضعیف ہیں۔ (حدیث نماز: ۴۳)

مگر اس کے جواب میں صرف یہ سوال کافی ہے کہ کیا مؤلف ’حدیث نماز‘ کے
 نزدیک اکثر سندوں کا مفہوم، دنیا کی تمام سندیں ہوتا ہے؟ اگر یہ اس کا مفہوم ہے
 تب تو آپ کا علامہ کی اس عبارت سے استدلال صحیح ہے، مگر کون ذی عقل و ہوش ایسا

ہوگا جو اس کے اس مفہوم کو صحیح قرار دے، ہر معمولی عقل والا بھی اس کا یہی مطلب لیتا ہے کہ ان سندوں میں سے اکثر ضعیف ہیں اور بعض صحیح یا حسن ہیں، اور اس مطلب کے لحاظ سے مؤلف کا اپنے مدعی پر استدلال ”مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ“ کا مصداق ہے؛ کیونکہ جب بعض سندوں کا قابل اعتبار ہونا اس سے سمجھ میں آرہا ہے تو اس سے یہ استدلال کیا معنی رکھتا ہے کہ کوئی بھی حدیث صحیح نہیں، پھر ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا کسی مسئلہ پر کسی حدیث سے استدلال کرنے کے واسطے یہ بھی ضروری ہے کہ اس باب کی تمام حدیثیں صحیح ہوں؟ اگر یہ اصول مسلم ہو جائے تو پھر دین کے کسی بھی مسئلہ کے بارے میں کسی حدیث سے استدلال نہیں کیا جاسکتا؛ کیونکہ ہر باب میں صحیح احادیث کے ساتھ ساتھ ضعیف بلکہ موضوع احادیث بھی ملتی ہیں تو کیا ضعیف و موضوع احادیث کے پائے جانے کی وجہ سے صحیح کو بھی رد کر دیا جانا چاہئے؟

امام ترمذی کا طرز عمل

مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام ترمذی کے بارے میں لکھا کہ انہوں نے پہلے ایک ضرب کی دلیل میں حضرت عمارؓ کی حدیث روایت کی، پھر دو ضرب کے قائلین کا ذکر کیا، مگر ان کی کوئی دلیل بیان نہیں کی۔ (حدیث نماز: ۴۳-۴۴)

مگر اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ کیا یہ کہ اس بارے میں امام ترمذی کے نزدیک کوئی حدیث ثابت نہیں، یا یہ کہ ثابت تو ہے اور اس کے قائلین قابل ذکر بھی ہیں مگر اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں؟ امکان تو دونوں باتوں کا ہے پھر مؤلف ”حدیث نماز“ کو اس سے کیا فائدہ ہوا؟ کیا یہ اصول نہیں پڑھا کہ ”عدم ذکر عدم وجود کی دلیل نہیں“۔

پھر ایک بات اور قابل غور ہے، وہ یہ کہ امام ترمذی نے اسی جگہ بعض اہل علم کا یہ

قول بھی ذکر کیا ہے کہ: ایک ضرب اور کفین تک مسح کی حضرت عمار کی حدیث ضعیف ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود حضرت عمار سے کندھوں تک مسح وارد ہوا ہے۔ مؤلف نے اس کو اختیار نہیں کیا، مگر محض ذکر نہ کرنے سے ضعیف ہونے پر استدلال فرمایا۔ فیاللجب!

روایت حدیث تقلید کے منافی نہیں

مؤلف ”حدیث نماز“ نے بعض علماء ندوۃ العلماء مولانا اسحاق وغیرہ کا اس بات پر رد کیا ہے کہ انہوں نے ان ائمہ حدیث امام بخاری و امام مسلم وغیرہ کو مقلد ثابت کرتے ہوئے شافعی و مالکی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، اور لکھا ہے کہ:

”ان امامان حدیث نے امام شافعی و امام مالک وغیرہ کے خلاف ایک ضرب سے تیمم ثابت کیا ہے اور ان کے مسلک کے خلاف یہ بھی ثابت کیا ہے کہ تیمم میں مسح صرف ہتھیلیوں تک ہی صحیح حدیث سے ثابت ہے اور کہنیوں تک مسح کرنا ضعیف روایت پر مبنی ہے۔ پھر لکھا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ائمہ اور حفاظ حدیث کسی کے مقلد نہیں تھے، بلکہ صحیح حدیث تلاش کرنا اور پوری امت کو اس پر عمل کرنے کے لئے بلانا ان کا مقصد عظیم تھا۔“

(حدیث نماز: ۴۴)

میں کہتا ہوں کہ حدیث کی روایت اور تقلید میں کوئی منافات و مخالفت نہیں ہے کہ کوئی حدیث روایت کرے تو لازمی طور پر وہ غیر مقلد ہوا کرے، رہا یہ کہنا کہ ان ائمہ حدیث نے امام شافعی و امام مالک وغیرہ کے خلاف حدیثیں نقل کی ہیں تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ ائمہ کی تقلید نہیں کرتے تھے؟ ہرگز نہیں؛ کیونکہ محدثین کا وظیفہ روایت کرنا ہے، خواہ وہ کسی کے خلاف جائے یا موافق آئے بلکہ کبھی وہ حضرات

خود اپنے مسلک کے خلاف بھی حدیث نقل کر دیتے ہیں، دیکھئے امام مالک کا مسلک نماز میں قیام کی حالت میں ارسال یعنی ہاتھ چھوڑ کر کھڑے ہونے کا ہے، ان کے مذہب کے تمام ائمہ نے اسی کو نقل کیا ہے، مگر انہوں نے ”موطا“ میں بسند صحیح ہاتھ باندھنے کی حدیث روایت کی ہے۔ کیا کوئی اس سے مؤلف ”حدیث نماز“ کی طرح یہ استدلال کر سکتا ہے کہ امام مالک نے خود اپنے خلاف حدیث روایت کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ میں مجرم ہوں؟ اسی طرح محدثین کبھی متضاد مسلک کی روایات بھی لاتے ہیں، اور ہر مسلک کی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جیسے امام ترمذی نے بہت جگہ ایسا کیا ہے مثلاً وقت عصر کے بارے میں ایک باب یہ باندھا: ”باب تعجیل العصر“ اور اس میں عصر کو جلدی پڑھنے کے بارے میں حضرت عائشہ سے حدیث لائے، پھر اسی کے بعد دوسرا باب باندھا: ”باب تأخیر العصر“ اور اس میں حضرت ام سلمہؓ کی حدیث لائے۔ (ترمذی: ۴۲۱)

اسی طرح ایک باب باندھا: ”باب ما جاء في كراهية الصلوة بعد العصر وبعد الفجر“ اور اس میں بھی متعدد صحابہ سے فجر و عصر کے بعد نماز کی کراہت نقل کی، پھر ایک باب بعنوان: ”باب ما جاء في الصلوة بعد العصر“ قائم کیا اور اس میں اس کا جواز بھی متعدد صحابہ سے نقل کیا ہے۔ (ترمذی: ۴۵۱)

اسی طرح رفع یدین کا باب بھی باندھا اور اس میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث لائے اور فرمایا کہ بعض اہل علم صحابہ اور تابعین میں سے اسی کے قائل ہیں، اور عدم رفع یدین کا بھی باب باندھا ہے اور اس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث لائے اور اس کو حسن قرار دیا اور کہا کہ ان میں سے بہت سے حضرات اسی کے قائل ہیں۔ (ترمذی: ۵۹۱)

نیز امام ابوداؤد نے ایک باب قائم کیا: ”باب ما یقطع الصلوٰۃ“ اور اس میں وہ حدیثیں لائے جن سے نمازی کے سامنے سے عورت یا کتیا گدھا گزر جانے پر نماز کے ٹوٹ جانے کا ذکر ہے، پھر اس کے خلاف باب باندھا: ”باب من قال لایقطع الصلوٰۃ شیء“ اور اس میں بھی اس کے مناسب احادیث ذکر کیں۔

(ابوداؤد: ۱۰۲۱-۱۰۲۱)

اور امام نسائی کو دیکھئے، وہ ایک باب اس عنوان سے باندھتے ہیں: ”باب الوضوء مما غیرت النار“ اور اسی کے بعد دوسرا باب باندھتے ہیں: ”باب ترک الوضوء مما غیرت النار“ اور دونوں بابوں میں حدیثیں لائے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ (نسائی: ۲۱-۲۲)

امام ابوداؤد و امام نسائی دونوں نے ایک باب قائم کیا کہ ”باب الوضوء من مس الذکر“ اور اس کے تحت حضرت بسرہ بنت صفوانؓ سے حدیث لائے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ: ”مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ“ (جو اپنی شرمگاہ چھوئے اس کو چاہئے کہ وہ وضو کرے) پھر اسی کے بعد باب باندھا: ”باب الرخصة فی ذلك“ یا ”باب ترک الوضوء من ذلك“ اور اس میں دوسری حدیث لائے کہ حضرت طلحہؓ نے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کے اس سوال پر کہ شرمگاہ کو چھوئے تو کیا حکم ہے؟ یہ فرمایا کہ: ”هَلْ هُوَ إِلَّا مُضْعَةٌ مِنْهُ أَوْ بُضْعَةٌ مِنْهُ“ (یہ شرمگاہ تو ایک جسم کا ٹکڑا ہے)۔ (ابوداؤد: ۲۲۱، نسائی: ۲۱-۲۰)

یہ چند مثالیں ”مشتہ نمونہ از خروارے“ کے طور پر ذکر کی گئیں، ورنہ ہر حدیث کی کتاب میں اس کا نمونہ مل سکتا ہے۔ اور اس میں اصل بات یہ ہے کہ محدثین احادیث کی روایت کرتے ہیں اور اس کے معنی و مطلب کو ائمہ فقہ پر چھوڑ دیتے

ہیں، اور وہ حضرات ان میں غور کرتے ہیں اور اس کی تشریح و توضیح کرتے ہیں، اور اس سے احکام کا استنباط کرتے ہیں، یہ کام محدث کا نہیں ہے بلکہ فقیہ کا ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ”بہت سے حامل فقہ فقیہ نہیں ہوتے“، لہذا ایک کام محدث کا ہے اور ایک کام فقیہ کا، دونوں میں گڈ مڈ کرنا صحیح نہیں۔

الغرض مؤلف ”حدیث نماز“ کا یہ کہنا کہ محدثین نے ائمہ فقہ کے خلاف حدیثیں نقل کر کے تقلید سے انکار کیا ہے، صحیح نہیں اور ان دونوں باتوں میں کوئی تلازم نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قیاس

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس موقع پر ”ایک اچھا نکتہ“ کے عنوان سے ”ترمذی شریف“ کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قیاس زیر بحث مسئلہ میں پیش کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ابن عباس نے تیمم میں ہاتھوں کے گٹوں تک مسح کرنے کی دلیل میں قرآن کے ایک اور حکم پر قیاس کیا ہے اور وہ ہے چوری میں ہاتھ کاٹنے کا مسئلہ، کہ چوری کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ﴿فَأَقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا﴾ (چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو) اور یہ ہاتھ گٹوں تک کاٹے جاتے ہیں، لہذا تیمم میں بھی ہاتھ کا مسح گٹوں تک ہوگا۔ (دیکھو حدیث نماز: ۴۵)

اس سلسلہ میں ہمیں دو باتیں کہنی ہیں:

ایک تو یہ کہ اس قیاس کے جواب میں حضرات علماء نے ایک بات تو یہ کہی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قیاس ایک اور قیاس کے معارض ہے، اور وہ یہ

ہے کہ وضو کے بارے میں قرآن میں کہنیوں تک دھونے کا حکم دیا گیا ہے اور تیمم وضو ہی کا بدل ہے، اور وضو اور تیمم ایک ہی باب یعنی طہارت سے متعلق ہیں، اس لحاظ سے اگر تیمم میں ہاتھوں کے مسح کو وضو میں ہاتھوں کے دھونے پر قیاس کیا جائے اور وضو کی طرح تیمم میں کہنیوں تک مسح مانا جائے تو یہ قیاس اقرب معلوم ہوتا ہے۔ امام شافعی نے بھی یہی قیاس پیش کیا ہے۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۳۲۵/۱)

دوسرے یہ کہ حضرت ابن عباس نے تیمم کے مسئلہ کو قیاس کیا ہے چوری کی سزا کے مسئلہ پر، اور ظاہر ہے کہ یہ ایک سزا کا مسئلہ ہے اور سزاؤں میں یقینی بات کو لیا جاتا ہے لہذا اس میں تو ہاتھ کے لفظ کو گٹوں تک مانا تا کہ یقینی بات پر عمل ہو، اور بے احتیاطی نہ ہو جائے، اس کے برخلاف تیمم کا مسئلہ ایک عبادت کا مسئلہ ہے اور عبادت میں احوط کو لیا جاتا ہے، اور احتیاط اس میں ہے کہ تیمم کہوں تک کیا جائے۔ (قالہ السرخسی فی المبسوط: ۱۰۷/۱)

تیسرے یہ کہ چوری کی سزا کا مقصود یہ ہے کہ چور کو عبرت ہو اور وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے، اور یہ بات گٹوں تک ہاتھ کاٹنے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے، لہذا چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنا مشروع ہوا، لیکن تیمم کا مقصود طہارت ہے اور تیمم وضو کا خلیفہ ہے لہذا اس میں وضو کی قائم مقامی کرتے ہوئے اس کو کہنیوں تک ہونا چاہئے، معلوم ہوا کہ یہ قیاس متعدد قیاسات کے خلاف ہے۔ یہ تو اس قیاس کا جواب ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی درست نہیں کہ چوری کی سزا میں ہاتھوں کا گٹوں سے کاٹا جانا اس آیت کی وجہ سے ہے، نہیں، بلکہ دراصل احادیث کی وجہ سے ہے، اگر اللہ کے نبی ﷺ کا اس سلسلہ میں اسوہ نہ ہوتا تو آیت سے بظاہر یہی سمجھا جاتا کہ پورا ہاتھ کندھوں سے کاٹا جانا چاہئے۔

دوسری بات کے تحت چند باتیں ہیں:

ایک یہ کہ ہمارے مؤلف مولانا عبدالمتمین صاحب تو قیاس کے سرے سے منکر ہیں، انہوں نے ابن عباس کے اس قیاس کو کیسے مان لیا، کیا قیاس جائز ہے اور اگر جائز ہے تو غیر مقلدین عام طور پر اس کو ناجائز کیوں کہتے ہیں؟

دوسرے یہ کہ جب ابن عباسؓ نے قیاس کیا تو کیا وہ اس قیاس کی وجہ سے مؤلف کے نزدیک مجرم نہیں ہو گئے؟ اگر نہیں تو امام ابوحنیفہ و دیگر ائمہ کے خلاف غیر مقلدین کے پروپگنڈے کی کیا وجہ؟

تیسرے یہ کہ جب یہ قیاس تھا تو اس کو ایک ”اچھا نکتہ“ کہہ کر پیش کرنے میں کیا حکمت ہے؟ یہی تو نہیں کہ قیاس کے جواز کو اپنے عوام سے چھپایا جائے اور ان کو اس سے بے خبر رکھا جائے؟

امام ابوحنیفہ کا مسلک کیا تھا؟

اس کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا ہے کہ:

”اس مسئلہ میں حضرت ابن عباسؓ اور امام ابوحنیفہؒ دونوں ہم خیال ہیں؛ کیونکہ ”عنا یہ شرح ہدایہ“ میں ایک روایت امام ابوحنیفہؒ کی یہ ہے کہ گٹوں تک مسح کیا جائے۔ اس کو نقل کر کے وہ کہتے ہیں کہ سیدنا امام اعظم ابن عباس کی طرح صرف پہنچوں تک ہی مسح کے قائل ہیں تو ابن عباس کی طرح امام اعظم ایک ہی ضرب کے قائل ہوں گے اور یہ بات قرین قیاس بھی ہے؛ کیونکہ حنفی مذہب کی بڑی کتاب ”ہدایہ“ میں جو یہ ہے کہ مٹی پر ہاتھ مار کر پھونکنا چاہئے تو یہ پھونکنا بھی صرف ایک ضرب والی حدیث سے ہی لیا ہے۔“

(حدیث نماز: ۴۶)

اس میں دو باتیں قابل ذکر ہیں: ایک تو امام اعظم کا اس بارے میں مسلک کیا ہے؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ مسلک وہی ہوتا ہے جو ان سے ان کے شاگرد اور قریب کے لوگ بیان کریں، اور اصحاب متون نے اس کو درج کیا ہو۔ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کے مخصوص شاگرد و شارح امام محمد نے اپنی ”موطا“ میں لکھا ہے کہ: ”الْتَيْمُّمُ ضَرْبَتَانِ ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ وَضَرْبَةٌ لِلْيَدَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ“ (موطا امام محمد: ۷۷)

(تیمم میں دو ضربیں ہیں: ایک ضرب چہرے کے لیے اور ایک کہنیوں تک ہاتھوں کے لیے، یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے)۔

اسی طرح امام طحاوی جو فقہ ائمہ و مسلک ائمہ کے بڑے جانکار و ماہر تھے انہوں نے امام ابوحنیفہ و امام محمد و امام ابو یوسف کا یہی مسلک بیان کیا ہے۔ (شرح معانی الآثار: ۸۷/۱)

اسی طرح متون فقہ احناف میں بھی سب میں یہی لکھا ہے، اور متون کے بارے میں یہ بات معلوم و مسلم ہے کہ وہ مذہب بیان کرنے کے لیے موضوع ہیں۔ (عمدة الرعاية: ۱۰)

لہذا جب تک اس کے خلاف کوئی تصریح و تصحیح نہ ملے گی اسی کو امام کا مذہب سمجھا جائے گا، اور اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا جو مسلک و مذہب ہے اس کو خود ان کے شاگرد اور ان کے مذہب کے واقف کار کی تصریح سے معلوم ہو گیا۔ اب محض ایک روایت کی بنیاد پر جس کی ائمہ مذہب نے تردید کر دی ہے امام ابوحنیفہ کا نیا مسلک گھڑ دینا نہ عقل کی رو سے درست ہے اور نہ شرع کی رو سے جائز ہے۔

رہا صاحب ”عنایہ“ کا امام ابوحنیفہ کی ایک روایت گٹوں تک مسح کی نقل کرنا تو اولاً تو یہ ایک روایت ہے، مذہب الگ چیز ہے اور محض روایت کا ہونا الگ بات، اور

ہر امام سے بعض مسائل میں متعدد روایات ملتی ہیں مگر وہ ان کا مسلک و مذہب نہیں ہوتا، امام شافعی کے بے شمار مسائل میں دو دو اور تین تین روایات ملتی ہیں، اور شوافع کے یہاں امام شافعی کے قول قدیم و قول جدید کا تذکرہ ہر جگہ ملتا ہے، اسی طرح دیگر ائمہ کے یہاں بھی ہوا ہے۔ مگر یہ ان کا مسلک و مذہب نہیں ہو جاتے، بلکہ مسلک وہی مانا جائے گا جو ان سے صحیح روایت سے ثابت ہو۔

دوسرے یہ کہ خود صاحب ”عناویہ“ نے اس روایت کی تردید کی ہے؛ کیونکہ انہوں نے ”ہدایہ“ کے قول: ”إِلَى الْمُرْفَقَيْنِ“ (مسح کہنیوں تک ہے) پر لکھا ہے کہ ”ہدایہ“ میں یہ بات اس لئے بیان کی گئی کہ حسن کی جو روایت امام ابوحنیفہ سے ”گٹوں تک مسح“ کے بارے میں ہے اس کی نفی ہو جائے۔ (عناویہ مع فتح القدر: ۱۲۹/۱)

یہ تو گٹوں تک مسح کی اس روایت پر کلام تھا، مگر افسوس تو یہ ہے کہ مولف ”حدیث نماز“ نے اس ضعیف روایت پر قیاس کرتے ہوئے مزید یہ کیا کہ امام ابوحنیفہ کی طرف دو ضرب کے بجائے ایک ضرب کو منسوب کر دیا اور کہا کہ:

”یہ بات قرین قیاس بھی ہے؛ کیونکہ حنفی مذہب کی بڑی کتاب ”ہدایہ“ میں جو یہ ہے کہ مٹی پر ہاتھ مار کر پھونکنا چاہئے تو یہ پھونکنا بھی صرف ایک ضرب والی حدیث سے ہی لیا ہے۔“ (حدیث نماز: ۴۶)

مگر یہ تو ”مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ“ والا قصہ ہے، کسی کا مسلک محض قیاس سے تراشا تو نہیں جاسکتا، بالخصوص جبکہ اس کے خلاف ان کی تصریح بھی ہو، اور یہ بات بھی محض غلط ہے کہ ”ہدایہ“ میں ”پھونکنے“ کی بات ایک ضرب والی حدیث سے لی گئی ہے؛ کیونکہ اس سلسلہ میں صاحب ”ہدایہ“ نے تو سرے سے کسی حدیث کا حوالہ ہی نہیں دیا ہے، اور حاشیہ میں ملا الہدایہ سے اس کا حوالہ حدیث عمار نقل کیا گیا ہے، مگر

یہ بات صرف اسی ایک حدیث میں نہیں ہے بلکہ حنفیہ نے متعدد احادیث سے لی ہے، چنانچہ علامہ عینی نے ”شرح ہدایہ“ میں اس کے لئے ”ابوداؤد“ کے حوالے سے حضرت ابن عمر کی حدیث اور حاکم و دارقطنی کے حوالے سے بھی انہی کی ایک اور حدیث اور طبرانی کے حوالے سے حضرت اسلم کی حدیث پیش کی ہے اور ان سب میں پھونکنے کا بھی ذکر ہے اور دوسرے کا بھی۔ (البنایہ: ۳۵۳/۱-۳۵۴)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مؤلف ”حدیث نماز“ کے یہ سارے دعوے محض باطل اور بے بنیاد ہیں، اور علمیت سے ان کا کوئی بھی تعلق نہیں۔

صلوٰۃ

✽ زبان سے نیت کی بحث ✽

اس کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نماز کے متعلق مسائل پر بحث شروع کر رہے ہیں، ہم یہاں بھی صرف ان مسائل سے تعرض کریں گے جن پر مؤلف نے احناف کے خلاف کچھ لکھا ہو اور طعن و تشنیع کی ہو۔

مؤلف مدظلہ نے نیت کی ضرورت اور معنی بتلاتے ہوئے زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنے کا ایک مختلف فیہ مسئلہ چھیڑ دیا، اور یہ مسئلہ خود احناف کے یہاں بھی مختلف فیہ ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ اس پر کچھ کلام کرنا چاہتے ہیں، اس کے بعد مؤلف کے بیان کا جائزہ لے کر حقیقت کو واضح گاف کریں گے۔

کیا زبان سے نیت کے الفاظ کا ثبوت ہے؟

ملا علی قاری نے محقق ابن الہمام سے نقل کیا ہے کہ بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ زبان سے ”میں فلاں نماز پڑھتا ہوں“ وغیرہ نہیں کہتے

تھے اور نہ ہی صحابہ اس کو کہتے تھے۔ (مرقات: ۴۰/۱)

اور علامہ ابن القیم کے حوالہ سے لکھا کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو ”اللہ اکبر“ کہتے، اس کے علاوہ کچھ نہ کہتے اور نہ ہی زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرتے..... اور یہ بدعت ہے، کسی بھی روایت سے یہ منقول نہیں ہوا، نہ صحیح روایت سے، نہ ضعیف سے، نہ مسند سے، نہ مرسل سے، اور نہ ہی صحابہ کرام میں سے کسی سے یہ نقل ہوا، اور نہ ہی تابعین وائمہ اربعہ نے اس کو مستحب سمجھا، اسی طرح علامہ قسطلانی اور جمال الدین سے بھی نقل کیا ہے۔

(مرقات: ۴۱/۱-۴۲)

عدم ثبوت دلیل جواز ہے

جب یہ محقق ہوا کہ زبان سے نیت کے الفاظ کہنے کا ثبوت نہیں ہے، تو یہ عدم استحباب پر دلالت تو کر سکتا ہے، مگر عدم جواز پر اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں؛ کیونکہ کراہت یا حرمت کے اثبات کے لیے مستقل دلیل کی ضرورت ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کہ عدم ثبوت کوئی دلیل نہیں، لہذا اس سے جواز ثابت ہو جائے گا؛ کیونکہ اشیاء میں اصل اباحت ہے، اور اس کے لیے مستقل دلیل کی حاجت نہیں، چنانچہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا ثبوت نہیں ہے مگر ان کی کراہت و حرمت کا کوئی قائل نہیں۔ (وللتفصیل محل آخر)

بعض فقہاء نے بدعت کیوں کہا؟

اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ حنابلہ اور مالکیہ اس کی کراہت اور اس کے بدعت ہونے کے قائل کیوں ہیں؟ اس کی وجہ محض عدم ثبوت نہیں ہے، بلکہ اس کے التزام

واستمرار کو بدعت کہتے ہیں؛ کیونکہ یہ التزام مالا یلزم ہے۔ (مرقات: ۴۱/۱)

غرض یہ کہ یہ حضرات بھی مطلق جواز کے منکر نہیں ہیں، بلکہ التزام مالا یلزم کی وجہ سے بدعت و کراہت کے قائل ہیں، لہذا یہ ہمارے بیان کے خلاف نہیں ہے۔ پس تلفظ بالنیۃ اصلاً اور فی نفسہ جائز و مباح ہے اور اس کا التزام بمعنی ضروری سمجھنا احناف کے یہاں بھی کراہت سے خالی نہیں، چنانچہ مرقات میں ملا علی قاریؒ نے اس کے ضروری نہ ہونے پر کافی طویل کلام کیا ہے، اسی طرح بہشتی زیور میں اس کا ضروری نہ ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ (مرقات: ۴۱/۱، بہشتی زیور: ۳۱/۱۱)

تلفظ بالنیۃ کی اصل پر لطیف استدلال

علامہ عینیؒ اور علامہ شرنبلالیؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس شخص پر زجر کیا تھا جس سے نیت کے الفاظ سنے تھے۔ (البنایۃ شرح الھدایۃ: ۱۵۰/۲، حاشیہ ہدایۃ: ۹۶/۱)

راقم کہتا ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تلفظ بالنیۃ کی قرون مشہود لہا بالخیر میں کچھ نہ کچھ اصل ہے؛ کیونکہ اس شخص کا زبان سے الفاظ کو ادا کرنا کسی صحابی کو دیکھ کر ہی ہوگا، جیسا کہ ان لوگوں کے حالات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے۔ رہا حضرت عمرؓ کا اس کو زجر کرنا، اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ نے تلفظ بالنیۃ پر زجر کیا؛ کیوں کہ زجر و تنبیہ زور سے کہنے پر بھی ہو سکتی ہے، بلکہ یہی اغلب ہے۔ چنانچہ اس پر یہ الفاظ بصراحت دلالت کرتے ہیں جو علامہ عینیؒ وغیرہ نے نقل کیے ہیں: ”إن عمر زجر علی من سمع منه ذلك“؛ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان الفاظ کو سن کر زجر فرمایا تھا، اور اگر محض تلفظ پر تنبیہ و زجر ہوتا تو یوں نقل کیا جاتا: ”إن عمر زجر علی من رای منه ذلك“ یا ”تلفظ بہ“ وغیرہ (کہ آپ نے جس کو زبان سے

نیت کرتا ہوا دیکھا اس کو زجر کیا) چنانچہ علامہ عبدالحی نے فرمایا کہ: اس سے کراہت پر استدلال نہیں کر سکتے؛ کیونکہ ممکن ہے جہر پر زجر فرمایا ہو۔ (حاشیہ ہدایہ: ۸۱/۱)

حاصل یہ ہے کہ اس کی اصل کی طرف اس واقعہ سے اشارہ ضرور ملتا ہے، جو جواز کے لیے کافی و ثانی ثبوت ہے۔

زبان سے نیت کرنے کا استحباب

جب زبان سے نیت کرنے کا جواز محقق و ثابت ہو گیا، تو اب یہاں پر یہ بحث سامنے آتی ہے کہ اس کی پابندی کرنا کیسا ہے جیسا کہ آج کل اکثر احناف کا عمل ہے؟ اس سلسلہ میں اکثر احناف کا قول استحباب و استحسان کا ہے، چنانچہ ملا علی قاریؒ نے ”مرقات شرح مشکاۃ“ میں فرمایا کہ ہمارے اکثر اصحاب اس کو مستحب کہتے ہیں۔ (مرقات: ۴۲/۱)

اور صاحب ”ہدایہ“ نے فرمایا: ”وَيَحْسُنُ ذَلِكَ لِاجْتِمَاعِ عَزِيمَتِهِ“ یعنی زبان سے نیت کے الفاظ کہنا قلبی یکسوئی کی غرض سے مستحسن ہے۔ (ہدایہ: ۸۰/۱)

اور علامہ ابن الہمام نے ”التجنیس“ سے نقل کیا ہے: ”وَمِنْ اخْتَارَهُ اخْتَارَهُ لِتَجْتَمِعَ عَزِيمَتُهُ“ (یعنی جن لوگوں نے اس کو پسند کیا ہے وہ قلبی یکسوئی کی غرض سے ہے)۔ (فتح القدير: ۲۷۳/۱)

اور علامہ نسفی و قاضی خانؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، اور زاہدی نے اس کی تصحیح کی ہے، اور ”منیۃ المصلی“ میں اسی کو مختار کہا ہے، اور صاحب ”غرر“ و صاحب ”تنویر الابصار“ نے اس پر جزم کیا ہے۔ (کذا قال فی حاشیۃ الہدایہ: ۸۱/۱)

اور یہ صرف احناف نہیں بلکہ امام شافعی نے بھی کہا ہے، چنانچہ علامہ ابن العربی مالکی نے ”القبس شرح موطا مالک بن انس“ میں اور علامہ ابو عبد اللہ العبدری مالکی

نے ”التاج والإكليل“ میں امام شافعی کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ: ”يُسْتَحَبُّ لَهُ أَنْ يَتَكَلَّمَ بِلِسَانِهِ بِنِسْبَتِهِ فَيَقُولُ: ”أُوَدِّي ظَهْرَ الْوَقْتِ“ فَيَكْبُرُ، وَهِيَ بَدْعَةٌ، مَا رُوِيَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ وَلَا عَنْ أَحَدٍ مِنَ السَّلَفِ، أَمَّا أَنَّهُ يُسْتَحَبُّ لِلْمَشْوَشِ الْخَاطِرِ الْمُوسَّوسِ الْفِكْرِ إِذَا خَشِيَ أَلَّا يَرْتَبِطَ لَهُ فِي قَلْبِهِ عَقْدُ النِّيَّةِ أَنْ يَعْضُدَهُ بِالْقَلْبِ حَتَّى يَذْهَبَ عَنْهُ اللَّبْسُ“ (القبس لابن العربي: ۲۱۴/۱، التاج والإكليل: ۵۱۵/۱)

(نماز پڑھنے والے کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ نیت کو زبان سے بھی کہہ لے، پس یوں کہے کہ میں ظہر کے وقت کی نماز ادا کرتا ہوں، پھر تکبیر کہے اور یہ بدعت ہے، نہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے اور نہ سلف میں سے کسی سے مروی ہے، لیکن جو شخص پر آگندہ خیال اور وسوسوں کا شکار ہو، اسے اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ دل میں نیت جمتی نہیں تو مستحب ہے کہ وہ زبان دل کو مضبوط کرے تاکہ تشویش ختم ہو جائے)

راقم کہتا ہے کہ بہت سی چیزیں مباح اور جائز ہوتی ہیں، مگر بعض عوارض کے لاحق ہو جانے سے وہ درجہ اباحت سے نکل کر درجہ استحسان و استحباب میں داخل ہو جاتی ہیں، مثلاً چلنا مباح ہے، مگر عبادت کی خاطر مستحسن اور باعث اجر و ثواب ہے، کھانا اور سونا مباح ہے مگر عبادت میں دلجمعی کی غرض سے مستحسن و مستحب ہے، اسی طرح تلفظ بالنیۃ مباح ہے مگر یہی اگر کسی غرض صحیح کی بنا پر ہو، خصوصاً جب کہ کسی مطلوب کا حصول اس سے ہوتا ہو، تو یہ درجہ اباحت سے نکل کر درجہ استحباب و استحسان میں داخل ہو جاتا ہے۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی تو اب یہ ملاحظہ ہو کہ نماز میں یکسوئی قلب، خشوع

و خضوع مطلوب شرعی اور مقصود ہے بلکہ نماز کی اصل روح یہی ہے۔ لہذا اگر یکسوئی قلب کی غرض سے تلفظ بالنیۃ ہو تو یہ بھی مستحسن و مستحب ہوگا۔ اور یہ تجربہ ہے کہ اس سے یکسوئی قلب حاصل ہوتی ہے اور ذہنی انتشار ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ طلباء پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ استاذ کی تقریر اگر ذہن میں بوجہ انتشار محفوظ نہ ہوتی ہو تو اس کو زبان سے دہرانے میں یکسوئی قلب پیدا ہو کر محفوظ ہو جاتی ہے، پس تلفظ بالنیۃ بھی اس غرض سے جو کہ مجرب عمل ہے، کیا جائے تو یہ مستحسن ہوگا۔

علامہ ابن الہمام نقل کرتے ہیں کہ:

”وَهَذَا لِأَنَّ الْإِنْسَانَ قَدْ يَغْلِبُ عَلَيْهِ تَفَرُّقُ خَاطِرِهِ ، فَإِذَا ذَكَرَ بِلِسَانِهِ كَمَا عَوْنَا عَلَى جَمْعِهِ“۔ (فتح القدير: ۱/۲۷۳)

(یہ زبان سے نیت کے الفاظ کہنا مستحسن اس لئے ہے کہ انسان پر بسا اوقات قلبی انتشار کا غلبہ ہو جاتا ہے، پس جب زبان سے اس کو ادا کرتا ہے تو جمعیت قلب میں یہ معاون ہو جاتا ہے)

اس میں علامہ ابن الہمام اسی تجربہ کو بیان فرما رہے ہیں۔

ایک شبہ اور جواب

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ بات ہوتی تو صحابہ کرام بھی اس کو اختیار کرتے، تاکہ نماز میں حضور قلب میں یہ معاون بنے، مگر ان حضرات نے باوجود دین پر حریص ہونے کے اس کو کیوں اختیار نہیں کیا؟ تو اس کا جواب ملا علی قاری علماء کی طرف سے دیتے ہیں کہ:

”وَقَدْ يُقَالُ : نُسَلِّمُ أَنَهَا بَدْعَةٌ ، وَلَكِنَّهَا مُسْتَحْسَنَةٌ اسْتَحَبَّهَا الْمَشَائِخُ لِإِسْتِعَانَةِ عَلَى اسْتِحْضَارِ النِّيَّةِ لِمَنْ أَحْتَاَجَ ، وَهُوَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ

وَأَصْحَابُهُ لَمَّا كَانُوا فِي مَقَامِ الْجَمْعِ وَالْحُضُورِ لَمْ يَكُونُوا مُحْتَاجِينَ إِلَى
الِاسْتِحْضَارِ الْمَذْكُورِ“. (مرقات: ۴۱/۱)

(یعنی کہا جاتا ہے کہ ہم اس کے بدعت ہونے کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن یہ مستحسن ہے جس کو مشائخ نے پسند کیا ہے؛ کیونکہ نیت کے استحضار میں جو اس کا محتاج ہو، اس سے اس کو اعانت ہوتی ہے، اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کو چونکہ مقام حضور حاصل تھا، اس لیے اس استحضار مذکور کی ان کو حاجت نہیں)۔

حاصل یہ ہے کہ زبان سے نیت کرنے پر بوجہ عدم ثبوت، استمرار و پابندی کرنا اگرچہ کہ بدعت ہے، مگر چونکہ فی نفسہ یہ مباح اور جائز ہے، اس لیے حضور قلب میں جو کہ نماز کا جزء اعظم ہے، معاون ہونے کی وجہ سے مستحسن ہے اور یہ ظاہر ہے کہ تقریباً سبھی لوگ یا کم از کم اکثر لوگ اس کے محتاج ہیں کہ زبان سے نیت کہہ کر اس ذہنی انتشار کو ختم کریں، اور یکسوئی سے نماز پڑھیں، برخلاف نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے، چونکہ ان کو مقام جمع و حضور حاصل تھا، تشنت و تفرق قلب سے وہ بری و پاک تھے، اس لیے جن لوگوں کو اس کی ضرورت و احتیاج نہیں ان کو اس کا ترک ہی افضل و اولیٰ ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں:

”وَقَدْ عَلِمْتَ أَنَّ الْأَفْضَلَ الْمُكَمَّلَ عَدَمُ النُّطْقِ بِالنِّيَّةِ“۔ پھر آگے چل کر فرماتے ہیں۔ ”بَلْ مَحَلُّهُ إِنْ احْتَجَّ إِلَيْهِ بِالِاسْتِعَانَةِ عَلَيْهِ“۔ (مرقات: ۴۱/۱)

(یعنی افضل و اولیٰ تو زبان سے نیت نہ کرنا ہی ہے..... بلکہ تلفظ بالنیة کا استجاب حضور قلب میں اس کی طرف احتیاج کی صورت میں ہے)

اس تمام تر تقریر سے یہ بات معلوم ہوئی کہ زبان سے نیت کرنا فی نفسہ جائز ہے

اور حضورِ قلب میں معین ہونے کی وجہ سے مستحب ہے۔ واللہ اعلم

مؤلف کے بیانات کی طرف رجوع

اب ہم مؤلف ”حدیث نماز“ کے بیانات کا جائزہ لیتے ہیں۔

(۱) مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”در مختار“ سے یہ بات نقل کی ہے کہ:

”زبان سے نیت کرنا محمد ﷺ سے منقول نہیں، اور نہ ہی صحابہ کرام سے، نہ تابعین سے منقول ہے، بلکہ اسے بدعت کہا گیا ہے۔ اسی طرح ”غایۃ الاوطار“ اور ”کنز الدقائق اردو“ اور ”بہشتی زیور“ کا بھی حوالہ دیا ہے، اور لکھا ہے کہ ان میں بھی نیت دل کے ارادہ کو کہا ہے اور نیت کے الفاظ ادا کرنے کو بدعت کہا گیا ہے۔“ (حدیث نماز: ۴۸)

اس سے مؤلف ”حدیث نماز“ نے یہ تاثر دیا کہ ان کتابوں میں زبان سے نیت کے الفاظ کہنے کو بدعت کہہ کر اس کے کرنے کو برا بتلایا گیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کتابوں میں بھی پہلے یہ لکھا ہے کہ مستحب ہے، پھر اس کے بعد لکھا کہ مشائخ کی سنت ہے، اور اس کو مستحب کہتے ہیں۔ اور اس سنت سے مراد نبی کریم ﷺ کی سنت نہیں ہے؛ کیونکہ یہ آپ ﷺ سے مروی و منقول نہیں ہے۔ اس کے بعد بعض حضرات کا یہ قول نقل کیا کہ اس کو بدعت کہا گیا ہے۔

اب اس سے یہ تاثر دینا کہ احناف کی کتابوں میں بھی احناف نے اس کو بدعت کہا ہے، صریح دھوکہ ہے۔ اور ”بہشتی زیور“ کی طرف جو یہ منسوب کیا ہے کہ اس میں نیت کے الفاظ ادا کرنے کو بدعت کہا گیا ہے، اس کا ”بہشتی زیور“ میں وجود نہیں ہے، ہاں نیت کے الفاظ کو غیر ضروری تو بتلایا گیا ہے، چاہے کہہ لے چاہے

نہ کہے۔ البتہ لمبی چوڑی نیت کو جس سے خلل واقع ہوتا ہے برا کہا گیا ہے۔ (بہشتی زیور: ۱۴۲)

(۲) مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”ہدایہ“ سے نقل کیا ہے کہ نیت صرف ارادہ کو کہتے ہیں، اور شرط نیت میں یہ ہے کہ قلب سے یہ جان لے کہ کوئی نماز پڑھ رہا ہے، رہا زبان سے نیت کے الفاظ کہنا یہ معتبر نہیں ہے۔ اس کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا کہ:

”اس عبارت سے اتنا تو کھل کر سامنے آ گیا کہ زبان سے نیت نہ کرنا

ہی بہتر ہے، صرف دل میں ارادہ کر لے“۔ (حدیث نماز: ۴۹)

راقم کہتا ہے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے غالباً عبارت کا مطلب ہی نہیں سمجھا، صاحب ”ہدایہ“ کا مطلب یہ ہے کہ نیت دل کے ارادہ کو کہتے ہیں اس لئے اگر محض زبان سے الفاظ ادا کرے اور دل میں اس کا خیال و ارادہ نہ ہو تو یہ معتبر نہیں ہے؛ کیونکہ یہاں نیت ہی نہیں پائی گئی۔ لیکن اگر کوئی شخص دل میں ارادہ کے ساتھ نیت کے الفاظ بھی ادا کرے تو یہ کیسا ہے؟ یہ دوسرا مسئلہ ہے، جس کو خود صاحب ”ہدایہ“ نے آگے بیان کیا ہے۔

ملا علی قاری رقم طراز ہیں:

”ثُمَّ لَا يَخْفَى أَنَّ النِّيَّةَ بِاللِّسَانِ مَعَ غَفَلَةِ الْجَنَانِ غَيْرُ مُعْتَبَرَةٍ، لِمَا وَرَدَ مِنْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُورِكُمْ، وَلَا إِلَى أَمْوَالِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ، وَأَعْمَالِكُمْ - - - وَفِي رِوَايَةٍ - - - وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَنِيَّاتِكُمْ، فَلَوْ نَوَى الظُّهْرَ بِقَلْبِهِ فِي وَفْتِهِ، وَتَلَفَّظَ بِنِيَّةِ الْعَصْرِ لَا يَضُرُّهُ، بِخِلَافِ الْعَكْسِ، وَهَذَا مَعْنَى قَوْلِهِمْ ”وَلَا مُعْتَبَرٌ بِاللِّسَانِ“ - (مرقات: ۴۰۱)

(پھر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ زبان سے نیت کرنا، دل کی غفلت کے ساتھ معتبر نہیں ہے؛ کیونکہ حدیث میں وارد ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا، اور نہ ہی تمہارے اموال کو دیکھتا ہے، لیکن تمہارے قلوب اور اعمال کو دیکھتا ہے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ”لیکن تمہارے قلوب اور نیتوں کو دیکھتا ہے“، پس اگر کوئی ظہر کے وقت میں دل سے ظہر کی نماز کی نیت کرے اور زبان سے عصر کہے تو کچھ نقصان نہیں، برخلاف اس کے (اگر کوئی دل سے ظہر کے وقت میں عصر کی نیت کرے اور زبان سے ظہر کہے تو معتبر نہیں) یہی معنی ہیں فقہاء کے قول ”لَا مُعْتَبَرَ بِاللِّسَانِ“ کے۔)

پس مؤلف کا ”ہدایہ“ کی عبارت پر یہ کہنا کہ: ”اس سے معلوم ہوا کہ زبان سے نیت نہ کرنا ہی بہتر ہے“ غلط نہیں ہے۔

(۳) مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا ہے کہ:

”اس کے بعد یہ عبارت ہے: ”وَيَحْسُنُ ذَلِكَ لِاجْتِمَاعِ عَزِيمَتِهِ“۔ (یعنی زبان سے نیت کرنا ارادہ کو یکسو رکھنے کے لیے اچھا ہے)، اس کی تردید اسی عبارت کے حاشیہ (۱۳) پر مولانا عبدالحی حنفی مرحوم لکھتے ہیں: ”اِخْتَلَفُوا فِي ذَلِكَ اِخْتِلَافًا كَثِيرًا، فَمِنْ قَائِلٍ أَنَّهُ بَدْعَةٌ، وَمِنْ قَائِلٍ أَنَّهُ مَكْرُوهٌ، وَمِنْ قَائِلٍ أَنَّهُ سُنَّةٌ، وَمِنْ قَائِلٍ أَنَّهُ مُسْتَحَبٌّ، وَالْأَصَحُّ أَنَّهُ بَدْعَةٌ حَسَنَةٌ“ (حدیث نماز: ۴۹)

(زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنے کے بارے میں فقہاء (حنفیہ) کا بہت اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ بدعت ہے، بعض کہتے ہیں کہ مکروہ یعنی برا ہے، بعض کہتے ہیں کہ سنت ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مستحب ہے، اور صحیح یہ ہے کہ بدعتِ حسنہ ہے۔)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی مؤلف "حدیث نماز" کی غلط فہمی ہے، کہ علامہ عبدالحی کی اس عبارت کو صاحب "ہدایہ" کی عبارت کی تردید سمجھ رہے ہیں، حالانکہ یہ تو اس کی تائید ہے؛ کیونکہ صاحب "ہدایہ" نے بھی اس کو سنت نہیں کہا، اور نہ ہی بدعت کہا، بلکہ مستحسن کہا ہے۔ اور ہم اوپر اس کی تحقیق کر آئے ہیں کہ یہ مستحب عند العلماء والمشائخ ہے، جو ایک غرض صحیح سے اختیار کیا گیا ہے۔ لہذا عدم ثبوت کی وجہ سے اس کو بدعت لغوی کہنا درست ہے، اور حسنہ کہنا اس وجہ سے ہے کہ یہ ایک مطلوب چیز کے حصول کا ذریعہ ہو رہا ہے، تو حاصل یہ کہ صاحب "ہدایہ" اور مولانا عبدالحی صاحب کی عبارات میں کوئی منافات و تضاد نہیں، بلکہ مولانا عبدالحی صاحب نے اس کی تائید فرمائی ہے۔ تائید کو تردید سمجھنا فہم و تقفہ سے عاری لوگوں کا ہی کام ہو سکتا ہے۔

(۴) مؤلف "حدیث نماز" نے لکھا ہے کہ:

”رہا معاملہ سنت کا تو اس کے متعلق حنفی مذہب کے زبردست مجتہد اور فقیہ علامہ شرنبلالی ”مراقی الفلاح“ میں لکھتے ہیں: ”إِنَّ مَنْ قَالَ مِنْ مَشَائِحِنَا أَنَّ التَّلْفُظَ سُنَّةٌ لَمْ يَرُدْ بِهِ سُنَّةُ النَّبِيِّ ﷺ“ (حدیث نماز: ۵۰)

(ہمارے مشائخ میں سے جس نے بھی یہ کہا ہے کہ زبان سے نیت کے الفاظ کہنا سنت ہے تو اس کے بارے میں سرے سے کوئی سنت رسول اللہ کی وارد نہیں ہوئی ہے) راقم کہتا ہے کہ یہ بھی یا تو مؤلف کی غلط فہمی ہے یا فریب دہی ہے؛ کیونکہ اس عبارت پر مؤلف نے اعراب بھی غلط لگایا ہے اور ترجمہ بھی غلط کیا ہے، صحیح عبارت یہ ہے: ”إِنَّ مَنْ قَالَ مِنْ مَشَائِحِنَا أَنَّ التَّلْفُظَ سُنَّةٌ لَمْ يَرُدْ بِهِ سُنَّةُ النَّبِيِّ ﷺ“ اور اس کا ترجمہ اس طرح ہے کہ ”ہمارے مشائخ میں سے جنہوں نے یہ کہا کہ نیت زبان سے کرنا سنت ہے، انہوں نے اس سے نبی کی سنت مراد نہیں لی ہے“، اور اس مراد پر

خود علامہ شرنبلالی کی اسی سے متصل اگلی عبارت دلالت کرتی ہے، وہ آگے فرماتے ہیں: ”بَلْ سُنَّةٌ بَعْضُ الْمَشَائِخِ لِاِخْتِلَافِ الزَّمَانِ وَ كَثْرَةِ الشَّوَاعِلِ عَلٰی الْقُلُوبِ بَعْدَ زَمَانِ التَّابِعِينَ“ (مراقی الفلاح: ۸۳)

(بلکہ ان کی مراد بعض مشائخ کی سنت ہے اور اس کی وجہ زمانے کا اختلاف اور تابعین کے زمانے کے بعد لوگوں کے دلوں پر کاموں کی کثرت ہے) حاصل یہ ہے کہ علامہ شرنبلالی کا مقصد اس عبارت سے ان مشائخ کی تردید نہیں جیسا کہ مؤلف نے تاثر دیا یا سمجھا ہے، بلکہ ان مشائخ کے کلام کی توجیہ ہے کہ ان کی مراد سنت رسول نہیں بلکہ سنت مشائخ ہے اور اس سنت مشائخ کے اختیار کرنے کی وجہ بھی بتادی کہ زمانے کا اختلاف ہے کہ پہلے لوگوں کو اس قدر ذہنی انتشار نہیں تھا جتنا کہ بعد کے لوگوں کو ہے، اس لیے مشائخ نے کہا کہ زبان سے بھی نیت کر لی جائے۔

اس وضاحت سے ہمارے مؤلف صاحب کی عبارت دانی و عربی دانی کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے کہ ایک معمولی عبارت کے سمجھنے میں بھی صریح غلطی کر گئے، اور یہ بھی نہ سوچا کہ اگر یہ لفظ: ”لم یرد بہ سنة النبی“ میں ”سنة النبی“ کا لفظ ”یرد“ کا فاعل ہوتا جیسا کہ مؤلف نے لکھا ہے تو عربیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ ”یرد“ کی بجائے ”ترد“ صیغہ مونث لاتے؛ کیونکہ سنت مونث ہے۔

ایک شبہ اور جواب

کسی کو اگر یہ شبہ ہو کہ اہل سنت کے نزدیک تو کوئی بدعتِ حسنہ نہیں ہے، اور یہی مذہب علماء دیوبند کا بھی ہے، تو پھر اس کو بدعتِ حسنہ کیسے کہا گیا؟ استاذی حضرت مفتی نصیر احمد صاحب نے فرمایا کہ شرعی بدعت میں حسنہ اور قبیحہ

کی تقسیم نہیں ہوتی، وہ تو قبیحہ ہی ہوتی ہے، اور بدعت لغوی میں یہ تقسیم ہوتی ہے، اور یہاں یہی لغوی بدعت مراد ہے؛ کیونکہ محض عدم ثبوت سے بدعت ہونا ثابت نہیں ہوتا، لہذا اس کو بدعت لغوی پر محمول کرنا ضروری ہے اور حسنہ ہونا اور پرگزر چکا۔ اس کے بعد اور جو کچھ مؤلف نے فرمایا ہے اس کے جوابات اوپر کی تقریر سے ہو چکے ہیں۔ فتدبر (واللہ اعلم)

✽ پاؤں سے پاؤں ملانا ✽

اہل حدیث حضرات نماز باجماعت میں ایک دوسرے کے پاؤں ملا کر کھڑا ہونا ضروری سمجھتے ہیں، جس کی وجہ وہ حضرات یہ بیان کرتے ہیں کہ حدیث میں ہے کہ حضرت نعمان بن بشیرؓ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا (رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں) کہ ہم میں سے آدمی اپنے ساتھی کے ٹخنے سے ٹخنہ ملاتا تھا۔ اور حضرت انسؓ کی روایت میں ہے کہ ہمارا ایک ساتھی دوسرے ساتھی کے کاندھے سے کاندھا اور قدم سے قدم ملاتا تھا۔ (بخاری: ۱۰۰۱)

مؤلف ”حدیث نماز“ بھی ان حدیثوں کو بیان کر کے احناف کو بھی اس پر عمل کی دعوت دے رہے ہیں کہ تم اگر اہل سنت ہو تو اس پر عمل کرو؛ کیونکہ یہ بھی سنت ہے۔ (دیکھئے حدیث نماز: ۵۳-۵۴)

اس موقع پر بھی مؤلف ”حدیث نماز“ نے اپنی عادت کے مطابق بڑی ہی مبالغہ آرائیاں کی ہیں۔ ہم پہلے احناف کا بلکہ تمام ہی ائمہ کا مذہب اور حدیثوں کا صحیح مطلب علماء کے کلام سے پیش کرتے ہیں۔

تسویہ صرف اور جمہور کا مذہب

اس میں کوئی اختلاف کسی کو بھی نہیں کہ صفوں کے درمیان برابری اہم کام ہے

امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، اور امام مالکؒ صفوف کی برابری کو سنت قرار دیتے ہیں اور بعض حضرات فرض و واجب ہونے کے بھی قائل ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ ”علامہ ابن عبدالبر نے ”الاستذکار“ میں فرمایا کہ تسویہ صفوف کے بارے میں آثار متواترہ وارد ہوئے ہیں، جن میں نبی کریم ﷺ سے تسویہ صفوف کا امر منقول ہے، اور اس پر خلفائے راشدین کا عمل بھی ہے، نیز اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ (اوجز المسالک: ۲۹۵/۳)

پاؤں سے پاؤں ملانے کا معنی

لیکن سوال یہ ہے کہ صفوف میں برابری کا مطلب کیا ہے، مؤلف ”حدیث نماز“ اور دیگر غیر مقلدین اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ ہر آدمی اپنا پاؤں دوسرے کے پاؤں سے ملائے۔ اور اس پر حضرت نعمان بن بشیرؓ کی حدیث جو اوپر نقل کی گئی، اس سے استدلال کرتے ہیں، حالانکہ اس کا یہ مطلب کسی نے نہیں لیا۔ اس لیے حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے فرمایا کہ یہ غیر مقلدین کے مختارات میں سے ہے جس کا سلف میں نام و نشان نہیں۔ (فیض الباری: ۲۳۷/۲)

اور مؤلف ”حدیث نماز“ نے ترقی کر کے یہ بھی فرمادیا کہ حنفی مذہب کی کتابوں میں ہم اہل حدیثوں کی طرح آپ کو بھی یہی حکم ہے کہ مل کر کھڑے رہو، اور درمیان میں جگہ نہ چھوڑو الخ۔ (حدیث نماز: ۵۳)

ہم کہتے ہیں کہ اس میں تو شک نہیں کہ ہماری کتابوں میں ملکر کھڑے ہونے اور درمیان میں جگہ نہ چھوڑنے کا حکم ہے، مگر ملکر کھڑے ہونے کا یہ مفہوم جو غیر مقلدین نے لیا ہے کہ پاؤں سے پاؤں ملانا چاہئے، یہ کہاں سے اخذ کر لیا؟ کتب احناف میں اس کا ذکر نہیں ہے بلکہ تسویہ صفوف میں اتصال کا حکم ہے۔

اس لئے آئیے، دیکھیں کہ علماء نے ان احادیث کا کیا مطلب بیان کیا ہے؛ کیونکہ حدیث کا وہی مطلب معتبر ہوگا جو شرح حدیث نے بیان کیا ہے۔

۱- حدیث کے مشہور شارح علامہ ابن حجر عسقلانی حضرت نعمان کی اسی حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ: ”الْمُرَادُ بِذَلِكَ الْمُبَالَغَةُ فِي تَعْدِيلِ الصَّفِّ وَسَدِّ خَلْلِهِ“ (فتح الباری: ۲/۲۱۱)

(اس سے مراد صف کی برابری میں اور درمیان صف میں جگہ بند کرنے میں مبالغہ بیان کرنا ہے)

۲- علامہ قسطلانی شافعی نے نعمان ابن بشیر کی مذکورہ حدیث کا مطلب ان الفاظ سے بیان کیا ہے ”الْمُرَادُ بِذَلِكَ الْمُبَالَغَةُ فِي تَعْدِيلِ الصَّفِّ وَسَدِّ خَلْلِهِ“ (ارشاد الساری شرح بخاری: ۷۶۲)

(یعنی الزاق منکب و قدم سے مراد، تعدیل صف میں مبالغہ اور خلل کو بند کرنا ہے)

۳- شارح بخاری علامہ بدر الدین العینی اس کی شرح میں ارشاد فرماتے ہیں: ”أَشَارَ بِهِذِهِ إِلَى الْمُبَالَغَةِ فِي تَعْدِيلِ الصُّفُوفِ وَسَدِّ الْخَلَلِ فِيهِ“ (عمدة القاری شرح بخاری: ۳۶۰/۴)

(یعنی الزاق منکب و قدم سے تعدیل صفوف اور درمیانی جگہوں کو بند کرنے میں مبالغہ کی جانب اشارہ ہے)

۴- محدث شہیر علامہ انور شاہ کشمیری نے فرمایا کہ حافظ ابن حجر نے کہا کہ مراد اس سے تعدیل صف میں مبالغہ ہے اور خلل کو بند کرنا ہے، یہی فقہاء اربعہ کے یہاں اس کا مطلب ہے کہ درمیان میں جگہ نہ چھوڑی جائے کہ جس میں تیسرا داخل ہو سکے۔ نیز فرمایا کہ صحابہ اور تابعین کے تعامل سے ہم نے سمجھا کہ ”الزاق منکب“

(یعنی کندھے ملانے سے) صحابہ کی مراد صرف آپس میں ملنا اور جگہ نہ چھوڑنا ہے۔
(فیض الباری: ۲۳۶/۲)

۵- شارح ترمذی علامہ یوسف بنوری فرماتے ہیں: ”وَالْحَاصِلُ أَنَّ الْمُرَادَ هُوَ التَّسْوِيَةُ وَالْإِعْتِدَالُ لِكَيْلَا يَتَأَخَّرَ أَوْ يَتَقَدَّمَ فَالْمُحَاذَاةُ بَيْنَ الْمَنَاكِبِ وَالزُّرَاقِ الْكِعَابِ كِنَايَةٌ عَنِ التَّسْوِيَةِ۔“ (معارف السنن: ۲۹۸/۲)

(یعنی حاصل یہ کہ مراد تسویہ اور اعتدال ہے، تاکہ کوئی موخر اور مقدم نہ ہو، پس کاندھوں کے درمیان برابری اور ٹخنوں کا ملانا یہ تسویہ صفوف سے کنایہ ہے)

۶- حضرت مفتی مہدی حسن صاحب ”قلائد الازہار شرح کتاب الآثار“ میں فرماتے ہیں: ”بس الزراق منكب بالمناكب اور الزراق كعب بكعب وركبه برکبه و قدم بقدم اور محاذات اعناق ومحاذات مناكب، یہ تمام کی تمام ایک ہی معبر و معنون کی تعبیرات ہیں اور وہ اعتدال و تسویہ اور مقاربه اور آپس میں محاذات اور اتصال ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے، اور الزراق حقیقی کے معنی مراد نہیں ہیں اور کیسے مراد لے سکتے ہیں جبکہ گھٹنے سے گھٹنے کا ملانا متحقق ہی نہیں ہو سکتا، جیسا کہ مشاہدہ ہے، پس مراد محض محاذات ہے اور اس کا سوائے اس کے جس کو بصیرت نہ ہوا انکار نہیں کر سکتا۔ (قلائد الازہار: ۶۷/۲)

شرح حدیث کی ان تشریحات سے واضح ہوا کہ قدم سے قدم یا کاندھے سے کاندھا ملانے سے مقصود صرف صفوف کی درستی و برابری میں مبالغہ بیان کرنا ہے، اور اس کا حقیقی معنی مراد نہیں۔

الزراق كعب کے حقیقی معنی مراد نہیں

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ:

۱- حضرت نعمان بن بشیر کی ایک روایت میں ”ٹخنے سے ٹخنہ“ ملانے کا ذکر ہے، اور دوسری میں بجائے ٹخنہ کے ”پیر سے پیر“ ملانے کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ ہی ”کاندھے سے کاندھا“ ملانے کا بھی ذکر ہے۔

اور ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں کو جمع کرنا مشکل ہے کہ ٹخنے بھی ایک دوسرے سے ملیں اور کاندھے بھی، اسی لئے ٹخنے ملانے کی روایت پر اہل حدیث نہ عمل کرتے ہیں اور نہ عمل کر سکتے ہیں، البتہ پیر سے پیر ملانے کی روایت پر عمل کرتے ہیں، شاید یہ تاویل کرتے ہوں کہ ٹخنے ملانے سے مراد پیر ملانا ہی ہے، مگر اس کے بجائے ان کو یہ تاویل کرنا چاہئے کہ اصل تو ٹخنے ملانا ہی ہے، اس کو قدم سے بھی تعبیر کر دیا گیا ہے۔ لہذا ٹخنے سے ٹخنے ملا کر کھڑا ہونا چاہئے، تا کہ دونوں روایات پر عمل ہو، مگر ٹخنے ملانے کا تو ذکر بھی نہیں کرتے، عمل تو بعد کی بات ہے۔

اسی طرح حضرت انسؓ کی روایت میں کاندھے ملانے کا بھی ذکر ہے، مگر اس کا اہل حدیث لوگ کوئی تذکرہ بھی نہیں کرتے، محض قدم ملانے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ آخر کیوں؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ دونوں باتوں پر عمل مشکل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مراد اس کا حقیقی معنی نہیں ہے، بلکہ صرف مبالغہ ہے۔

۲- اس کے حقیقی معنی مراد نہ ہونے پر ”ابوداؤد“ کی ایک حدیث اشارہ کرتی ہے، اس میں حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

”فَرَأَيْتُ الرَّجُلَ يَلْزُقُ مَنْكَبَهُ بِمَنْكَبِ صَاحِبِهِ وَرُكْبَتَهُ بِرُكْبَتِهِ صَاحِبِهِ وَكَعْبَهُ بِكَعْبِهِ“ (یعنی میں نے دیکھا کہ آدمی اپنے کندھے کو اپنے ساتھی کے کندھے سے اور اپنے گھٹنے کو اپنے ساتھی کے گھٹنے سے اور اپنے ٹخنے کو اپنے ساتھی کے ٹخنے سے ملاتا تھا۔ (ابوداؤد: ۱/۹۷، سنن بیہقی: ۳/۱۴۳۳)

امام ابن اہل سنت نے ”خلاصۃ البدرا المنیر“ میں ابن خزیمہ وابن حبان سے، امام ابن حجر نے ”فتح الباری“ میں، اور زرقانی نے ”شرح مؤطا“ میں اس حدیث کی ابن خزیمہ سے تصحیح نقل کی ہے۔ (خلاصۃ البدرا المنیر: ۲۸۱/۱، فتح الباری: ۲/۲۱۱، زرقانی علی المؤطا: ۴۵۲/۱)

اس حدیث میں کندھوں اور ٹخنوں کے ساتھ گھٹنوں کا بھی ذکر ہے، حالانکہ اس کو ملانے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ کیا اہل حدیث لوگ اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے کبھی گھٹنوں سے گھٹنے ملا تے ہیں؟

علامہ انور شاہ کشمیری نے فرمایا کہ خود غور کرو کہ کیا پیروں سے پیر ملانے کے ساتھ ساتھ کاندھے سے کاندھا ملانا، بغیر مشقت کے ممکن بھی ہے؟ بلکہ کوشش کے بعد بھی ممکن نہیں ہے۔ (فیض الباری: ۲/۲۳۷)

غرض یہ کہ حضرت نعمان بن بشیرؓ اور حضرت انسؓ کا مطلب اس سے یہ ہرگز نہیں کہ حقیقتاً پاؤں سے پاؤں اور کندھوں سے کندھا ملاتے تھے، بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ درمیان میں حتی الامکان جگہ نہ چھوڑتے تھے اور سب کے سب مل کر ایسا کھڑے ہوتے کہ اگر تیر بھی پھینکا جائے تو دوسرے کو نے میں کسی کو لگے بغیر پہنچ جاتا تھا؛ کیونکہ کوئی مقدم اور کوئی موخر نہ ہوتا تھا۔ اگر اس کو حقیقت پر محمول کیا جائے تو ظاہر ہے کہ بلا مشقت شدید اس پر عمل کرنا ممکن نہیں اور تکلف و تصنع کے بغیر اس کو اپنا نا خارج از امکان ہے؛ کیونکہ ایک طرف تو کندھوں کو ملانا اور پھر اس کے ساتھ ہی پیروں سے پیر اور ٹخنوں سے ٹخنے اور مزید گھٹنوں سے گھٹنے ملانا بڑا مشکل ہے، اسی لیے یہ حضرات اہل حدیث کندھوں والی بات کی طرف توجہ اور التفات ہی نہیں کرتے، اور نہ ٹخنوں و گھٹنوں والی بات کی طرف توجہ دیتے ہیں،

صرف قدم ملانے کی طرف متوجہ اور اسی پر مصر ہیں۔

۳- حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ”رَأَوْا صُفُوفَكُمْ وَقَارِبُوا بَيْنَهَا وَحَادُوا بِالْأَعْنَاقِ“ (نسائی شریف: ۹۳/۱، سنن بیہقی: ۱۴۲/۳)

(صفوف کو ملاؤ اور صفوف کو قریب قریب قائم کرو اور گردنوں کو برابر کرو۔) (کہ کوئی اوپر کوئی نیچے نہ ہو)

اس روایت میں گردنوں کو بھی برابر کرنے کا حکم خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے، تو کیا اس پر عمل ممکن بھی ہے کہ بڑی گردن والا اور چھوٹی گردن والا دونوں برابر ہو کر کھڑے ہو جائیں؟ معلوم ہوا کہ یہ محض تسویہ صفوف اور اعتدال قائمین سے کنایہ ہے کہ سب برابر برابر کھڑے ہوں، کوئی آگے پیچھے نہ ہو، کوئی اونچ نیچ نہ ہو، تاکہ صفوف ملائکہ سے مکمل مشابہت ہو جائے، اور اسی کا مختلف احادیث میں حکم دیا گیا ہے مثلاً:

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ: ”كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَمْسَحُ عَوَاتِقَنَا وَيَقُولُ: اسْتَوُوا وَلَا تَخْتَلِفُوا“ (مسلم: ۱۸۱/۱، نسائی: ۹۳/۱)

(رسول اللہ ﷺ نماز میں ہمارے کندھوں کو چھوتے اور فرماتے کہ برابر کھڑے ہو، اور اختلاف نہ کرو)

اور حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ: ”كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَتَخَلَّلُ الصُّفُوفَ مِنْ نَاحِيَةِ إِلَى نَاحِيَةٍ، يَمْسَحُ مَنَاكِبَنَا وَصُدُورَنَا، وَيَقُولُ: لَا تَخْتَلِفُوا فَتَخْتَلِفَ قُلُوبُكُمْ“ (نسائی: ۹۳/۱)

(رسول اللہ ﷺ صفوں کے درمیان ادھر سے ادھر جاتے اور ہمارے سینوں

اور کندھوں کو چھوتے (یعنی برابر کرتے تھے) اور فرماتے اختلاف نہ کرو، کہ کہیں تمہارے دلوں میں اختلاف نہ آجائے)

ایک دوسری روایت میں حضرت نعمانؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہماری صفوں کو اس طرح سیدھا فرماتے گویا کہ آپ تیر (کانشانہ) برابر کر رہے ہوں۔ (مسلم: ۱۸۲۱، سنن بیہقی: ۱۴۳۳۳)

ان تمام روایات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوگا کہ مقصود صفوف کی درستی ہے، جس کو مختلف تعبیرات سے بیان کیا گیا ہے اور یہ سب بغرض تسویہ اور مبالغہ فی الاعتدال بیان فرمایا گیا ہے، اگر صرف پیر ہی ملانا کوئی مقصود ہوتا تو نبی کریم ﷺ ”حَاذُوا بِالْأَعْنَاقِ“ کی طرح اس کو بھی بیان فرماتے۔ نیز آپ جب کندھوں اور سینوں کو چھوتے ہوئے ان کو برابر فرما رہے تھے تو پیروں کو بھی ضرور ملاتے ہوئے اور یہ فرماتے ہوئے جاتے کہ ان کو ملاؤ۔ واذ لیس فلیس۔

حاصل یہ کہ مقصود ان تمام اصحاب کا تسویہ صفوف کو بیان کرنا ہے، پیر کو ملانا یا کندھوں کو ملانا بیان کرنا مقصود نہیں ہے، اور یہ تعبیرات ہیں جو مبالغہ بیان کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہیں۔ هذا ما عندنا والعلم عند الله العلام.

❖ دو پیروں کے درمیان کا فاصلہ ❖

جب نماز میں کھڑے ہوں تو علماء حنفیہ نے لکھا ہے کہ دو پیروں کے درمیان چار انگل کا فاصلہ ہونا مستحب ہے، اس پر تنقید کرتے ہوئے مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا ہے کہ:

”بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ صف میں کھڑے ہو کر اپنے دونوں پاؤں کے درمیان صرف چار انگل کی جگہ رکھے، تو یہ بات عقل و نقل کے بالکل

خلاف ہے۔ اور یہ بات نہ اللہ ورسول کی فرمودہ اور نہ صحابہ کرام کی اختیار کردہ، اور نہ کسی امام کی بیان کردہ، بلکہ اس قدر بے اعتناء ہے کہ اس کی سند اور دلیل روئے زمین پر کہیں موجود نہیں ہے۔ (حدیث نماز: ۵۶)

راقم عفی اللہ عنہ کہتا ہے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ کا یہ دعویٰ کہ یہ عقل و نقل کے خلاف ہے یعنی علی الجہالت ہے اور بے بنیاد اور خلاف تحقیق بات ہے۔ نیز حقائق سے عدم واقفیت اور ظاہر پرستی کا تباہ کن نتیجہ ہے۔ اس لیے ہم یہاں پر بعون اللہ تعالیٰ ناظرین کے سامنے چند سطور لکھ کر مسئلہ کی اصل نوعیت کو واضح گف کریں گے۔

چار انگل سے تحدید مراد نہیں

سب سے پہلے یہ بات ملحوظ رکھنا چاہئے کہ احناف کے یہاں دونوں قدم کے درمیان چار انگل کا فاصلہ جو بیان کیا گیا ہے اس سے تحدید مراد نہیں ہے۔ خود احناف کی کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔ مولانا بنوریؒ نے لکھا کہ: ”حق یہ ہے کہ قدمین کے درمیان فصل میں کوئی تحدید نہیں ہے“۔ (معارف السنن: ۲/۲۹۸)

اس کے علاوہ احناف کا عمل خواہ علماء کا ہو، یا غیر علماء کا، یہ بتلاتا ہے کہ مراد تحدید نہیں ہے، کوئی بھی اس تحدید کو حقیقت پر محمول نہیں کرتا۔ رہے بعض جہلاء ان کا تو کوئی اعتبار نہیں اور نہ ہی ان سے مذہب احناف پر کوئی حرف آسکتا ہے۔

اب رہا یہ کہ کتابوں میں اس کی قید کیوں لگائی گئی؟ تو اصل بات یہ ہے کہ آدمی کو بے تکلف کھڑے ہونے میں کم و بیش چار انگل کا فاصلہ کافی ہوتا ہے، اور اگر کسی کو بے تکلف کھڑے ہونے کے لیے اس سے زیادہ فاصلہ کا تقاضا ہو تو اس کی بلا کسی کراہت کے اجازت ہے۔ تو اصل یہ ہے کہ آدمی بے تکلف اور بلا تصنع کھڑا ہو سکے،

اور چونکہ معمولی ڈیل ڈول والوں کے لئے عموماً چار انگل کا فاصلہ کافی ہوتا ہے، اسی لیے اس کو ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اس سے تحدید مراد نہیں ہے۔ اور اس کے بیان کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کہ کم علمی کی بنا پر ایسے معاملات میں متردد پریشان رہتے ہیں، تو ان جیسے لوگوں کی سہولت کی غرض سے ایسے احکام لکھ دیے جاتے ہیں جن کا ماخذ قرآن وحدیث ہی ہوتا ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ چار انگل کی تحدید نہیں ہے، بلکہ کم وبیش اتنی مقدار مراد ہے، تو یہ بات واضح ہو گئی کہ مؤلف ”حدیث نماز“ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکے جس کو ہم نے اوپر حقائق سے عدم واقفیت اور ظاہر پرستی سے تعبیر کیا تھا۔ اس تحدید کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے استنجاء میں تین ڈھیلے لینے کا حکم فرمایا، اس سے فرقہ ظاہریہ نے یہ سمجھا کہ تین کا عدد خاص طور سے مراد ہے۔ اور احناف نے اس کی حقیقت اور اصلیت کو پہچان کر کہا کہ مراد تحدید نہیں بلکہ مراد استزہاہ وصفائی ہے، خواہ وہ دو ڈھیلوں سے حاصل ہو جائے، یا تین سے، یا اس سے زائد سے۔ مگر چونکہ عموماً تین عدد ڈھیلوں سے حاجت پوری ہو جاتی ہے، اس لیے حدیث میں تین کا ذکر فرما دیا۔

اسی طرح یہاں فقہاء کے کلام میں چار انگل سے تحدید مراد نہیں، بلکہ انسان کی ہیئت طبعی کا اندازہ لگا کر بتایا گیا ہے کہ دو پیروں کے درمیان چار انگل کا فاصلہ ہونا چاہئے، اور اس ہیئت طبعی وحالت وضعی کو خشوع اور خضوع میں دخل ہے؛ کیونکہ اس کے خلاف میں تکلف اور تصنع ہے جو کہ خشوع میں خلل ڈالتا ہے۔

اور اتنی بات احادیث سے ثابت ہے کہ قیام میں حالت وضعی کو باقی رکھنا

چاہئے، چنانچہ:

(۱) حضرت عبداللہ ابن الزبیرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا ”صَفُّ الْقَدَمَيْنِ وَوَضْعُ الْيَمَنِ عَلَى الْيُسْرَى مِنَ السُّنَّةِ“۔ (ابوداؤد: ۱۱۰/۱)

(یعنی پیروں کو ملا کر رکھنا اور دائیں ہاتھ کو (نماز میں) بائیں پر رکھنا سنت ہے)

(۲) حضرت ابن مسعودؓ کے صاحبزادے حضرت ابو عبیدہ تابعیؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی کو حضرت عبداللہ نے نماز میں دونوں پیروں کو ملائے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ ”خَالَفَ السُّنَّةَ وَلَوْ رَاوَحَ لَكَانَ أَفْضَلَ“ (اس نے سنت کی مخالفت کی، اگر یہ مراوحہ کرتا تو افضل تھا) کہ دونوں کو ملا کر نہ کھڑا ہوتا اور آرام سے بلا تکلف کھڑا ہوتا۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اگر مراوحہ کرتا تو مجھے زیادہ اچھا معلوم ہوتا۔ (نسائی شریف: ۱۰۳/۱)

یہ دونوں روایتیں اگرچہ کہ موقوف ہیں، مگر دونوں ہی بحکم مرفوع ہیں؛ کیونکہ صحابی کا لفظ سنت کہنا مرفوع ہونے پر دلیل ہوتا ہے۔

علامہ نووی لکھتے ہیں: ”وَأَمَّا إِذَا قَالَ الصَّحَابِيُّ: أَمْرُنَا بِكَذَا أَوْ نُهْيُنَا عَنْ كَذَا أَوْ مِنَ السُّنَّةِ كَذَا، فَكُلُّهُ مَرْفُوعٌ عَلَى الْمَذْهَبِ الصَّحِيحِ الَّذِي قَالَهُ الْجَمْهُورُ مِنْ أَصْحَابِ الْفُنُونِ“۔ (مقدمہ شرح مسلم: ۱۷)

(یعنی جب صحابی یوں کہے کہ ہم کو اس کا حکم دیا گیا، یا اس سے روکا گیا، یا سنت میں سے یہ ہے، تو یہ سب کا سب، صحیح مذہب کے اعتبار سے مرفوع ہے جس کے جمہور اہل فن قائل ہیں۔)

اور حافظ ابن حجرؒ نے بھی ”شرح النجۃ: ۸۳“ میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں ان سے روایت کرنے والے حضرت ابو عبیدہؓ ہیں، ان کے بارے میں محدثین نے کہا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ سے ان کا سماع ثابت نہیں۔ چنانچہ امام ترمذیؒ نے ”باب ما جاء في الرجل تفوته الصلوات بأيتهن“

یبدأ“ اور ”باب ما جاء في مقدار القعود في الركعتين الأوليين“ میں فرمایا: ”إِنَّ أَبَا عُبَيْدَةَ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ أَبِيهِ“ اسی طرح امام طحاوی نے بھی ”وضو بالنبذ“ کے مسئلہ میں اس کی صراحت کی ہے۔ (سنن ترمذی: ۴۳۱/۱ و ۸۵۱/۱، طحاوی: ۷۵/۱)

مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا سماع ”طبرانی“ کی ایک روایت سے صراحت کے ساتھ ثابت ہے جس میں انہوں نے ”سَمِعَ“ کے لفظ سے اپنے والد سے سننا بیان کیا ہے۔ علامہ بدرالدین العینی نے ”عمدة القاری شرح بخاری“ میں ان لوگوں کا رد کرتے ہوئے جو ابو عبیدہ کے اپنے والد سے سماع نہ ہونے کے قائل ہیں، لکھا ہے کہ: یہ قول مردود ہے، پھر ”معجم اوسط طبرانی“ کی روایت اور ”مستدرک حاکم“ کی روایت کے حوالے سے سماع ثابت کیا ہے، اور نیز آگے چل کر فرمایا کہ سماع نہ ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں؛ کیونکہ حضرت عبداللہ کی وفات کے وقت ان کی عمر سات برس کی تھی، اور سات برس کا بچہ جب غیروں و اجنبیوں سے سماع کر سکتا ہے تو خود اپنے باپ سے کیوں نہیں کر سکتا؟۔ (عمدة القاری: ۴۲۹/۲-۴۳۰)

لہذا حضرت ابن مسعودؓ سے ان کا سماع محقق ہے، اور یہ حدیث منقطع نہیں بلکہ متصل ہے۔

غور کیجئے کہ ان روایات میں سے ایک میں ”صَفِّ الْقَدَمِ“ یعنی پیروں کے ملانے کو سنت کہا گیا ہے، اور دوسری روایت میں ”صَفِّ الْقَدَمِ“ ہی کو خلاف سنت بتلایا گیا ہے۔ اور دونوں میں اگرچہ لفظاً تعارض معلوم ہوتا ہے مگر حقیقتاً کوئی تعارض نہیں ہے؛ کیونکہ پہلی روایت میں صَفِّ قَدَمِ سے مراد زیادہ کشادہ کرنے کی نفی ہے اور دوسری روایت میں صَفِّ قَدَمِ سے مراد زیادہ ملانے کی نفی ہے۔ اور دوسری روایت میں ”لَوْ رَاحَ لَكَانَ أَفْضَلَ“ کے الفاظ اس مراد پر صریح دلالت کر رہے

ہیں؛ کیونکہ زیادہ ملانے میں بھی راحت نہیں بلکہ کلفت ہے اور زیادہ کشادہ کرنے میں بھی کلفت و مشقت ہے، تو مطلب دونوں روایات کا یہ ہے کہ اعتدال کے ساتھ جو صورت بلا تکلف و تصنع حاصل ہوتی ہے، اس پر قائم رہنا سنت ہے جو کہ مراوحہ ہے۔

مراوحہ کی تفسیر

مراوحہ کے معنی اہل لغت نے یہ لکھے ہیں کہ کبھی اس قدم پر کھڑا ہونا اور کبھی دوسرے پر کھڑا ہونا۔ (لسان العرب: ۲/۴۵۵، القاموس المحیط: ۱/۲۸۲) اور علامہ کشمیری نے اس کے معنی ”تفریح بین القدمین“ (دو قدموں کے درمیان فاصلہ رکھنا) بیان کئے ہیں۔ (فیض الباری: ۲/۲۳۷) راقم کہتا ہے کہ ”روح: بکسر العین“ کے معنی کشادہ ہونے کے ہیں، اس سے ”مراوحہ“ بمعنی کشادہ کرنا ہے اور اس کی تائید سیاق کلام سے بھی ہوتی ہے، چونکہ ”صف بمعنی ضم“ کے مقابلہ میں مراوحہ بولنا اس کے بمعنی ”تفریح“ ہونے کی تائید کرتا ہے۔ واللہ اعلم

نیز ”مصنف عبدالرزاق“ میں حضرت عبداللہ بن عمر کا بھی یہی طریقہ بتایا گیا ہے، چنانچہ حضرت ابن جریج کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت نافع نے بتایا کہ ”إِنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ لَا يُفْرِسِخُ بَيْنَهُمَا وَلَا يَمْسُ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى وَ قَالَ بَيْنَ ذَلِكَ“ (حضرت عبداللہ بن عمر قدموں کو کشادہ نہیں رکھتے تھے اور نہ ان میں سے ایک کو دوسرے سے مس کرتے تھے، فرمایا کہ ان کے درمیانی شکل ہوتی تھی)۔ (مصنف عبدالرزاق: ۲/۲۶۴)

نیز ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عطاء سے نماز میں دونوں قدموں کو

ملانے کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ: ”أَمَّا هَكَذَا حَتَّى تُمَاسَ بَيْنَهُمَا فَلَا، وَلَكِنْ وَسَطًا بَيْنَ ذَلِكَ“ (اس طرح کہ دونوں قدم مس ہو جائیں، ایسا نہیں لیکن درمیانی صورت ہو)۔ (مصنف عبدالرزاق: ۲/۲۶۴)

حاصل یہ ہے کہ ان روایات میں قدموں کو زیادہ ملانے اور زیادہ کشادہ رکھنے کو خلاف سنت کہا گیا ہے، لہذا معتدل طریقہ اختیار کرنا چاہئے، اور یہ بات چونکہ عموماً چار انگل سے یکم و بیش سے حاصل ہو جاتی ہے، اس لیے اس کا ذکر فقہاء نے کیا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے فقہاء کرام نے غسل کے تین فرائض بیان کئے ہیں، ایک کلی کرنا، دوسرے ناک میں پانی ڈالنا، اور تیسرے سارے بدن پر پانی بہانا، حالانکہ یہ تعبیر نہ قرآن میں آئی ہے اور نہ حدیث میں، مگر اس کے باوجود اس کو بے دلیل نہیں کہہ سکتے؛ کیونکہ یہ دراصل قرآن میں بیان کردہ حکم: ”وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا“ [المائدة: ۶] کی ایک دوسری تعبیر ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ غسل میں خوب اچھی طرح پاک ہو جاؤ، اور یہ پاکی اس طرح ہوگی کہ جہاں تک بدن میں پانی پہنچایا جاسکتا ہے وہاں تک پانی پہنچاؤ، لہذا فقہاء نے اندازہ لگایا اور فرمایا کہ تین فرض ہیں اور بعض نے بعض اعضاء کو الگ الگ شمار کیا اور فرائض کی تعداد اس سے زیادہ بتائی، یہ سب دراصل اسی حکم خداوندی کی مختلف تعبیرات ہیں، ان کو بے دلیل نہیں کہا جاسکتا۔

اسی طرح زیر بحث مسئلہ میں فقہاء کا یہ کہنا کہ چار انگل کا فاصلہ ہونا چاہئے، حدیث ہی کی ایک آسان و نئی تعبیر ہے اس کو بے دلیل کہنا، اسلوب بیان سے ناواقفیت ہے۔

اس سے بخوبی واضح ہو گیا کہ یہ بات بطریق عقل بھی اور بطریق نقل بھی ثابت ہے: بطریق نقل تو ابھی مذکور ہوا، رہا بطریق عقل تو اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ اس طرح بلا تکلف کھڑے ہونے میں خشوع و خضوع جو کہ مقصود اعظم ہے، حاصل ہوتا ہے۔ اس کے خلاف کرنے میں خشوع و خضوع میں خلل ہوتا ہے، لہذا اس نظریہ عقلی سے بھی اس کی تائید ہوگئی اور ساتھ ہی مؤلف کا بے بنیاد دعویٰ باطل ہو گیا۔ واللہ اعلم و علمہ اتم۔

تکبیر تحریمہ

تکبیر تحریمہ بالاتفاق سب کے نزدیک فرض ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی، البتہ لفظ ”اللہ اکبر“ کہنا ہی ضروری ہے یا اللہ تعالیٰ کے دوسرے ناموں سے بھی نماز شروع کی جاسکتی ہے؟ اس میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے، ائمہ ثلاثہ (امام شافعی و امام مالک و امام احمد رحمہم اللہ) کے نزدیک تو لفظ ”اللہ اکبر“ کہنا ہی ضروری ہے، اس کے بغیر نماز شروع ہی نہ ہوگی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر اس لفظ کے علاوہ کسی اور لفظ سے جو اللہ کی تعظیم پر دلالت کرے، نماز شروع کی جائے تو نماز شروع ہو جائے گی، لیکن خلاف سنت ہونے کی وجہ سے مکروہ ہوگی۔

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس اختلاف کی طرف اشارہ کرنے کے بعد احناف کے مذہب کو بے سند و بے بنیاد قرار دیا ہے۔ (حدیث نماز: ۵۹)

مگر یہ انصاف اور حق شناسی سے بعید اور خود ایک بے بنیاد دعویٰ ہے؛ کیونکہ مؤلف نے جو دلائل بیان کئے ہیں، وہ اپنے مدعی پر دلالت نہیں کرتے جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ اصل مسئلہ کی نوعیت ہی نہ سمجھ سکے، ورنہ یہ بے بنیاد دعویٰ نہ کرتے، اور ایسا ان کو دوسرے مواقع پر بھی ہوا ہے کہ مسئلہ کی نوعیت سمجھے بغیر ہی، مذہبِ احناف پر بے سند و بنیاد ہونے کا الزام لگا دیا۔ اس لئے ہم اول مسئلہ کی نوعیت بتائیں گے، پھر اس کی دلیل بیان کریں گے، جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مؤلف کو یہاں خلطِ مبحث ہوا ہے یا پھر یہ عناد اور بے انصافی کا نتیجہ ہے۔ واللہ یقول الحق ویہدی الی طریق مستقیم۔

حنفیہ کا مسلک اور ان کی دلیل

مسئلہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ و امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کے کسی بھی نام سے جو تعظیم پر دلالت کرتا ہو، نماز شروع کی جاسکتی ہے، اگرچہ ”اللہ اکبر“ کے سوا کسی اور اللہ کے نام سے نماز کا شروع کرنا سنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔

اس پر آپ کا استدلال قرآن پاک کی آیت سے ہے:

﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى﴾ (الاعلیٰ: ۱۵)

(یعنی) کامیاب ہوا (وہ شخص جس نے اللہ کا نام لیا اور نماز پڑھی)

اس آیت میں باتفاق مفسرین تفسیر تحریمہ کا ذکر ہے اور یہاں ”ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ“ (اللہ کا نام لیا) سے اس کو تعبیر کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ کوئی بھی اللہ کا نام لیا جائے اس سے نماز شروع ہو جاتی ہے۔

ملا علی قاریؒ ”شرح نقایہ“ میں فرماتے ہیں:

”فَالْتَكْبِيرُ يُجُوزُ بِلَفْظِ ”اللَّهُ أَكْبَرُ“ وَبِكُلِّ مَا دَلَّ عَلَى تَعْظِيمِهِ تَعَالَى لِقَوْلِهِ تَعَالَى: وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى، فَإِنَّهُ بِإِطْلَاقِهِ يَدُلُّ عَلَى جَوَازِ الشُّرُوعِ فِي الصَّلَاةِ بِكُلِّ ذِكْرٍ عَلَى سَبِيلِ التَّعْظِيمِ لِكُلِّ ”اللَّهُ أَجَلُّ، وَالرَّحْمَنُ أَكْبَرُ، وَاللَّهُ أَعْظَمُ إِلَى

آخِرہ۔“ (شرح النقایۃ: ۲۹/۱)

(پس تکبیر جائز ہے ”اللہ اکبر“ کے لفظ سے اور ہر اس سے جو اللہ کی تعظیم پر دلالت کرے، جس کی دلیل ”و ذکر اسم ربہ فصلی“ ہے؛ کیونکہ یہ اپنے اطلاق کی وجہ سے دلالت کرتا ہے نماز کے ہر اس ذکر سے شروع کے جواز پر جو تعظیم پر دلالت کرتا ہے، جیسے اللہ أجل، الرحمن أكبر، اللہ أعظم)

دوسری دلیل امام ابوحنیفہ کی یہ ہے کہ تکبیر کے معنی تعظیم ہی کے ہیں۔ چنانچہ ”تفسیر خازن“ میں آیت ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ (مذثر: ۳) (اپنے رب کی بڑائی بیان کیجئے) کی تفسیر ان الفاظ سے کی ہے ”وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ أَيْ عَظَّمَ رَبَّكَ عَمَّا يَقُولُهُ عَبْدُهُ الْأَوْثَانُ“۔ (اپنے رب کی ان چیزوں سے جو مشرکین کہتے ہیں بڑائی بیان کیجئے) (تفسیر خازن: ۳۲۶/۴)

اسی طرح ”تفسیر کبیر“ میں امام رازی نے علامہ کلبی سے نقل کیا ہے: ”قَالَ الْكَلْبِيُّ: عَظَّمَ رَبَّكَ عَمَّا يَقُولُهُ عَبْدُهُ الْأَوْثَانُ“۔ (تفسیر کبیر: ۱۹۰/۳۰) اس لئے آپ نے فرمایا کہ اللہ کی تعظیم پر دلالت کرنے والے کسی بھی نام سے نماز شروع کی جاسکتی ہے؛ کیونکہ اللہ نے تعظیم کا ہی مطالبہ کیا ہے۔

لہذا کوئی شخص لفظ ”اللہ أكبر“ نہ کہے، بلکہ کسی اور لفظ جیسے ”اللہ أجل“ یا ”الرحمن أكبر“ وغیرہ کہے تو نماز شروع ہو جائے گی۔ لیکن خود احناف کے یہاں بھی اس سے نماز میں کراہیت آجاتی ہے؛ کیونکہ لفظ ”اللہ اکبر“ سے تکبیر باندھنا ان کے نزدیک بھی واجب ہے، اسی لیے احناف کے یہاں عمل ”اللہ اکبر“ کہنے ہی پر ہے اور دوسرے الفاظ استعمال نہیں کرتے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں:

”وَلَفْظَةُ ”اللَّهُ أَكْبَرُ“ تَبَيَّنَتْ بِالْخَبْرِ، فَيَجِبُ الْعَمَلُ حَتَّى يُكْرَهُ الْإِفْتِتَاحُ بِغَيْرِهِ لِمَنْ يُحْسِنُهُ“۔ (اور لفظ ”اللہ اکبر“ حدیث سے ثابت ہوا ہے، پس اس پر عمل کرنا واجب ہے، حتیٰ کہ دوسرے الفاظ سے شروع کرنا اس شخص کے لیے جو اس کو صحیح ادا کر سکتا ہو، مکروہ ہے)

علامہ شیخ ابراہیم الحلی ”غنیۃ المستملی“ میں لکھتے ہیں:

”وَذَلِكَ لِأَنَّ التَّكْبِيرَ الْمَذْكُورَ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى ”وَرَبَّكَ فَكَبِّرُ“ وَقَوْلِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ ”وَتَحْرِيْمَهَا التَّكْبِيرُ“ وَحَيْثَمَا ذُكِرَ مِنَ الْمَنْصُوصِ مَعْنَاهُ التَّعْظِيمُ، فَكَانَ مِنَ الْمَطْلُوبِ بِالنَّصِّ التَّعْظِيمُ، وَيُؤَيِّدُهُ قَوْلُهُ تَعَالَى ”وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى“ وَهُوَ أَعْمٌ مِنْ لَفْظَةِ ”اللَّهُ أَكْبَرُ“ وَغَيْرِهِ وَلَا إِجْمَالَ فِيهِ، فَالْتَّابِتُ بِالْفِعْلِ الْمُتَوَارِثِ حِينَئِذٍ يُفِيدُ الْوُجُوبَ لِالْفَرْضِيَّةِ وَبِهِ نَقُولُ حَتَّى يُكْرَهُ لِمَنْ يُحْسِنُهُ تَرْكُهُ“ (غنیۃ المستملی: ۲۲۶)

(یہ اس لئے کہ اللہ کے قول ”وَرَبَّكَ فَكَبِّرُ“ اور حدیث: ”وَتَحْرِيْمَهَا التَّكْبِيرُ“ میں اور جہاں بھی تکبیر کا ذکر کیا گیا ہے اس کے معنی تعظیم کے ہیں، لہذا نص سے تعظیم ہی مطلوب ہوگی، اور اس کی تائید اللہ کے اس قول ”وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى“ سے بھی ہوتی ہے، اور یہ ”اللَّهُ أَكْبَرُ“ وغیرہ الفاظ سے عام ہے، اور اس میں کوئی اجمال نہیں ہے، پس متواتر عمل سے جو ثابت ہے وہ وجوب کا فائدہ دے گا، نہ کہ فرضیت کا، اور ہم اسی کے قائل ہیں، حتیٰ کہ جو لفظ ”اللَّهُ أَكْبَرُ“ کو ٹھیک ادا کرنے کی صلاحیت کے باوجود اس کو ترک کر دے تو یہ مکروہ ہے)

حضرت علامہ مفتی مہدی حسن صاحب ”قلائد الازہار شرح کتاب الآثار“ میں

فرماتے ہیں:

”امام مالک اول (یعنی اللّٰهُ اَكْبَرُ) کو متعین کرتے ہیں؛ کیونکہ یہی متواتر ہے۔ اس کا (احناف کی جانب سے) جواب دیا گیا کہ توارث تو مفید سنیت یا وجوب ہوتا ہے اور ہم اسی کے قائل ہیں؛ کیونکہ اصح قول کی بنا پر بغیر ”اللّٰهُ اَكْبَرُ“ کہے نماز کی افتتاح کرنا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔ جیسا کہ ”تحفہ“ ”ذخیرہ“ اور ”نہایہ“ وغیرہ میں ہے، اور پوری بحث ”حلیہ“ میں ہے۔ یہ مسئلہ اس قول پر مبنی ہے کہ اگر دوسرے الفاظ سے افتتاح کرے تو واجب حاصل نہ ہوگا، اسی کو علامہ شامیؒ نے کہا ہے، اور حدیث (تَحْرِيمُهَا التَّكْبِيرُ وَتَحْلِيلُهَا التَّسْلِيمُ) میں یہی مذکور ہے۔ اس سے ان مخالفین کا زعم ختم ہو گیا جو کہتے ہیں کہ احناف نصوص کی مخالفت کرتے ہیں۔ (فلاندا لا زہار شرح کتاب الآثار: ۱۹۸/۱)

اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ حنفیہ کے نزدیک بھی سنت کے مطابق لفظ ”اللّٰهُ اَكْبَرُ“ ہی سے نماز کو شروع کرنا چاہئے، اور کسی اور لفظ سے شروع کرنا خلاف سنت ہونے کی بنا پر ناجائز ہے، البتہ کوئی دیگر الفاظ تعظیم سے نماز کی ابتداء کریگا تو اس کی نماز شروع تو ہو جائے گی مگر مکروہ ہوگی۔

لفظ ”اللّٰهُ اَكْبَرُ“ فرض یا واجب؟

اس بحث سے معلوم ہو گیا کہ احناف خاص لفظ ”اللّٰهُ اَكْبَرُ“ کو فرض و رکن نہیں مانتے، لیکن واجب کہتے ہیں؛ کیونکہ فرضیت کے ثبوت کے لیے دلیل قطعی کی ضرورت ہوتی ہے، جو ثبوتاً و دلالتاً دونوں طرح قطعی ہو اور ایسی دلیل لفظ ”اللّٰهُ اَكْبَرُ“ کے فرض ہونے کی موجود نہیں ہے؛ کیونکہ اس سلسلہ میں جو احادیث ہیں وہ اخبار آحاد کہلاتی ہیں، اور وہ تمام علماء کے نزدیک ظنی ہیں، نہ کہ قطعی، اس لئے ان احادیث سے لفظ ”اللّٰهُ اَكْبَرُ“ کا کہنا واجب ہوا، فرض نہیں۔

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس موقع پر ”ترمذی“ کے حوالے سے محدثین کی طرف منسوب کرتے ہوئے یہ بات لکھی ہے کہ:

”اگر کوئی اللہ کے ننانوے ناموں میں سے کسی نام سے نماز شروع کرے اور ”اللَّهُ أَكْبَرُ“ نہ کہے تو یہ نماز کے لئے کافی نہ ہوگا۔“ (حدیثِ

نماز: ۵۸)

راقم کہتا ہے کہ اس قول کو تمام محدثین کی جانب منسوب کرنا غلط ہے؛ کیونکہ امام ترمذی نے یہ عبدالرحمن بن مہدی کا قول اپنی سند سے ذکر کیا ہے، اور عبدالرحمن بن مہدی کا یہ قول امام ابوحنیفہ پر حجت نہیں ہو سکتا، جبکہ امام صاحب نے قرآن سے دلیل دی ہے۔ پھر حیرت ہے کہ اہل حدیث ہو کر مؤلف نے ان محدثین کی بات کو بلا دلیل کیسے مان لیا؟ اس کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ ”اللَّهُ أَكْبَرُ“ کے سوا کسی اور اللہ کے نام سے نماز نہیں ہو سکتی، قرآن کہتا ہے کہ نماز ہو جاتی ہے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں ہوتی۔ فیاللجب!

❖ تکبیر تحریمہ میں ہاتھ کہاں تک اٹھائیں؟ ❖

تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے پر سب ائمہ کا اتفاق ہے، البتہ کہاں تک اٹھائیں، اس میں اختلاف ہے؛ کیونکہ روایات اس سلسلہ میں متعارض ہیں۔ بعض حضرات نے کندھوں تک اٹھانے کی روایات کو لیا اور بعض نے کانوں تک کو اختیار کیا۔ اور بعض نے تعارض کی وجہ سے اختیار دے دیا کہ جہاں تک چاہے اٹھا سکتے ہو۔ لیکن یہ اختلاف کوئی بڑا اختلاف نہیں، بلکہ صرف افضل و مفضول کا اختلاف ہے۔

مؤلف ”حدیث نماز“ نے بھی اس مسئلہ میں اپنے مسلک کو بیان کرنے کے بعد

کہ کندھوں تک ہاتھ اٹھانا چاہئے، یہ کہا کہ:
 ”اس سلسلہ میں کانوں تک ہاتھ اٹھانے کی بھی روایت آئی ہے،
 اور پھر کہا کہ کندھوں تک ہاتھ اٹھانا ہی زیادہ مضبوط ہے۔“ (دیکھئے حدیث
 نماز: ۶۰)

راقم کہتا ہے کہ تعارضِ ادلہ کے وقت ترجیح سے پہلے طریق تطبیق اختیار کیا
 جاتا ہے، اگر تطبیق ممکن نہ ہو تو پھر ترجیح کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، اور یہاں پر جمع
 و تطبیق ممکن ہے لہذا ایک کو ترجیح دے کر دوسری روایات کو نظر انداز کرنا قواعد کے
 خلاف ہے۔ اس لیے طریقِ ترجیح کے بجائے طریقِ تطبیق اختیار کرنا اولیٰ ہے، تاکہ
 دونوں قسم کی روایات پر عمل ہو جائے، چنانچہ اکثر علماء و ائمہ نے اسی لیے طریقِ تطبیق
 اختیار فرمایا ہے، تاکہ تعارض رفع ہو جائے۔

چنانچہ امام شافعیؒ نے کندھوں اور کانوں والی تمام روایات کو اس طرح جمع
 فرمایا کہ ہاتھوں کو اس طرح کندھوں کے مقابل کیا جائے کہ انگلیوں کے پوروے
 کانوں کے اوپر کے حصے کے برابر ہو جائیں اور انگوٹھے کانوں کی لو کے برابر
 ہو جائیں اور ہتھیلیاں کندھوں کے برابر ہیں۔ (شرح مسلم: ۱۶۸/۱)

علامہ خطابیؒ نے فرمایا کہ ہم سے ابو ثور کی جانب سے یہ بات بیان کی گئی کہ
 انہوں نے کہا کہ امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ اس سلسلہ میں حدیثِ راویوں کی وجہ سے
 مختلف ہو گئی کہ نبی کریم ﷺ اپنے ہاتھوں کو ایسا اٹھاتے کہ ہتھیلی کی پشت کندھوں کے
 برابر ہوتی اور انگلیوں کے پوروے کانوں کے مقابل ہوتے اور ہاتھ کا لفظ (ہتھیلی
 اور انگلیاں) دونوں کو جامع و شامل ہے، پس بعض راویوں نے ایک کو بیان کیا، بعض
 نے دوسرے کو بیان کر دیا بغیر تفصیل کے اور دونوں حدیثوں میں کوئی اختلاف

نہیں ہے۔ (امانی الاحبار: ۱۲۲)

علامہ ابوبکر ابن العربی مالکیؒ نے فرمایا کہ جمع، دونوں قسم کی روایات میں یوں ہے کہ انگلیوں کے پوروے کانوں کے برابر ہوں اور ہتھیلیاں کندھوں کے برابر ہوں۔ (امانی الاحبار: ۱۲۳)

حضرت مولانا یوسف صاحب کاندھلویؒ ”امانی الاحبار شرح شرح معانی الآثار“ میں فرماتے ہیں کہ اس جمع کی صورت کو بہت سے مالکیہ جیسے علامہ باجیؒ اور ابن العربیؒ اور قاضی عیاضؒ نے بیان کیا ہے..... پس ہمارے بیان سے معلوم ہوا کہ کانوں تک محاذات (یعنی ہاتھوں کا برابر کرنا) بہت سے شافعیہ اور مالکیہ کا مذہب ہے اور اختلاف گویا لفظی ہے۔ (امانی الاحبار: ۸۳)

کانوں تک ہاتھ اٹھانے کی روایات کی ترجیح

راقم کہتا ہے کہ نچند وجوہ کانوں تک رفع یدین کی روایات راجح معلوم ہوتی ہیں:

(۱) کانوں تک رفع یدین کی روایات محکم ہیں اور کندھوں والی روایات مؤول ہیں؛ کیونکہ اس میں احتمال ہے کہ راوی نے انگلیوں کا اعتبار نہ کر کے ہتھیلی کو مطلق ”ید“ سے تعبیر کر دیا ہو، برخلاف ان روایات کے جن میں کانوں تک کا رفع مروی ہے، کہ یہاں بات پوری ہو جاتی ہے، اور امام شافعیؒ نے جو راویوں کی وجہ سے اختلاف حدیث بیان فرمایا اس کا حاصل بھی یہی ہے۔ لہذا محکم کو مؤول پر ترجیح ہوگی۔

(۲) کانوں کی روایات پر عمل کرنے سے دونوں قسم کی روایات جمع ہو جاتی ہیں اور چونکہ جمع، ترجیح سے افضل ہے، اس لیے جمع کی صورت اختیار کرنا بہتر اور راجح ہے۔

(۳) کندھوں تک ہاتھ اٹھانے کی روایات میں اجمال ہے؛ کیونکہ اس میں کندھوں تک ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے اور ہاتھ تو تھیلی کو بھی کہتے ہیں اور ”ذراعین“ کو بھی اور انگلیوں کو بھی۔ لہذا اس میں کون سا حصہ کندھوں تک اٹھاتے تھے، یہ مذکور نہیں۔ اس لیے روایت مجمل ہوئی اور مجمل کے لیے بیان کی ضرورت ہے۔

چنانچہ اس کا بیان حضرت وائل بن حجر کی ایک روایت سے ہوتا ہے، جس میں صاف بیان ہے کہ: ”رَفَعَ يَدَيْهِ حَتَّى كَانَتْ حِيَالَ مَنْكَبَيْهِ وَحَاذِي بَابِهَامِيهِ اُذْنَيْهِ“ (آپ ﷺ نے کندھوں کے مقابل اپنے ہاتھ اٹھائے اور آپ کے انگوٹھے کانوں کے برابر تھے)۔ (ابوداؤد: ۱۰۵/۱)

پس یہ روایت مفصل ہوئی اور مفصل و مبین روایت کو مجمل و غیر مبین روایت پر ترجیح دی جائے گی، لہذا کانوں والی روایات قابل ترجیح ہوں گی۔

(۴) کانوں تک ہاتھ اٹھانے کی روایت کی تائید حضرت وائلؓ ہی کی ایک مرفوع قولی حدیث سے ہوتی ہے، جس کو طبرانی نے حضرت وائل کے مناقب میں بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: جب تو نماز پڑھے تو اپنے کانوں تک ہاتھ اٹھائے اور عورت اپنے پستان تک اٹھائے الخ۔ علامہ پیشویؒ نے فرمایا کہ: اس کے سب رجال ثقہ ہیں، سوائے میمونہ کے جس کو میں نہیں جانتا۔ (امانی الاحبار: ۸/۳)

راقم کہتا ہے کہ یہ روایت چونکہ محض تائید کے درجہ میں لائی گئی ہے۔ اس لیے میمونہ کے غیر معروف ہونے سے، خصوصاً جب کہ بقیہ رجال ثقہ ہیں، مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا؛ کیونکہ متابعات و شواہدات میں ضعفاء کی روایات بھی داخل ہو جاتی ہیں، جیسا کہ اصول حدیث کے طلبہ جانتے ہیں۔ (دیکھو: فتح المغیث: ۲۲۹/۱، مقدمہ شرح مسلم: ۱۸) مچھول کی روایت تو بدرجہ اولیٰ داخل ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم

اس سے معلوم ہوا کہ کانوں تک ہاتھ اٹھانے کی روایت کو فوقیت حاصل ہے، جو دوسری روایات کو نہیں۔ اس لیے بہت سے شوافع اور مالکیہ بھی اس کے قائل ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری روایات پر عمل کرنا بھی اپنی جگہ درست ہے، مگر اس کو مضبوط قرار دینا بعید ہے؛ کیونکہ محض سند کے قوی ہونے سے ہر جگہ یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے مستفاد ہونے والا حکم بھی قوی ہو، بعض اوقات اسناد کے قوی ہونے کے باوجود اس سے مستفاد حکم قوی نہیں ہوتا۔

مثلاً امام ترمذی نے فرمایا کہ میں نے اپنی کتاب میں جتنی حدیثیں بیان کی ہیں، وہ سب کی سب معمول بہا ہیں، سوائے دو حدیثوں کے: (۱) ابن عباس کی حدیث ”جمع بین الصلوٰتین بغیر عذر“۔ (۲) شربِ خمر کے متعلق چوتھی بار اعادہ پر قتل کے حکم والی حدیث۔ (کتاب العلیل، ترمذی: ۲/۲۳۳)

حضرت شیخ الہند نے فرمایا: یہ دونوں اجماعاً متروک ہیں، باوجود ان کی سند کے قوی اور صحیح ہونے کے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحیح و قوی حدیث کبھی کسی وجہ سے ترک کر دی جاتی ہے۔ (تقریر ترمذی: ۱۰)

حاصل یہ کہ کندھوں کی روایات کی اسناد کا قوی ہونا اگرچہ مسلم ہے؛ کیونکہ متفق علیہ روایات ہیں، مگر حکم مستفاد کا بھی قوی ہونا مسلم نہیں ہے، جب کہ قرآنِ خارجیہ اس کے خلاف ہیں، جیسا کہ اوپر مذکور ہوئے۔

ایک عرض

اس ہماری تقریر و تشریح سے مقصود یہ بتلانا ہے کہ احناف نے جو عمل اختیار کیا ہے، یہ محض آنکھ بند کر کے اختیار نہیں کر لیا ہے، بلکہ وجوہ تریح موجود ہیں، جن کو مبنی قرار دے کر اس کو اختیار کیا ہے۔ اب دوسرے لوگ اور روایات پر عمل کرتے ہیں،

تو اس سے تعرض مقصود نہیں؛ کیونکہ اس کے ثبوت سے ہمیں کوئی انکار نہیں۔ واللہ اعلم

تکبیر تحریمہ کے وقت کانوں کو چھونا

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس بحث کے دوران، کانوں کی لوچھونے کا ذکر کر کے اس کو بے سند اور بے اصل قرار دیا ہے، اور اس پر ”عمدة الرعایة“ سے مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کی عبارت نقل کی ہے، کہ کانوں کی لوچھونا کوئی مستقل سنت نہیں ہے؛ کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ (دیکھئے حدیث نماز: ۶۰)

راقم کہتا ہے کہ کانوں کی لوچھونے کا ذکر بہت سی کتب فقہ میں موجود ہے۔ مثلاً ”تنویر متن در مختار“، ”مراتی“، ”شرح وقایہ“، ”نقایہ“ وغیرہ، اور پھر ”تنویر“ کی تقریر ”در مختار“ میں، ”در مختار“ کی تقریر، علامہ شامی نے ”ردالمحتار“ میں اور ”نقایہ“ کی تقریر، ملا علی قاری نے ”شرح نقایہ“ میں فرمائی ہے۔

احادیث میں اس سلسلہ میں جو روایات وارد ہیں، ان میں مختلف قسم کے الفاظ آئے ہیں، بعض میں ”حذو“ کا لفظ ہے اور بعض میں ”محاذاة“ کا لفظ ہے، بعض میں ”مساواة“ کا ذکر ہے، اور بعض میں ”حیال اذنیہ“ آیا ہے، اور بعض میں ”حتی بلغ اذنیہ“ وارد ہوا ہے، مگر تقریباً سب کے معنی ایک ہیں، ایک دوسرے میں کوئی منافات نہیں ہے۔

محاذات کے معنی

احادیث میں زیادہ تر محاذات کا لفظ وارد ہوا ہے، جو صحیحین، مسند احمد، بیہقی، ابوداؤد، نسائی وغیرہ میں ہے۔ اور محاذات کے معنی ہیں کسی چیز کا دوسرے کے مقابل ہونا، خواہ درمیان میں فاصلہ ہو، یا نہ ہو۔ اور پھر اس فاصلے میں بھی بے حد تفاوت

ہوسکتا ہے، اور ہر درجہ محاذات ہی کا ہوگا۔ اور اگر درمیان میں کوئی فاصلہ ہی نہ ہو، اور دونوں چیزیں مل گئیں، اور دونوں کا مس ہو گیا، تو وہ بھی محاذات ہی ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ محاذات میں مس کی بھی قید نہیں، عدم مس کی قید بھی نہیں ہے، بلکہ مس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں صورتیں، محاذات میں داخل ہیں، جبکہ دونوں چیزیں آپس میں بالمقابل ہوں۔

جب یہ معلوم ہو گیا تو اب غور فرمائیے کہ احناف کی کتابوں میں ”محاذاتہ اذنین“ کے ساتھ مس کی قید لگا دی جائے، تو اس کو بے اصل ہرگز بھی نہیں کہا جاسکتا؛ کیونکہ محاذات، مس کے خلاف نہیں، اور نہ مس، محاذات کے خلاف ہے۔ بلکہ مس بھی محاذات ہی کی ایک فرد ہے بلکہ محاذات کی اعلیٰ فرد ہے؛ کیونکہ مس کے ساتھ محاذات بالکل تام ہو جاتی ہے۔

اسی کو ”در مختار“ میں بیان کیا ہے کہ محاذات سے یہی مراد ہے؛ کیونکہ اس سے محاذات کا تین ہو جاتا ہے۔ (در مختار: ۲۰۴۱)

اور حضرت مفتی مہدی حسن صاحب نے ”فلاند الازہار“ میں فرمایا کہ بعض کتب میں جو مس کا ذکر ہے یہ اس لیے کہ اس سے محاذات کا تحقق بالیقین ہو جاتا ہے۔ (فلاند الازہار: ۲۰۴۱)

راقم کہتا ہے کہ مس کی اس سے بھی صریح دلیل وہ روایت ہے، جس میں یہ الفاظ آئے ہیں ”يُرْفَعُ يَدَيْهِ إِلَىٰ اُذُنَيْهِ“ (آپ کانوں تک ہاتھ اٹھاتے) (رواہ الدر قطنی من طریق جریر بن عاصم بن کلیب۔ أمانی الأخبار: ۹۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”حذاء“ اور ”حیال“ ہی کی تفسیر بعض راویوں نے ”إلى أذنيه“ سے کی ہے؛ کیونکہ ”حذاء“ اور ”محاذاتہ“ میں، جیسا کہ

اوپر مذکور ہوا، دونوں صورتیں داخل ہیں، مع مس بھی، بغیر مس بھی۔ تو اس روایت سے تعین ہوگئی کہ ”مع مس“ یہ ”محاذاة“ تھی (اگرچہ کبھی کبھی ہی ہو) کیونکہ لفظ ”إلی“ اقتران و مس پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ اس کی مثال قرآن میں موجود ہے۔ ﴿فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ﴾ [المائدہ : ۶] (دھو اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک)۔

جمہور کے مسلک پر تو بالکل ظاہر ہے کہ ہاتھوں کا کہنیوں کے ساتھ دھونا ضروری ہے، جس سے مس کے ساتھ پوری کہنی بھی مغیا میں داخل ہے۔ اور بعض دیگر ائمہ کے مسلک پر بھی جو کہنیاں دھونے کے قائل نہیں، مس کا ضروری ہونا ظاہر ہے؛ کیونکہ کہنیوں تک مس ہونا ضروری ہے، ورنہ کچھ حصہ ہاتھ کا سوکھا رہ جائے گا، جس سے وضو نہ ہوگا۔

دوسری مثال یہ آیت ہے ﴿اتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ﴾ [البقرة: ۱۸۷] (روزوں کو پورا کرو رات تک) اور ظاہر ہے کہ جب تک رات نہ آجائے یعنی غروب نہ ہو جائے، روزہ کھولنا جائز نہیں۔ معلوم ہوا کہ دن جا کر رات کو مس کرے تو روزہ افطار کر سکتے ہیں، یہ ”إلی“ کے مس پر دلالت کرنے کی صریح دلیل ہے۔

اس تحریر کے بعد ”مسند ابوداؤد الطیالسی“ میں اس سے بھی صریح حدیث اس سلسلہ میں مل گئی، والحمد لله على ذلك، اور وہ یہ ہے کہ حضرت وائل بن حجرؓ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، آپ نے نماز کا افتتاح کیا، ”فَكَبَّرَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ حَتَّى بَلَغَ أُذُنَيْهِ“ (پس آپ نے تکبیر کہی اور ہاتھ

اُٹھائے یہاں تک کہ کانوں تک پہنچ گئے) (مسند طرابلسی: ۱/۱۳۷)

اس میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ آپ اپنے ہاتھ کانوں تک لے گئے، کیا اب بھی مس کے خلاف سنت نہ ہونے میں کوئی اشکال ہے؟

اب رہی یہ بات کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”عمدة الرعاية“ سے علامہ عبدالحی کی عبارت نقل کی ہے کہ کانوں کو چھونا مستقل سنت نہیں اور اس پر کوئی دلیل نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے صرف یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی مستقل سنت نہیں ہے، غالب یہ ہے کہ اس کے سنت موکدہ ہونے کی نفی فرما رہے ہیں اور اس کو کوئی بھی سنت موکدہ نہیں کہتا۔ احناف صرف مستحب بتلاتے ہیں، اور خود مولانا عبدالحی صاحب نے مستحب کہنے کی وجہ بھی اس عبارت کے بعد بیان کی ہے کہ ”شاید تحقیق محاذات کے لیے ایسا کہا ہو“ اور بات بھی وہی ہے جیسا کہ دیگر فقہاء نے لکھا ہے۔ اب رہی دلیل تو الحمد للہ ہم نے اوپر اس کا ذکر کر دیا ہے، اور علامہ عبدالحی کا اس کو ناجائز، جاننے والوں پر کیسے حجت ہو جائے گا؟۔ ہذا ما عندی والعلم عند اللہ۔

❖ قیام میں ہاتھ کہاں باندھیں؟ ❖

نماز میں قیام کی حالت میں داہنا ہاتھ، بائیں ہاتھ پر باندھنا جمہور علماء وائمہ کے نزدیک سنت ہے، صرف امام مالکؒ یہ کہتے ہیں کہ باندھنے کے بجائے ہاتھوں کا چھوڑ دینا سنت ہے۔ اور جو حضرات ہاتھ باندھنے کے قائل ہیں ان میں اختلاف ہے کہ ہاتھ سینے پر باندھے جائیں یا ناف کے نیچے؟ یہ مسئلہ بڑا معرکہ الآراء مسئلہ ہے، اور دونوں طرف علماء وائمہ ہیں اور اس مسئلہ پر طرفین کی جانب سے مستقل رسالے اور کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، اور احادیث میں غور کرنے سے معاملہ بڑا اہون اور وسیع معلوم ہوتا ہے۔ لہذا ایسے مسائل کو لے کر اختلاف کی خلیج قائم کرنا اور بے

بنیاد دعاوی اور مبالغہ سے کام لے کر دوسرے کو غلط ٹھہرانا، جاہلانہ طریقہ ہے۔ اس لیے ہم یہاں پر بطور تمہید اولاً کچھ باتیں گوش گزار کرنے کے بعد مسئلہ کی تنقیح کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز

ائمہ کے مذاہب

امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ، سفیان ثوریؒ، اسحاق بن راہویہؒ، ابو اسحاق مروزی شافعیؒ، ابو جکیز، ابراہیم نخعیؒ وغیرہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کے قائل ہیں، اور یہی حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے، اور امام شافعیؒ، ایک روایت میں امام احمدؒ، اور سعید بن جبیرؒ سینے کے نیچے، ناف سے اوپر ہاتھ باندھنے کے قائل ہیں۔ (المغنی: ۳۳۴/۱، شرح المہذب: ۲۶۹/۳)

خلاصہ یہ کہ ائمہ میں سے بعض ارسال (ہاتھ چھوڑ دینے) کے قائل ہیں، بعض ناف کے اوپر اور بعض ناف کے نیچے باندھنے کے قائل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ سینہ پر ہاتھ باندھنا ائمہ میں سے کسی کا مسلک نہیں ہے، جیسا کہ علامہ یوسف بنوری نے علامہ ابوالطیب مدنی سے نقل کیا ہے اور علامہ انور شاہ کشمیری و مولانا نظام الدین کیرانوی نے تصریح کی ہے۔ (معارف السنن: ۴۳۶/۲، فیض الباری: ۲۶۶/۲، تنقیح الضروری حاشیہ قدوری: ص ۲۵)

ہاں امام شافعیؒ سے ایک روایت ”حاوی“ میں ”فوق الصدر“ (سینہ پر ہاتھ باندھنے) کی بھی ہے، اسی کو صاحب ”ہدایہ“ نے ذکر کیا ہے۔ (فیض الباری: ۲۶۶/۲) حاصل یہ کہ سینہ پر ہاتھ باندھنا، ائمہ اربعہ میں سے کسی کا مذہب نہیں اگرچہ امام شافعی سے ایک روایت ہے۔ مگر غیر مقلدین کا اسی پر عمل ہے، اور طرفہ تماشایہ کہ اسی کو حق و سچ بھی سمجھتے ہیں، اور دیگر تمام مسالک کو غلط قرار دیتے ہیں۔ مؤلف

”حدیث نماز“ نے بھی اس مسئلہ پر کلام کیا ہے، اور حسب عادت اس میں بھی راہ اعتدال سے باہر ہو گئے ہیں، لہذا ہم اس کا جائزہ لیں گے جس سے ان شاء اللہ ناظرین کرام پر حق و صواب کی راہ آشکارا ہو جائے گی۔

سینہ پر ہاتھ باندھنے کی روایات کی تحقیق

مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”علی الصدر“ (سینے پر) ہاتھ باندھنے کی یہاں جا روایات پیش کی ہیں۔ ہم یہاں پر بالترتیب ان روایات پر کلام کرتے ہیں اور تحقیق و تنقیح کے ساتھ ان روایات کی صحت و عدم صحت کو واضح کرتے ہیں، جس سے مؤلف ”حدیث نماز“ کے دلائل کی حقیقت سامنے آجائے گی۔

پہلی حدیث

﴿عَنْ قَبِيصَةَ بِنِ حَلْبٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَنْصَرِفُ عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ يَسَارِهِ، وَرَأَيْتُهُ يَضَعُ يَدَهُ عَلَى صَدْرِهِ الْخِ﴾
 (قبیصہ بن حلب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے والد نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو (نماز کے بعد) دائیں بائیں پھرتے ہوئے دیکھا (اور نماز میں) سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے دیکھا)

یہ حدیث ”مسند احمد“ کی ہے، اور اس سے غیر مقلد لوگ استدلال کرتے ہیں کہ نماز میں ہاتھ سینہ پر باندھنا ہی سنت ہے، جیسا کہ مولانا عبدالمعین جو ناگرہی نے کہا ہے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ اولاً تو یہ حدیث صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ اس کے ایک راوی سماک بن حرب کے بارے میں ائمہ حدیث نے کلام کیا ہے، ایک جماعت علماء نے

ان کی توثیق کی ہے اور بہت سے محدثین نے ان کو ”لین“ (کمزور) وضعیف قرار دیا ہے۔ امام شعبہ، امام ابن المبارک، امام صالح جزرة، امام ابن خراش وغیرہ نے ان کو وضعیف قرار دیا ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۲۰۴/۴)

پہلے یہ بات کئی مرتبہ ہم بتلا چکے ہیں کہ راوی مختلف فیہ کی حدیث، حسن ہوتی ہے۔ اس لیے ہمارے علماء نے اس کو حسن قرار دیا ہے، جیسے علامہ شوق نیوی نے اس کو حسن کہا ہے۔ (التعلیق الحسن علی آثار السنن: ۶۸۱) مگر اس کے متن میں کلام ہے: کیونکہ سماک بن حرب کی ”علی صدرہ“ کے اضافہ کے ساتھ یہ روایت غیر محفوظ ہے، کیونکہ:

(۱) اس روایت کو خود امام احمد نے ”بطریق و کعب عن سفیان عن سماک عن قبیصة عن أبیہ“ روایت کیا ہے۔
(۲) اور دارقطنی نے بھی وکیع سے اور عبدالرحمن بن مہدی سے بسند مذکور روایت کیا ہے، جس میں صرف یہ الفاظ ہیں: ”رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَاضِعًا يَمِينَهُ عَلَى شِمَالِهِ فِي الصَّلَاةِ“۔ (یعنی حلب کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھتے ہوئے نماز میں دیکھا) اس میں ”علی صدرہ“ کا اضافہ نہیں ہے۔

(۳) اسی طرح امام ترمذی نے اپنی جامع میں، اور امام ابن ماجہ نے سنن میں اس روایت کو ”بطریق أبی الأحوص عن سماک بن حرب عن قبیصة بن حلب عن أبیہ“ روایت کیا ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں: ”كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُوْنُ مَنَا فَيَأْخُذُ شِمَالَهُ بِيَمِينِهِ“ (یعنی رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھاتے تھے، پس اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو پکڑتے تھے) (جامع الترمذی: ۳۴۰۱، سنن

ابن ماجہ: ۵۹/۱) اس میں بھی ”علی صدرہ“ کا اضافہ نہیں ہے۔

(۴) نیز امام احمد نے ”بطریق شریک عن سماک عن قبیصہ عن أبیہ“ اس کی تخریج کی ہے، جس میں یہ الفاظ ہیں: ”وَيَضَعُ إِحْدَى يَدَيْهِ عَلَى الْأُخْرَى“ (آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر رکھا) اس میں بھی ”علی صدرہ“ نہیں کہا۔ علامہ نیوی اس کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: اس سے معلوم ہوا کہ امام احمد نے ”بطریق یحییٰ عن سفیان“ جو روایت بیان کی ہے، یہ بہت سے اصحاب سفیان و سماک کی روایت کے مخالف ہے، پس یہ محفوظ نہیں ہو سکتی۔ (التعلیق الحسن: ۶۸/۱)

اور علامہ یوسف بنوری فرماتے ہیں کہ سماک بن حرب اس ”اضافہ“ میں متفرد ہیں اور ان کو بہت سے لوگوں نے کمزور کہا ہے اور امام نسائی نے کہا کہ: جب یہ کسی اصل میں تفرّد کریں تو حجت نہیں ہوتے الخ۔ (معارف السنن شرح ترمذی: ۴۴۰/۲)

دوسری حدیث

﴿عَنْ وَائِلِ بْنِ حَجْرٍ قَالَ: حَضَرْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَضَ إِلَى الْمَسْجِدِ، فَدَخَلَ الْمِحْرَابَ، ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ بِالتَّكْبِيرِ ثُمَّ وَضَعَ يَمِينَهُ عَلَى الْيُسْرَى عَلَى صَدْرِهِ﴾ (سنن بیہقی: ۴۶۲)

(حضرت وائل بن حجر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد کی طرف اٹھ کھڑے ہوئے، پھر آپ محراب میں داخل ہوئے، پھر اپنے ہاتھوں کو تکبیر کے ساتھ اٹھایا اور داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر رکھا)

مؤلف اس روایت پر بھی خاموشی سے گزر گئے حالانکہ یہ روایت بہت ہی ضعیف ہے؛ کیوں کہ ایک تو اس میں محمد بن حجر ایک راوی ہے، جس کے بارے میں علماء نے کلام کیا ہے۔ امام بخاری نے کہا: ”فیہ بعض النظر“ اور حافظ ذہبی نے ”میزان الاعتدال“ میں کہا: ”لہ مناکیر“۔ (میزان الاعتدال: ۱۰۴۶، لسان المیزان: ۱۱۹/۵)

اور دوسرے اس روایت میں عبد الجبار اپنی ماں سے روایت کرتے ہیں جو کہ مجہولہ ہیں۔ علامہ ابن الترمذی نے ”الجوہر النقی“ میں کہا کہ میں نہ ان کا حال جانتا ہوں اور نہ نام جانتا ہوں۔ (الجوہر النقی علی سنن البیہقی: ۴۶۲/۲، التعلیق الحسن: ۶۸/۱)

یہ ام عبد الجبار وہی راویہ ہیں جو اوپر ”کانوں تک ہاتھ اٹھانے کے بیان“ میں ایک روایت میں گزر چکی ہیں جو ہم نے استشہاد میں پیش کیا تھا۔ نیز اس کے ایک اور راوی سعید بن عبد الجبار بھی ضعیف ہیں (جو اپنے باپ عبد الجبار سے روایت کر رہے ہیں) امام نسائی نے کہا کہ قوی نہیں ہیں، اور حافظ ابن حجر نے ”تقریب“ میں کہا کہ سعید بن عبد الجبار حضرمی کوئی ضعیف ہیں۔ (میزان الاعتدال: ۲۱۵/۳، تقریب: ۲۳۸)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت نہایت ہی ضعیف ہے، جس میں دو ضعیف راوی اور ایک مجہولہ ہے۔ لہذا یہ ناقابلِ احتجاج ہے۔

تیسری حدیث

﴿عَنْ وَاثِلِ بْنِ حَجْرٍ قَالَ صَلَّى مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَوَضَعَ يَدَهُ الْيَمْنَى عَلَى يَدِ الْيُسْرَى عَلَى صَدْرِهِ﴾ (صحیح بن خزیمہ)

(حضرت وائل ابن حجر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر اپنے سینے پر رکھا) اس روایت کے بارے میں مؤلف ”حدیث نماز“ نے دعویٰ کیا ہے کہ: ”یہ روایت ہمارے نزدیک صحیح، مرفوع، متصل، غیر معطل اور غیر شاذ ہے۔“ (حدیث نماز: ۶۳)

کیا ابن خزیمہ نے اس کی تصحیح کی ہے؟

راقم کہتا ہے کہ اس روایت کو علامہ شوکانی نے ”نیل الاوطار“ میں نقل کرنے کے بعد کہا کہ: اس روایت کی ابن خزیمہ نے تصحیح کی ہے۔ مگر اب صحیح ابن خزیمہ کا نسخہ چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے جس میں یہ حدیث تو موجود ہے مگر اس میں ابن خزیمہ نے اس کی تصحیح نہیں کی ہے۔

علامہ بنوری نے لکھا کہ ظاہر یہ ہے کہ ابن خزیمہ نے اس حدیث پر حکم نہیں لگایا ہے؛ کیونکہ حافظ نے اپنی چاروں کتابوں ”فتح الباری، تلخیص، الدرر ایہ اور بلوغ المرام“ میں (اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد) تصحیح نقل نہیں کی، اسی طرح علامہ نووی نے اپنی تینوں کتابوں ”المجموع، شرح مسلم اور خلاصہ“ میں باوجود شدت احتیاج کے، اس کو نقل نہیں کیا۔ (معارف السنن: ۲/۴۳۸)

چونکہ مولانا یوسف بنوری کے پاس ابن خزیمہ کا مطبوعہ نسخہ نہیں تھا، اس لیے محض اندازہ پر اکتفاء فرمایا، اب کتاب میں دیکھنے سے بھی وہی حقیقت ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ امام ابن خزیمہ کی یہ کتاب اب چھپ کر آچکی ہے، آپ نے اس کو اپنی تصحیح میں برقم: ۴۶۳، جلد اول صفحہ ۳۰۰ پر درج کیا ہے، مگر کہیں بھی اس کی تصحیح نہیں کی ہے۔

پہلی علت مؤمل ضعیف ہے

یہ تو نقل سے متعلق بحث تھی، اس سے قطع نظر اس پر تحقیقی نظر ڈالنا چاہئے تاکہ اس روایت کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے، اس لئے ہم اس پر تفصیل سے کلام کرتے ہیں۔

یہ حدیث ضعیف ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں:

اول یہ کہ اس حدیث کی سند میں مؤمل بن اسماعیل متکلم فیہ راوی ہیں، بہت سے لوگوں نے ان کو لین اور کمزور کہا ہے، علامہ ذہبی نے ”الکاشف“ اور ”میزان الاعتدال“ میں کہا کہ: ”صدوق شدید فی السنة کثیر الخطاء“ اور کہا جاتا ہے کہ ان کی کتابیں دفن کر دی گئیں تھیں اور یہ حفظ سے احادیث بیان کرتے اور غلطی کر گئے۔ (الکاشف: ۳۰۹/۲، میزان الاعتدال: ۵۷۱/۶)

امام بخاری نے کہا کہ یہ منکر الحدیث ہیں اور ابو حاتم نے کہا ہے کہ یہ کثیر الخطاء ہیں، اور ابو زرعمہ سے نقل کیا گیا کہ ان کی حدیث میں بہت خطا ہے۔ اسی طرح اور بھی متعدد حضرات نے ان کو کثیر الخطاء قرار دیا ہے، اور سلیمان بن حرب نے کہا ہے کہ ان کی حدیث سے توقف کرنا چاہئے؛ کیونکہ یہ اپنے شیوخ سے منکر احادیث بیان کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب: ۳۳۹/۱۰، میزان الاعتدال: ۵۷۱/۶)

نیز حافظ ابن حجر نے ”شرح بخاری“ میں بخاری کے ”باب من أولم علی بعض نسائه أكثر من بعض“ کے تحت ایک حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ”و كذلك مؤمل بن إسماعیل فی حدیثه عن الثوری ضعف“ (اسی طرح مؤمل بن اسماعیل کی ثوری سے حدیث میں ضعف ہے) (فتح الباری: ۲۳۹/۹)

راقم کہتا ہے کہ یہ روایت مؤمل کی ثوری ہی سے ہے، جیسا کہ ابن خزیمہ میں

موجود ہے، لہذا یہ حدیث بھی ضعیف ہوگی۔ پھر دوسرے علماء کا کلام جو ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ببا ننگ دہل اعلان کر رہا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے؛ کیونکہ مؤمل پر منکر الحدیث ہونے اوکثیر الخطاء ہونے کی جرحیں معمولی نہیں بلکہ بڑی سخت جرحیں ہیں، اس کے باوجود اس حدیث کو صحیح ماننا انتہائی غلط ہے۔

بالفرض اگر کسی نے اس روایت کو صحیح بھی کہا، جیسا کہ شوکانی نے ابن خزیمہ سے نقل کیا ہے تو اس مؤمل کے ہوتے ہوئے اس حدیث کو صحیح کہا جاسکتا ہے؟ جب کہ خود وہ حضرات جو اس حدیث کی تصحیح کے درپے ہیں، مؤمل میں کلام کرتے ہیں۔ اسی لیے علامہ بنوری نے فرمایا ”اگر ہم فرض کر لیں کہ ابن خزیمہ کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے، تو کیا امت کو ابن خزیمہ کی تصحیح کا اعتقاد لازم ہے؟ جب کہ جہابذہ امت کے مؤمل کے بارے میں کلمات ہمارے سامنے اس کے خلاف شاہد و ناطق ہیں (معارف السنن: ۲۰/۴۳۹)۔“

اس تحقیق کے بعد ہم گزارش کرتے ہیں کہ مؤلف ”حدیث نماز“ کو پہلے یہ چاہئے تھا کہ مؤمل کی توثیق فرماتے اور اس کو بدلائل ثابت کرتے، پھر اس کی تصحیح فرماتے، ورنہ زبان اور قلم سے ضعیف کو قوی بتانے اور قوی کو ضعیف ثابت کرنے سے حقیقت بدل نہیں جاتی۔ غرض یہ کہ مؤلف کا یہ دعویٰ کرنا کہ یہ روایت صحیح ہے، بے دلیل ہے اور اٹکل سے کم نہیں۔

دوسری علت اضطراب

دوسری علت یہ ہے کہ اس میں اضطراب پایا جاتا ہے، چنانچہ یہ حدیث ”صحیح ابن خزیمہ“ میں ”علی صدرہ“ کے الفاظ سے ہے اور ”مسند بزار“ میں ”عند صدرہ“ کے الفاظ کے ساتھ آئی ہے اور ”مصنف بن ابی شیبہ میں ”تحت السرة“

کے الفاظ ہیں۔ اور سب میں حدیث ایک ہی ہے۔ (معارف: ۲/۲۳۷) لیکن مولانا بنوریؒ نے آگے چل کر فرمایا کہ بعد تفحص معلوم ہوا کہ ”عند صدرہ“ کی بزار والی روایت دوسری ہے، جس میں محمد بن حجر متکلم فیہ راوی ہیں۔ (معارف: ۲/۳۳۹)

راقم کہتا ہے کہ اس صورت میں ابن خزیمہ اور ابن ابی شیبہ کی دو روایات میں اضطراب پایا گیا، اور یہ معلوم ہے کہ حدیث مضطرب ضعیف ہوتی ہے۔ تیسری علت شد و ذی

اس میں تیسری علت یہ ہے کہ اس میں ”علی صدرہ“ کے الفاظ غیر محفوظ ہیں، چنانچہ علامہ نیویؒ نے فرمایا کہ: اس روایت کو امام احمدؒ نے ”مسند“ میں ”بطریق عبداللہ بن الولید عن سفیان عن عاصم عن أبیہ عن وائل“ روایت کیا ہے، نیز امام احمد ہی نے اور نسائی نے ”بطریق زائدة عن عاصم عن أبیہ عن وائل“ روایت کیا اور امام ابوداؤد نے ”بطریق بشر بن مفضل بن عاصم عن أبیہ عن وائل“ روایت کیا اور امام ابن ماجہ نے ”بطریق عبداللہ بن إدريس و بطریق بشر بن مفضل عن عاصم عن أبیہ عن وائل“ روایت کیا ہے اور امام احمد نے ”بطریق عبدالواحد“ اور ”بطریق زھیر بن معاویہ“ اور ”بطریق شعبہ عن عاصم عن أبیہ عن وائل“ اس کو روایت کیا، اور سب کے سب ”علی صدرہ“ کی زیادتی کے بغیر روایت کرتے ہیں، چنانچہ علامہ ابن القیمؒ نے ”اعلام الموقعین“ میں تصریح کی کہ سوائے مؤمل بن اسماعیل کے کسی نے ”علی صدرہ“ نہیں کہا، پس ثابت ہوا کہ یہ متفرد ہے۔..... پس بلا شک یہ غیر محفوظ اور شاذ ہے۔ (التعلیق الحسن: ۱/۶۵)

شاذ یا منکر؟

راقم کہتا ہے کہ یہ روایت علامہ نیوی کی تحقیق کی بنا پر شاذ ہے اور موصوف نے اس بات کو اس طرح ثابت کیا کہ مؤمل بن اسماعیل نے بہت سے لوگوں کی مخالفت کی ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اور راوی اگرچہ ثقہ ہو جب وہ ثقات کی یا اوثق کی مخالفت کرے تو اس کی روایت غیر مقبول، شاذ اور غیر محفوظ ہوتی ہے۔ انتہی کلامہ۔

راقم کہتا ہے کہ یہ مؤمل کو ثقہ ماننے کی صورت میں ہے، ورنہ تو مؤمل کا ضعیف ہونا اوپر گزر چکا ہے، یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ روایت منکر ہو؛ کیونکہ ضعیف راوی اگر ثقہ کی مخالفت کرتا ہے تو اس کو منکر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

”وَإِنْ وَقَعَتِ الْمُخَالَفَةُ مَعَ الضَّعْفِ، فَالرَّاجِحُ يُقَالُ لَهُ الْمَعْرُوفُ، وَالْمُقَابِلُ يُقَالُ لَهُ الْمُنْكَرُ“۔ (یعنی: اگر (راوی کی جانب سے) مخالفت اس کے ضعف کے ساتھ واقع ہو تو راجح کو معروف اور اس کے مقابل یعنی (اس مخالف کی روایت کو) منکر کہا جاتا ہے۔ (شرح الخبئة: ۴۰)

حاصل یہ ہے کہ یہ روایت منکر اور ناقابل قبول ہے اور اگر علامہ نیوی کی تحقیق پر اس کو شاذ مانیں تب بھی مؤلف ”حدیث نماز“ کا دعویٰ متزلزل ہو جاتا ہے؛ کیونکہ صحیح ہونے کے لیے حدیث کا شاذ نہ ہونا ضروری ہے۔

روایت مذکورہ ناقابل احتجاج ہے

حاصل یہ ہے کہ اس روایت میں کئی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے یہ روایت ناقابل احتجاج ٹھہرتی ہے:

(۱) مؤمل بن اسماعیل کا ضعف خصوصاً ثوری سے روایت کرنے میں۔

(۲) اضطرابِ متن۔

(۳) علیٰ صدرہ کے اضافہ کا تفرد اور اس کا غیر محفوظ اور شاذ ہونا یا اس کا منکر ہونا۔

(۵) یہ روایت بطریق سفیان ہے اور سفیان ثوریؒ کا مذہب معارف السنن میں شرح منقہی سے نقل کیا ہے کہ ”تحت السرة“ ہاتھ باندھنے کا تھا۔ (معارف السنن: ۲/۲۳۸)

لہذا اس سے بھی روایت میں ضعف بڑھ گیا۔ کمالاً یخفی اس تقریر سے مؤلف کے بے بنیاد دعویٰ کی حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ روایت صحیح غیر معلول، غیر شاذ ہے جب کہ اس میں اسبابِ ضعف کئی کئی جمع ہو گئے ہیں۔

فائدہ

صاحب ”عون المعبود“ نے اس روایت کی تصحیح ابن عون سید الناس اور علامہ شوکانی کے حوالہ سے ابن خزیمہ سے نقل کی ہے، مگر اوپر کی تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ ابن خزیمہ نے نہ تو اس کی تصحیح کی ہے اور نہ یہ تصحیح مسلم ہے؛ کیونکہ اس کا معلول و شاذ ہونا اور پھر اضطرابِ متن اور مؤمل کا ضعف ظاہر ہو گیا۔ واللہ اعلم

علامہ کشمیریؒ کا ارشاد

آپ نے فرمایا کہ ”ابن خزیمہ“ میں وائل کی حدیث میں لفظ ”علیٰ صدرہ“ بھی واقع ہوا ہے اور یہ میرے نزدیک قطعاً معلول ہے؛ کیونکہ ائمہ میں سے اور سلف میں سے کسی نے نہ اس پر عمل کیا اور نہ اس طرف گئے۔ (فیض الباری: ۲/۲۶۶)

حضرت شاہ صاحبؒ اپنی خداداد بصیرت و حذاقت سے ”ابن خزیمہ“ دیکھے بغیر ہی اس کے معلول ہونے کو سمجھ گئے تھے اور اب دلائل سے بھی اس کا معلول ہونا واضح ہو گیا۔ وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

مؤلف نے چونکہ یہی تین مرفوع روایتیں پیش کی ہیں اس لیے ہم انہیں کے جوابات پر کفایت کرتے ہیں، اس کے علاوہ بھی بعض مرفوع روایات ہیں جن کے بارے میں علامہ نیوی نے کہا کہ وہ روایات تمام کی تمام ضعیف ہیں۔ اس کی تفصیل کے لیے ”آثار السنن“ کی تعلق ملاحظہ فرمائیں۔ (آثار السنن مع التعلیق الحسن: ۱۸-۶۹)

حضرت ابن عباس کی روایت

ہاں مؤلف نے حضرت ابن عباسؓ سے دو موقوف حدیثیں اپنے مدعی پر پیش کی ہیں، ان پر بھی ایک متلاشی حق کو نظر کرنا چاہئے کہ حق کیا ہے؟
مؤلف ”حدیث نماز“ نے کہا کہ ”بیہقی“ اور ”ابن ابی حاتم“ میں حضرت ابن عباسؓ سے بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کا ایک اثر وارد ہوا ہے۔ (حدیث نماز: ۶۳)
اس کا جواب یہ ہے کہ مؤلف نے پہلے تو اس روایت کی تعیین نہیں کی کہ کیا الفاظ سے یہ حدیث آئی ہے اور کس کے واسطے سے روایت کی گئی ہے اور نہ یہ بتایا کہ کونسی جلد و صفحہ پر ہے، تاکہ ہم دیکھتے اور فیصلہ کرتے۔ ”سنن بیہقی“ میں ”باب وضع الیدین علی الصدر فی الصلاة من السنة“ میں ہمیں صرف وہی اثر ابن عباس کا ملا جس کو مؤلف نے آگے ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ [الکوثر: ۲] کی تفسیر میں پیش کیا ہے، اگر اس سے مراد وہی اثر ہے تو اس کا جواب ابھی اس کے بعد آئے

گا، اور اگر دوسری روایت مراد ہے تو اولاً حوالہ پھر اس کی تصحیح مؤلف کے ذمہ ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی دوسری روایت

مؤلف نے ”تفسیر خازن“ اور ”تفسیر معالم التنزیل“ کے حوالے سے دوسری روایت حضرت ابن عباس سے ﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأَنْحَرْ ﴾ [الکوثر: ۲] کی تفسیر میں پیش کی ہے کہ انہوں نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ: ”تیرے رب کے لیے نماز پڑھ اور نماز میں سینے کے بالائی حصہ پر ہاتھ باندھ“، اور ”معالم التنزیل“ سے یہ عبارت نقل کی ہے:

”وَرَوَى عَنْ أَبِي الْجَوْزَاءِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ : فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأَنْحَرْ، قَالَ : وَضَعُ الْيَمِينِ عَلَى الشَّمَالِ فِي الصَّلَاةِ عِنْدَ النَّحْرِ“ (ابو الجوزاء نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ ”وَأَنْحَرُ“ کے معنی دائیں ہاتھ کو نماز میں بائیں ہاتھ پر سینے کے پاس رکھنا ہے)۔ (حدیث نماز: ۶۴)

میں کہتا ہوں کہ اولاً: ”وَأَنْحَرُ“ کے یہ معنی متعین نہیں، ثانیاً: عند المفسرین راجح نہیں، اور ثالثاً: بطریق صحیح ثابت نہیں، پھر اس سے احتجاج کیسے صحیح ہوگا؟ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأَنْحَرْ ﴾ [الکوثر: ۲] میں مذکورہ معنی متعین نہیں ہیں، بلکہ دیگر احتمالات ہیں۔ چنانچہ علامہ رازی نے ”تفسیر کبیر“ میں اس کی مختلف تفسیریں بیان فرمائی ہیں۔ اور علامہ آلوسی نے ”روح المعانی“ میں بھی کئی اقوال بیان کیے ہیں، اسی طرح ”تفسیر خازن“ میں مذکورہ معنی کی تعیین نہیں کی ہے، بلکہ دوسرے قول کو مذکورہ قول سے مقدم کیا ہے۔ (تفسیر کبیر: ۱۲۹/۳۲، روح المعانی: ۳۰، تفسیر خازن: ۴)

پھر مفسرین نے اس معنی کو ترجیح بھی نہیں دی ہے بلکہ مرجوح قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ رازیؒ پہلے جمہور مفسرین کا یہ قول بیان کرتے ہیں ”إِنَّ الْمُرَادَ هُوَ نَحْرُ الْبَدَنِ“ (یعنی: ”وَإِنْ نَحَرَ“ سے مراد اونٹوں کی قربانی کرنا ہے) پھر اگلے صفحہ پر دوسری توجیہات و تفسیرات کو مرجوح اور جمہور کے قول کو راجح ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”وَ حَامِسُهَا أَنَّ اسْتِعْمَالَ لَفْظَةِ النَّحْرِ فِي نَحْرِ الْبَدَنِ أَشْهُرٌ مِنْ اسْتِعْمَالِهِ فِي سَائِرِ الْوُجُوهِ الْمَذْكُورَةِ ، فَيَجِبُ حَمْلُ كَلَامِ اللَّهِ عَلَيْهِ“۔

(”وَإِنْ نَحَرَ“ کو قربانی پر محمول کرنے کی افضلیت کی پانچویں وجہ یہ ہے کہ لفظ ”نَحْرُ“ کا استعمال اونٹ کی قربانی کے معنی میں زیادہ مشہور ہے دوسرے وجوہ مذکورہ میں استعمال ہونے سے، لہذا کلام اللہ کو اس پر حمل کرنا واجب ہے۔ (تفسیر کبیر: ۱۲۹/۳۲-۱۳۰)

اسی طرح علامہ آلوسی نے فرمایا کہ: وَ يُرْجَحُ قَوْلُ الْأَكْثَرِينَ إِنْ لَمْ يَصِحَّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يُخَالِفُهُ أَنَّ الْأَشْهُرَ اسْتِعْمَالَ النَّحْرِ فِي نَحْرِ الْبَابِلِ دُونَ تِلْكَ الْمَعَانِي الْخ - اسی طرح طبری نے بھی لکھا ہے (تفسیر روح المعانی: ۴۴۴/۳۰، تفسیر الطبری: ۷۲۴/۱۶)

غرض یہ کہ مفسرین اس تفسیر کو راجح قرار نہیں دیتے بلکہ مرجوح قرار دیتے ہیں۔ پھر اس روایت کا ثبوت بھی بطریق صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ اس روایت کے ایک راوی روح بن المسیب پر سخت جرح کی گئی ہے۔ ابن عدی نے کہا کہ: اس کی احادیث غیر محفوظ ہیں، اور ابن حبان نے کہا کہ: یہ موضوع روایات ثقات سے بیان کرتا ہے، اس سے روایات کرنا جائز نہیں۔ (لسان المیزان: ۴۸۶/۳)

اور اگرچہ بعض حضرات نے اس کو صالح بھی کہا ہے، تاہم اس قدر سخت جرح

کے ہوتے ہوئے اس روایت کو موضوع نہیں تو کم از کم نہایت ضعیف کہا جائے گا، پس یہ روایت بھی قابل احتجاج نہیں، ضعیف ہے۔ افسوس کہ ضعیف سے استدلال کر کے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی روایات کی تحقیق

اس کے بعد مؤلف نے احناف کے دلائل کے متعلق کہا کہ:

”زیر ناف ہاتھ باندھنے کی روایتیں ”مسند احمد“ اور ”ابوداؤد“ میں بھی ہیں، لیکن خود ان محدثین نے ان روایتوں کو مرفوع یا صحیح نہیں مانا بلکہ ضعیف قرار دیا ہے اور ضعیف روایت سے دلیل لینا ٹھیک نہیں جبکہ صحیح روایات موجود ہوں۔ یعنی سینے پر ہاتھ باندھنے کی روایتیں قوی ہیں اور زیر ناف ہاتھ باندھنے کی روایتیں کمزور ہیں۔“

پھر علامہ مقتدی حسن صاحب استاذ مرکزی دارالعلوم، بنارس سے نقل کیا کہ:

”ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی روایت حکماً مرفوع ہے، لیکن اس کی تمام سندیں ضعیف ہیں؛ کیونکہ اس کی سندیں عبدالرحمن بن اسحاق واسطی کی طرف لوٹی ہیں اور یہ باتفاق ائمہ ضعیف رجال ہیں۔“ (حدیث نماز: ۶۳)

راقم کہتا ہے کہ زیر ناف ہاتھ باندھنے کی روایتیں ضعیف اور خود ان محدثین نے ان کو صحیح اور مرفوع نہیں مانا، تو کیا مؤلف اس کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ آپ نے جو روایتیں ”علی الصدر“ (سینہ پر ہاتھ باندھنے) کی پیش کی ہیں انہیں کم از کم ان محدثین سے صحیح ثابت کر دیں؟

افسوس کہ مؤلف تو حق تلاشی کے ہر جگہ نعرے لگاتے ہیں مگر جہاں مسلک

سامنے آتا ہے، تلبیسات اور بے دلیل دعویوں کی آڑ لے کر باطل کو اختیار کر جاتے ہیں اور پھر کمال یہ ہے کہ علامہ شوکانی اور بعض دیگر حضرات کے مقلد بن جاتے ہیں، خصوصاً حدیث کے اختیار کرنے میں تو تحقیق کو بالائے طاق رکھ کر مقلد نظر آتے ہیں اور جو احق بالتقلید تھے ان کی تقلید کو کفار و مشرکین کی تقلید سے تشبیہ دے کر پیچھا چھڑاتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

رہا جناب مقتدی حسن صاحب کا ارشاد تو اس کا جواب مفصلاً اوپر گزر چکا کہ اس حدیث کو متفق علیہ ضعیف کہنا خلاف تحقیق ہے، اور تعجب ہے کہ مؤلف یہاں پر دوسروں کی ان تحقیقات میں بے جا تقلید کیسے کر لیتے ہیں جب کہ تقلید کے منکر ہیں۔ ہم پہلے بھی یہ بات لکھ چکے ہیں کہ مؤلف کو اولاً اپنی پیش کردہ روایات کو تحقیقی معیار پر لا کر ثابت کرنا چاہئے تھا کہ یہ روایات صحیح ہیں، معلول نہیں ہیں۔ اس کے بغیر دعویٰ محض کیسے قابل قبول ہو سکتا ہے؟ مگر مؤلف ہیں کہ مطلب براری کے لیے غیر صحیح کو صحیح اور معلول کو غیر معلول قرار دیتے چلے جا رہے ہیں۔ غرض یہ کہ مؤلف حدیث نماز کا یہ دعویٰ کہ ”علی الصدر“ کی روایتیں قوی ہیں اور ”تحت السرة“ کی ضعیف محض اٹکل ہے، جو کسی طرح قابل قبول نہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کے سلسلہ میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان میں صحیح بھی ہیں اور حسن و ضعیف بھی، ہم یہاں پر بعض کو نقل کرتے ہیں اور ان پر جو کلام ہے اس کو بھی بیان کرتے ہیں۔

پہلی حدیث

﴿عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وائِلِ بْنِ حَجْرٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَضَعُ يَمِينَهُ عَلَى شِمَالِهِ فِي الصَّلَاةِ تَحْتَ السُّرَّةِ﴾ (مصنف ابن أبي شيبة:

(۳۲۱/۳، مع تعلیقات الشیخ عوامہ الحلبی)

(حضرت علقمہ بن وائل نے اپنے والد حضرت وائل بن حجر سے روایت کیا کہ حضرت وائل بن حجرؓ نے فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے نماز میں اپنے داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھا یعنی باندھا)۔ یہ روایت ہم نے اس نسخہ سے لی ہے جس کو شیخ محمد عوامہ نے اپنی قابل قدر تعلیقات و تحریجات کے ساتھ شائع کیا ہے، اس میں یہ روایت صاف الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

بعض حضرات کو مصنف ابن ابی شیبہ کے بعض نسخوں میں ”تحت السرة“ کی یہ زیادتی نہیں ملی، مگر حق یہ ہے کہ اکثر نسخوں میں یہ زیادتی موجود ہے، چنانچہ قاسم بن قطلوبغا حنفیؒ نے ”مصنف ابن ابی شیبہ“ کی طرف اس زیادتی کو منسوب کیا ہے، نیز شیخ ابوالحسن قائم سندیؒ نے اپنے رسالہ ”فوز الکرام“ میں کہا کہ: میں نے خود مصنف میں اس زیادتی کو دیکھا ہے جو صحیح نسخہ میں امارات صحیحہ کے ساتھ موجود تھا اور کہا کہ: یہ زیادتی اکثر نسخوں میں صحیح ہے۔ (التعلیق الحسن: ۷۰-۷۱)

اور علامہ شیخ محمد ہاشم سندی نے اپنے رسالہ ”ترصیح الدرۃ علی درہم الصرة“ میں فرمایا کہ ”میں نے یہ زیادتی مصنف ابن ابی شیبہ کے تین نسخوں میں پائی ہے، ایک وہ نسخہ جس کو شیخ قاسم محدث دیار مصریہ نے نقل کیا ہے، دوسرا وہ نسخہ جس کو شیخ محمد اکرم النصر پوری نے نقل کیا ہے اور تیسرا وہ نسخہ جس کو شیخ عبدالقادر مفتی مکہ معظمہ نے نقل کیا ہے۔ (ترصیح الدرۃ: ۸۱)

جب متعدد نسخوں میں اس زیادتی کا ہونا ثقات اثبات سے ثابت ہو گیا تو اب یہ کہنے کی کیا گنجائش ہے کہ فلاں اور فلاں کو یہ زیادتی نہیں ملی؟ کیا نسخوں کے تعدد کی وجہ سے ایسا ہونا کوئی بعید ہے کہ کوئی اس کو پائے اور کوئی نہ پائے؟ جس نے نہیں پایا

وہ ثابت نہ مانے مگر نفی کا کیا حق ہے؟ اور جس نے پایا وہ نفی کیونکر کر دے؟
شیخ محمد عوامہ نے بہت خوب لکھا ہے کہ:

”جس نے ان چار نسخوں سے یہ حدیث نقل کی جن میں یہ جملہ نہیں ہے وہ اس زیادتی کے ثابت نہ ماننے میں معذور ہے لیکن اس کے وارد ہونے کی نفی کرنے میں وہ معذور نہیں ہے، اور جو اس کو ان دو نسخوں سے نقل کرے جن میں یہ زیادتی ثابت ہے وہ اس کو ثابت ماننے میں معذور ہے بلکہ اس پر یہ بات واجب ہے، اور اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ اس کو حذف کرے۔“ (تعلیقات مصنف ابن ابی شیبہ شیخ محمد عوامہ: ۳۲۱/۳)

یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ صاحب تحفۃ الاحوذی علامہ مبارکپوری نے اس ”تحت السرة“ کی زیادتی کو گرانے کی بے جا کوشش کی ہے اور شیخ محمد حیات سندھی وغیرہ کی تقلید میں ایک ثابت امر کا انکار کر دیا ہے، اور علامہ قاسم بن قطلوبغا جیسے ثقہ کی گواہی کو غیر معتبر قرار دینے کی جرأت بے جا کا مظاہرہ کیا ہے، ہم یہاں مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کی بات کا جواب دیں۔ مبارکپوری صاحب کے بیان کا خلاصہ یہ دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ:

”قاسم بن قطلوبغا کے سوا کسی نے اس حدیث میں یہ زیادتی بیان نہیں کی ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں نظر کرتے ہوئے قاسم بن قطلوبغا کی نظر چوک گئی ہو اور اس حدیث کے بعد مذکور ابراہیم نخعی کے اثر میں وارد ”تحت السرة“ کی زیادتی کو اس حدیث میں سمجھ لیا ہو اور نقل کر دیا ہو۔“

اور دوسرے یہ کہ متعدد حضرات نے مصنف ابن ابی شیبہ سے اس کو نقل نہیں کیا ہے، علامہ ابن الترمذی نے ”الجوہر النقی“ میں مصنف ابن

ابی شیبہ سے ابو مجلز کا اثر نقل کیا ہے، اور اس کے سوا مصنف سے کوئی اور حدیث نقل نہیں کی، اس سے ظاہر یہی ہے کہ مصنف میں ”تحت السرة“ کی زیادتی حدیث وائل میں نہیں تھی، کیونکہ اگر ہوتی تو ابن الترمذی ضرور اس کو نقل کرتے، اسی طرح شیخ حیات سندھی سے نقل کیا کہ میں نے اہل علم میں سے سوائے قاسم کے نہ کسی کو دیکھا اور نہ سنا کہ اس حدیث میں وہ اس زیادتی کو نقل کرتے ہیں۔ پھر لکھا کہ ابن عبد البر نے مصنف سے بہت لیا ہے مگر اس کو انھوں نے نقل نہیں کیا، اور ابن حجر نے بھی اس کو نقل نہیں کیا۔ نیز لکھا کہ سیوطی نے بھی اس کو نقل نہیں کیا، اور علامہ زیلعی نے بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، اور علامہ عینی جو رطب و یابس سب کچھ جمع کر دیتے ہیں انھوں نے بھی اس کو نقل نہیں کیا، اگر یہ زیادتی مصنف ابن ابی شیبہ میں ہوتی تو یہ لوگ ضرور نقل کرتے۔ (ملخصاً تحفۃ الاحوذی: ۲۸۶/۱)

جہاں تک پہلا سوال و اشکال ہے اس کے جواب میں ہم وہی کہہ دینا مناسب سمجھتے ہیں جو شیخ محمد عوامہ نے اس کا جواب دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

”ان هذا تظنن و تشكك يفرح به أعداء الله والاسلام، لو فتح لما بقى لنا ثقة بشيء من مصادر ديننا“ (یہ ایک گمان و شک ہے جس سے اللہ اور اسلام کے دشمن خوش ہوں گے، اگر اس کا دروازہ کھول دیا جائے تو ہمارے دینی مصادر میں سے کسی پر بھی ہمیں اعتماد باقی نہیں رہے گا) (تعلیقات ابن ابی شیبہ: ۳۲۱/۳)

دوسرے سوال و اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال اس وقت ہو سکتا تھا جبکہ یہ دعویٰ کیا جاتا کہ تمام نسخوں میں یہ زیادتی موجود ہے، لیکن جبکہ یہ بات واضح ہو گئی کہ

بعض معتبر نسخوں میں یہ زیادتی پائی گئی ہے اور اس کو ثقہ حضرات نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور نقل کیا ہے تو اس کو گرانے کے لئے یہ کہنا کہ فلاں اور فلاں نے اس کو کیوں نقل نہیں کیا؟ ایک غیر معقول سوال ہے۔ ممکن ہے کہ جن حضرات نے اس کو نقل نہیں کیا ان کے پاس موجود نسخوں میں وہ زیادتی نہ ہو اور جنہوں نے نقل کیا ان کے پاس کے نسخوں میں وہ موجود رہی ہو، لہذا بقاعدہ ”المُثَبِّتُ مُقَدَّمٌ عَلَى النَّافِي“ اس کو قبول کرنا ہی شیوہ اہل علم و دیانت ہے۔

اس کے بعد آئیے دیکھیں کہ اس روایت کی سند کا کیا حال ہے؟ اس روایت میں حضرت وائل جو کہ صحابی ہیں ان کے علاوہ تین راوی ہیں اور یہ تینوں راوی ثقہ اور قوی ہیں، چنانچہ سب سے پہلے حضرت امام وکیع ہیں، حافظ نے ”تہذیب التہذیب“ میں کہا کہ وکیع بن الجراح بن ملح الرواسی الکوفی ان کی کنیت ابوسفیان ہے۔ امام احمد نے ان کے بارے میں فرمایا کہ میں نے ان سے زیادہ وسیع العلم اور حافظ نہیں دیکھا۔ اور احمد بن سہل نے کہا کہ: وکیع اپنے وقت کے امام المسلمین تھے۔ امام ابن معین نے فرمایا کہ: میں نے وکیع سے افضل کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ قبلہ رو ہو کر حدیث یاد کرتے تھے اور قیام لیل و صیام نہاران کا مشغلہ تھا، اور امام ابوحنفیہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔ (تہذیب التہذیب: ۱۰۹/۱۱-۱۱۴)

دوسرے راوی ہیں موسیٰ بن عمیر تمیمی کوفی، اور وہ حضرت علقمہ بن وائل، شععی حکم بن عتیبہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے امام وکیع، ابن المبارک، حفص بن غیاث روایت کرتے ہیں، ان کے بارے میں امام مزنی نے تہذیب الکمال میں اور حافظ ابن حجر نے ”تہذیب التہذیب“ میں فرمایا کہ: ابن معین، ابو حاتم، محمد بن عبد اللہ بن نمیر، خطیب، عجلی اور دولابی نے کہا کہ: موسیٰ بن عمیر ثقہ ہیں

اور ابو زرہ نے کہا کہ: ان میں کوئی خرابی نہیں۔ (تہذیب الکمال: ۱۲۷/۲۹، تہذیب
التہذیب: ۲۳۴/۱۰)

تیسرے راوی علقمہ بن وائل ہیں، حافظ ذہبی نے ”میزان“ میں ان کو صدوق
کہا ہے اور حافظ ابن حجر نے کہا کہ: ابن حبان نے ان کو ”ثقات“ میں ذکر کیا ہے
اور ابن سعد نے کہا کہ: یہ ثقہ ہیں اور علقمہ سے بخاری نے ”جزء رفع الیدین“ میں
اور مسلم نے اپنی ”صحیح“ میں روایت کیا ہے اور اصحاب سنن اربعہ نے اپنی ”سنن“
میں تخریج کی ہے۔ (میزان الاعتدال: ۱۳۴/۵، تہذیب التہذیب: ۲۴۷/۷)

غرض یہ کہ اس حدیث کی سند قوی اور مضبوط ہے؛ کیونکہ اس کے تمام راوی ثقہ
ہیں، چنانچہ علامہ نیوی نے تعلیق الحسن میں اور علامہ عبدالرحمن مبارکپوری نے تحفۃ
الاحوذی شرح ترمذی میں لکھا ہے کہ قاسم بن قطلوبغا نے ”تخریج احادیث
الاختیار شرح المختار“ میں فرمایا کہ: یہ سند جید ہے اور علامہ محمد بن ابوطیب مدنی نے
”شرح ترمذی“ میں فرمایا کہ: یہ حدیث سند کے لحاظ سے قوی ہے اور شیخ عابد سندھی
نے ”طوالح الانوار“ میں کہا کہ: اس کے رجال ثقہ ہیں۔ (التعلیق الحسن: ۷۰۱، تحفۃ
الاحوذی: ۲۸۶/۱)

سماعِ علقمہ کا ثبوت

بعض حضرات محدثین نے جیسے حافظ ابن حجر نے ”تقریب“ میں اور امام ترمذی
نے امام بخاری سے ”علل کبیر“ میں علقمہ کا اپنے باپ وائل بن حجر سے نہ سننا بیان
کیا ہے، اور اسی لیے اس حدیث الباب کو منقطع کہا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ
عدمِ سماع کا قول کسی غلط فہمی کی بناء پر ہے؛ کیونکہ امام مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی
وغیرہ میں سماعِ علقمہ عن ابیہ کی تصریح اور بعض میں اشارہ موجود ہے۔

(۱) امام مسلم نے اپنی ”صحیح“ میں بیان کیا ”حدثنا عبید اللہ بن معاذ العنبري قال نا أبي قال نا أبو يونس عن سماك بن حرب عن علقمة بن وائل أن أباه حدثه الخ. (باب صحة الإقرار بالقتل: ۶۱/۲)

اس میں جملہ ”أن أباه حدثه“ (یعنی علقمہ کے والد نے علقمہ سے بیان کیا) سماع پر صراحتاً دلالت کر رہا ہے؛ کیونکہ ”تحدیث“ وہیں بولتے ہیں جہاں سماع ہوا ہو۔ کما تقرر فی موضعه۔

(۲) امام ترمذی نے اپنی ”جامع“ میں ”باب ما جاء في المرأة إذا استكرهت على الزنا“ میں اولاً ایک حدیث ”بطریق عبد الجبار بن وائل بن حجر“ بیان کرنے کے بعد اس کو منقطع کہا، اور پھر دوسری روایت بیان کی جو بطریق علقمہ بن وائل ہے، اس کو روایت کرنے کے بعد آخر میں کہا کہ: علقمہ بن وائل بن حجر نے اپنے باپ سے سنا ہے اور یہ (اپنے بھائی) عبد الجبار سے بڑے ہیں اور عبد الجبار نے اپنے باپ سے نہیں سنا۔ (ترمذی: ۲۶۹/۱)

اس میں خود امام ترمذی نے تصریح کی ہے کہ: علقمہ نے اپنے باپ سے سنا اور جو ”علل کبیر“ میں امام بخاری سے عدم سماع نقل کیا یہ اس کے مخالف و معارض ہے۔

(۳) امام ترمذی ہی نے ”کتاب الاحکام“ میں حضرت وائل کی ایک حدیث روایت کی ہے، جس کی سند وہ اس طرح نقل کرتے ہیں: حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو داؤد الطیالسی ثنا شعبة عن سماك سمعت علقمة يحدث عن أبيه، الخ (ترمذی: ۲۵۷/۱)

(۳) امام ابو داؤد نے رفع یدین کے باب میں بیان کیا کہ عبد الجبار نے کہا کہ: میں میرے والد کی نماز کو چھوٹا ہونے کی وجہ سے سمجھ نہیں سکتا تھا، لہذا میرے بھائی

علقمہ نے مجھ سے میرے والد وائل کی طرف سے بیان کیا۔ الخ (ابوداؤد: ۱۰۵/۱) اس سے معلوم ہوا کہ عبد الجبار تو وائل سے نہیں سن سکے، البتہ ان کے بھائی علقمہ کو اپنے والد وائل سے سماع حاصل ہے اور وہ ان سے حدیثیں نقل کرتے تھے، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ امام بخاری وغیرہ نے جو بیان کیا کہ عبد الجبار وائل کے انتقال کے چھ ماہ بعد پیدا ہوئے، یہ صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ اس روایت میں ان کا اپنے والد وائل کے زمانے میں ہونا صراحتاً مروی ہے۔

(۴) امام نسائی نے ”باب رفع الیدین عند الرفع من الركوع“ میں بیان کیا کہ ”أخبرنا سويد بن نصر أخبرنا عبد الله بن المبارك عن قيس بن سليم العنبري حدثني علقمة بن وائل حدثني أبي الخ (نسائی: ۱۱۹/۱) اس میں بھی حضرت علقمہ نے وائل سے بلفظ ”تحدیث“ روایت بیان کی ہے جو کہ سماع میں صریح ہے۔

(۴) امام نسائی ہی نے ”کتاب القسامۃ“ میں ”باب القود“ کے تحت حدیث علقمہ کے ناقلین کا اختلاف بیان کرتے ہوئے یہ سند بیان کی ہے: ”أخبرنا زكريا بن يحيى قال ثنا عبید الله بن معاذ قال ثنا أبي قال ثنا أبو يونس عن سماك بن حرب عن علقمة بن وائل حدثه أن أباه حدثه“ الخ (نسائی: ۲۰۷/۲) یہی روایت مسلم کے حوالہ سے پہلے بیان کی گئی ہے۔

(۵) امام نسائی نے ہی اس کے بعد یہ سند بیان کی ہے ”أخبرنا محمد بن معمر قال ثنا يحيى بن حماد عن أبي عوانة عن إسماعيل بن سالم عن علقمة بن وائل أن أباه حدثهم“ الخ (نسائی: ۲۰۷/۲)

ان میں بھی ”تحدیث“ کی تصریح موجود ہے، لہذا سماع علقمہ ثابت ہے، اور اس کا انکار کرنا ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور جن حضرات نے اس کا انکار کیا ہے، ہم ان

کو معذور سمجھتے ہیں کہ غالباً علم نہ ہوا ہو۔ واللہ اعلم
 نیز امام ترمذی نے متعدد مواقع پر علقمہ عن وائل بن حجر والی سند کو صحیح قرار دیا ہے،
 مثلاً دیکھو: (ترمذی: باب ما جاء أن البينة على المدعي: ۲۴۹/۱، و باب ما جاء
 ستكون فتنة كقطع الليل المظلم: ۴۳۲/۲)

اور حافظؒ نے ”بلوغ المرام“ میں صفتِ صلوة کے بیان میں ”ابوداؤد“ کی
 روایتِ علقمہ بن وائل کی تصحیح فرمائی ہے، اس پر علامہ نیوی نے فرمایا کہ: ممکن ہے
 عدم سماع کے قول سے بعد علم رجوع کر لیا ہو۔ نیز علامہ عظیم آبادی نے ”عون المعبود
 “ میں لکھا ہے کہ: حق یہ ہے کہ علقمہ نے اپنے باپ سے سنا ہے، پھر لکھا کہ: حافظ نے
 تقریب میں جو یہ لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے والد سے نہیں سنا، یہ بات صحیح نہیں ہے
 (دیکھو: التعلیق الحسن: ۹۹/۱، عون المعبود: ۲۹۳/۲)

اضطرابِ متن کا رفع

ہم نے ابن خزیمہ کی روایت کے تحت جس کو مؤلف زید مجاہد نے پیش کیا تھا یہ
 بتلایا تھا کہ ”مصنف ابن ابی شیبہ“ میں یہ روایت ”تحت السرة“ کے اضافہ کے ساتھ
 ہے اور مسند بزار میں ”عند صدره“ کے الفاظ سے مروی ہے۔ لہذا یہاں یہ بحث پھر
 سامنے آتی ہے کہ یہ روایت اضطراب سے خالی نہیں ہے، تو اس کو کیسے
 اختیار کیا جائے؟

راقم کہتا ہے کہ ہم نے مولانا بنوری کے حوالہ سے ”عند صدره“ کے متعلق
 لکھا تھا کہ یہ مستقل دوسری طویل حدیث ہے، لہذا اب ”علی الصدر“ اور
 تحت السرة “ کا اضطراب باقی رہ گیا اور یہ معلوم ہے کہ اگر اضطراب دفع و رفع
 ہو سکتا ہو تو پھر اس کو بطریق تطبیق یا ترجیح رفع کیا جاتا ہے اور ”علی الصدر“ اور

”تحت السرة“ میں تطبیق تو ممکن نہیں، البتہ ”تحت السرة“ کی روایت کو سند کے عالی اور قوی ہونے کی وجہ سے ترجیح دی جاسکتی ہے؛ کیونکہ ہم نے روایت ابن خزیمہ میں ضعف ثابت کیا تھا کہ اس میں مؤمل بن اسماعیل راوی ہیں جو کہ ضعیف ہیں، اور ابن ابی شیبہ کی سند جیسا کہ ابھی ہم نے بتلایا قوی اور صحیح ہے۔ اس لیے ”تحت السرة“ کی روایت کو ترجیح دے کر اضطراب رفع کیا جائے گا، لہذا اس سے متن کے اضطراب کی علت ختم ہوگئی۔

علامہ نیمویؒ کا رجحان اور اس کا جواب

آپ نے ”تحت السرة“ کی زیادتی کو اکثر نسخوں میں صحیح ماننے کے بعد ثقات کی مخالفت کی وجہ سے غیر محفوظ قرار دیا ہے۔ (التعلیق الحسن: ۱۸۱)

کیونکہ بہت سے حفاظ نے جیسا کہ ہم ”ابن خزیمہ“ کی روایت میں بیان کر چکے ہیں اس زیادتی کو بیان نہیں کیا اور علامہ نیمویؒ نے ”التعلیق الحسن“ میں شاذ کی تعریف یہ کی ہے کہ ثقہ اوثق یا جماعت ثقات کی مخالفت کرے، خواہ مخالفت دوسری روایات کے منافی ہو یا منافی نہ ہو۔ (التعلیق الحسن: ۶۷۱)

اس تعریف پر ”تحت السرة“ کی زیادتی بھی غیر محفوظ اور شاذ ہوگی۔ مگر اس میں دو وجہ سے کلام ہے: ایک تو اس وجہ سے کہ ابن الصلاح اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے روایت میں زیادتی کے قابل قبول ہونے میں منافی ہونے اور نہ ہونے کا اعتبار کیا ہے کہ اگر یہ زیادتی دوسرے ثقہ یا اوثق کی روایت کے منافی ہو (یعنی اس زیادتی کو قبول کرنے سے دوسرے اس سے بڑے ثقہ کی روایت کا مردود ہونا لازم آتا ہو) تو قبول نہیں کی جائے گی، اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر قبول کی جائے گی۔ (مقدمہ ابن الصلاح: ۴۴، شرح النجیہ: ۳۳)

اس اصول پر ”تحت السرة“ کی زیادتی قبول کی جائے گی؛ کیونکہ یہ دوسری روایات کے منافی نہیں؛ کیونکہ دوسرے حضرات حفاظ نے اس زیادتی سے سکوت فرمایا ہے۔ رہی ”ابن خزیمہ“ کی روایت اس کے بارے میں ہم نے بتلایا تھا کہ یہ زیادتی مؤمل کی ہے، جو کہ ضعیف راوی ہیں، لہذا یہ زیادتی منکر ہوگی، اور یہ معلوم ہے کہ ضعیف کی زیادتی مقبول نہیں ہوتی، جب کہ ثقہ کی زیادتی بھی مطلقاً مقبول نہیں تو ضعیف کی زیادتی کیسے مقبول ہوگی۔ (وسیاتی زیادة تحقیق)

حاصل یہ ہے کہ علامہ نیوی کی تحقیق پر ”تحت السرة“ کی زیادتی مقبول نہیں اور امام ابن الصلاح اور حافظ ابن حجر وغیرہ حضرات کے نزدیک ان کی تحقیق پر مقبول ہونا چاہئے جیسا کہ خود علامہ نیوی نے ”تعلیق التعلیق“ میں بیان کیا ہے۔ دوسرے اس وجہ سے ”تحت السرة“ کی مذکورہ زیادتی کو غیر محفوظ اور شاذ قرار دینا خالی از نظر نہیں؛ کیونکہ اس کے شواہدات موجود ہیں۔ حضرت علیؓ کی روایت جس کو ہم عنقریب پیش کریں گے اس کی شاہد موجود ہے، جس کا درجہ حسن سے کم کا ہرگز نہیں، جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا۔ لہذا یہ درجہ شذوذ سے نکل جائے گی۔ نیز حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ کی روایت بھی اس سلسلہ میں اس کی شواہدات میں سے ہوگی۔ لہذا جب اس کی تقویت شواہد سے ہو رہی ہے، تو پھر اس میں شذوذ کہاں باقی رہا؟ غرض یہ روایت درجہ شذوذ سے قطعاً نکل جائے گی۔ کمالاً یخفی علی اولی النہی۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ”ابن ابی شیبہ“ کی یہ روایت باعتبار سند کے قوی اور بے غبار ہے اور علت انقطاع بے اصل ہے۔ کما مر۔ البتہ متن میں دو علتیں ہیں: ایک اضطراب کی جس کا دفعیہ علو سند و قوت سند سے ہو گیا، دوسری علت شذوذ کی ہے جس

کا دفعیہ شواہدات سے ہو گیا۔ لہذا یہ باعتبارِ سند و متن کے قابلِ حجت ہوگئی۔ (واللہ اعلم) اس کے متعلق بعض ابحاث ہم باب کے آخر میں ذکر کریں گے۔

دوسری حدیث

﴿عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ وَضَعُ الْكَفِّ عَلَى الْكَفِّ تَحْتَ الشُّرَّةِ﴾ (حضرت علیؑ نے فرمایا کہ: ہاتھ کو ہاتھ پر (رکھ کر) ناف کے نیچے باندھنا سنت ہے) (ابوداؤد: واحمد: ۱۱۰۱، ابن ابی شیبہ: ۳۴۲/۱، الدرر القطنی: ۲۸۶/۱، لیبہقی: ۳۱/۲)

یہ حدیث متعدد محدثین نے روایت کی ہے، جیسا کہ اوپر حوالے دئے گئے ہیں اور ان میں امام ابوداؤد بھی ہیں، ہاں سنن ابی داؤد کے بعض نسخوں میں یہ حدیث پائی نہیں جاتی، مگر متعدد نسخوں میں موجود ہے، چنانچہ مشہور اہل حدیث عالم علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے ”عمون المعبود“ میں لکھا ہے کہ: یہ حدیث بعض نسخوں میں پائی نہیں جاتی مگر ابن الاعرابی اور دوسروں کے نسخوں میں ثابت ہے، حافظ جمال الدین مزنی نے ”تحفة الاشراف فی معرفۃ الاطراف“ میں فرمایا کہ: یہ حدیث ابوسعید الاعرابی اور ابن داسہ و دیگر بہت سے لوگوں کے نسخوں میں موجود ہے۔ (عمون المعبود: ۳۲۳/۲)

حدیث کی سند پر بحث

اس روایت کے دو راویوں پر کلام کیا گیا ہے: ایک راوی عبدالرحمن بن اسحاق کوفی واسطی ہیں، اور دوسرے زیاد بن زید۔ پہلے راوی عبدالرحمن بن اسحاق کوفی واسطی ہیں، جن کی کنیت ابوشیبہ ہے، یہ راوی متکلم فیہ ہیں۔ امام نوویؒ نے کہا ہے کہ وہ باتفاق ائمہ جرح و تعدیل ضعیف ہیں۔ (شرح مہذب: ۲۷۰/۳)

مگر حقیقت یہ ہے کہ عبدالرحمن بن اسحاق کی اگرچہ جمہور ائمہ نے تضعیف کی ہے مگر بعض ائمہ نے ان کی توثیق بھی کی ہے، تمام لوگوں نے ان کی تضعیف نہیں کی ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے کہ: ”منکر الحدیث، یکتب حدیثہ، ولا یحتج بہ“ (یہ منکر الحدیث ہیں، ان کی حدیث لکھی جاسکتی ہے، اور اس سے احتجاج نہیں کیا جاسکتا) اور اسی طرح امام عجمی نے کہا کہ: ”ضعیف جائز الحدیث، یکتب حدیثہ“ (کہ یہ ضعیف، جائز الحدیث ہیں، ان کی حدیث لکھی جاسکتی ہے) (تہذیب الکمال: ۵۱۸/۱۶، تہذیب التہذیب: ۱۲۵/۶)

اور محدثین کے مطابق یہ الفاظ اس راوی کے حق میں بولے جاتے ہیں جس کی حدیث اگرچہ فی نفسہ حجت نہ ہو لیکن دوسری روایات و شواہدات کی وجہ سے قبول کی جاسکتی ہو۔ (دیکھو فتح المغیث سخاوی: ۳۶۹/۱)

اور امام ترمذی نے اپنی ”جامع“ میں فرمایا کہ: بعض اہل علم نے حافظہ کی وجہ سے عبدالرحمن کی تضعیف کی ہے۔ (جامع الترمذی: ۷۵/۲)

اس میں امام ترمذی نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض لوگ ان کی تضعیف نہیں کرتے۔ اسی لیے خود امام ترمذی نے ”باب ما جاء فی سوق الجنة“ میں ان کے طریق سے مروی ایک حدیث کی تحسین بھی فرمائی ہے۔ (ترمذی: ۷۸/۲)

اس طرف حافظ نے ”القول المسدود“ میں اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ کہا ہے کہ: امام ترمذی نے ان کی حدیث کی تحسین کی ہے باوجود ان کے اس قول کے کہ حافظہ کی وجہ سے ان میں کلام کیا گیا ہے۔ (القول المسدود: ۳۵)

نیز حافظ نے لکھا ہے کہ: حاکم نے ان کے طریق سے مروی ایک حدیث کی تصحیح کی ہے اور ابن خزیمہ نے اپنی ”صحیح“ میں ان کی ایک دوسری حدیث کی تخریج کی ہے، لیکن

کہا ہے کہ: قلب میں ان (عبدالرحمن) سے کچھ ہے۔ (القول المسدود: ۳۵)

لہذا عبدالرحمن بن اسحاق متفق علیہ ضعیف نہیں بلکہ بعض کے نزدیک یہ حسن الحدیث ہیں، لہذا ان کی حدیث کو مطلقاً ضعیف کہنا صحیح نہیں، اور اگر جمہور کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جیسا کہ عرض کیا گیا، ان کی حدیث کا اعتبار و شہادت کے لئے لینا تو بلاشبہ درست ہے۔

دوسرے راوی زیاد بن زید ہیں، ان کو مجہول کہا گیا ہے، مگر یہ تمام سندوں میں نہیں ہیں بلکہ ابوداؤد کی سند میں ہیں، اور دارقطنی وغیرہ نے اس حدیث کو بطریق ”عبدالرحمن عن العمان بن سعد عن علی“ بھی روایت کیا ہے اور دو سندوں میں زیاد کو ذکر کیا ہے۔ پس زیاد کی جہالت روایت کی قած نہ ہوگی جب کہ دوسرا طریق موجود ہے۔ (بذل المجہود: ۲۳۲)

حدیث علی کا رفع حکمی

جب سند کی حیثیت معلوم ہوگئی، تو اب یہ دیکھئے کہ یہ حدیث علی حکماً مرفوع ہے؛ کیونکہ حضرت علیؑ نے اس حدیث میں لفظ سنت استعمال فرمایا ہے اور محدثین نے صحابی کے قول ”السنة کذا“ وغیرہ کو مرفوع قرار دیا ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

”وَمِنَ الصَّيغِ الْمُحْتَمَلَةِ قَوْلُ الصَّحَابِيِّ: مِنَ السُّنَّةِ كَذَا، فَالْأَكْثَرُ عَلَى أَنَّ ذَلِكَ مَرْفُوعٌ“ (اور مرفوع ہونے کا احتمال رکھنے والے الفاظ میں سے صحابی کا قول: ”من السنة کذا“ (یعنی سنت یہ ہے) ہے، پس اکثر (جمہور محدثین اور علماء) اس پر ہیں کہ یہ مرفوع ہے)۔ (شرح الخبہ: ۷۹)

اور علامہ نوویؒ رقم طراز ہیں:

”وَأَمَّا إِذَا قَالَ الصَّحَابِيُّ: أَمْرُنَا بِكَذَا، أَوْ نَهْيُنَا عَنْ كَذَا، أَوْ مِنَ السُّنَّةِ كَذَا، فَكُلُّهُ مَرْفُوعٌ عَلَى الْمَذْهَبِ الصَّحِيحِ الَّذِي قَالَهُ الْجَمْهُورُ مِنْ أَصْحَابِ الْفُنُونِ“ جب صحابی یوں کہے کہ ہمیں اس بات کا امر کیا گیا، یا ہم کو اس چیز سے روکا گیا، یا کہے کہ سنت یہ ہے تو یہ سب کا سب مرفوع ہے، صحیح مذہب کے اعتبار سے جس کے جمہور اصحاب فنون قائل ہیں۔ (مقدمہ شرح مسلم: ۱۷)

معلوم ہوا کہ یہ حدیث علیؑ موقوف نہیں بلکہ مرفوع ہے، اس کو موقوف کہنا فن سے ناواقفیت ہے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ صحابی کا ”فَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ“ کہنا، یا ”قَالَ“ کہنا سنیت پر اس قدر صراحت کے ساتھ دلالت نہیں کرتا، جتنا کہ لفظ سنیت اس پر دلالت کرتا ہے؛ کیونکہ فعل میں احتمال ہے کہ کبھی کبھی کیا ہو جس سے سنیت کا ثبوت نہیں ہوگا، الا یہ کہ قرائن ہوں، ہاں لفظ سنیت کہنا اس پر صراحتاً دلالت کرتا ہے کہ یہ کام آپ نے بطور عبادت و سنیت کیا ہے۔ (کمالا یخفی علی من له أدنی فهم)

غرض یہ کہ یہ روایت باعتبار سند کے درجہ حسن سے کم نہیں اور باعتبار متن کے اپنے مدعی پر صریح دال ہے، کہ ”تحت السرة“ ہاتھ باندھنا سنیت ہے۔ اس کے علاوہ حضرت وائل کی حدیث سے اس کی تقویت ہوتی ہے جس سے انکار کرنا تعنت و عناد ہے۔

تیسری حدیث

﴿عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: أَخَذُ الْأَكْفَ عَلَى الْأَكْفِ﴾

فِي الصَّلَاةِ تَحْتَ السُّرَّةِ ﴿﴾ (حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ نماز میں ہتھیلی کو ہتھیلی پر ناف کے نیچے رکھنا ہے) (ابوداؤد)

اس کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے جو ابن الاعرابی کے نسخہ میں ہے، اس میں عبدالرحمن بن اسحاق ہیں جن پر کلام اوپر گزر چکا۔ (عمون المعبود: ۳۲۵/۲، بذل الجہود: ۲۴۲/۲)

چوتھی حدیث

﴿ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : ثَلَاثٌ مِنْ أَخْلَاقِ النَّبِيِّ : تَعْجِيلُ الْإِفْطَارِ وَتَأْخِيرُ السُّحُورِ وَوَضْعُ الْيَدِ الْيُمْنَى عَلَى الْيُسْرَى فِي الصَّلَاةِ تَحْتَ السُّرَّةِ ﴾ (رواہ ابن حزم فی المحلی: ۳۰۳/۳)

(حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ تین باتیں اخلاق نبوت میں سے ہیں: افطار میں جلدی کرنا، سحری میں تاخیر کرنا اور نماز میں داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر ”تَحْتَ السُّرَّةِ“ یعنی ناف کے نیچے باندھنا)

علامہ نیوی فرماتے ہیں کہ: اس کی سند سے ہم واقف نہ ہو سکتے تاہم شواہدات میں ضعیف بھی داخل ہو جاتے ہیں اور اگر صحیح ہوں تو کلام ہی نہیں۔ (التعلیق الحسن: ۱۷۱)

پانچویں حدیث

﴿ عَنْ الْحِجَابِ بْنِ حَسَانَ قَالَ : سَمِعْتُ أَبَا مَجَلَزٍ أَوْسَأَلْتُهُ قَالَ : قُلْتُ : كَيْفَ يَصْنَعُ ؟ قَالَ : يَضَعُ بَاطِنَ كَفِّ يَمِينِهِ عَلَى ظَاهِرِ كَفِّ شِمَالِهِ ، وَيَجْعَلُهَا أَسْفَلَ مِنَ السُّرَّةِ ﴾ (ابن ابی شیبہ: ۴۲۷/۱)

(حجاج بن حسان نے کہا کہ: میں نے حضرت ابو مجلز تابعی سے سنا، یا میں نے خود ان سے سوال کیا کہ کیسے کروں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اپنے دائیں ہاتھ کے باطن کو بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھے اور ان (ہاتھوں) کو ناف سے نیچے رکھ لے) علامہ نیوی نے کہا کہ: اس کو ابو بکر بن ابی شیبہ نے روایت کیا اور اس کی اسناد صحیح ہے۔ (آثار السنن: ۱۷۱)

اس روایت کو امام ابوداؤد نے ابن الاعرابی کے نسخہ میں تعلقاً روایت کیا ہے، اور ”تعلیق الحسن“ اور ”بذل المجہود“ میں بحوالہ ”الجوہر النقی“، ”تمہید“ لابن عبدالبر سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو مجلز تابعی کا مذہب ”تحت السرة“ ہاتھ باندھنے کا تھا۔ (تعلیق الحسن: ۱۷۱، بذل المجہود: ۲۴۲)

امام بیہقی نے حضرت ابو مجلز کا قول ”فوق السرة“ بتلایا ہے، مگر علامہ ابن الترمکانی نے ”الجوہر النقی“ میں کہا کہ: اس کی سند بیان نہیں کی تاکہ سند دیکھتے، اور ابو مجلز کا مذہب ”تحت السرة“ ہاتھ باندھنے کا تھا جو بسند جید آیا ہے۔ (بذل المجہود: ۲۴۲)

یہ چند احادیث ہیں، بعض مرفوع اور بعض موقوف، اور ایک مقطوع ہے، ان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نماز میں تحت السرة ہاتھ باندھنا ثابت ہے، ان میں سے پہلی حدیث کا صحیح ہونا بھی واضح ہو چکا ہے اور دوسری حدیث حضرت علی کی حسن ہے اور تیسری حضرت ابو ہریرہ کی روایت بھی حسن سے کم نہیں۔ اور اگر یہ سب روایات ضعیف بھی ہوں تب بھی ضعیف روایات مختلف و متعدد طرق سے ثابت ہوں تو حسن ہو جاتی ہیں۔ پھر حضرت انس کی حدیث اور حضرت ابو مجلز تابعی کا اثر، یہ سب مل ملا کر تقویت میں اور اضافہ ہو گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ”تحت السرة“ کی روایات سب ضعیف نہیں بلکہ صحیح بھی ہیں اور حسن بھی، ضعیف بھی اور سب مل کر تو صحیح کو بھی اصح بنا دیتی ہیں جن پر احناف عمل کرتے ہیں۔

ترجیح مذہب حنفی

اوپر کی تقریر سے احناف کا مستدل اور اس کا صحیح وقوی ہونا ثابت ہو گیا، اب ہم یہاں علی التنزل کہتے ہیں کہ اگر علامہ نیموی کے قول کے مطابق ابن ابی شیبہ کی ”تحت السرة“ کی زیادتی شاذ ہو جیسا کہ ”علی الصدر“ کی زیادتی شاذ ہے، تو جس طرح ”تحت السرة“ کا ثبوت اس سے نہ ہوگا اسی طرح ”علی الصدر“ کا ثبوت اس سے نہیں ہوگا۔ اب اس کے علاوہ دیگر روایات کو دیکھا جائے، حضرت ہلب کی روایت جس کو مؤلف نے اول نمبر پر بیان کیا تھا، یہ بھی غیر محفوظ اور شاذ ہے، جس میں اس کے راوی سماک ”علی صدرہ“ کے اضافہ میں متفرد ہیں، لہذا یہ بھی قابل احتجاج نہیں ہے۔ اس کے مقابل احناف کے پاس حضرت علیؑ کی روایت ہے، جو حسن ہے، کما مر۔ اور اگر حسن نہ بھی ہو تو دیگر احادیث سے مل کر حسن ہو ہی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ ہلب کی روایت میں سنیت کا بیان مسلم نہیں، ممکن ہے کہ کبھی ایسا کیا ہو، اس کے برخلاف حضرت علیؑ کی روایت سنیت پر صریح ہے۔ اسی طرح حضرت وائلؑ کی روایت جس کو مؤلف نے نمبر ۲ پر ذکر کیا تھا سنیت میں صریح نہیں ہے، بخلاف ان روایات کے جن میں سنیت کو بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ اوپر روایات گزر چکی ہیں۔

اگر یوں کہو کہ ”علی الصدر“ کی روایات ضعیف سب مل کر حسن ہو جاتی ہیں، تو ہم کہتے ہیں کہ احناف کی روایات سب مل کر حسن سے آگے درجہ صحیح میں

داخل ہو جاتی ہیں، جب کہ ابن ابی شیبہ کی سند میں کسی کو کلام کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اور اگر ابن خزیمہ کی ”علی الصدر“ والی روایت میں مؤمل کو ثقہ مان لیا جائے تو بھی ابن ابی شیبہ کی سند اس سے عالی ہے۔ کما مرفعیلاً۔ اور اگر ”علی الصدر“ کو زیادتی ثقہ کہو تو ”تحت السرة“ تو بدرجہ اولیٰ اس کا مستحق ہوگا کہ زیادتی ثقہ کہلایا جائے اور قبول کیا جائے، جیسا کہ علامہ نیوٹی نے بھی ”تعلیق التعلیق“ میں اس کی تصریح کی ہے، لہذا جب دونوں زیادتی ثقہ ہوں گے اور ظاہر ہے کہ یہ اضطراب متن ہے، لہذا علو اسناد کی وجہ سے ”تحت السرة“ کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ حاصل یہ ہے کہ کسی بھی طرح ”تحت السرة“ پر ”علی الصدر“ والی روایات کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ فمن ادعی فعلیہ البیان۔

مؤلف ”حدیث نماز“ کے بعض بیانات کا جائزہ

دلائل کی اس گفتگو کے بعد ہم مؤلف ”حدیث نماز“ کے چند بیانات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جس سے مؤلف صاحب کی صداقت و امانت علمی کا ناظرین اندازہ لگا سکیں گے۔

حوالہ یاد ہو کہ؟

جناب مؤلف صاحب نے ایک عنوان باندھا ہے: ”آپ کے یہاں بھی اس کا ثبوت ہے“، اس کے بعد علماء احناف پر بے جا الزامات اپنی عادت شریفہ کے مطابق لگانے کے بعد علامہ عینی کی ”عمدة القاری“ سے نقل کیا کہ: ”امام شافعی نے حضرت وائل بن حجر کی روایت سے حجت پکڑی ہے، جس کی ابن خزیمہ نے تخریج کی ہے کہ حضرت وائل نے کہا کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، آپ

نے دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر اپنے سینے پر رکھا۔ (حدیث نماز: ۶۵)

جواب: ہم پہلے بھی مؤلف کی اس قسم کی تلبیسات اور ہیر پھیر پر عرض کر چکے کہ حنفیہ کی کسی کتاب میں کسی امام کا مسلک بیان کرنے سے اس کو ہمارا مسلک سمجھ لینا یا دوسروں کو سمجھانا جہالت یا تلبیس ہے۔

علامہ عینی تو امام شافعی کا مذہب اور ان کی دلیل بیان کر رہے ہیں نہ کہ احناف کا مذہب، پھر احناف کے یہاں اس کا ثبوت کہاں اور کیسے ہوا؟ کیا یہ علمی امانت و دیانت کے تقاضے کے خلاف نہیں؟ اور کیا یہ جھوٹ میں داخل نہیں؟

تردید یا تائید؟

مؤلف نے لکھا ہے کہ صاحب ”ہدایہ“ نے ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کے ثبوت میں جو روایت بیان کی ہے، اس پر علامہ عینی لکھتے ہیں: ”هَذَا قَوْلُ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، وَاسْنَادُهُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ غَيْرُ صَحِيحٍ“ (یعنی: یہ حضرت علی کا قول ہے اور اس کی سند نبی کریم ﷺ تک صحیح نہیں ہے۔) (حدیث نماز: ۶۵)

جواب: میں کہتا ہوں کہ مؤلف کو اس عبارت سے کیا فائدہ اور احناف کو کیا ضرر ہوا؟ کیونکہ علامہ عینی کے بیان کا یہ مطلب ہے کہ صاحب ”ہدایہ“ نے ”لقولہ علیہ السلام“ کہا تھا کہ یہ نبی کریم ﷺ کا قول ہے، اس پر علامہ عینی نقد کر رہے ہیں کہ یہ حضرت علی کا مقولہ ہے، اس کی سند میں حضرت علی کے بعد نبی کریم ﷺ کا نام مبارک بڑھانا صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ یہ روایت حضرت علی پر موقوف ہے۔ اور ہم پہلے اس پر بحث کر چکے ہیں کہ یہ مقولہ حضرت علی کا ہی ہے مگر مرفوع میں داخل ہے۔ چنانچہ علامہ عینی کا جو مقولہ مؤلف نے نقل کیا ہے اس کے بعد علامہ عینی رقمطراز ہیں ”وقول علی: ”إِنَّ مِنَ السُّنَّةِ“ هَذَا اللَّفْظُ يَدْخُلُ فِي الْمَرْفُوعِ عِنْدَهُمْ“

حضرت علیؓ کا یہ فرمانا کہ ”یہ سنت ہے“ یہ لفظ محدثین کے یہاں مرفوع میں داخل ہو جاتا ہے۔ (عمدة القاری: ۱۵۳)

اب غور فرمائیے کہ یہ احناف کی تائید کر رہے ہیں یا تردید کر رہے ہیں، اس صورت میں مؤلف کو اس سے کیا فائدہ ہو اور احناف کو اس سے کیا ضرر ہو؟

تضعیف یا توثیق؟

پھر مؤلف نے لکھا ہے کہ:

”حدیث پیغمبر تو ہے ہی نہیں، حضرت علیؓ کا بھی قول ہے یا نہیں؟ اس پر علامہ عینی جرح و تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”وَلَكِنَّ الَّذِي رُوِيَ عَنْ عَلِيٍّ فِيهِ مَقَالٌ لِأَنَّ فِي سَنَدِهِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ إِسْحَاقَ الْكُوفِيَّ، قَالَ أَحْمَدُ: لَيْسَ بِشَيْءٍ مُنْكَرٍ الْحَدِيثُ“ (جو قول حضرت علیؓ سے مروی ہے اس میں کلام ہے؛ کیوں کہ اس کی سند میں عبدالرحمن بن اسحاق کوئی ہیں۔ امام احمد نے کہا کہ یہ شخص بالکل نکما ہے اور منکر الحدیث (بات کرنے میں بڑا خراب) ہے) ہو سکتا ہے حضرت علیؓ کے نام سے اسی نے یہ روایت گھڑ لی ہو) اس کے بعد علامہ عینی نے ایک دو نہایت ہی ضعیف ثبوت نزم انداز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کے بیان کیے، مگر زور بیان سینے پر ہاتھ باندھنے کے دلائل ہی میں ہے۔“ (حدیث نماز: ۶۶)

جواب: راقم کہتا ہے کہ علامہ عینیؒ یہاں حدیث علیؓ پر جرح و تنقید نہیں کر رہے ہیں، اگر ایسا ہی سمجھا ہے تو یہ مؤلف کی فہم ناقص کا نتیجہ ہے جس کی داوہم پہلے بھی کئی جگہ دے چکے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ عینیؒ اول تو یہ بیان کر رہے ہیں کہ اس حدیث میں عبدالرحمن کی وجہ سے کلام ہوا ہے، اس کے بعد ہی فوراً اس کا جواب دے

رہے ہیں، جس کو نقل کرنے میں مؤلف ”حدیث نماز“ کو یہ اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ حقیقت سب کے سامنے کھل کر آجائے گی، اور اپنی بات بنائے نہ بنے گی، لہذا اس جواب کو ہی اڑا دیا، مگر اہل انصاف کا تو یہ رویہ نہیں ہوتا! اے کاش انصاف کا نعرہ لگانے والے انصاف کا خون نہ کرتے اور حق کی تلاش کے دعوے دار حق کا گلانہ گھونٹتے تو کیا ہی خوب ہوتا!

لیجئے! علامہ عینیؒ مذکورہ عبارت کے بعد خود اس کا جواب ان الفاظ میں دے رہے ہیں:

”قلت: روی أبو داؤد، وسکت علیہ، ویعضدہ ما رواہ ابن حزم من حدیث أنس: من أخلاق النبوة وضع اليمين على الشمال تحت السرّة“ (یعنی: میں کہتا ہوں کہ ابو داؤد نے (حضرت علیؓ کی حدیث) روایت کی اور اس پر سکوت کیا (جو ان کے نزدیک روایت کے قابلِ حجت ہونے کی علامت ہے) اور اس کی تائید اور تقویت اس روایت سے ہوتی ہے جس کو علامہ ابن حزم نے حضرت انسؓ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ اخلاقِ نبوت میں سے دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے باندھنا ہے)۔ (عمدة القاری: ۱۵۳)

حاصلِ جواب یہ ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک اگر یہ منکر الحدیث ہیں تو امام ابو داؤدؒ کے نزدیک یہ قابلِ حجت ہیں، اسی لیے تو انہوں نے سکوت کیا اور اگر یہ ضعیف ہی ہیں تو اس کی تائید مذکورہ بالا حدیثِ انسؓ سے ہوتی ہے، لہذا یہ ضعف ختم ہو گیا۔

انتباہ

علامہ عینیؒ نے امام ابو داؤدؒ کا سکوت بیان کیا ہے مگر میرے نزدیک اس میں

اشکال و کلام ہے؛ کیوں امام ابو داؤد نے اگرچہ حدیث علیؑ پر کلام نہیں کیا اور سکوت کیا ہے، مگر حدیث ابی ہریرہ میں عبد الرحمن کی وجہ سے کلام کیا ہے اور امام احمدؒ سے ان کی تضعیف نقل کی ہے جیسا کہ ابن الاعرابی کے نسخہ میں ہے۔ لہذا عبد الرحمن امام ابو داؤد کے نزدیک ضعیف ہوں گے۔ مگر اس سے علامہ عینیؒ کا جواب مخدوش نہیں ہوتا؛ کیونکہ جواب کا خلاصہ یہ ہوگا کہ یہ عبد الرحمن ضعیف بھی ہوں تو ان کی حدیث کی مؤید و شاہد ابن حزم کی روایت انس ہے، لہذا ضعف ختم ہو گیا۔ فافہم ولا تعجل بالردو القبول۔

ابن امیر الحاج کی تقلید

مؤلف نے علامہ ابن امیر الحاج علیہ الرحمۃ کی شرح منیہ سے مندرجہ ذیل عبارت اپنے ترجمہ کے ساتھ بحوالہ ”فتاویٰ ثنائیہ“ نقل کی ہے:

” ان الثابت من السنة وضع اليمين على الشمال ، ولم يثبت
حدیث تعیین المحل الذی یكون فیہ الوضع من البدن إلا حدیث
وائل“۔ (ملخصاً) (بیشک سنت سے ثابت ہے سیدھا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھنا،
مگر ایسی کوئی بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی جس کی رو سے بدن کے کسی خاص
مقام پر ہاتھوں کا رکھنا واجب ہو سوائے وائل کی حدیث کے) (جس میں سینے پر
ہاتھ باندھنے کی سنت کا بیان ہے) (حدیث: ۶۶)

جواب: میں کہتا ہوں کہ اسی طرح کی بات علامہ ابن نجیم مصری نے ”البحر
الرائق“ میں کہی ہے اور ان حضرات نے یہ بات ان کے پیش نظر دلائل کے لحاظ سے
کہی ہے، ان کے سامنے ایک تو یہ اثر تھا جس میں ہے کہ تین باتیں سنن مرسلین میں
سے ہیں، اور ان میں سے ایک تحت السرة ہاتھ باندھنا ہے، دوسرے حضرت وائل کی

حدیث جس میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے، ان دو کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے یہ بات لکھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان دو احادیث میں سے حضرت وائل کی حدیث کے سوا دوسری حدیث ہاتھ باندھنے کے مقام و محل کو بتانے والی ثابت نہیں، لہذا ممکن ہے کہ ان حضرات کے پیش نظر صرف یہی دو احادیث ہوں اور دوسری احادیث نہ ہوں، اس لئے یہ بات بطور حصر اضافی کہی ہو اور جیسا کہ اوپر بھی عرض کیا ہے مصنف ابن ابی شیبہ کا وہ نسخہ جس میں ”تحت السرة“ کی زیادتی وارد ہے وہ بعض کے پاس نہیں تھا، لہذا ان کی بات کو حصر حقیقی سمجھ کر یہ مطلب لینا کہ حضرت وائل کی حدیث کے سوا دنیا میں کوئی حدیث ثابت نہیں ان کی مراد کے خلاف ہے۔

پھر علامہ ابن امیر الحاج اور علامہ ابن نجیم مصری کا مقام حدیث کی جانچ پرکھ میں اس قدر بڑا نہیں ہے کہ ان کی بات کو اس سلسلہ میں حرف آخر مان لیا جائے، جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ ان حضرات کی یہ بات مخدوش ہے، کیونکہ مذکورہ حدیث وائل جرح سے خالی نہیں اور اس سلسلہ میں دوسری حدیث ثابت بھی ہے، جیسا کہ اوپر گزرا ہے، لہذا صاحب ”حدیث نماز“ کے لئے بلا تحقیق ان کی بات کو مان کر اندھی تقلید کے جرم کا ارتکاب کیوں کر جائز ہو گیا؟

جھوٹ کا بدترین نمونہ

مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”عین الہدایہ“ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:
 ”ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی حدیث باتفاق ائمہ محدثین ضعیف

ہے۔“ (حدیث نماز: ۶۷)

راقم کہتا ہے کہ مؤلف نے یہاں بھی حسب معمول جھوٹ کا سہارا لیا: اولاً تو علامت واوین (” ”) سے یہ تاثر دیا کہ بعینہ یہ عبارت ”عین الہدایہ“ میں ہے،

حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ وہاں پہلے حضرت علیؓ کی ”السنة وضع الكف الخ“ والی حدیث بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: نوویؒ نے کہا کہ اس روایت کے ضعیف ہونے پر ائمہ حدیث متفق ہیں۔

مگر مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس عبارت میں لفظ ”اس روایت“ کے بجائے ”ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی حدیث“ لکھ کر یہ دھوکہ دینا چاہا ہے کہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی جتنی حدیثیں ہیں ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ محض جھوٹ ہے۔ کسی ایک حدیث کے ضعیف ہونے سے اس باب کی تمام احادیث کیوں ضعیف ہو جائیں گی؟

ثانیاً: خود ”عین الہدایہ“ میں علامہ نوویؒ کے مذکورہ قول کے بعد لکھا ہے کہ ”لیکن ”مصنف ابن ابی شیبہ“ میں بطریق ابراہیم بن ادہم النخعی (جو اولیاء مشائخ میں سے معروف ہیں) زیر ناف ہاتھ باندھنا مرفوع حدیث سے ثابت ہے، اور اس کی اسناد میں کوئی کلام نہیں، سوائے اس کے کہ علقمہ نے ابن مسعود سے سنا، یا نہیں، تو اس میں امام ترمذیؒ کی شہادت کافی ہے کہ سماع ثابت ہے، پس روایت صحیح ہے۔ (عین الہدایہ: ۴۵۰/۱)

غور کیجئے کہ صاحب عین الہدایہ علامہ نووی کا قول ذکر کر کے اس کے بعد اپنی تحقیق پیش کر رہے ہیں مگر ان کی تحقیق کو چھپا کر ان کی طرف وہ قول منسوب کر رہے ہیں جو ان کا نہیں، بلکہ ان کے نقطہ نظر کے خلاف ہے، معلوم نہیں کہ کس طرح کی یہ اہل حدیثیت ہے؟

پھر یہ بھی عجیب ہے کہ صحیح حدیث سامنے آجانے کے باوجود اس پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں اور احناف کی عبارتوں میں ترمیم کر کے لوگوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اور اہل حدیث اور منصف اور خدا ترس ہونے کے دعوے دار بھی ہیں۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

جھوٹ کا دوسرا نمونہ

عربی ”حاشیہ ہدایہ“ کے حوالے سے مؤلف نے حدیثِ علیؑ کے متعلق نقل کیا کہ ”ضعیف متفق علیٰ ضعفہ“ اس کا مطلب آگے یہ لکھا ہے کہ ”ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی روایت ضعیف ہے اور اس پر تمام اماموں کا اتفاق ہے۔“ (حدیث نماز: ۶۷)

جواب: راقم کہتا ہے کہ یہ بھی دھوکہ اور تلبیس ہے، وہاں ”متفق علیٰ ضعفہ“ کے بعد ”کذا قال النووی“ (یعنی یہ علامہ نوویؒ کا قول ہے) لکھا ہے۔ اور مؤلف اس قول کو احناف کی جانب منسوب کر رہے ہیں، یہ اور بات ہے کہ انہوں نے اس کو نقل کیا اور خاموش رہے، مگر تنبیہ بھی کی کہ یہ علامہ نوویؒ کا قول ہے۔ دوسرے ”ضعفہ“ میں ضمیر کا مرجع خاص حدیثِ علیؑ ہے جیسا کہ ظاہر ہے، مگر مؤلف نے ”ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی روایت“ کو اس کا مرجع بنایا جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس باب کی سب روایات ضعیف ہیں، کیا یہ تلبیس نہیں؟ اور حق چھپانا نہیں؟

اور ہم نے علامہ نوویؒ کے قول کا جواب اوپر مفصلاً دے دیا ہے، اگرچہ محشی ”ہدایہ“ حنفی کو اس کا علم نہ ہو اور وہ خاموش رہے، تو مذہبِ احناف پر اس سے کیا اثر اور اس سے کیا ضرر؟

تقلید محض

مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”عین الہدایہ“ اور ”شرح وقایہ اردو“ کے حوالے سے نقل کیا کہ سینے پر ہاتھ باندھنے کی حدیث قوی ہے۔ (حدیث نماز: ۶۷)

جواب: مگر مؤلف اس عبارت سے پہلے یہ بھی پڑھ لیتے اور اس کا جواب دیتے تو اپنے مذہب کی کوئی خدمت ہوتی، مگر مقصود تحقیق اور تلاشِ حق نہیں، اس لیے جو دل چاہا لے لیا اور جو چاہا چھوڑ دیا۔ ”عین الہدایہ“ میں مذکورہ عبارت سے پہلے یہ عبارت بھی ہے: ”لیکن ظاہر ہے کہ حدیثِ وائل میں متیقن ایک مرتبہ نماز کا فعل ہے اور صرف اس قدر سے سنت ہونا ثابت نہیں ہوتا“۔ (عین الہدایہ: ۲۵۰/۱)

مؤلف نے اس سے قطع نظر حدیث کی قوت کو نقل کر دیا، حالانکہ اس حدیث سے ”سنیت“ کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اس حدیث کی قوت ان حضرات نے بھی غالباً علامہ شوکانی وغیرہ کی نقول پر اعتماد کر کے بیان کر دی ہوگی، جس کی حقیقت ہم اوپر واضح کر چکے ہیں۔ اور اگر انہوں نے ہی کہی ہے، تب بھی ہمیں اس سے اتفاق نہیں، جب تک کہ مذکورہ بالا علل اس کے ختم نہ ہو جائیں۔ تیسرے انہوں نے حضرت علیؑ کی سند کے مقابلے میں اس حدیث کی سند کو قوی بتلایا ہے، جس پر مفصل بحث اوپر گزر گئی، لیکن ”مصنف بن ابی شیبہ“ کی حدیثِ وائل جس کی صحت اوپر ثابت کر چکا ہوں، اس کے مقابلے میں اس کو قوی نہیں کہا۔ الغرض یہ حضرات حنفیہ، مذہبِ احناف کے مقابلے میں آپ کی تائید نہیں کر رہے ہیں، خوب سمجھ لیں۔

حاشیہ ہدایہ کی غلط فہمی

حاشیہ ”ہدایہ“ سے مؤلف نے یہ عبارت نقل کی ہے:

”هذا تعليل بمقابلة حديث وائل فيرد ، وحديث علي لا يعارضه لما ذكرنا من ضعفه“ (ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو بیان کرنا بڑی ہیرا پھیری ہے حضرت وائل کی حدیث کے مقابلے میں،

یہ مردود ہے۔ حضرت علیؓ والی روایت اس کے مقابل و معارض ہو ہی نہیں سکتی؛ کیوں کہ اس کا کمزور ہونا ہم نے خود بیان کر دیا ہے۔ (حدیث نماز: ۶۷)

جواب: سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ مؤلف نے ”ہذا تعلیل“ کا ترجمہ کیا ہے: ”بڑی ہیرا پھیری“ حالاں کہ یہ ترجمہ بالکل غلط ہے؛ کیوں کہ تعلیل کے معنی علت اور وجہ بیان کرنے کے ہیں، اور یہاں محشی کا مقصد یہ ہے کہ صاحب ”ہدایہ“ نے نماز میں ہاتھوں کو ناف کے نیچے باندھنے کی جو عقلی وجہ اور علت یہ بیان کی ہے کہ ”اس میں تعظیم ہے اور یہی مقصود ہے“، یہ علت اپنی رائے اور قیاس سے بیان کرنا حدیثِ وائل کے مقابلے میں مردود ہے؛ کیوں کہ حدیث کے سامنے قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، رہی حدیثِ علیؓ تو وہ ضعیف ہونے کی وجہ سے حدیثِ وائل کے معارض نہیں بن سکتی۔

اب رہا محشی کا اعتراض تو میں کہتا ہوں کہ یہاں محشی کو غلط فہمی ہوئی ہے؛ کیونکہ صاحب ہدایہ نے یہ تعلیل حدیثِ وائل کے مقابلے میں نہیں کی ہے، بلکہ حدیثِ علیؓ کی موافقت میں کی ہے، اس لئے کہ صاحب ہدایہ نے اس جگہ حدیثِ وائل کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے، تو یہ تعلیل اس کے مقابلے میں کیونکر ہو سکتی ہے؟ لہذا یہ حدیث کے مقابلے میں رائے و قیاس نہیں ہے، بلکہ حدیثِ حضرت علیؓ کی موافقت میں تعلیل ہے یعنی اس کی حکمت و علت کا بیان ہے۔

رہا محشی کا یہ کہنا کہ حدیثِ علیؓ ضعیف ہونے کی وجہ سے حدیثِ وائل کے معارض نہیں ہو سکتی، اس کا جواب اوپر ہو چکا کہ حدیثِ وائل بھی ان علل کی وجہ سے جن کو ہم نے بیان کیا، اس قابل نہیں کہ اس سے احتجاج کیا جاسکے، پھر حدیثِ علیؓ تو اولاً ضعیف نہیں کہ ناقابل احتجاج ہو، جیسا کہ بیان ہوا، دوسرے اگر ضعیف بھی ہو تو اس

کے شواہدات بھی موجود ہیں، چنانچہ علامہ عبدالحی صاحب نے اس کے شواہد ”سعایہ“ میں بیان کئے ہیں۔ (دیکھو: سعایہ: ۱۵۶/۲)

اس کے علاوہ احناف کا مسلک کوئی حدیثِ علیؑ ہی پر منحصر نہیں، جب کہ ”مصنف بن ابی شیبہ“ کی صحیح حدیث، احناف کے لیے حجت اور شافی و کافی ہے۔ لہذا اگر حدیثِ علیؑ ضعیف بھی ہے تو کیا ہوا؟

حدیثِ علیؑ مرفوعِ حکمی ہے

مؤلف نے اس کے بعد ”شرح وقایہ اردو“ سے اور ”ہدایہ“ کے بین السطور سے بھی نقل کیا کہ ”یہ حدیثِ علیؑ مرفوع نہیں“۔ (حدیث نماز: ۶۷)

جواب: اس کا جواب دیا جا چکا ہے کہ یہ لفظاً مرفوع نہیں ہے، لیکن حکماً مرفوع ہے اور حضراتِ احناف کے نفی کرنے سے مقصود یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس کو قولِ رسول کہا ہے، یہ غلط ہے؛ کیونکہ یہ قولِ رسول نہیں بلکہ قولِ علیؑ ہے جس میں وہ رسول اللہ ﷺ کا عمل و طریقہ بیان کر رہے ہیں، ورنہ وہ مطلقاً اس کے مرفوع ہونے کے منکر نہیں ہیں۔

کتب حدیث کی درجہ بندی۔ ایک علمی بحث

مؤلف نے ”عمدة الرعایہ حاشیہ شرح وقایہ“ سے بھی حدیثِ علیؑ کا ضعف نقل کیا ہے، جس کا جواب کئی مرتبہ ہو چکا۔

مولانا عبدالحی صاحب نے ”عمدة الرعایہ“ میں ”مصنف بن ابی شیبہ“ کی حدیثِ وائل، جس پر تفصیلی گفتگو ہم اوپر کر چکے ہیں، نقل کر کے اسی کی تصحیح بھی فرمائی اور فرمایا کہ:

”اگر تم کہو کہ اس حدیث میں علتِ انقطاع ہے؛ کیونکہ علقمہ نے اپنے باپ سے نہیں سنا، بلکہ اپنے باپ کے انتقال کے چھ ماہ بعد پیدا ہوئے، تو میں اس کا جواب دوں گا کہ یہ بعض محدثین کا قول ہے اور صحیح یہ ہے کہ چھ ماہ بعد پیدا ہونے والا علقمہ کا بھائی عبدالجبار ہے، لیکن علقمہ نے اپنے باپ سے حدیث بیان کی اور ان سے سنا ہے، جیسا کہ ”سنن نسائی“ اور ”جامع ترمذی“ مطالعہ کرنے والے پر مخفی نہیں ہے..... بالجملہ ہاتھوں کو ناف کے نیچے باندھنا، جیسا کہ گمان کرنے والے لوگ گمان کرتے ہیں، بے دلیل نہیں ہے۔“ (عمدة الرعاية: ۱/۱۶۵)

صاحب ”حدیث نماز“ اس صریح دلیل کو پڑھ کر خبط الحواسی میں مبتلا ہو گئے اور جب کوئی علت سمجھ میں نہ آئی، تو پھر دوسرا طریقہ اختیار کیا اور کہا کہ: ’مصنف بن ابی شیبہ‘ کی یہ روایت ہے، جسے آپ کے مسلک حنفی میں تیسرے درجے کی کتاب قرار دیا گیا ہے، جسے صحیح کتابوں کے مقابلے میں قبول نہیں کیا جاسکتا، اس کے علاوہ اس روایت میں انقطاع بھی بعض محدثین بتلاتے ہیں۔ (حدیث نماز: ۶۸)

لاحول ولا قوة الا باللہ! جب حدیث صحیح سامنے آگئی تو اب کتب حدیث کا درجہ بیان کر کے حدیث سے اعراض کے کیا معنی؟ کیا اسی کا نام اہل حدیث ہونا ہے؟ کیا کسی حدیث میں اس درجہ بندی کا ذکر ہے؟

پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ بعض علماء نے اگرچہ کتب احادیث میں ترتیب قائم کی ہے کہ بخاری و مسلم سب سے مقدم اور ان کی احادیث اصح، پھر جو صرف بخاری میں ہو، پھر وہ جو صرف مسلم میں ہو، پھر وہ جو بخاری و مسلم کی شرط پر ہو، وغیرہ۔ اس طرح دیگر کتابوں کی ترتیب اور ان کے طبقات بیان کیے ہیں کہ فلاں فلاں طبقہ

اولیٰ میں، فلاں فلاں طبقہٴ ثانیہ میں، فلاں فلاں طبقہٴ ثالثہ میں شمار ہوتی ہیں وغیرہ۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تفصیل سے اس مسئلہ کی بھی وضاحت کر دی جائے تاکہ حقیقت سامنے آجائے۔

جن حضرات نے مذکورہ بالا ترتیب کتب قائم فرمائی ہے، یہ دراصل رواۃ حدیث کے شرائط کے لحاظ سے ہے، اگر راوی ان شروط مقررہ پر پورا پورا اتر آتا ہے، تو حدیث کو صحیح یا صحیح کہا جاتا ہے اور جن کتب میں اس کی جتنی رعایت کی گئی، اسی لحاظ سے اس کا درجہ اور ترتیب قائم کر دی گئی۔

چنانچہ امام بخاریؒ کی ”الجامع الصحیح“ کو صحیح الکتب کہنا اسی وجہ سے ہے کہ ان کے شرائط سخت تھے اور اس پر انہوں نے شدت کے ساتھ عمل کیا، پھر دوسرا نمبر امام مسلمؒ کی ”الجامع“ کا ہے، ارنح؛ کیوں کہ امام بخاری و امام مسلمؒ راوی کی صداقت و ثقاہت کے ساتھ ساتھ اور بھی دیگر امور کی رعایت فرماتے ہیں، مثلاً راوی کا کثیر الملازمہ و طویل الصحبہ ہونا وغیرہ۔ اور دوسرے ائمہ ان اشیاء کو کچھ ضروری خیال نہیں کرتے جس کی وجہ سے انہوں نے اس کا خیال نہیں کیا۔ پھر خود امام بخاریؒ و مسلمؒ کے درمیان بعض شروط میں اختلاف ہے، مثلاً قبولیت عنعنہ میں امام بخاریؒ کم از کم ایک مرتبہ کی ملاقات کو ضروری قرار دیتے ہیں اور امام مسلمؒ اس کا شدت کے ساتھ رد کرتے ہیں اور صرف معاصرت کو کافی قرار دیتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ شرائط رواۃ پر صحت اور اصحیت کا مدار ہے، اسی پر کتب احادیث کی ترتیب کا مدار بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ ”بخاری“ و ”مسلم“ کو صحیح کہنے کے باوجود علماء حدیث نے تصریح کی ہے کہ ”بخاری“ و ”مسلم“ میں بھی بعض ضعیف روایات ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الحدیث زکریا صاحبؒ نے بعض مشائخ سے نقل کیا ہے کہ:

”لايخفى أن في صحيح البخاري من الأحاديث ما هو صحيح بالاتفاق وضعاف بالاتفاق ، وتختلف فيهما حتى أن البخاري نفسه صرح في الكتاب بالنسبة ببعض الأحاديث أنه لا يصح الخ“۔

(یہ بات مخفی نہیں کہ ”صحیح بخاری“ کی احادیث میں وہ حدیثیں بھی ہیں جو بالاتفاق صحیح ہیں اور وہ بھی ہیں جو بالاتفاق ضعیف ہیں، اور صحت و ضعف میں مختلف بھی ہیں، حتیٰ کہ امام بخاری نے خود کتاب میں بعض احادیث کی نسبت تصریح کی ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے)۔ (مقدمہ اجز المسالک: ۸۷)

نیز حافظ ابن حجر نے ”صحیحین“ کی احادیث کو مفید علم یقینی اور راجح ثابت کرتے ہوئے فرمایا:

”على أن هذا يختص بما لم ينتقده أحد من الحفاظ مما في الكتابين“ (یہ ترجیح اور مفید علم نظری ہونا ان احادیث کے ساتھ خاص ہے جن پر حفاظ حدیث نے طعن و تنقید نہ کی ہو)۔ (شرح الخبہ: ۱۹)

اور امام مسلم نے تو خود ”مقدمہ مسلم“ میں بیان فرمایا کہ: ہم اپنی کتاب میں تین قسم کے لوگوں سے روایت بیان کریں گے، پھر تیسری قسم میں ضعفاء کو داخل کیا ہے (اگرچہ یہ متابعات ہی میں ہو)۔ (دیکھو مقدمہ مسلم: ۲۱)

حاصل یہ ہے کہ ترتیب کتب اور اصحیٰ احادیث کا مدار رواۃ پر ہے، خواہ وہ ”بخاری“ میں ہوں یا کسی اور کتاب میں ہوں اور اگر ”بخاری“ میں ہی ہونا، یا ”مسلم“ میں ہی ہونا، کوئی اصل رکھتی تو ابن حجر کو تخصیص کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

علامہ نووی نے بھی ”صحیحین“ کی احادیث کے مفید علم ضروری ہونے پر رد کرتے ہوئے لکھا ہے:

”فإن أخبار الآحاد التي في غيرهما يجب العمل بها إذا صحّت
أسانيدها ، ولا تفيد إلا الظن ، فكذا الصحيحان فإنما يفترق الصحيحان
وغيرهما من الكتب في كون ما فيهما صحيحاً لا يحتاج إلى النظر فيه بل
يجب العمل به مطلقاً ، وما كان في غيرهما لا يُعمَلُ به حتى ينظر وتوجد
فيه شروط الصحيح.“ (مقدمہ شرح مسلم: ۱۵)

(یعنی: اخبار آحاد جو ”صحیحین“ کے علاوہ دوسری کتب میں ہوں ان پر بھی عمل
واجب ہے، جب کہ ان کی سندیں صحیح ہوں اور یہ (اخبار آحاد) صرف مفید ظن ہوتی
ہیں، پس اسی طرح ”صحیحین“ بھی (صرف مفید ظن ہوں گی) ہاں ”صحیحین“ اور
دوسری کتب میں صرف یہ فرق ہوگا کہ ”صحیحین“ کی احادیث جو صحیح ہیں، محتاج الی
النظر نہیں؛ بلکہ مطلقاً اس پر عمل واجب ہے اور جو احادیث دوسری کتابوں میں ہیں
ان پر عمل نہیں کیا جائے گا، جب تک کہ (سند میں) نظر نہ کی جائے اور اس میں شروط
صحیحہ نہ پائی جائیں)۔

علامہ ابن الہمام نے بھی اس مسئلہ پر بحث فرمائی ہے اور لکھا کہ:

”وقول من قال: ”أصح الأحاديث ما في الصحيحين ، ثم ما تفرد به
البخاري ، ثم ما انفرد به مسلم ، ثم ما اشتمل على شرطهما من غيرهما ،
ثم ما اشتمل على شرط أحدهما “ تحكّم لا يجوز التقليد فيه ؛ إذ
الأصححة ليس الا لاشتمال رواتهما على الشروط التي اعتبرها“ (یعنی:
جس نے یہ کہا کہ ”صحیح الاحادیث وہ ہیں جو ”صحیحین“ میں ہوں، پھر وہ جو صرف
”بخاری“ میں ہوں، پھر وہ جو صرف ”مسلم“ میں ہوں، پھر وہ جو ”بخاری“ و ”مسلم“
کی شرط پر ہوں، پھر وہ جو صرف ”بخاری“ کی شرط پر ہوں، پھر وہ جو صرف ”مسلم“
کی شرط پر ہوں“، یہ تحکم (دعویٰ بلا دلیل) ہے، اس میں تقلید جائز نہیں ہے، کیونکہ

اصحیت کا مدار، راویوں کا ان شروط پر اتر آنا ہے جن کا امام بخاریؒ و امام مسلمؒ نے بھی اعتبار کیا ہے۔ (فتح القدیر: ۱۸۸/۱)

علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے بھی یہی بات فرمانے کے بعد لکھا ہے کہ:

”فإذا فرض وجود تلك الشروط في رواية حديث في غير الكتابين أفلا يكون الحكم بأصحية ما في الكتابين عين التحكم“۔ (یعنی: جب ان شرائط کے ”صحیحین“ کے علاوہ (دوسری کتب) کی حدیث کے روات میں پائے جانے کو فرض کیا جائے، تو کیا ”صحیحین“ کی احادیث ہی پر اصحیت کا حکم لگانا عین تحکم نہ ہوگا؟) (السعایہ شرح شرح الوقایہ: ۳۰/۲)

اس سے معلوم ہوا کہ محققین احناف کے نزدیک مذکورہ ترتیب کتب اور بخاری و مسلم کی احادیث میں اصحیت کا انحصار قابل قبول بات نہیں، بلکہ اس پر عمل کرنا اور اس قول کی تقلید کرنا جائز بھی نہیں، جیسا کہ ابن الہمامؒ نے تصریح کی ہے۔

ایک شبہ اور جواب

اگر یہ شبہ ہو کہ ”بخاری“ و ”مسلم“ کی شرائط اگر دوسری کتب میں پائی جائیں، تو بلاشبہ ”بخاری“ و ”مسلم“ میں اصح الاحادیث کے انحصار کا دعویٰ تحکم محض ہے، لیکن کلام تو دوسری کتب میں ان شروط کے وجود کا ہے کہ آخر ”بخاری“ و ”مسلم“ کے علاوہ دوسری کتب میں یہ شروط پائی بھی جاتی ہیں یا نہیں؟ کیوں کہ ”بخاری“ و ”مسلم“ نفس صحت کے ساتھ ساتھ ان شروط کی بھی رعایت کرتے ہیں، جن کا دوسروں نے اعتبار یا التزام نہیں کیا؟

راقم کہتا ہے کہ جس طرح اصحیت کے لیے امام بخاریؒ و امام مسلمؒ نے بھی بعض شروط کو معتبر سمجھا اور ان کا التزام کیا ہے، اسی طرح بعض دیگر شروط کا دوسرے ائمہ

اعتبار کریں اور اس کو معیار قرار دیں تو اس کا ان کو ہر طرح اختیار ہے، لہذا اگر امام بخاریؒ و مسلمؒ کثیر الملازمت و طویل الصحبت ہونے کی شرط اور اس کا التزام کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے اور بعض ان کی دیگر شرائط کی وجہ سے ان کی احادیث کو اصح کہا جاتا ہے، تو ہم یہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے یہاں بعض شرائط امام بخاریؒ و مسلمؒ سے زیادہ سخت ہیں، مثلاً ضبطِ راوی میں وہ دوسروں سے زیادہ شدت برتتے ہیں۔ (دیکھو حیاة امام ابوحنیفہؒ مترجم: ۳۷۸)

اسی طرح امام صاحب کی روایات ثلاثی زیادہ ہیں اور یہ اعلیٰ درجہ کی شمار ہوتی ہیں، اس کے علاوہ ثنائی بھی بکثرت ہیں، جن میں صرف دو واسطے ہوتے ہیں، جبکہ ”بخاریؒ و مسلمؒ“ کے یہاں یہ بات بہت کم ہے۔ امام بخاریؒ کے پاس ثلاثیات صرف بائیس ہیں اور ثنائی ایک بھی نہیں، نیز امام ابوحنیفہؒ کے شیوخ زیادہ ترفیقہ ہیں اور احناف کے یہاں فقیہ کی روایت راجح اور قوی ہوتی ہے، جب کہ امام بخاریؒ و مسلمؒ کے یہاں یہ معیار نہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اعتبارِ شرط ایک امر اجتہادی ہے، جس میں مجتہد کو اختیار حاصل ہے کہ بعض شرط کا التزام و اعتبار کرے، بعض کا نہ کرے، تو جو روایات امام ابوحنیفہ کے معیار پر اتریں گی، وہ ان اعتبارات سے ”بخاریؒ و مسلمؒ“ کی روایات سے اصح ہوں گی، قطع نظر اس سے کہ کسی اور اعتبار سے ”بخاریؒ اور مسلمؒ“ کی روایات راجح اور اصح ہوں۔

کیونکہ اصح و اقوی ہونا، ایک امر اعتباری اور اضافی چیز ہے، کوئی کسی اعتبار سے اصح ہے، تو دوسری کسی اور اعتبار سے اصح ہے، اگر ہم ”بخاریؒ و مسلمؒ“ کی روایات کو بلحاظ ان شرط کے اصح کہیں، جن کا انہوں نے التزام و اعتبار کیا ہے، تو امام

ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ وغیرہ ائمہ کی روایات بعض دیگر امور و شرائط کے لحاظ سے صحیح ہو سکتی ہیں، چنانچہ علامہ ابن الہمامؒ نے فرمایا:

”فدار الأمر في الرواة على اجتهاد العلماء فيهم ، وكذا في الشروط حتى أن من اعتبر شرطاً وألغاه آخر يكون مارواه الآخر مما ليس فيه ذلك الشرط عنده مكافياً لمعارضته المشتمل على ذلك الشرط“ (یعنی روایت کے بارے میں معاملہ علماء کے اجتہاد پر دائر ہے، اسی طرح شروط (کے اعتبار کرنے میں) حتیٰ کہ جو شخص کسی شرط کا اعتبار کرے اور دوسرا اعتبار نہ کرے تو دوسرے کی روایت جس میں اس شرط کو ملحوظ نہیں رکھا گیا، معارضہ کے لیے کافی ہوگی اس روایت سے جس میں اس شرط کا لحاظ ہے)۔ (فتح القدر: ۱۸۸/۱)

راقم کہتا ہے کہ جب خاص شرط کے اعتبار نہ کرنے کے باوجود بھی یہ روایت اس سے معارضہ کر سکتی ہے جس میں وہ شرط خاص کا لحاظ ہو، تو جس روایت میں کوئی اور شرط ملحوظ ہو جس کا دوسروں نے اعتبار ہی نہ کیا ہو (اگرچہ کہ دوسرے شروط کا اعتبار کیا ہو) تو کیا یہ اس کے معارض نہیں ہو سکتی؟

غرض یہ کہ اصح و اقویٰ ہونا ایک اضافی چیز ہے، کسی ایک اعتبار سے کوئی روایت اصح ہو، تو دوسری روایت کسی اور اعتبار سے اصح ہو سکتی ہے اور ایک دوسرے کی معارض بھی ہو سکتی ہے۔

لہذا معاملہ آخر کا ررواۃ پر ہی آکر ٹھہرتا ہے، خواہ کوئی کتاب ہو، جب روایت معیار تحقیق پر اتر آئے تو اس کے بعد ترجیح میں ہم کسی کتاب کے پابند نہیں، بلکہ خارج سے ترجیح حاصل کی جائے گی۔

چنانچہ علامہ ابن الہمامؒ نے فرمایا:

”و کون معارضه فی البخاری لایستلزم تقدیمہ بعد اشتراکھا فی الصحۃ بل یطلب الترجیح من خارج“ (یعنی روایت کے معارض روایت کا ”بخاری“ میں ہونا ”بخاری“ کی روایت کی تقدیم و ترجیح کو مستلزم نہیں، ان دونوں (بخاری اور غیر بخاری کی روایت) کے صحیح ہونے میں مشترک ہونے کے بعد بلکہ ترجیح خارج سے طلب کی جائے گی۔) (فتح القدر: ۱۸۸/۱)

اور علامہ عبدالحی صاحب نے بھی یہی بات ارشاد فرمائی ہے۔ (دیکھو سعایہ: ۳۰۲)

کیا یہ کتابیں صحیح ہیں؟

اس کے بعد ہم مؤلف کے کلام کے طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ ”صحیح کتابوں کے مقابلے میں ”مصنف ابن ابی شیبہ“ کی روایت قبول نہیں کی جاسکتی۔“

راقم کہتا ہے کہ صحیح کتابوں سے غالباً وہی تین کتابیں مراد ہیں، جن کا ذکر مؤلف نے شروع میں کیا ہے، ”مسند احمد“، ”سنن بیہقی“ اور ”صحیح ابن خزیمہ“، مگر مؤلف کو معلوم ہونا چاہئے کہ ”مسند احمد“ اور ”بیہقی“ کو صحیح کہا بھی نہیں جاتا اور ان میں بے شمار ضعیف روایات ہیں، جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں، ان کو صحیح کہنا تو نہایت حیرت ناک بات ہے جو اہل علم کے لئے مضحکہ خیز ہے۔

رہی ”ابن خزیمہ“ کی صحیح تو اس کو صحیح تو کہا جاتا ہے، مگر معلوم ہونا چاہئے کہ اس میں بھی ضعیف روایات ہیں، اگرچہ زیادہ نہ ہوں اور حسن بھی بے شمار ہیں۔ الغرض اس میں بھی صرف صحیح احادیث نہیں ہیں، اس کی روایت ”علی الصدر“ کی تحقیق آپ نے اوپر ملاحظہ فرمائی کہ یہ روایت معلول ہے۔

لہذا مؤلف کا یہ کہہ کر پیچھا چھڑانا بے جا ہے کہ یہ ابن ابی شیبہ تیسرے درجہ کی

کتاب ہے اور صحیح کے بعد کی ہے، کتاب کسی بھی درجہ کی ہو، جب حدیث کا صحیح و ثابت ہونا ثابت ہو جائے تو اس کو ماننا مسلمان کے لئے لازم ہے۔

عورت سینے پر ہاتھ باندھے

مؤلف نے اس کے بعد علامہ عبدالحی صاحب کی ایک عبارت نقل کی ہے، جس میں یہ ہے کہ ابن خزیمہ اور مسند احمد کی روایت سے ”علی الصدر“ کا بھی ثبوت ہے جس کو امام شافعی اور ان کے تابعین نے لیا ہے اور ہمارے حضرات علماء حنفیہ نے بھی اس کو عورتوں کے حق میں اختیار کیا ہے؛ کیونکہ یہ ان کے لیے زیادہ پردہ کی بات ہے۔ الخ۔..... اس کے بعد مؤلف نے لکھا کہ:

”میں کہتا ہوں عورتوں کی تو پردہ پوشی ہے ہی، اگر مرد بھی سینے پر ہاتھ باندھتے تو ضعیف روایات پر عمل کرنے سے ان کی بھی پردہ پوشی ہو جاتی،“
پھر آگے چل کر لکھا کہ: مردوں اور عورتوں میں تفریق کرنا محض بے اصل ہے۔“ (حدیث نماز: ۶۸)

راقم کہتا ہے کہ ضعیف روایات کون سی ہیں؟ مؤلف اس پر غور کر لیں، زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں۔ دوسرے احناف نے جو تفریق کی ہے کہ مرد تو ناف کے نیچے اور عورت سینے پر ہاتھ باندھے، یہ احناف نے بے دلیل نہیں کہا ہے، بلکہ اس کی اصل دلیل خود مولانا عبدالحی صاحب نے بیان فرمائی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

”وأما في حق النساء فاتفقوا على أن السنة لهن وضع اليدين على الصدر؛ لأنه أستر لها كما في البناية“ (بہر حال عورتوں کے حق میں (تمام ائمہ نے) اتفاق کیا ہے کہ عورتوں کے حق میں سنت سینے پر ہاتھ باندھنا ہے؛ کیونکہ یہ ان کے لیے زیادہ پردہ کی بات ہے، جیسا کہ ”البناية“ میں لکھا ہے۔ (سعاہ: ۱۵۶/۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اتفاق و اجماع کی وجہ سے احناف نے اس کو اختیار کیا ہے اور اجماع تمام امت کے نزدیک بڑی حجت ہے۔ (واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم)

عورت و مرد کی نماز کا فرق

رہا عورت و مرد کی نماز میں فرق کو بے اصل کہنا، یہ خود بے اصل بات ہے، متعدد احادیث سے دونوں کی نماز میں فرق کا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مختصراً یہاں عرض کرتا ہوں۔

(۱) ﴿عن یزید بن ابی حبیب: أن رسولَ الله ﷺ مرَّ علی امرأتین تُصلَّیان، فقال: إذا سجَدتُمَا فُضِّمًا بَعْضُ اللّحمِ إلی الأرض، فإنَّ المرأَةَ لیستُ فی ذاک کالرَّجُل﴾ (مرا سیل ابی داؤد: ۸)

(حضرت یزید بن ابی حبیب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا دو عورتوں پر سے گزر ہوا، جو نماز پڑھ رہی تھیں، آپ نے فرمایا کہ جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کا بعض حصہ زمین سے ملا لیا کرو؛ کیوں کہ عورت اس میں مرد کی طرح نہیں ہے) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت کو سجدہ میں زمین سے مل کر اور دبی دبی نماز پڑھنا چاہئے، جب کہ مرد کے لئے یہ طریقہ ہے کہ اس کے تمام اعضاء کھلے کھلے ہوں۔

اس حدیث کے راوی یزید بن ابی حبیب مشہور و معروف تابعی ہیں، ابن حبان نے ”کتاب الثقات“ میں ان کو تابعین میں شمار کر کے بتایا ہے کہ آپ صحابی حضرت عبد اللہ بن الحارث بن جزء رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ اور ابن حجر نے ”تہذیب التہذیب“ میں ان کا ذکر کیا ہے اور ابن سعد، لیث، ابو زرعہ عجلی سے ان کی توثیق و تعریف نقل کی ہے، اور ابن سعد سے نقل کیا کہ وہ اپنے زمانہ میں اہل مصر کے

مفتی تھے۔ (کتاب الثقات: ۵۴۶/۶، تہذیب التہذیب: ۱۱/۳۱۹-۳۲۰)

یہ روایت صحابی کا واسطہ مذکور نہ ہونے کی وجہ سے مرسل ہے، اور مرسل حدیث جمہور علماء وائمہ کے نزدیک مقبول ہے۔ البتہ امام شافعیؒ مرسل کو غیر مقبول قرار دیتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک بھی مرسل کی تائید کسی موصول یا دوسری مرسل روایت سے ہو جائے تو وہ مقبول ہوتی ہے، خواہ یہ تائیدی روایت ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔

اور زبیر بحث مرسل روایت کو امام بیہقی نے موصولاً دوسندوں سے روایت کیا ہے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی: ۳/۵۷)

(۲) ﴿عن ابن عمر رضی اللہ عنہ مرفوعاً: إذا جلست المرأة في الصلوة وضعت فخذها على فخذها الأخرى، فإذا سجدت ألقفت بطنها على فخذها كأستر ما يكون، فإن الله ينظر إليها، يقول: ياملاحتكي! أشهدكم إني غفرت لها﴾ (کنز العمال: حدیث نمبر: ۲۰۱۹۹)

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب عورت نماز میں بیٹھے تو اپنی ایک ران دوسری ران پر رکھے، اور جب سجدہ کرے تو پیٹ کو رانوں سے ملا لیا کرے، اس طرح کہ زیادہ سے زیادہ پردہ ہو جائے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھتا ہے، اور فرماتا ہے کہ اے میرے فرشتو! تم گواہ رہو کہ میں نے اس (عورت) کو بخش دیا)

اس میں عورت کے سجدے اور جلسے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے کہ سجدے میں رانوں کو پیٹ سے ملا کر رکھنا چاہئے اور اس کی تائید گذشتہ حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ اس میں بھی سجدے میں زمین سے ملے رہنے کا حکم دیا ہے، اور جلسے میں رانوں کو ایک دوسرے سے ملا کر اس طرح رکھنے کا حکم ہے کہ ایک ران دوسری ران پر ہو، اور یہ معلوم ہے کہ مرد کے لئے یہ طریقہ نہیں ہے، لہذا یہ پتہ چلا کہ مرد و عورت

کی نماز میں فرق ہے۔

یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے، مگر اس کے شواہد موجود ہیں، اس سے اوپر جو حدیث گذری ہے وہ بھی اس کے بعض اجزاء کی شاہد ہے، اور آگے حضرت علیؓ کی روایت موقوفہ آرہی ہے، جس میں جلسہ میں رانوں کو ملا کر رکھنے کا حکم ہے، یہ زیر بحث روایت کے پہلے جز کی شاہد ہے، اور محدثین کے اصول کے مطابق شواہدات کی روشنی میں ضعیف حدیث کبھی حسن کے درجہ کو اور کبھی صحیح کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ لہذا اس کا ضعف ختم ہو گیا۔

(۳) ﴿عن ابن عمر رضي الله عنه: أَنَّهُ سُئِلَ كَيْفَ كَانَ النِّسَاءُ يُصَلِّيْنَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ؟ قَالَ: كُنَّ يَتَرَبَّعْنَ، ثُمَّ أُمِرْنَ أَنْ يَحْتَفِزْنَ﴾ (جامع المسانيد: ۴۰۰/۱، مسند امام ابوحنيفه: ۴۹)

(حضرت ابن عمرؓ سے سوال کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عورتیں نماز کس طرح پڑھتی تھیں؟ فرمایا کہ وہ چار زاوے پر بیٹھتی تھیں، پھر ان کو حکم دیا گیا کہ سرین کے بل بیٹھیں)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت کو نماز میں مرد کی طرح پیر بچھا کر نہیں، بلکہ سرین کے بل زمین پر بیٹھنا چاہئے، جبکہ مرد کے لئے یہ طریقہ ہے کہ اپنا ایک پیر بچھا کر اسی پر بیٹھ جائے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مرد و عورت کی نماز میں فرق ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں میں نماز کا یہ طریقہ، رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے چلا آ رہا ہے، بلکہ آپ کے حکم سے ہے؛ کیوں کہ صحابی کا یہ کہنا ”حکم دیا گیا“ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔

چنانچہ امام ابو عبد اللہ الحاکم اپنی کتاب ”معرفة علوم الحديث“ میں فرماتے ہیں: ”

ومنه (أي من المرفوع) قول الصحابي المعروف بالصحبة ”أمرنا أن نفعل كذا“ و ”كُنَّا نُؤمِّرُ بِكَذَا“ فهو حديث مُسْنَد . (معرفة علوم الحديث: ۲۸، نیز دیکھو مقدمہ ابن الصلاح: ۲۸، نزہۃ النظر: ۸۵، الفیۃ العراقی: ۱۹، ارشاد طلاب الحقائق: ۱۶۱/۱)

الغرض حضرت ابن عمرؓ کا یہ کہنا کہ ”عورتوں کو یہ حکم دیا گیا“ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے یعنی یہ اللہ کے رسول کا فرمان اور حکم بیان کیا گیا ہے۔

اب رہا اس کی سند کا معاملہ تو عرض ہے کہ اس کو امام ابوحنیفہؒ نے حضرت نافعؓ سے اور نافعؓ نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے اور یہاں تک کی سند بلاشبہ صحیح ہے اور اعلیٰ درجہ کی ہے۔ (کما لا یخفی علی المہرۃ) اس کے بعد امام اعظمؒ سے مسانید کے جامع تک جو راوی ہیں وہ بھی سب کے سب قابل قبول اور لائق اعتماد ہیں، سوائے زر بن ابی نجیح کے، جن کے بارے میں حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی نے لکھا ہے کہ ان کے حالات مجھ کو نہ مل سکے۔ (اعلاء السنن: ۲۰۳-۲۱)

یہاں یاد رہے کہ زر بن ابی نجیح کو غیر مقبول نہیں قرار دیا گیا ہے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ ان کے حالات کا علم نہ ہو سکا، ویسے یہ بات اپنی جگہ ثابت ہو چکی ہے کہ امام اعظمؒ کے مسانید قابل احتجاج ہیں۔ (دیکھو اعلاء السنن: ۲۱۳-۲۲) پھر ایک موقوف روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جو ابھی درج کریں گے، لہذا یہ روایت قابل قبول و لائق احتجاج ہے۔

(۴) ﴿عن علي رضي الله عنه قال: إذا سجدت المرأة ، فلتحتفز ولتلتصق فخذیها ببطنھا﴾ (عبدالرزاق: ۳۸۳ واللفظ له، ابن ابی شیبہ: ۲۲۲/۱، سنن بیہقی: ۲۲۲/۲)

(حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جب عورت سجدہ کرے تو اس کو چاہئے کہ سرین کے بل بیٹھے اور اپنے پیٹ سے رانوں کو ملائے رکھے)
 علامہ ظفر احمد عثمانی نے اعلاء السنن میں اس روایت کے راویوں پر کلام کر کے آخر میں فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔ (اعلاء السنن: ۲۴/۳)

(۵) ﴿عن ابن عباس رضی اللہ عنہ اَنَّهُ سُئِلَ عَنْ صَلَاةِ الْمَرْأَةِ فَقَالَ: تَجْتَمِعُ وَتَحْتَفِزُ﴾ (ابن ابی شیبہ: ۲۴۱/۱)

(حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا کہ عورت کی نماز کیسی ہوتی ہے؟ تو اس کے جواب میں فرمایا کہ: وہ سمٹ کر نماز پڑھے اور سرین کے بل بیٹھے)

ان احادیث و آثار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرد و عورت کی نماز میں بعض چیزوں میں فرق ہے، اس کا انکار جہالت ہے، اور ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اور یہ مسئلہ صرف حنفیہ کے یہاں نہیں ہے کہ وہ مرد و عورت کی نماز میں فرق کرتے ہیں، بلکہ تمام ہی ائمہ کے یہاں اس کا لحاظ موجود ہے۔ یہاں صرف امام شافعی کا ایک حوالہ پیش کرتا ہوں جس سے ایک طرف یہ معلوم ہوگا کہ مرد و عورت کی نماز میں فرق ہے اور دوسرے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ اس فرق کی بنیاد کس چیز پر ہے؟

حضرت سیدنا امام شافعی علیہ الرحمہ اپنی کتاب ”الام“ میں عورت کی نماز کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”وقد آدب اللہ تعالیٰ النساء بالاستتار، وأدبهنّ بذلك رسول اللہ ﷺ، وأحبّ للمرأة في السجود أن تضمّ بعضها إلى بعض، وتلتصق بطنها بفخذيها، وتسجد كأستر ما يكون لها، وهكذا أحبّ لها في الركوع، والجلوس، وجميع الصلوة أن تكون فيها كأستر ما يكون لها، وأحبّ

أن تكفت جلبابها، وتجافيه راکعةً وساجدةً علیها لئلا یصفها ثيابها۔
(کتاب الام للامام شافعی: ۱۱۵)

(تحقیق کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو پوشیدہ اور مستور رہنے کی تعلیم دی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ان کو اس کی تعلیم دی ہے، اور عورت کے لئے اس بات کو پسند فرمایا کہ وہ سجدہ میں اپنے بعض حصے کو بعض سے اور اپنے پیٹ کو رانوں سے ملا کر رکھے، اور اس طرح سجدہ کرے کہ اس کے حق میں زیادہ سے زیادہ پردہ ہو جائے، نیز اسی طرح آپ ﷺ نے عورت کے لئے رکوع اور جلسے اور پوری نماز میں اس بات کو پسند فرمایا ہے کہ وہ اس انداز سے نماز پڑھے کہ زیادہ سے زیادہ مستور و پوشیدہ رہے، اور یہ بھی پسند فرمایا کہ وہ اپنی چادر کو سمیٹ لے اور چادر کو رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے، اپنے اوپر ڈھیلا رکھے، تاکہ اس کے کپڑے (چست ہونے کی وجہ سے) اس کی تصویر نہ کھینچیں)

حاصل کلام یہ کہ ان احادیث اور آثار سے بطور قدر مشترک یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مرد و عورت کی نماز میں فرق ہے اور یہ فرق اس بات پر مبنی ہے کہ عورت زیادہ سے زیادہ مستور و پوشیدہ رہے۔ اس مسئلہ پر احقر کا رسالہ ”فیض السماء فی احکام صلاة النساء“ میں مزید احادیث و آثار و اقوال تابعین و ائمہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

مرزا مظہر جان جاناں کی تقلید

مؤلف نے ”مقدمہ عین الہدایہ“ سے مشہور صوفی بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے متعلق نقل کیا کہ ”آپ سینے پر ہاتھ باندھنے کی حدیث کو بوجہ قوی ہونے کے ترجیح دیتے اور خود سینے پر ہاتھ باندھتے“۔ (حدیث نماز: ۶۹)
راقم کہتا ہے کہ اس حوالے سے ہمیں کیا نقصان اور مؤلف کو کیا نفع؟ ظاہر ہے

کہ ہم مرزا مظہر صاحبؒ کے مقلد نہیں، ہم نے تو امام ابوحنفیہؒ کی تقلید کا التزام کیا ہے، اور آپ کسی امام کی بھی تقلید کے قائل نہیں؟ پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ مرزا صاحب جیسے صوفی کی تقلید آپ کو کیسے گوارا ہوئی جبکہ صوفیاء آپ لوگوں کی نظر میں بدعتی و گمراہ ہیں؟

الغرض ان کا عمل و قول ہم پر کیسے حجت ہو سکتا ہے؟ رہا حدیث کا قوی ہونا اس کا جواب گزر چکا اور حقیقت واضح ہو گئی۔

آخری فیصلہ

آخر میں راقم عرض کرتا ہے کہ ہم نے دونوں قسم کی روایات اور ان پر کلام مع مالہ و ماعلیہ کے نقل کر دیا، جس سے معلوم ہوا کہ کوئی ایسی روایت جس پر بلا کسی جھجک کے عمل کیا جاسکے، اس باب میں نہیں ہے، انصاف یہ ہے کہ نہ احناف کے پاس ہے، نہ دوسروں کے پاس ہے، بلکہ سب میں کلام ہے، اب محض معاملہ ترجیح کا ہے اور ترجیح احناف کے دلائل کو ہے؛ کیونکہ ”مصنف ابن ابی شیبہ“ کی روایت باعتبار سند کے قوی اور اس پر جو کلام ہے اس کا تفصیلی جواب ہم نے دیدیا ہے، بخلاف روایت ”ابن خزیمہ“ کے؛ کیوں کہ اس میں مؤمل بن اسماعیل کے بارے میں کلام ہے، لہذا ہم نے ہمارے دلائل کو راجح سمجھا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

❁ دعائے استفتاح یعنی ثناء ❁

نماز میں ہاتھ باندھ لینے کے بعد ثنا پڑھی جاتی ہے، یہ ثناء کن الفاظ کے ساتھ اور کون سی پڑھی جائے؟

اس میں سب کا اتفاق ہے کہ جو بھی منقول دعائیں ہوں، ان میں سے جسے بھی

پڑھ لے گا سنت ادا ہو جائے گی، البتہ ان دعاؤں میں سے افضل کون ہے، اس میں ذرا سا اختلاف ہے۔ یہ اختلاف صرف افضلیت میں ہے، جواز و عدم جواز میں نہیں۔ بعض حضرات ”بخاری شریف“ میں منقول دعاء کو پسند کرتے ہیں، جس کو ہمارے مؤلف نے اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے:

”اللَّهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اللَّهُمَّ نَقِّنِي مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبَ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اللَّهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالنَّجْوَى وَالْبَرْدِ“۔ (بخاری: ۱۰۳۱)

اور احناف ”سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، الْح“ والی احادیث پر عمل کرتے ہوئے، اس کو افضل بتاتے ہیں، یہاں ہم مذہب احناف کی دلائل کی رو سے وضاحت اور اس کی ترجیح ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی حدیث اور اس پر بحث

﴿عن عائشة قالت : كان رسول الله ﷺ إذا استفتح الصلوة قال : سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ﴾ (ابوداؤد: ۱۱۳۱، دارقطنی: ۲۹۹)

(حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع فرماتے تو ”سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ“ پڑھتے تھے۔

اس روایت کی حاکم نے بھی اپنی ”مستدرک“ میں تخریج کی ہے اور کہا کہ: ”صحیح الاسناد علی شرطہما“ (اس کی اسناد بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے)۔ (مستدرک: ۳۵-۳۶)

علامہ شوکانی نے حافظ محمد بن عبدالواحد کا قول نقل کیا ہے کہ: ”ما علمتُ فیہم یعنی رجال إسناد أبي داؤد مجروحاً“ (میں نے ابو داؤد کی سند کے راویوں میں کوئی مجروح نہیں پایا)۔

پھر شوکانی فرماتے ہیں: ”اس کے راوی طلق بن غنم سے بخاری نے اپنی صحیح میں حدیث لی ہے، اور عبدالسلام بن حرب کی حدیث شیخین یعنی بخاری و مسلم دونوں نے لی ہے، اور ابو حاتم نے ان کی توثیق کی ہے اور حاکم نے اس (مذکورہ) حدیث کی تصحیح کی اور اس کی ایک شاہد بھی بیان کی ہے۔ (نیل الاوطار: ۲۱۱/۲-۲۱۲)

امام ابو داؤد کے اشکال کا جواب

مگر اس حدیث پر امام ابو داؤد نے اشکال کیا ہے، چنانچہ وہ اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ: یہ حدیث عبدالسلام بن حرب سے مشہور نہیں ہے، عبدالسلام سے (ان کے شاگردوں میں سے) سوائے طلق بن غنم کے کوئی روایت نہیں کرتا، اور (اس حدیث میں) نماز کا قصہ ایک جماعت، بدیل بن میسرہ سے روایت کرتی ہے، یہ حضرات (اس دعا میں سے) کچھ بھی ذکر نہیں کرتے۔ (ابو داؤد: ۱۱۳/۱)

حاصل ان اعتراضوں کا یہ ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور عبدالسلام اس زیادتی میں متفرد ہیں، مگر دیگر محدثین نے اس کا جواب دیا ہے۔

علامہ ابن الترمذی نے امام ابن دقیق العید سے نقل کیا کہ: انہوں نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حدیث طلق بن غنم کی امام بخاری نے ”صحیح“ میں تخریج کی اور عبدالسلام بن حرب کی ابو حاتم نے توثیق کی اور شیخین نے ان سے تخریج کی ہے اور اسی طرح اس سے اوپر عائشہؓ تک (سب راوی ثقہ ہیں اور شیخین نے ان سے تخریج کی

ہے) ، رہا عبدالسلام سے اس روایت کا مشہور نہ ہونا یہ اس میں قادح نہیں ہو سکتا، جب کہ عبدالسلام سے روایت کرنے والا ثقہ ہے، اور رہا ایک جماعت کا اس کو ذکر نہ کرنا، تو اہل فقہ و اصول اس میں کیا کہتے ہیں وہ معلوم ہے۔ (الجوہر النقی علی سنن البیہقی: ۵۱۲)

اور اس کا جواب شیخ ناصر الدین الالبانی نے یہ دیا ہے کہ: ”هذا الإعلال ليس بشيء عندنا لأنها زيادة من ثقة وهي مقبولة“ (ہمارے نزدیک یہ علت نکالنا صحیح نہیں؛ کیونکہ یہ ثقہ کی جانب سے ایک زیادتی ہے اور وہ مقبول ہوا کرتی ہے) (ارواء الغلیل: ۵۱۲)

الغرض امام ابوداؤد کی روایت صحیح ہے۔ لہذا یہ قابل احتجاج اور لائق استدلال ہے؛ کیونکہ سب رواۃ ثقہ ہیں اور امام ابوداؤد کے اعتراضات بھی دفع ہو گئے۔

حافظ ابن حجرؒ کے اشکال کا جواب

اس حدیث پر ایک اشکال حافظ ابن حجرؒ نے کیا ہے، چنانچہ آپ نے ”تلخیص الحیبر“ میں فرمایا کہ: ”اس حدیث کو امام ابوداؤد اور امام حاکم نے روایت کیا اور اس کے رجال ثقہ ہیں لیکن اس میں انقطاع ہے“۔ (تلخیص: ۸۶۱)

راقم کہتا ہے کہ اس حدیث کی سند میں علت انقطاع کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ابوالجوزاء جن کا نام اوس بن عبداللہ ربعی ہے، ان کو حضرت عائشہؓ سے لقاء و سماع حاصل نہیں۔ مگر خود حافظ ابن حجرؒ نے ”تہذیب التہذیب“ میں فرمایا کہ: ابن عبدالبر نے ”التمہید“ میں کہا کہ: ابوالجوزاء نے حضرت عائشہؓ سے نہیں سنا، اور جعفر الفریابی نے ”کتاب الصلوٰۃ“ میں کہا کہ: ابوالجوزاء نے کہا کہ: میں نے حضرت عائشہؓ کے پاس قاصد بھیجا تا کہ وہ ان سے مسئلہ دریافت کرے، الخ۔ حافظؒ

فرماتے ہیں کہ اس سے ظاہر یہی ہے کہ ابوالجوزاء نے حضرت عائشہؓ سے ملاقات نہیں کی، لیکن اس بات سے کوئی مانع نہیں کہ اس کے بعد حضرت عائشہؓ سے ملاقات کی ہو، جیسے کہ امام مسلم کا امکانِ لقاء کا مذہب ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۱/۳۳۵)

معلوم ہوا کہ خود حافظ کے نزدیک بھی ”ابوالجوزاء عن عائشہ“ روایت متصل ہے۔ نیز امام مسلم نے ”اپنی صحیح“ میں ایک دوسری حدیث بعینہ اسی سند ”بدیل بن میسرۃ عن ابی الجوزاء عن عائشہ“ سے روایت کی ہے، جس پر نہ امام نوویؒ نے کچھ کہا اور نہ کسی اور نے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مسلم کے نزدیک بھی یہ سند صحیح ہے، اسی لئے انہوں نے اس کو روایت کیا ہے۔

الغرض ”عن ابی الجوزاء عن عائشہؓ“ والی روایت امام مسلم کے نزدیک بھی متصل ہوگی، اور جمہور کے نزدیک اتصالِ سند کے لئے معاشرت و امکانِ لقاء کافی ہے۔ پس یہ روایت قابلِ احتجاج ہے اور بقول امام حاکم یہ حدیث صحیح ہے۔

دوسری حدیث اور اس پر کلام

حضرت عائشہ ہی سے روایت ہے کہ: کان النبی ﷺ إذا افتتح الصلوۃ قال: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ ﴿﴾

(جب اللہ کے نبی نماز شروع کرتے تو یہ کہتے تھے: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ ﴿﴾ ترمذی: ۱/

۵۷، ابن ماجہ: ۵۸/۱، ابن خزیمہ: ۲۴۰/۱، دارقطنی: ۳۰۱/۱، طحاوی: ۱۴۵/۱)

اس کی سند میں حارثہ بن ابی الرجال ایک راوی ہیں جن پر کلام ہوا ہے، امام ترمذی نے کہا کہ: ان کے حافظہ کی وجہ سے ان پر کلام کیا گیا ہے، نیز امام احمد و تیحی

بن معین و نسائی وغیرہ نے ان کو ضعیف و متروک کہا ہے۔ (تہذیب الکمال : ۲۵۳/۳، تہذیب التہذیب: ۱۴۴/۲)

الغرض یہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف ہے مگر پہلی حدیث کی شاہد ہے، اور اس وجہ سے اس کو حسن یا صحیح کہا جاسکتا ہے اور یہی وہ شاہد ہے جس کا ذکر بطور شاہد حاکم نے اور شوکانی وغیرہ نے کیا ہے۔ ”الجوہر النقی“ میں ہے کہ حاکم نے اس حدیث حارثہ بن محمد ابوالرجال کو حدیث ابوداؤد کی شاہد کہا ہے اور خود اس روایت ”ترمذی“ کو بھی صحیح الاسناد کہا ہے۔ (الجوہر النقی: ۵۱/۲)

اور شیخ ناصر الدین الالبانی نے بھی شواہد کی روشنی میں اس حدیث کو ارواء الغلیل میں صحیح قرار دیا ہے۔ (ارواء الغلیل: ۵۰/۲)

اس تحقیق سے مؤلف کے اس اعتراض کا جواب ہو گیا کہ اس کی سند میں ایک راوی حارثہ بن ابی الرجال ہے، جس کی یادداشت اور حافظہ کمزور تھا۔ (حدیث نماز: ۷۱)

تیسری حدیث اور اس پر کلام

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ رات میں نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے، پھر: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ“ پڑھتے تھے ﴿

(ابوداؤد: ۱۱۳/۱، ترمذی: ۵۷/۱، نسائی: ۱۰۴/۱، ابن ماجہ: ۵۸/۱، مسند احمد: ۵۰۳/۳، دارمی:

۳۱۰/۱، ابن خزمیہ: ۲۳۸/۱، دارقطنی: ۲۹۸/۱، طحاوی: ۱۴۵/۱)

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس حدیث کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ”یہ دعائی (سبحانک اللہم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالی جدک ولا الہ

غیرک) ”ترمذی شریف“ میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کی گئی ہے، اس کی سند میں علی بن علی ہیں، جن کے بارے میں فن رجال کے امام یحییٰ بن سعید قطان نے جرح کی ہے، اسی لیے امام احمد بن حنبلؓ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے ہی نہیں۔ (حدیث نماز: ۷۰-۷۱)

راقم کہتا ہے کہ مؤلف نے حسب عادت صرف اپنے مطلب کی بات نقل کر دی اور باقی کو نظر انداز کر دیا حالانکہ یہ اہل علم کا شیوہ نہیں ہے، بات یہ ہے کہ علی بن علی الرفاعی کے بارے میں یحییٰ القطان نے اور بعض حضرات نے کلام کیا ہے، مگر اکثر حضرات نے ان کی توثیق کی ہے، امام وکیع بن الجراح اور ابن معین و ابو زرہ نے کہا کہ: یہ ثقہ ہیں، اور حرب نے امام احمد سے نقل کیا کہ: ان میں کچھ خرابی نہیں، نیز امام احمد سے ایک روایت میں نقل کیا کہ: یہ صالح ہیں، اور ابو حاتم نے کہا کہ: ان کی حدیث میں خرابی نہیں، اور نسائی نے بھی ”لاباس بہ“ کہا، اور آجری نے کہا کہ: ابو داؤد نے ان کی تعریف کی ہے، اور فضل بن دکین اور عفان نے کہا کہ: یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مشابہت رکھتے تھے۔ (تہذیب الکمال: ۵۲۱/۱۲-۵۲۳، تہذیب التہذیب: ۳۱۹/۷)

اس سے معلوم ہوا کہ علی بن علی کے بارے میں اگرچہ بعض حضرات نے جرح کی ہے لیکن اکثر علماء نے ان کی توثیق و تصدیق کی ہے، لہذا ان کی حدیث کم از کم حسن ہوگی، اور امام احمد نے جو یہ فرمایا کہ ”لا یصح هذا الحدیث“ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حسن بھی نہ ہوگی؛ کیونکہ مراد ان کی اس حدیث کے صحیح ہونے کی نفی ہے اور یہ حسن کے منافی نہیں۔ (دیکھو: تدریب الراوی وغیرہ)

اس حدیث کے بارے میں شیخ الالبانی نے امام احمد کا قول: لا یصح هذا

الحديث“ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: ”قلت: لعل هذا لا ينفي أن يكون حسناً، لأن رجاله كلهم ثقات، وعلى هذا وإن تكلم فيه يحيى بن سعيد فقد وثقه يحيى بن معين، وو كيع، وأبو زرعة، وقال شعبة: اذهبوا بنا إلى سيدنا وابن سيدنا علي بن علي الرفاعي، وقال أحمد: لم يكن به بأس إلا أنه رفع أحاديث. قلت: وهذا لا يوجب إهدار حديثه بل يحتاج به حتى يظهر خطأه، وهنا ما روى شيئاً منكراً بل توبع عليه كما سبق“۔ (میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ اس سے اس حدیث کے حسن ہونے کی نفی نہ ہو؛ کیونکہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، اور اس بنا پر اگرچہ اس (علی بن علی کے بارے) میں یحییٰ بن سعید نے کلام کیا ہے مگر یحییٰ بن معین، وکیع اور ابو زرعة نے ان کی توثیق کی ہے، اور شعبہ نے کہا کہ ہمیں ہمارے سردار اور سردار کے بیٹے علی بن علی الرفاعي کے پاس لے چلو، اور امام احمد نے کہا کہ ان میں کوئی خرابی نہیں ہے سوائے اس کے کہ بعض احادیث کو (جو موقوف تھیں) مرفوع بیان کر دیا، البانی کہتے ہیں کہ: میں کہتا ہوں کہ یہ بات ان کی حدیث کے رد کا سبب نہیں ہے، بلکہ ان کی حدیث سے احتجاج کیا جائے گا جب تک کہ اس میں خطا ظاہر نہ ہو، اور یہاں انھوں نے کوئی منکر چیز روایت نہیں کی، بلکہ ان کی حدیث کی متابعت کی گئی ہے جیسا کہ گزرا) (ارواء الغلیل: ۵۱۲-۵۲)

اس کے ساتھ جب یہ حدیث اوپر کی حدیث سے تائید پاگئی اور اس کے شواہد و قرائن بھی پائے گئے تو اس کی وجہ سے یہ حدیث ضرور قابل احتجاج ہے۔

حضرت عمرؓ کا عمل اور اس پر بحث

عبدہ بن ابی لباہ سے روایت ہے کہ: ﴿ أن عمر بن الخطاب كان يجهر

بِهؤلاء الكلمات، يقول: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ ﴿﴾ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کلمات کو زور سے کہا کرتے تھے: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ) (مسلم: ۱۷۲۱، مستدرک: ۳۶۱/۱)

اور اسی بات کو امام دارقطنی نے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت اسود بن یزید اور علقمہ سے بھی روایت کیا ہے، او امام طحاوی نے عمرو بن میمون، اسود اور علقمہ تینوں سے اس کو روایت کیا ہے۔ (سنن دارقطنی: ۲۹۹/۱-۳۰۰، معانی الآثار: ۱۴۵-۱۴۶)

مؤلف نے ”مسلم“ کی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد کہا کہ:

”حضرت امام مسلم نے خود اس حدیث کو اس حدیث سے رد کر دیا ہے جس میں ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ الحمد للہ رب العالمین سے آواز بلند کرتے تھے، اسی لئے امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں بیان کیا ہے کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی ابولبابہ ہے، اس نے حضرت عمرؓ سے نہیں سنا، اس کا سماع خلیفہ دوم سے ثابت ہی نہیں ہے، یعنی ”سبحانک اللہم“ والی روایت منقطع ہے اور صحیح کے خلاف بھی ہے۔ (حدیث نماز: ۷۱)

راقم کہتا ہے کہ: جہاں تک امام مسلم کے اس حدیث کو رد کرنے کی بات ہے یہ مؤلف حدیث نماز کا اپنا خیال ہے جس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ جو حضرات امام مسلم کے طرز سے واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ امام مسلم نے اس جگہ اولاً اپنی سند سے عبدہ کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا عمل نقل کیا، پھر اسی سند سے جو انہوں نے اسی کے ساتھ سنی تھی دوسری حدیث حضرت قتادہ کے حوالے سے نقل کی ہے، اور اس جگہ

ان کا مقصود یہی دوسری حدیث کو روایت کرنا ہے، اور ضمناً پہلی حدیث بیان کر دی ہے، اس سے ان کا یہ مقصود بیان کرنا کہ وہ دوسری حدیث سے پہلی کو رد کرنا چاہتے ہیں، امام مسلم کے طرز سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ (دیکھئے شرح مسلم: ۱۷۲/۱)

اب رہی مولف کی دوسری بات کہ یہ حدیث منقطع ہے تو عرض ہے کہ یہ حدیث بسباق ”مسلم“ اگرچہ منقطع ہے، لیکن اس روایت کے بے شمار طرق ہیں، جن سے حضرت عمرؓ کا ان الفاظ کو جہراً ادا کرنا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ امام طحاوی، امام دارقطنیؒ وغیرہ نے اس کو متصلاً روایت کیا ہے، طحاوی نے چھ طرق سے اس کو روایت کیا ہے، اور ان کے بارے میں علامہ عینی کہتے ہیں کہ: ”ہذہ سنتہ طرق کلہا موقوفة صحاح و رجالہا ثقات“۔ (مخبر الافکار: ۲/۴۱۵)

اور دارقطنی میں ایک روایت بسند صحیح اس طرح آئی ہے:

”حدثنا محمد بن نوح الجند نيسا بوري حدثنا هارون بن اسحاق ثنا ابن فضيل وحفص بن غياث عن الأعمش عن ابراهيم عن الأسود قال: كان عمر إذا افتتح الصلاة قال: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ وَ لَا إِلَهَ غَيْرُكَ (دارقطنی: ۳۰۰/۱)

دارقطنی کی شرح ”التعلیق المغنی“ میں اس کے بارے میں کہا ہے کہ: اس کی سند صحیح اور اس کے سب رواۃ ثقہ ہیں۔ (التعلیق المغنی: ۱۱۳/۱)

اسی لئے شیخ ناصر الدین الالبانی نے اپنی کتاب ”ارواء الغلیل“ میں اس پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ: قلت: وقد صح موصولاً، فأخرجه ابن أبي شيبه في المصنف، والطحاوي والدارقطني، و الحاكم والبيهقي من

طرق عن الأسود بن یزید قال: سمعت عمر افتتح الصلاة و کبر فقال: سبحانک الخ، وإسناده صحیح، وصححه الحاکم والذهبی، وكذا الدارقطني“ (میں کہتا ہوں کہ یہ موصولاً بھی صحیح ثابت ہو چکی ہے، ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، طحاوی، دارقطنی، حاکم اور بیہقی نے متعدد طرق سے اسود بن یزید سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ: میں نے حضرت عمرؓ کو سنا کہ انہوں نے نماز شروع کی اور تکبیر کہی، پھر کہا: ”سبحانک اللہم الخ، اس کی سند صحیح ہے، حاکم اور ذہبی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور اسی طرح دارقطنی نے بھی صحیح کہا ہے) (ارواء الغلیل: ۲۸۸-۲۹)

پھر مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد بن حنبل کی طرح امام مسلم نے بھی رد کر دیا ہے۔ (حدیث نماز: ۷۱)

راقم کہتا ہے کہ امام مسلم کے رد کرنے کی تردید آپ اوپر پڑھ آئے ہیں، رہا امام احمد کا اس حدیث کو رد کرنا تو یہ بات صحیح نہیں؛ کیونکہ امام احمد نے صرف ابوسعید کی روایت کو صحیح نہیں مانا ہے اور کسی ایک روایت کو صحیح نہ ماننے سے اس باب کی تمام روایات کا صحیح نہ ماننا لازم نہیں آتا، ورنہ تو خود امام احمد نے حارثہ بن محمد ابوالرجال کی حدیث کے بارے میں کہا کہ: صحیح ہے۔ (دیکھو: فلائد الازہار: ۱۹۹/۱)

اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ امام احمد کا مسلک بھی وہی ہے جو احناف کا ہے کہ ”سبحانک اللہم“ پڑھا جائے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ نے اپنے ”فتاویٰ“ میں اولاً دونوں قسم کے الفاظ ثناء نقل کئے ہیں، پھر فرمایا کہ:

”والأول اختیارأبی حنیفة و أحمد، والثانی اختیارالشافعی“ (پہلی یعنی ”سبحانک اللہم“ والی دعا کو) امام ابوحنیفہ و احمد نے اختیار کیا اور ثانی یعنی ”اللہم

باعد والی "دعاء کو امام شافعی نے اختیار کیا) (مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۲/۴۰۴)
ابن قدامہ نے "معنی" میں بھی اس کی تصریح کی ہے کہ: امام احمد نے حضرت
عمرؓ اور سلف کے تعامل کی وجہ سے اس کو اختیار فرمایا ہے۔ (المعنی: ۱/۳۳۵)
اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ امام احمد نے اس حدیث کو رد نہیں کیا، بلکہ اسی کی
وجہ سے اس کو اپنا مسلک قرار دیا ہے، مگر مؤلف "حدیث نماز" نے بلا تحقیق امام احمد
کی طرف اس حدیث کے رد کرنے کا الزام لگا دیا، جو موجب افسوس بھی ہے اور
باعث حیرت بھی۔

اب جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ "سبحانک اللہم" کی روایات بھی صحیح ہیں،
تو اس کے بعد ترجیح خارج سے ہوگی؛ کیونکہ بخاری میں کسی روایت کا ہونا ہمارے
نزدیک اصح و ارجح ہونے کی دلیل نہیں۔ لہذا جب دونوں قسم کی روایات جمع ہو گئیں،
تو اب ترجیح خارج سے ہو گئی۔

اور ہمارے پاس اس کی ترجیح کی کئی وجوہات ہیں:

(۱) ایک وجہ یہ ہے کہ مختلف طرق سے حضرت عمرؓ، حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت
عثمان رضی اللہ عنہما سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ یہ حضرات "سبحانک اللہم"
والی دعاء پڑھتے تھے، نہ کہ "اللہم باعد بینی و بین خطایای" والی دعاء۔
حضرت عمرؓ سے اس کا ثبوت اوپر مسلم وغیرہ کی حدیث سے معلوم ہو چکا ہے، اور
حضرت ابو بکر صدیقؓ سے اس کے پڑھنے کا ثبوت سعید بن منصور کی روایت میں ہے۔
(کمانی فتح القدر: ۱/۲۹۴)

اور حضرت عثمان سے اس دعاء کا پڑھنا دارقطنی کی روایت میں وارد ہوا ہے۔

(دارقطنی: ۱/۳۰۲)

اس طرح تین خلفاء راشدین کا عمل اس کے مطابق ہونا اس حدیث کے عملاً راجح ہونے کی دلیل ہے۔

(۲) نیز حضرت عمرؓ کا محضر صحابہ میں اس کو جہر سے پڑھنا بے شمار روایات سے ثابت ہے، یہ جہر آپ اسی لیے کرتے تھے کہ لوگ اس کو سیکھ کر خود بھی پڑھیں، اگر نبی کریم ﷺ کا اکثر یا آخری عمل یہ نہ ہوتا، یا خود نبی کریم ﷺ نے آپ کو نہ سکھایا ہوتا تو آپ ایسا نہ کرتے۔ یہ بھی اس طرف مشیر ہے کہ یہی ”سبحانک اللہم“ والی دعاء، افضل اور راجح ہے۔

رہا یہ کہ امام بخاریؒ کی سند عالی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ محض علو سند اس دعاء کے افضل ہونے اور اس کے سنت ہونے پر دال نہیں ہو سکتا، ہاں مطلق ثبوت سے کسی کو انکار نہیں کہ آپ نے اس کو پڑھا ہے اور بتلایا بھی ہے، مگر آپ کا غالب عمل اور پھر آپ کے بعد صحابہ کرام کا عمل بتاتا ہے کہ افضل ”سبحانک اللہم“ ہے۔

چنانچہ علامہ ابن الہمام ”فتح القدر“ میں فرماتے ہیں کہ: ”ولما ثبت من فعل الصحابة كعمر رضی اللہ عنہ وغیرہ الافتتاح بعدہ علیہ السلام بسبحانک اللہم مع الجہر بہ لقصہ تعلیم الناس؛ لیقتدوا و یانسوا کان دلیلاً علی أنه الذی کان علیہ ﷺ آخر الأمر أو أنه کان الأكثر من فعلہ وان کان رفع غیرہ أقوى علی طریق المحدثین۔ (فتح القدر: ۲۹۴/۱)

(جب رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرات صحابہ جیسے حضرت عمرؓ وغیرہ سے ”سبحانک اللہم“ والی دعاء سے نماز کا افتتاح کرنا بقصد تعلیم، جہر کے ساتھ ثابت ہو گیا تا کہ لوگ اس کی اقتداء و اتباع کریں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہی وہ عمل ہے جس پر آخر الامر اللہ کے رسول ﷺ قائم تھے، یا یہ کہ یہی آپ کا اکثر عمل رہا، اگر

چہ کہ دوسری روایت کا رفع محدثین کے طریق پر اقوی ہے) نیز ابن الہمام نے فرمایا کہ: غیر مرفوع حدیث یا وہ مرفوع جو باعتبار ثبوت مرجوح ہے، وہ کبھی اپنے مقابلے کی مرفوع حدیث سے مقدم و راجح ہو جاتی ہے، جبکہ ایسے قرائن پائے جائیں جو اس کے صحیح ہونے اور ہمیشہ کا عمل ہونے کا فائدہ دیں۔ (فتح القدر: ۱/۲۹۵)

الغرض یہاں بھی ”سبحانک اللہم“ پر نبی کریم ﷺ کے استمرار اور اس کی سنیت پر قرائن ہیں، لہذا یہ مقدم اور راجح ہوگا۔

فائدہ مہمہ

یہاں یہ بات بھی لائق غور و تأمل ہے کہ محدثین نے جو احادیث کی قوت و ضعف بیان کیا ہے، یہ امر اجتہادی ہے، جس میں یہ احتمال قطعی طور پر موجود ہے کہ واقعہ اس کے خلاف ہو۔

چنانچہ علامہ ابن الصلاح، علامہ نووی اور علامہ سیوطی وغیرہ محدثین فرماتے ہیں:

”ومتی قالوا: ”هذا حديث صحيح“ فمعناه: أنه اتصل
سندہ مع الأوصاف المذكورة، وليس من شرطه أن يكون
مقطوعاً به في نفس الأمر، إذ منه ما ينفرد بروايته عدل واحد،
وليس من الأخبار التي أجمعت الأمة على تلقيها بالقبول،
وكذلك إذا قالوا: ”هذا حديث غير صحيح“ فليس ذلك قطعاً
بأنه كذب في نفس الأمر، إذ قد يكون صدقاً في نفس الأمر،
وإنما المراد به أنه لم يصح إسناده على الشرط المذكور“۔

(جب محدثین کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی سند اوصاف مذکورہ کے ساتھ متصل ہے، اور اس کی شرط میں سے یہ نہیں ہے کہ نفس الامر میں بھی قطعی طور پر ثابت و صحیح ہو؛ کیونکہ صحیح حدیث میں سے وہ بھی ہوتی ہے جو صرف ایک عادل آدمی روایت کرے، اور یہ ان احادیث میں سے نہیں جس کے قبول کرنے پر امت کا اتفاق ہو، اور اسی طرح جب علماء کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں، تو یہ کوئی قطعی بات نہیں کہ نفس الامر میں یہ کذب و جھوٹ ہے؛ کیونکہ کبھی نفس الامر میں وہ سچ بھی ہو سکتی ہے، لہذا یہ مراد ہے کہ اس حدیث کی سند شرط مذکور پر صحیح نہیں) (قدمہ ابن الصلاح: ۹، تدریب الراوی: ۳۴)

جب یہ بات معلوم ہوگئی، تو میں کہتا ہوں کہ امام بخاریؒ کی سند اگرچہ عالی ہے، مگر دوسرے قرائن ایسے یہاں ہیں جو بتاتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا مستمر عمل اور پسندیدہ امر ”سبحانک اللہم“ والی دعاء پڑھنے کا تھا، لہذا علماء حنفیہ نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

صاحب نور الہدایہ کا تسامح

مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”نور الہدایہ ترجمہ اردو شرح وقایہ“ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

”حنفی مذہب کے زبردست، مجتہد، محقق اور مؤید علامہ کمال ابن الہمام کا بیان ہے کہ بجائے ”سبحانک اللہم“ کے ”اللہم باعد بیني الخ“ پڑھنا زیادہ تر صحیح ہے۔“ (حدیث نماز: ۷۲)

راقم کہتا ہے کہ صاحب ”نور الہدایہ“ کی اصل عبارت یہ ہے:

”اور ذکر کیا اس کو (یعنی ”اللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي“ والی دعا کو) شیخ ابن الہمام نے اور کہا: ”وهو أصح من الكل ؛ لأنه متفق عليه ، ومع ذلك لم يقل بسننہ عیناً أحد من الائمة الأربعة۔“ (یہ صحیح ہے کل روایتوں سے، اس واسطے کہ اتفاق کیا اس پر امام بخاری و مسلم نے اور باوجود اس کے نہیں کہا کسی نے ساتھ سنیت خاص ”بسحانك اللّٰهُم“ کے، تو اگر وہ دعاء بھی پڑھے تو کچھ حرج نہیں اور جائز ہے فقط۔ (نور الہدایہ ترجمہ اردو شرح وقایہ: ۸۷/۱)

اس عبارت میں اول تو کہیں بھی ”اللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي“ کے پڑھنے کو زیادہ صحیح نہیں کہا گیا ہے، بلکہ اس کی حدیث کو اصح کہا گیا ہے، اور حدیث کے اصح ہونے سے اس کی سنیت ثابت نہیں ہو جاتی، جب تک کہ استمرار وغیرہ امور جو سنیت پر دلالت کرتے ہیں ان کا ثبوت نہ ہو، ثانیاً: یہاں مترجم ”شرح وقایہ“ کو علامہ ابن الہمام کی عبارت سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے، اس لیے ہم علامہ ابن الہمام کی پوری عبارت ”فتح القدیر“ سے نقل کرتے ہیں؛ تاکہ علامہ ابن الہمام کا مطلب صاف ظاہر ہو جائے۔

علامہ موصوف نے اولاً امام ترمذی کا کلام ابوسعید کی روایت کے تحت نقل کیا کہ اس میں علی بن نجاد ہیں، جن میں امام یحییٰ بن سعید القطان نے کلام کیا ہے، اس کے بعد جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”وعلى ابن نجاد بن رفاعه وثقه وكيع وابن معين وأبوزرعة ، وكفى بهم ، ولما ثبت من فعل الصحابة كعمر وغيره الافتتاح بعده عليه السلام ” بسحانك اللّٰهُم“ مع الجهر لقصده تعليم الناس ؛ ليقصدوا ويأمنوا كان دليلاً على أنه الذي كان عليه ﷺ آخر الامر، أو أنه كان

الأكثر من فعله ، وإن كان رفع غيره أقوى على طريق المحدثين ، ألا يرى أنه روى في الصحيحين من حديث أبي هريرة أنه ﷺ كان يسكت هنيئاً قبل القراءة بعد التكبير، فقلت : بأبي أنت وأمي يا رسول الله ! رأيت سكوتك بين التكبير و القراءة ما تقول ؟ قال : أقول : اللهم باعد بيني الخ ، وهو أصح من الكل ؛ لأنه متفق عليه و مع ذلك لم يقل بسنيته عيناً أحد من الأربعة . والحاصل أن غير المرفوع أو المرفوع المرجوح في الثبوت عن مرفوع آخر قد يقدم على عديله إذا اقترن بقرائن تفيد أنه صحيح عنه ﷺ ومستمر عليه .“ (فتح القدير: ۲۹۴/۱)

(علی بن نجاد بن رفاعہ کی وکیع، ابن معین اور ابو زرعمہ نے توثیق کی ہے اور یہ (لوگ ہمیں) کافی ہیں اور جب کہ صحابہ کا مثل حضرت عمرؓ وغیرہ کے ”سبحانک اللہم“ سے نماز کی افتتاح کرنا رسول اللہ ﷺ کے بعد جہر کے ساتھ ثابت ہوا تا کہ لوگ اس کی اقتدا کریں اور تعلیم حاصل کریں، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہی رسول اللہ ﷺ کا آخری عمل تھا، یا یہ کہ یہی اکثر عمل تھا، اگرچہ ”سبحانک اللہم“ کے علاوہ دوسری روایت کا رفع محدثین کے طریقہ پر اقوی ہے؛ کیوں کہ ”اللہم باعد بینی“ کی روایت ابو ہریرہ سے ”صحیح بخاری“ و ”مسلم“ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ قراءت سے پہلے اور تکبیر کے بعد کچھ سکوت فرماتے تھے، میں نے کہا: کہ یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ (اس سکوت میں) کیا پڑھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں ”اللہم باعد بینی“ ارنخ۔ پڑھتا ہوں اور یہ تمام روایات سے اصح ہے؛ کیوں کہ متفق علیہ ہے اور باوجود اس کے خاص اس کی سنیت کا ائمہ اربعہ میں سے کوئی قائل نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ غیر مرفوع یا باعتبار ثبوت کے مرجوح مرفوع کبھی

اپنے مقابل پر مقدم و راجح ہو جاتا ہے، جب ایسے قرائن مل جائیں جو اس بات کی نشاندہی کریں کہ یہ بات نبی کریم ﷺ سے صحیح ثابت ہے اور یہ کہ آپ کا یہ ہمیشہ کا معمول ہے)

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ”اللہم باعد بینی“ والی روایت متفق علیہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ تمام روایتوں سے اصح ہے، مگر اس کے باوجود خاص طور پر اس کی سنیت کا ائمہ اربعہ میں سے کوئی قائل نہیں؛ کیوں کہ دوسرے قرائن اس پر دال ہیں کہ ”سبحانک اللہم“ والی دعاء آپ نے پابندی کے ساتھ اور آخری عمر تک پڑھی ہے اور آپ کا آخری عمل یہی ہے۔

یہ حاصل ہے علامہ ابن الہمام کے کلام کا، لہذا اس سے یہ مطلب نکالنا کہ یہ ”اللہم باعد بینی“ والی دعاء کو ”سبحانک اللہم“ والی دعاء پر ترجیح دے رہیں، ”تاویل القول بما لا یرضابہ القائل“ کی قبیل سے ہوگا۔

دوسرے مترجم ”شرح وقایہ“ نے ”لم یقل بسنیتہ“ کی ضمیر کو ”سبحانک اللہم“ کی طرف راجع کیا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، بلکہ آپ نے تو یہ کہا ہے کہ: ”اللہم باعد“ والی دعاء سنداً قوی ہونے کے باوجود خاص طور پر اس کی سنیت کا ائمہ اربعہ میں سے کوئی بھی قائل نہیں۔ ابن الہمام کے اس جملہ کو ”سبحانک اللہم“ کی طرف اشارہ قرار دینا، سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہے؛ کیونکہ اگر آپ کی مراد یہ ہوتی تو اس کے بعد ”والحاصل أن غیر المرفوع قد یقدم، الخ“ کا کیا مطلب ہے؟ اسی طرح اس سے پہلے ”وان کان رفع غیرہ أقوى“ (اگرچہ ”سبحانک اللہم“ کے علاوہ دوسری روایت اقوی ہے) کا کوئی مطلب نہ رہے گا۔ حاصل یہ ہے کہ امام ابن الہمام کی مراد وہ نہیں جو صاحب ”نور الہدایہ“ نے سمجھی

اور ان کی تقلید ہمارے مؤلف نے کر لی۔ الغرض یہ ثابت ہوا کہ ” سبحانک اللہم“ والی دعاء، احناف کے یہاں مختلف وجوہ سے راجح ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

﴿ قرأت خلف الامام ﴾

مسئلہ ” قرأت خلف الامام“ زمانہ قدیم سے معرکہ الآراء بنا ہوا ہے اور علماء قدیم و جدید نے اس مسئلہ پر رسائل مستقلہ تالیف فرمائے ہیں اور طرفین سے اس سلسلہ پر مناظرے و مباحثے بھی ہو چکے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے مواقع میں اعتدال اور انصاف پر جمع رہنا از بس دشوار امر ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر بعض غیر منصف و غیر متعادل اشخاص سے اس سلسلہ میں دغذغہ و غلغلہ تک کا ظہور ہوا اور بعض نے تعصب و حمیت جاہلیہ کو اپنا شیوہ بنایا اور یہ سب کا سب تجاوز عن الحد و دو میلان عن الحق کا نتیجہ ہے۔

چوں کہ اس مسئلہ پر احناف نے بھی بہر دقت و وسعت مواد جمع فرمایا اور مسئلہ کی بہر نوعیت کافی و ثنائی وضاحت مدلل طریقہ پر بیان فرمادی ہے، اس لیے ہمیں اس سلسلہ میں زیادہ تفصیل میں جانے کی حاجت نہیں، تاہم جب مؤلف ” حدیث نماز“ نے اس مسئلہ کو چھیڑا اور جگہ جگہ اپنی عادت سے مجبوراً مغالہ آرائی اور تعصب سے کام لیا اور مذہب احناف کو لچر اور رکیک تاویلات اور تلمیسات سے ضعیف ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی اور علماء احناف کے کلام کو آگہ خداع بنا کر ” کلمة حق اريد بها الباطل“ اور ” تاويل القول بما لا يرضى به القائل“ کا مصداق ہوئے، تو ہمیں بھی اس پر کچھ لکھنا پڑ رہا ہے، ورنہ اس پر مزید لکھنے کی کوئی حاجت و ضرورت

نہیں تھی۔ اور مؤلف ”حدیث نماز“ جن علماء احناف کے حوالے بغرض خداع یا بوجہ انخراع دیتے ہیں، وہی اس مسئلہ پر احناف کے مسلک کی وضاحت اور اس کے دلائل کی اصابت و تقویت کے لیے کافی ہیں، مگر جو حق کو چھوڑ کر صرف میلان الی الباطل رکھتا ہو اور مقصود ہی تلبیس اور دھوکہ دہی ہو اور جس کا شیوہ بنی بر تعصب و تعسف ہو اس کو ہزار حقائق کے سامنے ہوتے ہوئے بھی باطل ہی نظر آتا ہے۔

اس مسئلہ پر حضرت قطب العالم المحدث رشید احمد گنگوہیؒ نے ”ہدایت المعتدی فی قراءۃ المقتدی“ کے نام سے رسالہ لکھا اور حضرت قاسم العلوم مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ نے ”توثیق الکلام“ اور ”الدلیل المحکم“ دو رسالے لکھے اور مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ نے ”امام الکلام“ اور اس کا حاشیہ ”غیث الغمام“ لکھا اور حضرت انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے رسالہ ”فصل الخطاب فی مسئلۃ أم الكتاب“ لکھا اور علامہ ہاشم سندھیؒ نے ”تنقیح الکلام“ لکھا اور حضرت احمد علی صاحب سہارنپوریؒ نے ”الدلیل القوی“ لکھا، اسی طرح حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ نے ”فاتحۃ الکلام“ لکھا اور مولانا ابوالزہد سرفراز خان صاحب صفدر نے سب سے زیادہ مفصل و مدلل و محقق طور پر ”احسن الکلام“ دو جلدوں میں لکھی۔

ان تمام رسالوں میں مذہب احناف کو ثابت کیا گیا ہے اور تمام دلائل کو بدقت و وسعت بیان کیا گیا ہے، یہ نشاندہی ہم نے اس لیے کر دی تاکہ اگر کسی کو دیکھنا ہو تو ان میں تفصیل ملاحظہ کر لیں اور اپنی تسکین کر لیں۔

فاتحہ خلف الامام کے بارے میں ائمہ کے مسالک

اولاً حضرات ائمہ کے مسالک کو یہاں بیان کر دینا مناسب ہے، اگرچہ کہ ہمیں

سب کے مسالک سے بحث کرنا نہیں ہے، تاہم مسئلہ کی نوعیت سمجھنے کے لیے چوں کہ مفید ہے، اس لیے یہاں مختصراً ائمہ کے مذاہب سامنے آجائیں، تو بہتر ہے۔
(۱) بعض ائمہ کے نزدیک مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، خواہ نماز سری ہو یا جہری، یہی امام شافعی کا مسلک ہے۔ (شرح المہذب: ۳۲۳)

(۲) امام احمدؒ کا مذہب ابن قدامہ نے ”معنی“ میں جہری نمازوں میں عدمِ وجوب بلکہ عدمِ استحباب بیان کیا ہے۔ اور فرمایا کہ: یہی ہمارے امام اور امام زہری اور امام مالک، ابن عیینہ، ابن المبارک اور اسحاق کا مسلک ہے اور امام شافعی کا ایک قول ہے۔ (المعنی: ۳۹۲/۱)

(۳) امام مالکؒ کے نزدیک بھی مختار وہی ہے، جو امام احمدؒ کے یہاں ہے کہ جہری نمازوں میں نہ پڑھے اور سری نمازوں میں پڑھنا واجب ہے۔ (المعنی: ۳۹۲/۱، شرح المہذب: ۳۶۵/۳)

(۴) امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ سری اور جہری دونوں قسم کی نمازوں میں قرأت نہ کرے۔ البتہ سری نماز میں پڑھنا مباح ہے، یعنی نماز میں کوئی خرابی نہ ہوگی اور جہری نماز میں پڑھنا مکروہ ہے۔ (ہدایہ: ۱۰۲/۱)

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ائمہ اربعہ میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ امام مالک و امام احمد بن حنبل بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ سری نمازوں میں پڑھنے کی اجازت ہے، جہری میں اجازت نہیں۔ بلکہ امام احمدؒ نے یہاں تک فرمایا کہ: ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ اگر امام جہراً قرأت کرے تو بھی مقتدی کو اس کی قرأت کافی نہ ہوگی، اور فرمایا کہ:

”یہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ ہیں، اور یہ امام مالک اہل حجاز میں سے ہیں، اور یہ امام ثوری اہل عراق میں سے ہیں، اور یہ امام اوزاعی اہل شام میں سے ہیں، اور یہ امام ابواللیث اہل مصر میں سے ہیں، ان حضرات نے یہ نہیں کہا کہ آدمی نماز پڑھے اور اس کا امام قرأت کرے اور وہ خود قرأت نہ کرے تو اس کی نماز باطل ہے۔ (المغنی: ۳۹۳/۱)

جب یہ معلوم ہو گیا کہ امام ابوحنیفہ اپنے مسلک میں کوئی منفرذ نہیں، بلکہ آپ کے ساتھ اور ائمہ بھی ہیں جو جہری نمازوں میں مقتدی کے لئے قرأت کے قائل نہیں، تو اب ہم دلیل کی طرف آتے ہیں۔

وجوب فاتحہ کے دلائل کا علمی جائزہ

پہلے ہم مؤلف ”حدیث نماز“ کی جانب سے مقتدی کے لئے سورہ فاتحہ پڑھنے کے وجوب پر ذکر کردہ دلائل کا علمی جائزہ لیں گے اور ان کے جوابات حوالہ قلم کریں گے، نیز ان کی جانب سے احناف پر وارد کردہ اعتراضات کا جواب اور علماء احناف کے کلام سے اخذ کردہ غلط مطالب کی تردید حوالہ قرطاس کریں گے۔

پہلی دلیل کا جائزہ

مؤلف ”حدیث نماز“ نے بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، ابو داؤد، بیہقی، جزء القراءۃ للبخاری، اور مشکوٰۃ کے حوالے سے یہ حدیث اپنے مسلک کی دلیل میں ذکر کی ہے:

﴿عَنْ عِبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ﴾ -

(حضرت عبادہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جس شخص نے

سورہ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوتی)

مؤلف نے مذکورہ روایت سے مقتدی کے لیے سورہ فاتحہ کا واجب ہونا بلکہ فرض ہونا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر مؤلف کا یہ مدعی اس حدیث سے ثابت نہیں ہو سکتا؛ کیوں کہ اس حدیث کے پس منظر پر نظر ڈالنے اور سیاق و سباق کی تحقیق کے بعد یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ حدیث مقتدی کے احکام بیان کرنے کے لیے وارد نہیں ہوئی ہے، بلکہ منفرد کا حکم اس میں بیان ہوا ہے۔

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بعض روایات سے اس حدیث میں لفظ ”فصاعداً“ کی زیادتی آئی ہے، چنانچہ مسلم، نسائی، ابوداؤد میں حضرت عبادہؓ کی اس حدیث میں یہ زیادتی مذکور ہے۔ (مسلم: ۱۶۹/۱، نسائی: ۱۰۵/۱، ابوداؤد: ۱۱۹/۱)

اور یہ روایات صحیح ہیں، جن میں کوئی علت نہیں ہے۔ تو اب اس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورہ فاتحہ اور اس سے زیادہ کچھ اور نہ پڑھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں صرف سورہ فاتحہ پڑھنے کو ضروری قرار نہیں دیا ہے، بلکہ سورہ فاتحہ کے ساتھ ساتھ کچھ اور سورت ملانا بھی ضروری قرار دیا ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ جب اس حدیث عبادہؓ میں سورہ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت کے ملانے کو بھی ضروری قرار دیا ہے، تو جو حضرات اس حدیث سے سورہ فاتحہ مقتدی کے لیے واجب یا فرض ثابت کرتے ہیں، ان کو دوسری سورت بھی مقتدی کے لیے واجب یا فرض ماننا چاہئے، حالانکہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں: کیونکہ مقتدی کے لیے قراءت کو واجب قرار دینے والے حضرات مقتدی کے لیے صرف ”سورہ فاتحہ“ کو واجب قرار دیتے ہیں، اس سے زائد کچھ پڑھنے کو وہ بھی صحیح نہیں مانتے، حالانکہ

حدیث وہی ہے اور راوی بھی وہی ہیں اور الفاظ و اسلوب و انداز بھی وہی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ حدیث اصل میں مقتدی کے لئے نہیں، بلکہ امام یا منفرد کے لیے ہے۔

لفظ ”فصاعداً“ کی تصحیح

اب رہی یہ بات کہ یہ لفظ ”فصاعداً“ کیا صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے تو جواب یہ ہے کہ ہاں یہ صحیح روایات میں ثابت ہے اگرچہ اس کو امام بخاری نے ”جزء القراءۃ“ میں لفظاً گرا دیا ہے اور اس زیادتی میں معمر راوی کو متفرد قرار دیا ہے، حالانکہ امام بخاری کی شان سے یہ بات نہایت ہی تعجب انگیز اور قابل حیرت ہے۔

اولاً اس لئے کہ معمر راوی اس زیادتی میں متفرد نہیں ہیں، بلکہ اور لوگ بھی ان کے ساتھ اس زیادتی کو بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ”ابوداؤد“ میں سفیان نے اور امام بخاری کی کتاب ”جزء القراءۃ“ میں عبدالرحمن بن اسحاق مدنی نے اور بیہقی کی کتاب القراءۃ میں اوزاعی و شعیب بن حمزہ نے اور صالح نے معمر کی اس میں متابعت کی ہے۔ (دیکھو: فصل الخطاب علامہ کشمیری: ۴، عمدۃ القاری: ۴/۲۵۱)

ثانیاً: اگر یہ متفرد ہی ہوں تب بھی معمر ثقہ راوی ہیں اور ثقہ کا تفرّد اور اس کی زیادتی محدثین کے اصول کے مطابق قابل قبول ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم حافظ ابن حجر اور علامہ نووی وغیرہ سے پہلے کئی جگہ نقل کر چکے کہ ثقہ راوی کی زیادتی جب اوثق یا ثقات کی روایات کے مخالف نہ ہو، تو مقبول ہوتی ہے، ثقہ کا تفرّد ایسے مواقع میں مضرت نہیں ہوتا، مگر پھر بھی امام بخاری اور امام بیہقی اس کو معمر کا تفرّد کہہ کر گرا دیتے ہیں۔ کیا یہ تعجب انگیز بات اور حیرت کن منظر نہیں ہے؟

امام بخاری کا نقد اور اس کا جواب

آپ نے ”جزء القراءۃ“ میں عبدالرحمن بن اسحاق مدنی کی متابعت کا ذکر کرنے

کے بعد فرمایا کہ: عبدالرحمن بن اسحاق کبھی اس کو زہری سے (بلا واسطہ) روایت کرتے ہیں، پھر کبھی درمیان میں واسطہ ذکر کرتے ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ عبدالرحمن نے بواسطہ و بلا واسطہ دونوں طرح روایت زہری سنی ہو اور کبھی بواسطہ روایت کیا ہو اور کبھی بلا واسطہ، اور یہ بات روایت میں قاذح نہیں ہو کرتی۔

اور یہ عبدالرحمن بن اسحاق مدنی رجال ”مسلم“ میں سے ہیں، اور اکثر حضرات کے نزدیک ثقہ و قابل اعتماد ہیں، اور امام بخاری نے بھی ان سے ”صحیح“ میں استشہاد کیا ہے اور خود انہوں نے بھی ان کو ثقہ کہا ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۱۲۶/۶)

جب عبدالرحمن ثقہ راوی ہیں، تو پھر امام بخاری کا یہ کہنا کہ ”ہم نہیں جانتے کہ یہ حدیث ان کی صحیح ہے یا نہیں“ قابل تعجب ہے؛ کیونکہ ثقاہت راوی کی صورت میں جہاں علم نہ ہو، تو ظاہر اور مبتدا درصحت ہی ہوتی ہے اور پھر معمر کی متابعت عبدالرحمن ہی میں منحصر نہیں ہے کہ مدار کار یہی ہو، بلکہ دوسرے ائمہ ثقاہت نے معمر کی متابعت کی ہے، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ لہذا یہ زیادتی صحیح ہے۔

لفظ ”فصاعداً“ کے شواہد

پھر اس کے بے شمار شواہد ہیں، چنانچہ ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے، جس میں یہ الفاظ ہیں ” اِنَّهٗ لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِقُرْآنٍ وَّلَوْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَمَا زَادَ“ اور انہی سے ایک روایت میں ” اِنَّهٗ لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِقِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَمَا زَادَ“ آیا ہے۔ (ابوداؤد: ۱۱۸/۱)

اس روایت میں جعفر متکلم فیہ راوی ہیں، مگر بعض نے ان کی توثیق کی ہے،

لہذا یہ روایت حسن سے کم نہیں ہوگی، اور پھر شواہدات میں ضعیف بھی قابل قبول ہوتی ہیں۔ اور پھر ”کتاب القراءة للبیہقی“ میں اس کی متابعت بھی عبدالکریم بن رشید نے کی ہے۔ (فصل الخطاب: ۹۱)

نیز ابوداؤد ہی نے ابوسعید سے ایک روایت میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں: ”أَمْرُنَا أَنْ نَقْرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَمَا تَيْسَّرَ“۔ (ابوداؤد: ۱۱۸/۱)

حضرت رفاعہ سے ابوداؤد میں ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: ”ثُمَّ اقْرَأْ بِأَمِّ الْقُرْآنِ وَمَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ تَقْرَأَ“۔ (ابوداؤد: ۱۲۵/۱)

امام طحاوی نے ”شرح معانی الآثار“ میں روایت جابر بیان کی ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں: ”كُنَّا نَتَحَدَّثُ أَنَّهُ لَا صَلَاةَ إِلَّا بِقِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ فَمَا فَوْقَ ذَلِكَ أَوْ مِمَّا أَكْثَرُ مِنْ ذَلِكَ“۔ (شرح معانی الآثار: ۱۵۴/۱)

یہ اور اس جیسی دیگر روایات ”فصاعداً“ والی روایت کی شواہد ہیں اور یہ روایات بھی صحیح یا حسن ہیں، جیسا کہ مراجعت کتب سے معلوم ہوگا۔ ہم یہاں ان احادیث پر کلام کرنے سے بوجہ طوالت قاصر ہیں، اس لیے اسی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ معمر کی روایت میں ”فصاعداً“ کی زیادتی اولاً تو بلا کسی متابع و شاہد کے ہی مقبول ہے؛ کیونکہ ثقہ کا تفرّد مضروقاتح نہیں ہوتا، دوسرے معمر کی کئی ثقہ حضرات نے متابعت بھی ہے اور اس کے شواہد بھی موجود ہیں۔ لہذا اس زیادتی کے صحیح ہونے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

فقہی بحث

اس حدیثی بحث کے بعد ہم حدیث کے فقہی پہلو کی طرف آتے ہیں کہ جب صحیح حدیثوں سے ”فصاعداً“ کی زیادتی ثابت ہو چکی، تو معلوم ہوا کہ اس حدیث

میں صرف سورہ فاتحہ کو واجب قرار نہیں دیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دوسری کوئی سورت ملانے کو بھی واجب قرار دیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مقتدی کے لیے سورہ فاتحہ کو واجب قرار دینے والے حضرات صرف اسی کو ضروری بتاتے ہیں، دوسری سورت کو ضروری تو کیا درست بھی نہیں سمجھتے ہیں، حالانکہ دونوں کو ضروری قرار دینا چاہئے۔ اور حضرات احناف جیسا کہ اوپر اشارہ ہو چکا ہے، اس حدیث کو مقتدی کے لیے مانتے ہی نہیں، بلکہ اس کو غیر مقتدی (منفرد امام) کے لیے مانتے ہیں اور پوری حدیث پر عمل کرتے ہیں کہ امام و منفرد دونوں کو اس حدیث کی رو سے سورہ فاتحہ اور دوسری کوئی سورت پڑھنا واجب قرار دیتے ہیں۔ اور حدیث میں یہی مذکور ہے۔

روایت جابر کی تحقیق

اور اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ حضرت جابرؓ سے موقوفاً و مرفوعاً یہ روایت مقتدی کے استثناء کے ساتھ آئی ہے۔ امام طحاوی و امام دارقطنی نے حضرت جابر سے مرفوعاً اور امام ترمذی و امام مالک و امام محمد و امام عبدالرزاق نے موقوفاً روایت کیا کہ:

﴿مَنْ صَلَّى رَكْعَةً لَمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأَمِّ الْقُرْآنِ فَلَمْ يُصَلِّ إِلَّا أَنْ يَكُونَ وَرَاءَ الْإِمَامِ﴾

(جو شخص کوئی رکعت سورہ فاتحہ کے بغیر پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی مگر یہ کہ

وہ امام کے پیچھے ہو)

(شرح معانی الآثار: ۱۵۹/۱، سنن دارقطنی: ۳۲۷/۱، ترمذی: ۱۱/۱، مؤطا مالک:

۲۸، مؤطا محمد: ۱۰۹، مصنف عبدالرزاق: ۱۲۱/۲)

اس روایت کو امام ترمذی نے ”حسن صحیح“ کہا ہے۔ راقم کہتا ہے کہ روایت ایک ہے اور اختلاف محض وقف و رفع میں ہے، مرفوعاً بیان کرنے والے یحییٰ بن سلام ہیں

جو امام مالک سے روایت کرتے ہیں، اور دوسرے رواۃ امام مالک سے اسی کو موقوفاً روایت کرتے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس بحث کو بھی بیان کر دیا جائے، ہم پہلے بھی کئی جگہ یہ بیان کر چکے ہیں کہ جہاں وقف و رفع میں اختلاف ہو، وہاں جمہور محققین محدثین کے مسلک پر رفع کو ترجیح دی جاتی ہے، خواہ رفع کرنے والے وقف کرنے والوں سے کیفاً و کماً زیادہ ہی ہوں، جیسا کہ علامہ ابن الصلاح اور علامہ نووی وغیرہ نے تصریح کی ہے۔

علامہ ابن الصلاح ”مقدمہ“ میں فرماتے ہیں کہ:

”وہكذا إذا رفع بعضهم الحديث إلى النبي ﷺ ، ووقفه بعضهم على الصحابي ، أو رفعه واحد في وقت ووقفه هو أيضاً في وقت آخر، فالحكم على الأصح في كل ذلك لما زاده الثقة من الوصل والرفع ؛ لأنه مثبت وغيره ساكت ، ولو كان نافياً فال مثبت مقدم عليه لأنه علم ما خفي عليه“ (اسی طرح اگر بعض راویوں نے حدیث کو رسول اللہ ﷺ تک مرفوعاً بیان کیا اور بعض نے صحابی پر موقوفاً بیان کیا، یا ایک راوی نے کسی وقت حدیث کو مرفوع بیان کیا اور اسی راوی نے کسی اور وقت اس کو موقوف کر کے بیان کیا تو ان سب صورتوں میں اصح قول پر حکم اس وصل و رفع کی زیادتی کو ہوگا جو ثقہ نے بیان کیا ہے؛ کیونکہ یہ زیادتی بیان کرنے والا مثبت ہے اور دوسرا ساکت، اور اگر وہ وصل و رفع کا انکار بھی کرتا تو بھی مثبت اس پر مقدم ہوتا؛ کیونکہ یہ وہ بات جانتا ہے جو دوسرے پر مخفی رہ گئی) (مقدمہ ابن الصلاح: ۳۶)

علامہ نووی ”التقریب“ میں فرماتے ہیں:

”إذا روى بعض الثقات الضابطين الحديث مرسلًا، وبعضهم متصلًا، أو بعضهم موقوفًا، وبعضهم مرفوعًا، أو وصله هو و رفعه في وقتٍ وأرسله ووقفه في وقتٍ آخر فالصحيح عند أهل الحديث والفقہ والأصول أن الحكم لمن وصله أو رفعه، سواء كان المخالف له مثله في الحفظ والإتقان أو أكثر منه؛ لأن ذلك أى الرفع والوصل زيادة ثقة وهى مقبولة“۔

(جب بعض ثقہ راوی حدیث کو مرسلًا بیان کریں اور بعض متصلًا یا بعض موقوفًا اور بعض مرفوعًا یا خود ایک ہی راوی کبھی موصولًا و مرفوعًا روایت کرے، پھر وہی کبھی ارسال و وقف کرے، تو اہل حدیث و اہل فقہ و اصول کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ حکم اسی کو ہوگا جو وصل و ورفع کرے، مخالف خواہ حفظ و اتقان میں وصل و رفع کرنے والے کے برابر ہو یا اس سے زیادہ ہو؛ کیونکہ یہ وصل و رفع ثقہ کی زیادتی ہے اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے) (التقریب مع تدریب الراوی للسیوطی: ۱۱۷)

اسی طرح علامہ نوویؒ نے ”مقدمہ شرح مسلم: ۱۶۰“ میں اور ”شرح مسلم: ۲۵۶۱“ میں بھی تصریح کی ہے۔ (فلیراجع إلیہ) لہذا یہاں بھی اسی اصول پر روایت مرفوعہ کو ترجیح دینی چاہئے۔

یحییٰ بن سلام کی توثیق

اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ یحییٰ بن سلام جنہوں نے اس روایت کو مرفوعًا مالک سے بیان کیا ہے آیا یہ ثقہ ہیں یا نہیں؟

یحییٰ بن سلام کے بارے میں دارقطنی نے کہا کہ: یحییٰ بن سلام ضعیف ہے، اور کتاب العلل میں کہا کہ: قوی نہیں ہے، اور ابن حبان، ابوزرعہ، ابو حاتم نے ان کی توثیق کی ہے، اور ابن حجر نے فرمایا کہ: ابوالعرب نے ”طبقات القیروان“ میں کہا

کہ: یہ مفسر تھے اور ان کی قدر و منزلت تھی اور وہ حفاظِ حدیث اور اللہ کے نیک بندوں میں سے تھے۔ (لسان المیزان: ۸/۴۲۸)

راقم کہتا ہے کہ ابو حاتم اور ابو ذر عہ جیسے کبار محدثین کی توثیق کے سامنے دارِ قطنی کی تضعیف زیادہ اہم نہیں؛ کیونکہ ابو حاتم ان لوگوں میں سے ہیں، جنہوں نے تمام رِوَاۃ ورجال میں کلام کیا ہے اور یہ متشددین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح ابو ذر عہ اُس فن کے حاذق و ماہر اشخاص میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی توثیق کے ہوتے ہوئے دارِ قطنی وغیرہ کی تضعیف، وہ بھی مبہم، کسی طرح قابلِ اعتناء نہیں ہو سکتی۔ البتہ ابن حبان نے ان کو ”کتاب الثقات“ میں ذکر کرنے کے بعد یہ لکھا کہ کبھی کبھی خطا کر جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں گزارش یہ ہے کہ کبھی کبھی خطا کا ہو جانا، قاصر و باعثِ ضعف نہیں ہو سکتا، حتیٰ کہ اس سے شعبہ جیسے راوی بھی بچ نہ سکے۔ خود دارِ قطنی نے ان پر خطا و وہم کا ریمکارک قائم کیا ہے، امام شعبہ نے ایک قولی حدیث ”تحیة المسجد وقت الخطبة“ کے سلسلہ میں روایت کی ہے جو ”صحیح مسلم“ میں ہے، اس پر دارِ قطنی نے نقد کیا ہے اور اس روایت میں سلیک کے قصہ کے بعد قولی حدیثِ عام کو شعبہ کا وہم قرار دیا، اس کے باوجود کسی نے شعبہ کو ضعیف قرار نہیں دیا۔

امام مالک کو بھی بعض حضرات نے وہم کی طرف منسوب کیا ہے، امام مالک نے ایک روایت بیان کی جس میں لفظ ”قبا“ (ایک جگہ کا نام) روایت کیا، اس پر حافظ ابو عمر ابن عبدالبر نے کہا کہ: محدثین لفظ ”قبا“ روایت نہیں کرتے ”عوالی“ روایت کرتے ہیں، بلاشک یہ لفظ ”قبا“ کا ذکر کرنا امام مالک کا وہم ہے۔ (التعلیق

(الممجد: ۴۵)

حاصل یہ کہ کبھی کبھی خطا کا ہو جانا موجب ضعف نہیں، غالباً اسی وجہ سے ابن حبانؒ نے ان کی توثیق کی ہے، اور اگر علی الترتیل دارقطنی کی تضعیف کو کوئی درجہ دیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ یحییٰ کو مختلف فیہ کہا جائے کہ بعض نے توثیق کی اور بعض نے تضعیف کی، لہذا یہ حسن الحدیث ہوں گے اور حسن الحدیث کی زیادتی بھی مثل ثقہ کے مقبول ہوتی ہے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

”و زیادہ راویہما ای الحسن والصحیح مقبولة مالم تقع منافیة لروایة من هو اوثق“.

(ان دونوں یعنی صحیح اور حسن راویوں کی زیادتی مقبول ہے جب تک کہ اوثق کی روایت کے منافی نہ ہو)۔ (شرح الخبہ: ۳۷)

اور ظاہر ہے کہ ”رفع“ ایک زیادتی ہے، لہذا یہ وقف کے مقابلہ میں راجح ہوگا، اگرچہ کہ وقف والا حسن الحدیث ہو۔

حاصل یہ کہ یحییٰ بن سلام اولاً: تو ثقہ ہیں، لہذا بلا تکبر ”رفع“ کو ترجیح دی جائی گی، ثانیاً: اگر بعض کی تضعیف کا اعتبار کیا جائے تو یحییٰ حسن الحدیث ہوں گے اور راوی حسن کی زیادتی بھی مقبول ہوتی ہے، لہذا پھر بھی ترجیح روایت مرفوع ہی کو ہونی چاہئے۔

یحییٰ بن سلام کی رفع میں متابعت

پھر یحییٰ بن سلام اس ”رفع“ میں متفرّد بھی نہیں، بلکہ دوسرے بھی ان کے ساتھ ہیں، امام ابن الترمذی نے ”الجوہر النقی“ میں کہا کہ: امام بیہقی نے ”الخلافيات“ میں ذکر کیا ہے کہ: اس کو اسماعیل بن موسیٰ السدی نے بھی مرفوعاً امام مالک سے روایت کیا ہے، اور اسماعیل صدوق ہیں، امام نسائی نے کہا کہ: ان میں کوئی خرابی نہیں، اور

ابن عدی نے کہا کہ: لوگوں نے ان کو برداشت کیا ہے اور ان سے روایت کی ہے، ان پر جو انکار کیا جاتا ہے وہ ان کے شیعیت میں غلو کی وجہ ہے۔ (الجوہر النقی علی سنن لیبہقی ۲: ۲۲۸)

علامہ یوسف بنوری نے ”معارف السنن“ میں حضرت شاہ صاحبؒ کی ”تعلیقات الآثار“ سے نقل کیا کہ: اسی طرح عاصم بن عصام نے عن یحییٰ بن نصر عن مالک اس کو مرفوعاً روایت کیا ہے، جیسا کہ ”تخریج“، ”کتاب القراءۃ“ اور ”لسان“ میں ہے، اور یہ بھی ثقہ ہیں۔ (معارف السنن: ۳: ۲۸۶)

ایک شبہ اور جواب

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ حضرات (یحییٰ بن سلام، اسماعیل بن موسیٰ اور عاصم) سب کے سب اس روایت کو امام مالکؒ ہی سے بیان کرتے ہیں اور خود امام مالکؒ نے اس روایت کو ”موطأ“ میں موقوفاً بیان کیا ہے، اگر یہ مرفوع ہوتی تو امام مالکؒ موطأ میں اس کو مرفوع کیوں نہ روایت کرتے؟

راقم کا خیال یہ ہے کہ دراصل امام مالک کے نزدیک مرفوعات ہی پر مدار اعمال و مناظر استنباط نہیں تھا، جیسا کہ بعض کا مذہب ہے، حتیٰ کہ ان کے یہاں صحت روایت کے لیے انقطاع و ارسال قاصر نہیں تھا، اسی وجہ سے امام مالک اصل موضوع میں مراسیل و مقاطع کا استخراج فرماتے ہیں، تو ممکن ہے امام مالکؒ نے عمل کے لیے موقوف کو کافی سمجھ کر موقوفاً روایت کر دیا، اگرچہ دوسرے موقع پر اسی کو مرفوعاً بھی بیان کیا، جس کو دوسرے ان کے شاگردوں نے بھی روایت کیا ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ امام مالک کے پاس یہ روایت موقوفاً و مرفوعاً دونوں طرح تھی، ”موطأ“ میں ایک کو رکھ دیا؛ کیونکہ مرفوعات کو جمع کرنے کا آپ نے التزام

نہیں کیا اور دوسرے موقعہ پر مرفوعاً بیان کیا۔ واللہ اعلم
الغرض حضرت کی یہ حدیث مرفوعاً بھی صحیح یا حسن ہے اور قواعد و اصول کے تحت
موقوف پر راجح ہے۔ (هذا ما عندنا و فوق كل ذي علم عليم)
حضرت جابرؓ کی روایت مرفوع و موقوف سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث ”
لا صلوة لمن لم يقرأ بأمر القرآن أو بفتح الكتاب“ مقتدی کے لیے نہیں بلکہ
غیر مقتدی (امام و منفرد) کے لیے ہے۔ اور امام ترمذی نے نقل کیا ہے کہ: امام احمدؒ
نے بھی اس حدیث کو غیر مقتدی کے لیے ہی مانا ہے، اور امام ابو داؤد نے کہا کہ:
حضرت سفیانؒ نے بھی اس کی یہی توضیح فرمائی ہے کہ یہ غیر مقتدی کے لیے ہے۔
دیکھو: سنن ترمذی: ۴۶۱/۱، سنن ابی داؤد: ۱۱۹/۱)

اس بحث سے ہمیں صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ احناف اس حدیث کی مخالفت
نہیں کرتے بلکہ اس کا صحیح مورد محل تلاش کر کے اس کے منشا پر عمل کرتے ہیں۔ اسی
کے ضمن میں ہم نے بعض ابحاث علمیہ جو اس مسئلہ سے متعلق تھے بیان کر دیئے ہیں۔
دوسری دلیل کا جائزہ

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اپنے مسلک پر دوسری دلیل مسلم، ابو داؤد، ابن ماجہ
وغیرہ کے حوالے سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پیش کی ہے، وہ یہ ہے:
﴿عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: مَنْ صَلَّى صَلَاةً لَمْ
يَقْرَأْ فِيهَا بِأَمْرِ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ ثَلَاثًا غَيْرَ تَمَامٍ، فَقِيلَ لِأَبِي هُرَيْرَةَ: إِنَّا
نَكُونُ وَرَاءَ الْإِمَامِ، فَقَالَ: اقْرَأْ بِهَا فِي نَفْسِكَ﴾
(حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص
نماز پڑھے اور اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے تو وہ نماز ناقص ہے، یہ آپ نے تین

مرتبہ فرمایا، حضرت ابو ہریرہؓ سے کہا گیا کہ ہم لوگ امام کے پیچھے ہوتے ہیں، تو انہوں نے کہا کہ: آہستہ سے سورہ فاتحہ پڑھ لیا کرو)

اس سے ہمارے مؤلف ”حدیث نماز“ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ امام کے پیچھے کھڑے ہو کر بھی سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، مگر اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے جو الفاظ ہیں ان سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ حکم مقتدی کے لئے بھی ہے، بلکہ جیسا کہ اوپر ہم نے بتایا یہ حکم امام یا منفرد کے لئے ہے، ہاں حضرت ابو ہریرہ کے الفاظ سے ثابت کرنا چاہتے ہوں تو سوال یہ ہے کہ ان کے یہاں صحابہ کرام کے اقوال اور ان کی رائے حجت نہیں ہے، تو پھر اس سے ان کا کیا فائدہ؟ اور اگر مقصود احناف پر حجت قائم کرنا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ دیگر صحابہ کرام کا اجتہاد ان کے خلاف ہے، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، لہذا احناف کے یہاں یہ حجت نہیں، خصوصاً جب کہ احادیث صریحہ اس کے خلاف ہیں، جیسا کہ یہ بھی عنقریب واضح ہوگا۔

پھر میں کہتا ہوں کہ اس حدیث میں چند بحثیں ہیں:

اول: سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم کہ یہ فرض ہے یا واجب؟

دوسری: سورہ فاتحہ پڑھنے کا یہ حکم مقتدی کے لیے ہے یا غیر مقتدی کے لیے۔

تیسری: ”اقراء بھا فی نفسک“ (اپنے جی میں اس کو پڑھ لے) کے معنی

اور اس کا محمل کیا ہے۔

پہلی بحث یہاں سے متعلق نہیں ہے، ہم اس کی تفصیل آگے چل کر کریں گے۔

دوسری بحث کہ یہ حکم کس کے لیے ہے، اوپر تفصیل سے گذر چکا کہ یہ حکم مقتدی

کے لئے نہیں ہے، بلکہ منفرد و امام کے لئے ہے، لہذا دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت

نہیں ہے۔

”اقْرَأْ بِهَا فِي نَفْسِكَ“ کے معنی

اب رہی تیسری بحث، تو چوں کہ یہاں یہی اصل مقصود ہے، اس لیے یہاں ہم اسی سے تعرض کرتے ہیں۔ لہذا عرض ہے کہ ”اقْرَأْ بِهَا فِي نَفْسِكَ“ (اپنے جی میں اس کو پڑھ لو) یہ قول حضرت ابو ہریرہؓ کا ہے، جو انہوں نے ”من صلی الخ“ سے استنباط فرما کر بیان فرمایا ہے۔

مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ ”اقْرَأْ بِهَا فِي نَفْسِكَ“ کے معنی کیا ہیں اور اس قول کا محمل کیا ہے؟ مؤلف نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ”آہستہ سے پڑھ لیا کرو“، لیکن اس جگہ یہ معنی بیان کرنا سوال سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا؛ کیونکہ ذرا غور کیجئے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے جن صاحب نے یہ پوچھا تھا کہ ”ہم کبھی امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو کیا کریں؟“ کیا وہ یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ ہم امام کے پیچھے زور سے پڑھیں یا آہستہ؟ اور اس کے جواب میں حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ کہا کہ ”آہستہ پڑھ لو“؟ ظاہر ہے کہ یہ قطعی طور پر مراد نہیں؛ کیونکہ وہ صاحب اتنی بات تو جانتے ہی تھے کہ امام کے پیچھے آہستہ ہی پڑھا جاتا ہے، زور سے نہیں پڑھا جاتا، پھر وہ کیوں یہ بات پوچھتے؟ لہذا سوال کا منشا یہ پوچھنا تھا کہ جب آپ یہ سنارہے ہیں کہ سورہ فاتحہ پڑھے بغیر نماز ناقص رہتی ہے تو جب ہم امام کے پیچھے ہوں تو کیا کریں؟ پڑھیں یا نہیں؟ اس کے جواب میں آپ نے کہا کہ: ”اقْرَأْ بِهَا فِي نَفْسِكَ“ یعنی زبان سے نہ پڑھو نہ آہستہ نہ زور سے بلکہ جی جی میں پڑھ لو۔

اور ”قراءت فی النفس“، یعنی جی جی میں پڑھ لینے کے معنی ”تدبر وغور و فکر“ کے ہیں، چنانچہ لغت میں اس کے یہ معنی بیان کیے گئے ہیں۔
لغت عربی کی معروف کتاب ”القاموس المحیط“ میں علامہ مجدالدین فیروز آبادی

لکھتے ہیں: ”تَقَرَّرَ تَفَقَّهًا“ (یعنی تقرأ کے معنی سمجھا)۔ (تاج العروس: ۲۱۹/۱)

اسی طرح علامہ زرقانی مالکی نے بعض علماء کا قول اسی حدیث کی تفسیر میں یہی نقل کیا ہے کہ: ”معناہ تدبرھا إذا سمعت الإمام یقرأھا“ (اس کا معنی یہ ہے کہ تم آیت پر غور کرو جب امام کو پڑھتا ہوا سنو)۔ (زرقانی علی المؤمنین: ۲۵۴/۱)

علامہ ظفر احمد صاحب نے ”خلاصۃ الفتاویٰ“ سے اسی موقعہ پر یہ مسئلہ نقل کیا ہے کہ: جب کوئی یہ قسم کھالے کہ میں فلاں کی کتاب نہیں پڑھوں گا، تو امام محمدؐ کے نزدیک اگر یہ شخص کتاب میں نظر کرے اور جو اس میں لکھا ہے سمجھ جائے، تو حائث ہو جائے گا، یعنی قسم ٹوٹ جائے گی۔ (اعلاء السنن: ۵۳۴/۲)

اس کی وجہ یہی ہے کہ امام محمدؐ کے نزدیک قرأت کے لیے زبان سے پڑھنا ضروری نہیں، سمجھ لینا، غور کرنا بھی قرأت میں داخل ہے۔ اسی لیے جب اس نے دیکھا، اور سمجھا تو بس قرأت متحقق ہوئی اور حائث ہوا۔

اور امام محمدؐ اہل لغت میں سے ہیں اور لغت کے مسلم امام ہیں، حتیٰ کہ امام ابو عبید جو کہ مشہور و مسلم لغوی ہیں اور بڑے پایہ کے محدث بھی ہیں، وہ امام محمدؐ کے قول سے لغت میں احتجاج کرتے تھے، بدائع الصنائع اور شامی میں ہے کہ: امام محمدؐ جس طرح شریعت میں امام تھے اسی طرح لغت میں بھی واجب التقلید امام تھے، جس طرح ابو عبید، اصمعی، خلیل، فراء، کسائی، وغیرہ ائمہ لغت تھے۔ اور امام ابو عبید اپنی جلالت شان کے باوجود خود امام محمدؐ کی لغت میں تقلید کیا کرتے اور ان کے قول سے احتجاج کرتے تھے، اور امام ثعلب فرمایا کرتے تھے کہ: امام محمدؐ ہمارے نزدیک امام سیبویہ کے ہم پلہ ہیں اور ان کا قول لغت میں حجت ہے۔ (البدائع: ۳۳۲/۲، شامی: ۲۸۷/۲)

اس سے امام بیہتی کے اس قول کا رد ہو گیا جو انہوں نے اپنی کتاب ” القراءۃ خلف الامام “ میں فرمایا ہے کہ: ” لا يجوز حملہ علی ذکرہا بقلبہ دون التلفظ لإجماع أهل اللسان علی أن ذلك لا یسمى قراءۃ “ (القراءۃ خلف الامام: ۱۳۱)

معلوم ہوا کہ قرأت فی النفس کے یہ معنی بھی لغت میں آتے ہیں، لہذا اس کو خلاف عربیت کہنا صحیح نہیں ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

جب یہ بات واضح و صاف ہو گئی کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ مطلب ہے کہ امام کے پیچھے دل میں پڑھ لو یعنی تدبر و غور و فکر کرو تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مؤلف کا اس سے اپنے مسلک پر استدلال صحیح نہیں۔

تیسری دلیل کا جائزہ

مؤلف نے اپنے مسلک پر تیسری دلیل ابو داؤد کے حوالے سے حضرت عبادہ بن الصامت سے نقل کی ہے کہ: ” عن عبادۃ بن الصامت قال: کُنَّا خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ ، فَثَقُلْتُ عَلَيْهِ الْقِرَاءَةَ ، فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ: لَعَلَّكُمْ تَقْرَءُونَ وَنَحْنُ خَلْفَ إِمَامِكُمْ؟ قُلْنَا: نَعَمْ ، يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ: لَا تَفْعَلُوا إِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ ؛ فَإِنَّهُ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِهَا.“

(حضرت عبادہ بن الصامتؓ بیان کرتے ہیں کہ: ایک مرتبہ ہم فجر کی نماز رسول اللہ ﷺ کے پیچھے پڑھ رہے تھے، کہ آپ پر قرآن کا پڑھنا مشکل ہو گیا، جب نماز سے آپ فارغ ہوئے، تو فرمایا کہ شاید تم اپنے امام کے پیچھے پڑھتے ہو؟ ہم نے کہا: ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ کے علاوہ اور کچھ نہ پڑھو: کیونکہ جو شخص اس کو نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس حدیث سے مولف ”حدیث نماز“ کا استدلال صحیح نہیں۔ اولاً تو اس لئے کہ یہ حدیث اس درجہ کی نہیں کہ اس سے استدلال کیا جائے، دوسرے اس سے وہ بات ثابت بھی نہیں ہوتی جو وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ اس حدیث میں دو طرح سے بحث ہے: ایک حدیثی بحث کہ اس کا درجہ کیا ہے، دوسرے فقہی، جس کو ہم ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

حدیث مذکورنا قابل احتجاج ہے

ہم پہلے اس کے حدیثی پہلو کے متعلق کلام کرتے ہیں، تاکہ حدیث کا درجہ بھی معلوم ہو جائے۔ اس حدیث میں محدثین کے اصول کے اعتبار سے کئی ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے یہ ناقابل استدلال ہے:

سند کا اضطراب

ایک یہ ہے کہ اس میں اضطراب پایا جاتا ہے، علامہ یوسف بنوریؒ نے حدیث عبادہؓ پر جو اس قصہ کے ساتھ مروی ہے، بڑی لمبی بحث فرمائی ہے، اور علامہ کشمیریؒ نے بھی ”فصل الخطاب“ میں کئی صفحات میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔ علامہ بنوریؒ نے اس حدیث کو معلول اور ناقابل حجت قرار دیا ہے؛ کیونکہ اس کی سند اور اس کے متن دونوں میں شدید اضطراب ہے۔

(۱) اس حدیث کو مکحول راوی کبھی حضرت عبادہؓ سے منقطعاً روایت کرتے ہیں، درمیان میں واسطہ ذکر نہیں کرتے اور حضرت مکحول نے حضرت عبادہؓ سے بالاتفاق نہیں سنا۔ یہ روایت ”دارقطنی“ اور ”بیہقی“ وغیرہ میں ہے۔

(۲) ابوداؤد اور بیہقی وغیرہ میں یہی مکحولؒ کبھی حضرت عبادہؓ کے درمیان نافع

بن محمود کا واسطہ ذکر کرتے ہیں۔

(۳) ترمذی، ابوداؤد وغیرہ میں بطریق محمد بن اسحاق، حضرت مکحول اس حدیث کو کبھی محمود بن الربیع عن عبادہ روایت کرتے ہیں۔

(۴) کبھی مکحول اس کو محمود بن الربیع عن ابی نعیم روایت کرتے ہیں، کہ ابو نعیم نے حضرت عبادہ سے سنا ہے، جیسا کہ یہ روایت ”مستدرک حاکم“ اور ”سنن دارقطنی“ میں ہے۔

(۵) کبھی مکحول اس کو نافع عن محمود بن الربیع عن عبادہ روایت کرتے ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ ”الاصابہ“ میں محمود کے حالات میں ”دارقطنی“ سے نقل کیا ہے۔

(۶) کبھی مکحول اس کو عبداللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں اور اس قصہ کو عبداللہ ہی کا قرار دیتے ہیں، جیسا کہ علامہ مادرینیؒ نے اشارہ کیا ہے۔

(۷) اور کبھی مکحول اس کو رجاء بن حیوۃ عن عبداللہ بن عمرو روایت کرتے ہیں، جیسا کہ اس کی طرف بھی مادرینیؒ نے اشارہ کیا ہے۔

(۸) اور کبھی رجاء بن حیوۃ روایت کرتے ہیں محمود سے عبادہ پر موقوف کر کے، یہ روایت ”طحاوی“ میں ہے، جیسا کہ علامہ مادرینیؒ نے نقل کیا ہے۔

یہ وقفاً ورفعاً، اور انقطاعاً و اتصالاً آٹھ وجوہ اضطراب ہیں۔ اس میں شدید اختلاف و اضطراب ہے کہ عبادہ سے روایت کرنے والے کون ہیں؟ نافع یا محمود یا ابو نعیم؟ نیز یہ قصہ حضرت عبادہ کا ہے یا عبداللہ بن عمرو کا؟ اور دونوں کا واقعہ ہونا بہت ہی مستبعد ہے؛ کیوں کہ مخرج ایک ہی ہے۔

اضطرابِ متن

- دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے متن والفاظ میں بھی اضطراب ہے: چنانچہ
- (۱) ابوداؤد، ترمذی وغیرہ کے الفاظ: ” لا تفعلوا إلا بام القرآن فانہ لا صلوة “ ہیں جس میں قصہ مذکور ہے جو بطریق محمد ابن اسحاق ہے۔
- (۲) ابوداؤد میں ” إذا جهرت “ کی قید ہے جو بطریق زید بن واقد عن مکحول ہیں۔
- (۳) دارقطنی کے الفاظ بطریق ولید بن مسلم اس طرح ہیں: ” هل تقرأون في الصلوة معي؟ قال نعم ، قال : لا تفعلوا إلا بفتح الكتاب “ اس میں بغیر تعلیل کے فرمایا ہے۔
- (۴) دارقطنی کے الفاظ بطریق زبیدی مرسل اس طرح ہیں: ” فلا تفعلوا إلا بأم القرآن سرّاً في أنفسكم “.
- (۵) دارقطنی کے الفاظ بطریق زید بن واقد عن حزام بن حکیم و مکحول عن نافع اس طرح ہیں: ” قال منكم من أحد يقرأ شيئاً من القرآن إذا جهرت بالقرآن (الخ ما قال) فلا يقرء ن أحد منكم شيئاً من القرآن إذا جهرت بالقراءة إلا بأم القرآن “.
- (۶) دارقطنی کے الفاظ بطریق ابن عیینہ عن ابن شہاب عن محمود بن عبادہ یہ ہیں: ” قال : أم القرآن عوض من غيرها وليس غيرها منها عوض “.
- (۷) بیہقی کے الفاظ بطریق علی ابن الحارث بغیر قصہ کے: ” سمعت رسول الله ﷺ يقول: لا صلوة لمن لم يقرأ بفتح الكتاب، إمام وغير إمام “.
- (۸) طبرانی کے الفاظ معجم کبیر میں: ” من صلى خلف الإمام فليقرأ

بفاتحة الكتاب“ (ذکرہ فی کنز العمال)

(۹) طبرانی کے الفاظ: ”من قرأ خلف الإمام فليقرأ بفاتحة الكتاب“.

(۱۰) سیاق احمد بطریق محمد بن اسحاق: ”فلا عليكم أن تفعلوا بفاتحة

الكتاب ؛ فإنه لا صلوة إلا بها“

(۱۱) طبرانی کے الفاظ مجتم اوسط میں: ”لا صلوة إلا بفاتحة الكتاب

و آيتين معهما“.

(۱۲) بیہقی کے الفاظ کتاب القراءة میں: ”لا صلوة لمن لم يقرأ بفاتحة

الكتاب خلف الإمام“.

(۱۳) اسماعیل بن سعید صاحب امام احمد کے الفاظ: ”أمرنا رسول الله ﷺ

أن نقرأ بفاتحة الكتاب في كل ركعة“ (أخرجه في التلخيص (

(معارف السنن: ۳/۲۰۳-۲۰۵)

ان روایات میں سے بعض سے امام کے پیچھے مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنے کی

اباحت ثابت ہوتی ہے، بعض سے وجوب، بعض میں امام وغیر امام مذکور ہے، بعض

میں غیر امام ہے، بعض سے صرف سورہ فاتحہ پڑھنا معلوم ہوتا ہے، بعض سے کچھ

اور بھی پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔

جو ان روایات میں غور کرے گا یہ اضطراب صاف نظر آئے گا۔ لہذا ایسی صورت

میں اس سے احتجاج کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ خصوصاً جس مسئلہ میں اختلاف

ہو، اور پھر دوسروں پر اقامت حجت کے سلسلے میں اس سے احتجاج کرنا کسی طرح

درست نہیں ہو سکتا۔

محمد بن اسحاق کا حال اور تفرد

تیسری وجہ یہ ہے کہ ان تمام طرق میں سے احسن طریق محمد بن اسحاق کا ہے اور محمد بن اسحاق میں کلام معروف اور مشہور ہے، حتیٰ کہ امام مالک، یحییٰ القطان اور سلیمان التیمی نے ان کو کذاب کہا ہے، اور فریابی نے زندیق کہا ہے۔ (تھذیب التھذیب: ۳۶۹-۳۹، الکامل لابن عدی: ۱۰۳۶، ضعفاء العقلی: ۲۴/۴)

اگرچہ ان کے حق میں کذاب کہنا ہمارے نزدیک زیادتی ہے اور ہم محمد بن اسحاق کے بارے میں یہ بات درست نہیں سمجھتے، لیکن محمد ابن اسحاق کے بارے میں خود مخالفین احناف نے یہ تصریح کی ہے کہ: جس میں یہ متفرد ہوں، وہ قابل احتجاج نہیں۔ علامہ نیوی نے لکھا ہے کہ علامہ ذہبی نے ”میزان“ میں کہا کہ: جس میں یہ متفرد ہوتے ہیں، اس میں نکارت ہوتی ہے؛ کیونکہ ان کے حافظہ میں کچھ نقصان تھا۔ اور حافظ نے ”درایہ“ کی ”کتاب الحج“ میں کہا کہ: ابن اسحاق ”باب احکام“ میں متفرد ہوں تو قابل احتجاج نہیں، چہ جائیکہ جب وہ اثبت کی مخالفت کریں۔ (التعلیق الحسن: ۷۷/۱)

یہاں اس کی سند میں محمد ابن اسحاق طریق مکحول میں ”محمود ابن الربیع عن عبادہ“ ذکر کرتے ہیں اور اس میں یہ متفرد ہیں۔ اور دارقطنی نے جو بطریق الولید بن مسلم مکحول عن محمود ذکر کیا ہے، اس میں ”محمود بن الربیع عن عبادہ“ نہیں ہے، بلکہ ”محمود عن ابی نعیم اُنه سمع عبادہ“ ہے، لہذا یہ ابن اسحاق کی متابعت نہیں ہو سکتی۔ غرض یہ کہ اس طریق میں ابن اسحاق متفرد ہیں، (پوری بحث ”امانی الاحبار“: ۱۱۱/۳-۱۱۳ میں ملاحظہ فرمائیں)

مکحول کا عنعنہ

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس کے راوی حضرت مکحول بھی اگر چہ ثقہ ہیں، مگر مدلس بھی ہیں اور مدلس کا عنعنہ مقبول نہیں ہوتا، اور یہاں مکحول عنعنہ سے روایت کرتے ہیں، تو ان کی روایت کیسے مقبول ہوگی، اور پھر ایک جماعت نے ان کی تضعیف بھی کی ہے۔ (امانی الاجبار: ۱۱۲/۳)

ایک شبہ کا جواب

اگر کوئی یوں کہے کہ: کسی بھی صورت سے اگر اضطراب رفع ہو جائے تو پھر ناقابل احتجاج ہونے کے کیا معنی؟ اور یہاں محمد بن اسحاق کا طریق چوں کہ تمام طرق سے اقوی ہے، اس لیے اسی کو ترجیح دے کر اضطراب کو رفع کیا جائے گا۔ تو میں کہتا ہوں کہ: محمد بن اسحاق کا طریق اگرچہ تمام طرق سے اقوی ہے، مگر خودنی نفسہ ناقابل احتجاج ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا کہ محمد بن اسحاق منفرد ہونے کی صورت میں خصوصیت کے ساتھ لائق احتجاج نہیں، پھر مکحول کا مدلس ہونے کے ساتھ عنعنہ کرنا روایت کو پایہ اعتبار سے گرا دیتا ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

حدیث کی فقہی بحث

اب اس حدیث کے فقہی پہلو پر نظر کیجئے، اور آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین ہونا چاہئے کہ مؤلف کا دعویٰ مقتدی کے لیے سورہ فاتحہ پڑھنے کی فرضیت و رکنیت کا ہے، جیسا کہ خود مؤلف نے ہی ایک دو صفحہ بعد اسکی تصریح کی ہے اور کہا کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز باطل ہے۔ (حدیث نماز: ۸۰)

مگر اس حدیث سے وہ بات ثابت ہی نہیں ہوتی جو وہ ثابت کرنے کے درپے ہیں؛ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اولاً فرمایا ”لا تفعلوا إلا بأمر القرآن“ (سوائے سورہ فاتحہ کے کچھ اور نہ کرو) اس میں نہیں سے استثناء کیا گیا ہے، اور اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ نبی سے استثناء محض اباحت کا فائدہ دیتا ہے نہ کہ وجوب کا، اور امام شافعیؒ بھی اسی کے قائل ہیں کہ استثناء من انہی مفید اباحت ہوتا ہے۔ لہذا اس جملہ سے مقتدی کے لیے سورہ فاتحہ نماز میں پڑھنے کی اباحت ثابت ہوتی ہے، اور ہم بھی اباحت کے قائل ہیں بشرطیکہ جہری نماز میں سکتات میں پڑھے اور سری میں بلا منازعت ہو۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اس کے بعد پھر نبی کریم ﷺ کا یہ جملہ ”لا صلوة لمن لم یقرأ بہا“ وجوب کے لیے کیسے ہو سکتا ہے، جیسا کہ اس کو واجب قرار دینے والے کہتے ہیں؛ کیونکہ اس صورت میں کلام نبوت میں تضاد لازم آئے گا کہ اول کلام تو اباحت ثابت کر رہا ہے اور پھر اس کے بعد والا کلام مفید وجوب ہے، حالانکہ ان دونوں چیزوں میں تضاد ہے۔ لہذا ایسی تشریح ہونی چاہئے کہ کلام رسول اللہ ﷺ میں یہ علت و خرابی پیدا نہ ہو۔

چنانچہ ”معارف السنن“ میں بحوالہ حضرت علامہ کشمیریؒ حضرت شیخ المشائخ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے اس حدیث کی شرح اس طرح نقل کی گئی ہے کہ حدیث میں اولاً مقتدی کو قرأت سے منع کیا گیا ہے، لیکن سورہ فاتحہ نزاع کی قلت کی وجہ سے مباح قرار دیا؛ کیونکہ یہ نمازوں میں بار بار لوٹائی جاتی اور زبانوں میں چڑھی ہوئی ہے، تو امام کی قرأت سے بلا منازعت کئے آسانی کے ساتھ سورہ فاتحہ پڑھی جاسکتی ہے، اور نیز اس کو ایک اور اہمیت بھی حاصل ہے کہ غیر مقتدی کے لیے یہ

ضروری ہے۔ اور سورہ فاتحہ کے علاوہ دیگر سورتوں کو یہ اہمیت و خصوصیت حاصل نہیں۔ اور سورہ فاتحہ کی طرح دوسری سورتیں متعین بھی نہیں بلکہ لاعلیٰ التعمین اس کا وجوب ہے۔ اور سورہ فاتحہ کی طرح زبانوں پر چڑھی ہوئی نہیں تو اس پر منازعت کے آثار ہیں۔ تو ان وجوہ کی بنا پر سورہ فاتحہ کو مباح قرار دیا اور دوسری سورتوں کو نہیں۔

اور ”فإنه لا صلوة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب“ سے وجوب کا وہم نہ ہونا چاہئے؛ کیونکہ یہ جملہ اگرچہ موقع تعلیل میں واقع ہوا ہے، مگر حقیقت میں تعلیل نہیں، محض استشہاد ہے سورہ فاتحہ کی اباحت کے لیے، یعنی یہ بتلانا مقصود ہے کہ سورہ فاتحہ کو مباح کیوں قرار دیا، اور دوسری سورتوں کو مباح کیوں قرار نہیں دیا؟ سو بتلادیا کہ چونکہ غیر مقتدی کے لیے بلا فاتحہ کے نماز ناقص ہوتی ہے، اس لیے یہاں مقتدی کے حق میں مباح رکھا گیا کہ اس کو ایک خصوصیت حاصل ہے، بخلاف دیگر سورتوں کے کہ وہ علی التعمین واجب نہیں اور زبانوں پر چڑھی ہوئی بھی نہیں، اس لیے اس کو مقام اباحت کا درجہ نہیں دیا گیا ہے۔

مذکورہ تشریح کی وجہ یہ ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کی تحقیق کی بنا پر یہ حدیث اور ”مسلم“ و ”بخاری“ کی حدیث اور ”مسلم“ کی لفظ ”فصاعداً“ والی حدیث سب کی سب ایک حدیث ہیں، اگر ”لا صلوة الخ“ کو مقتدی کے حق میں مانا جائے تو سورہ فاتحہ کے علاوہ اور سورتوں کو بھی مقتدی کے حق میں واجب ماننا پڑے گا، اور پھر اول کلام اور آخر کلام میں تعارض بھی ہوگا؛ کیونکہ پوری حدیث اب اس طرح ہوگی ”فلا صلوة إلا بأمر القرآن؛ فإنه لا صلوة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب فصاعداً“۔ (یعنی امام کے پیچھے کچھ مت پڑھو، سوائے سورہ فاتحہ کے؛ کیوں کہ اس شخص کی

نماز نہیں ہوتی جو امام کے پچھے سورہ فاتحہ اور کچھ زائد سورت نہ پڑھے۔
 ظاہر ہے کہ شروع میں صرف سورہ فاتحہ پڑھنے کو فرمایا اور اس کی اجازت دی
 اور آخر میں سورہ فاتحہ اور دیگر سورت کے بغیر نماز نہ ہونے کا ذکر فرمایا، حالانکہ یہ معنی
 لینا کلام رسول میں بالکل درست نہیں، ایسا مہمل اور متناقض کلام جاہل سے بھی
 بعید ہے، تو آپ جیسے فصیح اہل اللسان وبلغ اہل البیان سے ایسا متناقض کلام کیسے
 متصور ہو سکتا ہے؟ لہذا الاحمالہ یہ کہنا پڑے گا کہ ”فإنه لاصلوٰۃ“ کلام اول کی تعلیل
 وعلت نہیں ہے، بلکہ محض استشہاد ہے، اور تعلیل و استشہاد میں فرق یہ ہے کہ علت
 مدار و مناط حکم ہوتی ہے اور شاہد مدار حکم نہیں بلکہ ملائم و مناسب حکم ہوتا ہے۔
 بالجملہ یہ حدیث بھی احناف کے خلاف نہیں بلکہ خود مقتدی کے حق میں وجوب
 فاتحہ کے قائلین پر حجت ہے۔ یہ تقریر اس صورت پر کی گئی ہے کہ حدیث کو علی الترتیل
 صحیح و قابل حجت تسلیم کر لیا جائے، ورنہ پہلے ہم بتلا چکے ہیں کہ حدیث مضطرب
 و ناقابل احتجاج ہے۔

چوتھی دلیل کا جائزہ

وجوب سورہ فاتحہ کی دلیل میں چوتھے نمبر پر مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام
 ابوداؤد کے حوالے سے دوسری سند سے حضرت عبادہ کی یہی حدیث بیان فرمائی ہے،
 جس میں یہ الفاظ ہیں کہ:

”قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَأَنَا أَقُولُ مَا لِي أَنْزَعُ الْقُرْآنَ ، فَلَا تَقْرَءُوا
 بِشَيْءٍ مِّنَ الْقُرْآنِ إِذَا جَهَرْتُمْ إِلَّا بِأَمِّ الْقُرْآنِ“ . (ابوداؤد: ۱۲۶/۱)
 (نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ قرآن مجھ سے چھینا جا رہا ہے،
 جب میں بلند آواز سے قرأت کروں تو تم لوگ سورہ فاتحہ کے سوا کچھ بھی نہ پڑھو)

راقم کہتا ہے کہ: اس حدیث کے بھی دو جواب ہیں: ایک یہ کہ اس میں بھی سورہ فاتحہ کے پڑھنے کا جواز بیان کیا گیا ہے، وجوب کا اس سے ثبوت ہرگز نہیں ہوتا، جیسا کہ اوپر کی حدیث کے تحت ہم نے ثابت کیا ہے پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ اس حدیث میں ”اذا ظہرت“ کی قید ہے تو عدم ظہر کے وقت کیا حکم ہوگا؟

دوسرے یہ کہ اس روایت کی سند میں نافع بن محمود ہیں اور ان کے بارے میں علامہ دارقطنی نے تو یہ کہا ہے کہ: یہ ثقہ ہیں مگر متعدد حضرات نے ان کو مجہول کہا ہے۔ علامہ ذہبی نے میزان میں ”لا یعرف“ اور حافظ ابن حجر نے تقریب میں ان کو مستور کہا ہے اور آپ ہی نے تھذیب التھذیب میں ابو عمر بن عبد البر سے نقل کیا ہے کہ: یہ مجہول ہیں اور ابن الترمذی نے کہا کہ: ابو عمر ابن عبد البر نے ان کو مجہول کہا اور امام طحاوی نے بھی ”لا یعرف“ فرمایا ہے۔ (میزان: ۷/۷، تھذیب التھذیب: ۳۶۶/۱۰، الجوهري النقي على سنن البيهقي: ۲۳۶/۲)

رہا امام دارقطنی کا ان کو ثقہ کہنا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک دو آدمیوں کے کسی راوی سے روایت کر دینے پر جہالت مرتفع ہو جاتی ہے خواہ وہ جہالت عین ہو یا جہالت وصف ہو، لہذا انہوں نے اپنے مسلک کے مطابق نافع کو ثقہ کہہ دیا؛ کیونکہ ان سے دو شخص روایت کرتے ہیں ایک مکحول دوسرے حزام بن حکیم، مگر جمہور کے نزدیک جہالت عین تو دو کی روایت سے مرتفع ہو جاتی ہے مگر جہالت وصف مرتفع نہیں ہوتی۔ اس لئے جمہور کے مطابق یہ مستور الحال ہیں، جیسا کہ ابن حجر نے لکھا ہے، لہذا اس حدیث سے کیسے استدلال ہو سکتا ہے۔

پانچویں دلیل کا جائزہ

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس سلسلہ کی پانچویں روایت ابن ماجہ سے نقل کی

ہے کہ:

”عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده: أَلَّ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ: كُلُّ صَلَاةٍ لَا يُقْرَأُ فِيهَا بِفَا تَحَةَ الْكِتَابِ فَهِيَ خِدَاجٌ، فَهِيَ خِدَاجٌ“۔ (ابن ماجہ: ۶۱/۱)

(حضرت عمرو بن شعيب اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے ناقص ہے، وہ نماز ناقص ہے)

میں کہتا ہوں کہ: یہ روایت بھی احناف کے خلاف نہیں؛ کیونکہ احناف بھی یہی کہتے ہیں کہ ہر نماز میں سورۃ فاتحہ ضروری ہے، امام، منفرد، مقتدی سب کے لیے، مگر امام و منفرد کی قرأت حقیقی ہوگی اور مقتدی کی قرأت حکمی ہوگی، یعنی امام کی قرأت ہی اس کی قرأت شمار ہوگی۔

رہا یہ کہ اس کی کیا دلیل ہے؟ تو اس کی صریح دلیل یہ حدیث ہے: ”من كان له إمام فقراءه الإمام له قراءه“ (کہ جس کا امام ہو اس امام کی قرأت ہی مقتدی کی قرأت ہے) اس حدیث کی تصحیح و تحقیق پورے مالہ و ماعلیہ کے ساتھ آگے آئے گی۔

غرض یہ کہ احناف تمام صحیح روایتوں پر عمل کرتے ہیں، کسی کو چھوڑ کر کسی کو اپناتے نہیں، جب حدیث ”لا صلوة لمن لم يقرأ بها“ بھی سامنے ہے اور حدیث ”من كان له إمام“ بھی سامنے ہے، تو احناف نے دونوں احادیث پر غور کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ قرأت تو سب کے ذمہ ہے، ہاں بعض کی قرأت حقیقی ہے، بعض کی حکمی ہے۔ اور اس کی تائید بہت سے فتاویٰ صحابہ اور دیگر احادیث اور آیات شریفہ سے ہوتی ہیں۔

رہا مقتدی کے پڑھنے کا حکم، تو اوپر بیان ہو چکا کہ یہ صرف جائز ہے، نہ کہ واجب، اور یہ جواز بھی اس شرط کے ساتھ ہے کہ محل استماع و باعث تشویش نہ بنے اور یہ جواز اس طرح سمجھ میں آیا کہ اصولیین نے لکھا ہے کہ: جب کسی بات کا نہی سے استثناء کیا جائے تو اس سے جواز مفہوم ہوتا ہے۔ (اعلاء السنن: ۱۰۷/۴)

چھٹی دلیل کا جائزہ

مؤلف ’حدیث نماز‘ نے ’جزء القراءة للبخاری‘ سے بھی ایک روایت پیش کی ہے وہ یہ ہے:

”عن محمد بن أبي عائشة عمّن شهد ذاك قال: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ فَلَمَّا قَضَى صَلَاتَهُ، قَالَ: أَتَقْرَأُ وَنَ الْإِمَامُ يَقْرَأُ؟ قَالُوا: إِنَّا لَنَفْعَلُ، قَالَ: فَلَا تَفْعَلُوا إِلَّا أَنْ يَقْرَأَ أَحَدُكُمْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فِي نَفْسِهِ“

(حضرت محمد بن ابی عائشہ ان صحابی سے جو اس موقع پر حاضر تھے، انہوں نے کہا کہ: رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی، جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا امام کی قرأت کے ساتھ تم بھی قرأت کرتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کرو، مگر اتنا کرو کہ تم میں ہر ایک سورہ فاتحہ آہستہ سے پڑھے) (حدیث نماز: ۷۸)

میں کہتا ہوں کہ: اس حدیث سے بھی مقتدی کے لئے سورہ فاتحہ پڑھنے کا وجوب ثابت نہیں ہوتا جو ہمارے مؤلف کا منشاء ہے بلکہ صرف جواز و اباحت ثابت ہوتی ہے اور ہم اس کے قائل ہیں، دوسرے اس حدیث میں تو یہ کہا گیا ہے کہ: ”فلا تفعلوا إلا أن يقرأ أحدكم بفاتحة الكتاب في نفسه“ (ایسا مت کرو مگر یہ کہ جی جی میں پڑھلو) اور جی جی میں پڑھنے کے معنی آہستہ پڑھنے کے نہیں ہیں،

بلکہ اس کے معنی معانی قرآن میں غور و فکر اور تدبر کرنے کے ہیں جیسا کہ اوپر تفصیل سے اس کو مدلل طور پر بیان کیا گیا ہے۔

رہا یہ شبہ کہ اگر اس سے مراد معانی میں تدبر و غور و فکر ہے تو اس میں سورہ فاتحہ کی کیا خصوصیت، تدبر و تامل تو سارے قرآن کا ہونا چاہئے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس حدیث میں ”فصاعداً“ (سورہ فاتحہ اور اس سے زیادہ) کی زیادتی دوسرے طرق سے ثابت ہے اور یہ واقعہ ایک ہی ہے، لہذا حدیث کا منشاء یہی ہے کہ سورہ فاتحہ وغیرہ جو بھی پڑھا جاتا ہے اس میں غور و فکر کرو، دوسرا جواب یہ ہے کہ چونکہ یہ سورت بار بار پڑھی جاتی ہے اور زبانوں پر چڑھی ہوئی ہے، ہر کس و ناکس اس کے معانی کو باسانی سمجھ سکتا ہے، تو خصوصیت سے اس کے بارے میں ارشاد ہوا کہ اس میں تو بے حد آسانی ہے۔ (واللہ اعلم)

یہاں تک ہم نے مؤلف ”حدیث نماز“ کے پیش کردہ دلائل پر الحمد للہ تفصیل و تحقیق کے ساتھ کلام کیا ہے، جس سے ثابت ہوا کہ ان احادیث سے جو ثابت ہوتا ہے، احناف اس کے منکر نہیں اور سورہ فاتحہ کو مقتدی کے حق میں واجب قرار دینے والوں کا یہ دعویٰ کہ مقتدی کے ذمہ قرأت فرض اور واجب ہے، کسی طرح ان احادیث سے ثابت نہیں ہوتا۔

علامہ شوکانی کے بیان کا جواب

اس کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام شوکانی سے سورہ فاتحہ پڑھنے کی احادیث کے مخارج بیان کیے ہیں، (دیکھئے حدیث نماز: ۸۰) ان سب کا جواب ہماری اوپر کی تقریر سے نکل آئے گا کہ ان سے یا تو اباحت ثابت ہوتی ہے یا یہ غیر مقتدی کے لیے ہیں، نہ کہ مقتدی کے لیے، اور مؤلف

”حدیث نماز“ نے علامہ شوکانی سے نقل کیا کہ ”وجوب فاتحہ علی المتقدي“ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور جمہور علماء و صحابہ کا اور تابعین کا اور ان کے بعد والوں کا مذہب ہے۔
 راقم کہتا ہے کہ: امام مالکؒ وجوب کے قائل نہیں ہیں، نہ جہری میں نہ سری میں، بلکہ جہری میں پڑھنے کے قائل بھی نہیں ہیں، صرف سری میں استحباب کے قائل ہیں، جیسا کہ اوپر ہم نے نقل کیا ہے، اور جمہور کا مسلک بھی احناف کے موافق ہے یعنی عدم وجوب۔ لہذا علامہ شوکانی کا مذکورہ بیان خلاف تحقیق ہے۔

علامہ کشمیریؒ نے اپنے رسالہ ”فصل الخطاب“ میں لکھا ہے کہ: جو لوگ (سلف میں سے) جہری نماز میں پڑھتے تھے وہ بہت ہی قلیل تھے اور جو سکتات میں پڑھتے تھے وہ ان سے کچھ زائد تھے اور جو صرف سری میں پڑھتے تھے یہ زیادہ تھے اور بعض ایسے تھے کہ سری نماز میں کبھی پڑھتے تھے اور کبھی ترک کرتے تھے۔ (فصل الخطاب: ۳۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وجوب کے قائل تو کوئی کوئی تھے اور جو جہری میں بھی پڑھتے تھے ان میں بھی یہ وجوہاً ہی پڑھتے ہوں اس کی کیا دلیل ہے؟ استحباباً بھی پڑھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اوپر کی مذکورہ عبارت سے دو سطر پہلے حضرت علامہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ اقل قلیل وجوب کی طرف گئے ہیں، پھر فرمایا کہ یہ بات مراجعت الی الآثار سے معلوم ہوگی۔

اور امام احمدؒ کا مذہب بھی ہم بیان کر چکے کہ سری نمازوں میں استحباب قرأت للمقتدی اور جہری میں عدم وجوب بلکہ عدم استحباب ہے۔ اس کے باوجود جمہور کو موجبین قرأت میں شمار کرنا خلاف واقعہ نہیں تو اور کیا ہے؟ اور امام احمدؒ نے تو یہ بھی فرمادیا کہ ہم اہل اسلام میں سے جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے قرأت کو واجب بتانے والے کو جانتے ہی نہیں۔

معلوم ہوا کہ امام احمدؒ کے زمانہ تک کم از کم تو موجبین (واجب قرار دینے والے) نہیں تھے اور اگر تھے بھی تو اقل قلیل جن کا کوئی شمار نہیں۔

کیا یہ حدیث متواتر ہے؟

مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام بخاریؒ سے نقل کیا کہ:

”حدیث ” لا صلوة الا بام القرآن“ (بغیر سورہ فاتحہ کے

نماز نہیں ہوتی) رسول اللہ ﷺ سے متواتر طریقہ سے مروی ہے۔ اس کے

بعد مؤلف نے لکھا کہ امام بخاری نے اس کے ثبوت میں دنیا کے سامنے

”جزء القراءۃ“ لکھ کر پیش کر دی۔ (دیکھئے حدیث نماز: ۷۹)

راقم کہتا ہے کہ امام بخاریؒ کا یہ دعویٰ کس حد تک صحیح ہے کہ یہ حدیث متواتر ہے، یہ ایک الگ بحث ہے، اس سے ہٹ کر سوال یہ ہے کہ اگر یہ حدیث متواتر بھی ہو تو کیا اس سے ان کا یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے جس کا دعویٰ کیا گیا ہے؟ امام بخاری اور ان کے تابعین کا دعویٰ تو یہ ہے کہ مقتدی کے لیے قرأت فاتحہ سری و جہری نمازوں میں فرض اور نماز کارکن ہے، اور اس کی دلیل میں ” لا صلوة لمن لم یقرأ بام القرآن“ والی حدیث پیش کرتے ہیں۔ مگر اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ یہ حکم مقتدی کے حق میں ہے، جب احتمال نکل آیا کہ یہ غیر مقتدی کے لیے ہے، تو پھر اس احتمال کے ہوتے ہوئے اسے فرضیت کا ثبوت کیسے ہو جائے گا؟ فرضیت و رکنیت تو دلیل قطعی سے جو دلالت و ثبوتاً دونوں طرح قطعی ہو ثابت ہوتی ہے۔ اور ہم نے اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا کہ یہ مقتدی کے لیے ہرگز نہیں ہو سکتی؛ کیونکہ

اس میں ”فصاعداً“ کی زیادتی صحیح طور پر ثابت ہے۔ نیز دوسری احادیث مثل ”إذا قرأ فأنصتوا“ (جب امام پڑھے تو تم خاموش رہو) اور ”من كان له إمام فقراءه الإمام له قراءه“ وغیرہ جو صحیح احادیث ہیں (جیسا کہ تفصیل سے بحث آگے آئے گی) یہ بھی ”لاصلوة“ میں تخصیص کی متقاضی ہیں، ورنہ ان احادیث کا کیا جواب ہوگا؟ اگر یوں کہو کہ یہ احادیث صحیح نہیں ہیں، تو ہم کہیں گے کہ محدثین کے اصول و قواعد کے تحت یہ حدیثیں بالکل صحیح ثابت ہیں، ان سے انکار کرنا احادیث کا ٹھکرانا ہے۔ اگر ٹھکرانا ہی ہے تو ٹھکرا جائیے، مگر اس سے احناف پر کیا حجت قائم ہو جائے گی کہ امام بخاری نے صحیح نہ مانا، یا انہوں نے ”لاصلوة“ سے مقتدی کے حق میں فاتحہ کو واجب قرار دیا، کسی حدیث کو ”صحیح نہیں“ کہہ کر آگے چلے جانا تو بہت آسان ہے، کوئی کسی کے قلم اور زبان کو روک نہیں سکتا، الا یہ کہ خوف خدا اور خشیت الہی آجائے۔ الغرض امام بخاری کا جو دعویٰ ہے وہ کسی بھی حدیث سے ثابت نہیں ہوتا کہ مقتدی پر قرأت کرنا واجب ہے، اس کے بغیر اس کی نماز نہیں ہوتی، بلکہ اس کے خلاف صحیح احادیث سے اس کا رد ہوتا ہے۔

مؤلف کی غلط فہمی

یہاں مؤلف ”حدیث نماز“ کی ایک غلط فہمی بلکہ عجیب غلط فہمی کا ذکر بھی مناسب ہے، وہ یہ کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے یہاں ایک عنوان قائم کیا ہے ”سورہ فاتحہ شرط نماز اور رکن نماز ہے“ اس کے بعد امام بخاری کی ایک عبارت نقل کی اور اس میں مؤلف نے بڑا عجیب دھوکہ کھایا ہے، اس سے مؤلف کی لیاقت و قابلیت کا بھی بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

امام بخاریؒ کی جو عبارت مؤلف نے نقل کی وہ یہ ہے:

”قال النبی ﷺ: ”لا صلوة“ ولم يقل ”لا یجزی“، قیل له: إن الخبر إذا جاء عن النبی ﷺ فحکمہ علی اسمہ وعلی الجملة حتی یجیء ثبناً“ .

مؤلف نے اس کا ترجمہ و مطلب یہ بیان کیا ہے:

” (نبی کریم ﷺ نے ”لا صلوة“ فرمایا یعنی نماز ہی نہیں ہوتی ”لا یجزی“ نہیں فرمایا، یعنی نماز نا کافی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب حدیث نبوی آجائے تو اس کا حکم پورے نام پر ہوتا ہے اور تمام چیزوں پر یہاں تک کہ آپ ہی کے بیان سے کچھ اور ثابت نہ ہو جائے۔ (مطلب یہ ہے کہ قیام تو قیام اس کا رکوع، سجدہ وغیرہ کچھ بھی نہیں ہوتا جس نے سورہ فاتحہ نہ پڑھی ہو)۔“ (حدیث نماز: ۷۹)

مؤلف نے اوپر کی امام بخاریؒ کی عبارت سے جو سمجھا اور اس کا مطلب بیان کیا، اس کو پڑھ کر ایک ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم بھی ہنس پڑے گا اور مؤلف کی عربی دانی اور سلامتِ فہم کی خوب داد دے گا۔

بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ کی مندرجہ بالا عبارت میں ”لا صلوة“ اور ”لا یجزی“ کے معنی مؤلف کی سمجھ میں نہ آئے، بلکہ معلوم ہی نہیں تھے، تو جو معنی مؤلف کے ذہن میں تھے، اسی کو امام بخاریؒ کی عبارت کا جامہ پہنا کر بیان کر دیا، جو امام بخاریؒ کے مقصد کے بالکل خلاف ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے جب یہ فرمایا کہ خبر متواتر سے ثابت ہوا ہے کہ بغیر سورہ فاتحہ نماز نہیں ہوتی، تو اس کے بعد امام بخاریؒ کو ایک شبہ

دامن گیر ہوا، وہ یہ کہ : ” لاصلوۃ“ میں لائفی کمال کا ہو، جیسا کہ احناف نے کہا ہے، تو پھر اس حدیث سے رکنیت فاتحہ و فرضیت ثابت نہ ہوگی، حالانکہ امام بخاریؒ کو یہی ثابت کرنا ہے، تو امام بخاریؒ اس عبارت سے اس شبہ اور جواب شبہ کی تقریر کر رہے ہیں اور احناف کا رد کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے جو فرمایا اس کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے:

اگر بعض لوگ (احناف) یہ کہیں کہ نبی کریم ﷺ نے تو ”لاصلوۃ“ (نماز کامل نہیں ہوتی) فرمایا ہے، ”لا یجزی“ (بالکل ہی نہیں ہوتی) نہیں فرمایا؛ کیونکہ ”لاصلوۃ“ کا مطلب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز کامل نہ ہوگی؛ کیونکہ حرف ”لا“ لائفی کمال کے لیے بھی آتا ہے، جیسے حدیث میں بھی آیا ہے کہ جو شخص اذان سن کر مسجد نہ آئے تو اس کی نماز نہیں ہوتی، تو یہاں کمال صلاۃ کی لائفی مقصود ہے، تو امام بخاریؒ اس کا جواب اپنی عبارت میں ”قیل لہ“ سے دے رہے ہیں کہ اس کہنے والے سے کہا جائے گا کہ جب کوئی حدیث نبی کریم ﷺ سے ثابت ہو جائے تو اس کا حکم الفاظ و عموم پر ہی ہوتا ہے، الا یہ کہ دوسری حدیث بھی آ کر اس معنی کی تخصیص کر دے۔ اور حضرت جابرؓ نے ”لا یجزی“ کے الفاظ بھی روایت کیے ہیں، تو لائفی کمال مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ (بتشریح امام بخاریؒ کی عبارت ختم ہوئی)

اب غور فرمائیے کہ مؤلف نے امام بخاریؒ کی شروع کی عبارت ”اگر یہ بعض لوگ یوں کہیں“ کو حذف کر دیا اور ”لاصلوۃ“ کے معنی (نماز ہی نہیں ہوتی) اور ”لا یجزی“ کے معنی (نماز ناکافی ہے) بیان کیے، اور سمجھا کہ امام بخاریؒ یہاں سے حدیث کی شرح بیان کر رہے ہیں اور ”قیل لہ“ کا ترجمہ کیا کہ (یہ بھی کہا گیا ہے) جبکہ ”فان قیل“ شرط کی جزا ہے اور امام بخاریؒ احناف کو مذکورہ شبہ بیان

کر کے جواب دے رہیں کہ اس لاء کونفی کمال کے لیے لینے والے کو یہ جواب دیا جائے گا، الخ۔ اس سے مؤلف کی استعداد و قابلیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

امام بخاریؒ کے نقد کا جواب

اس کے بعد ہم امام بخاریؒ کی مذکورہ عبارت میں مذکور بات کا جواب دیتے ہیں، ہم پہلے بتا چکے کہ ”لاصلوۃ“ والی حدیث مقتدی کے لیے ہے ہی نہیں، لہذا یہاں امام بخاریؒ کی عبارت کو پیش کرنا لغو ہے؛ کیوں کہ امام بخاریؒ یہاں مقتدی سے بحث نہیں کر رہے ہیں بلکہ مطلق نماز سے سورہ فاتحہ کے تعلق کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

علماء احناف ”لاصلوۃ“ میں ”لا“ کونفی کمال کے لیے امام و منفرد کے حق میں مانتے ہیں، نہ کہ مقتدی کے حق میں؛ کیونکہ مقتدی کو تو پڑھنا ہے ہی نہیں تو نفی کمال یا نفی اصل سے اس کے حق میں کیا بحث؟ البتہ یہاں ایک دوسرا مسئلہ ہے، وہ یہ کہ سورہ فاتحہ کا نماز سے کیا تعلق ہے؟ آیا رکنیت کا یا وجوب کا؟ اس مسئلہ کا مقتدی سے تعلق نہیں، امام و منفرد سے تعلق ہے۔ یہ مسئلہ بھی ائمہ کے مابین مختلف فیہ ہے، اگرچہ ہمیں اسکے بیان کرنے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ یہ موضوع سے خارج بحث ہے، تاہم چون کہ ایک مناسبت ہے اور مخالفین ایسی چیزوں کو اچھالتے رہتے ہیں اس لیے یہاں اس پر بھی چند سطور لکھ دی جائیں تو عین مصلحت معلوم ہوتا ہے۔

سورہ فاتحہ رکن نماز ہے یا واجب؟

امام بخاریؒ نے یہ اعتراف تو کر لیا کہ اگر دوسری حدیث آکر عموم کو ختم کر دے تو جائز ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ ”جب حدیث ثابت ہو جائے تو اس کا حکم الفاظ

وعموم پر ہوتا ہے، الایہ کہ دوسری حدیث آ کر اس کو ختم کر دے اور خاص معنی بیان کر دے۔“

اب ہم کہتے ہیں کہ: دوسری حدیث نے آ کر ”لاصلوۃ“ میں لاکوئی جنس واصل سے نکال کر نفی کمال کی طرف پھیر دیا۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ اور دیگر صحابہ کرام سے یہ حدیث مختلف کتب حدیث میں آئی ہے:

”قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ صَلَّى صَلَاةً لَمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأَمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ ثَلَاثًا، وَفِي بَعْضِ الرَّوَايَاتِ: غَيْرَ تَمَامٍ، وَفِي بَعْضِهَا: خِدَاجٌ خِدَاجٌ خِدَاجٌ“۔ (مسلم: ۱۷۰/۱، الطحاوی: ۱۵۸/۱)

(نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص نماز پڑھے اور اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، اور بعض روایات میں تین دفعہ فرمایا کہ وہ ناقص ہے، ناقص ہے، وہ ناقص ہے)

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس روایت کو اوپر پیش کیا تھا جس میں اس مرفوع حصہ کے علاوہ ابو ہریرہؓ کا مقولہ موقوفہ: ”اقرأ بها في نفسك“ بھی تھا، جس پر ہم وہاں بحث کر چکے ہیں اور اس جگہ بھی ہم نے وعدہ کیا تھا کہ فاتحہ کی فرضیت اور رکعت پر ہم پھر کسی موقع پر کلام کریں گے، لہذا یہی اس ایفاء وعدہ کا موقع ہے۔

لہذا عرض ہے کہ اس حدیث میں سورہ فاتحہ نہ پڑھنے سے نماز پر ”خداج“ (ناقص ہونے) کا حکم لگایا ہے، بالکل باطل و منفی ہونے کا حکم نہیں فرمایا، اور یہ بات ظاہر ہے کہ جو چیز ناقص ہوتی ہے اس شی کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے، ورنہ اس پر ناقص ہونے کا حکم صحیح نہیں ہوتا: کیوں کہ جس شی کا وجود ہی نہ ہو اس پر ناقص ہونے کا حکم لگانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی سورۃ فاتحہ نماز میں نہ پڑھے اور دوسری سورتیں پڑھے، تو اس کی نماز ناقص ہوگی باطل نہ ہوگی اور احناف اسی کے قائل ہیں کہ سورۃ فاتحہ واجب اور ضروری ہے اگر اس کو نہ پڑھا تو نماز تو باطل نہ ہوگی، مگر چونکہ ناقص ہے اس لیے لوٹنا ضروری ہے، اور ”لاصلوۃ“ میں ”لا“ کو نفی کمال کے لئے لینے میں یہی معنی ہوتے ہیں، کہ نمازِ کامل بغیر پورے فاتحہ نہ ہوگی یعنی ناقص ہوگی۔

امام ابو بکر جصاص رازی نے ”احکام القرآن“ میں لکھا ہے کہ: اونٹنی کے لیے ”اخذت“ کا لفظ اس وقت نہیں بولتے جب کہ وہ بالکل بچہ نہ ڈالے، ”اخذت“ یا ”اخذت الناقة“ اس وقت بولتے ہیں جب کہ وہ بچہ کو ناقص الخلقیت یا مدتِ حمل سے پہلے ہی پورا بچہ جنے، اور اگر وہ بالکل بچہ نہ جنے تو اس کو خداج سے متصف نہیں کیا جاتا۔ (احکام القرآن: ۲۱/۱)

حضرت شیخ زکریا نے ”اوجز المسالک“ میں مرقات کے حوالے سے لکھا ہے: ”خداج“ کے معنی (کمی اور نقصان) کے ہیں۔ امام لغت خلیل وغیرہ نے کہا کہ: ”اخذت الناقة“ اس وقت بولتے ہیں جب اونٹنی پوری مدتِ حمل سے پہلے بچہ ڈال دے، اگرچہ وہ بچہ جسمانی اعتبار سے پورا ہو، اور ”اخذت“ اس وقت بولتے ہیں کہ وہ بچہ کو ناقص الخلقیت جنے، اگرچہ پوری مدت پر جنے۔ اور ایک جماعت اہل لغت یہ کہتی کہ: ”اخذت“ اور ”اخذت“ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔

اور ”غیر تمام“ جن روایات میں آیا ہے اس کا مطلب بھی نقص اور کمی ہے بنسبت کمال کے، گویا غیر تمام بطور بدل یا تاکید کے ہے اور بظاہر یہ بتلایا ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز میں کمی رہے گی، یہ نہیں کہ وہ سرے سے باطل اور کالعدم ہو جائے گی۔ (اوجز المسالک: ۱۷۱/۲)

اس سے معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ نے ”جزء القراءة: ۲۵“ میں جو محدث ابو عبید لغوی کی طرف منسوب کر کے یہ قول نقل کیا کہ: ”أخذت الناقة“ اس وقت بولتے ہیں جب کہ اونٹنی سقطہ ڈالے اور سقطہ بچہ مردہ ہوتا ہے، جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ گویا اس طرح بغیر فاتحہ کے نماز بھی بے جان اور بے فائدہ ہے، یہ امام بخاری کا اصل معنی پر اضافہ ہے، اس میں یہ جملہ: ”سقطہ بچہ مردہ ہوتا ہے اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے“ یہ ابو عبید کا قول نہیں ان کا قول صرف اتنا ہے کہ: ”أخذت الناقة“ اس وقت بولتے ہیں کہ اونٹنی سقطہ ڈالے۔ اور یہ اوپر کے اقوال کے مطابق ہے اور سقطہ کے معنی نا تمام بچہ کے ہیں، اس میں مردہ ہونے کی قید نہیں ہے۔ چنانچہ ”القاموس“ میں علامہ مجد الدین فیروز آبادی لکھتے ہیں:

”السقطۃ مثلثة الولد لغير تمام“ (یعنی السقطہ مدت سے پہلے جنا ہوا بچہ (خواہ پورا ہو یا نہ ہو)۔ (القاموس: ۸۶۶/۱)

اور ”خداج“ کے معنی لکھے ہیں:

”الناقة جاء بولد ناقص وان كانت أيامه تامة فہی خداج“ (یعنی وہ اونٹنی جو ناقص بچہ ڈالے اگرچہ پوری مدت پر ہو پس اس اونٹنی کو خداج کہتے ہیں۔ (قاموس: ۲۳۷/۱)

لغت کی کتاب ”مختار الصحاح“ میں ہے ”خدجت الناقة“ اس وقت بولتے ہیں جب مدت سے قبل بچہ ڈالے تو اس اونٹنی یا بچہ کو خداج یا خدج کہتے ہیں اگرچہ وہ بچہ تام الخلق ہو..... اور ”أخذت“ اس وقت بولتے ہیں کہ ناقص بچہ ڈالے اگرچہ مدت پوری ہو (مختار الصحاح: ۱۹۶/۱)

اس سے معلوم ہوا کہ مردہ ہونا، یہ زائد قید ہے۔ حاصل یہ کہ لفظ ”خداج“ ناقص کے لیے استعمال ہوتا ہے، بالکل منفی و باطل شی کے لیے خداج نہیں بولا جاتا۔

لہذا نماز بغیر فاتحہ (منفرد و امام کے لیے) ناقص و واجب الاعادہ ہوگی، بالکل منفی و باطل نہیں ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ احناف بغیر فاتحہ نماز کو جائز کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، احناف صرف یہ کہتے ہیں کہ سورہ فاتحہ رکن نماز و فرض نماز نہیں ہے، لیکن اس کے وجوب کے وہ بھی قائل ہیں۔

ایک حدیثی تحقیق

ہم نے یہ تشریح و توضیح اس لیے کی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ احناف میں سے جن حضرات نے ”لاصلوۃ“ میں لاکونفی کمال کے لیے مانا ہے، ان کی یہ بات حدیث ہی سے مستخرج و مستنبط ہے، مگر اس کے علاوہ ”لا“ کونفی اصل کے لیے بھی مانا جائے، تو اس سے مذہب احناف کو کوئی ضرر نہیں؛ کیوں کہ ”لاصلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب“ میں لفظ ”فصاعداً“ کی زیادتی صحیح طور پر ثابت ہے، تو اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو سورہ فاتحہ اور کچھ زیادہ نہ پڑھے تو اس کی نماز نہیں ہوتی۔ اس میں مطلق قرأت نہ کرنے سے نماز کی بالکل نفی فرمائی ہے، صرف سورہ فاتحہ نہ پڑھنے سے تو خداج فرمایا ہے، جو عین مذہب حنفی ہے کہ مطلق قرأت فرض ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوگی اور سورہ فاتحہ کی تعیین صرف واجب ہے اس کے ترک سے نماز واجب الاعادہ ہوتی ہے اور جن روایات میں لفظ ”لا یجزی“ آیا ہے، یہ اولاً تو راویوں کا تساہل ہے جو روایات بالمعنی میں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امام زیلعی نے صاحب ”تنقیح“ سے نقل کیا کہ ”لا یجزی“ لفظ کے بیان کرنے میں زیاد بن ایوب متفرد ہیں، اور صحیح ”لاصلوۃ“ ہے۔ (دیکھو نصب الراية: ۱/۳۶۵)

ثانیاً ہم کہتے ہیں کہ: یہ نماز کا نہ ہونا اس وقت کے لحاظ سے ہے کہ فاتحہ

وسورت دونوں نہ پڑھے، لہذا یہ احناف پر حجت نہیں۔ (فہم)
یہی تحقیق علامہ کشمیریؒ نے ”فصل الخطاب“ میں فرمائی ہے کہ: احادیث
”خداج“ میں تو بغیر قرأت (فاتحہ) کے نماز کو خداج بتلایا ہے، نہ کہ منفی.....
اور جن روایات میں صلاۃ کی نفی ہے یہ باعتبار انقضاء فاتحہ و قراءۃ مزید کے ہے
..... اس سے معلوم ہو گیا کہ حدیث ”لا صلوة لمن لم یقرأ بأمر القرآن
فصاعداً“ بالکلیہ قرأت کے انقضاء کی وجہ سے فرمایا ہے۔ لہذا لا کونفی کمال کے لیے
ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ (فصل الخطاب: ۹۱-۲۰)

لاء نفی کا معنی - علامہ شوکانیؒ کا جواب

مؤلف نے امام شوکانیؒ سے نقل کیا کہ:

” (حدیث میں) نفی اگر ممکن ہو تو ذات کی طرف متوجہ ہوگی ورنہ
اقرب الی الذات کی طرف ہوگی اور اقرب الی الذات صحت صلوة ہی
ہے نہ کہ کمال صلوة، لہذا اسی پر حمل کرنا واجب ہے اور کمال صلوة پر حمل
کرنا حمل علی الابدع ہے۔“ (حدیث نماز: ۸۰)

راقم کہتا ہے کہ: **اولاً** تو ”لاء“ میں کسی بھی تاویل کی ضرورت ہی نہیں،
جیسا کہ ابھی مذکور ہوا کہ مطلق قرأت کے انقضاء سے نبی کریم ﷺ نے صحت نماز کی نفی
فرمائی ہے اور احناف بھی یہی کہتے ہیں۔ **ثانیاً**: احناف نے ”لاء“ کو نفی کمال کے
لیے مانا بھی ہے، تو اس کا قرینہ احادیث ”خداج“ موجود ہیں اور قرینہ کے ہوتے
وقت ابعدا پر بھی حمل ہو تو کیا حرج ہے؟ پھر ”لاء“ کا نفی کمال کے معنی میں ہونا اگرچہ
مجاز ہے مگر بعید نہیں، بلکہ یہ مجاز متعارف ہے، بلکہ بہت کثرت سے یہ صیغہ اسی معنی

میں مستعمل ہوتا ہے، اور اس کی متعدد مثالیں خود قرآن و احادیث میں ملتی ہیں۔
 مثلاً قرآن شریف میں ہے ﴿ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ ﴾ [التوبہ: ۱۲] (بے شک ان کی قسم قسم نہیں ہے) حالانکہ اس سے پہلے فرمایا ﴿ وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ ﴾ [التوبہ: ۱۲] (اور یہ لوگ اگر عہد کے بعد اپنی قسم کو توڑ دیں)
 حدیث میں فرمایا کہ: ”لَا أَيْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ“ (جس کے پاس امانت نہیں اس کا ایمان نہیں) اس میں ”لا ایمان“ سے نہ تو ذات ایمان کی نفی کی گئی ہے اور نہ صحت ایمان کی نفی، بلکہ مراد کمال ایمان کی نفی ہے۔

دوسری حدیث میں ہے ”لَا صَلَوةَ لِحَارِ الْمَسْجِدِ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ“ (مسجد کے پڑوسی کی نماز بجز مسجد کے اور کہیں نہیں ہوتی)
 تیسری حدیث حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً مروی ہے ”لَا صَلَوةَ بِحَضْرَةِ طَعَامٍ وَلَا هُوَ يُدَافِعُهُ الْأَخْبَثَانِ“ (کھانے کے سامنے آجانے کے وقت نماز نہیں ہے اور نہ اس حالت میں کہ پیشاب اور پاخانہ اس کو مجبور کر رہے ہوں)
 پانچویں حدیث ”لَا صَلَوةَ لِمَنْ لَا تَشْهَدَ لَهُ“ (جس کا شہد نہیں اس کی نماز نہیں)

چھٹی حدیث ”لَا صَلَوةَ لِمَنْ لَا يُطِيعُ الصَّلَوةَ ، وَطَاعَةُ الصَّلَوةِ أَنْ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ“ (جس نے نماز کی اطاعت نہیں کی اس کی نماز نہیں اور نماز کی اطاعت یہ ہے کہ وہ نماز فحش اور منکر باتوں سے روک دے)۔

ان مثالوں سے معلوم ہوا کہ ”لاء“ کو نفی کمال کے لیے لینا، بعد و بعید تو کیا ہوتا بلکہ یہ مجاز متعارف ہونے کی وجہ سے اقرب ہے۔

لہذا علامہ شوکانیؒ کا اس کو بعید بتلانا خود خالی از بعد نہیں؛ کیونکہ بعض چیزیں کسی

اصطلاح میں حقیقی ہوتی ہیں تو کسی اور اصطلاح میں حقیقی نہیں ہوتیں اور ایک ہی چیز کسی میں مجاز اور کسی میں حقیقت ہو جاتی ہیں۔

چنانچہ علامہ تفتازانی نے ”مختصر المعانی شرح تلخیص المفتاح“ میں صاحب ”تلخیص المفتاح“ کے قول کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”احتراز بقوله: (في اصطلاح به التخاطب) عن المجاز المستعمل فيما وضع له في اصطلاح الآخر غير الاصطلاح الذي به وقع التخاطب، كالصلوة إذا استعملها المخاطب بعرف الشرع في الدعاء؛ فانها تكون مجازاً لاستعمالها في غير ما وُضعت له في الشرع يعني الأركان المنصوصة وإن كانت مستعملة فيما وُضعت له في اللغة“۔ (مختصر المعانی: ۳۱۴)

(صاحب تلخیص المفتاح نے حقیقت کی تعریف میں ”اصطلاح به التخاطب“ کہہ کر اس مجاز سے احتراز کیا ہے جو دوسری اصطلاح میں جس میں گفتگو نہیں ہو رہی ہے، حقیقت میں استعمال ہو رہا ہے، جیسے لفظ صلوة کہ جب مخاطب اس کو عرف شرع میں دعاء کے معنی میں استعمال کرے تو یہ استعمال (اگرچہ لغت حقیقی معنی میں ہے) مجاز ہوگا؛ کیونکہ شرع میں دعاء کے علاوہ دوسرے معنی کے لیے وضع ہوا ہے، یعنی ارکان مخصوصہ (نماز) کے لیے، اگرچہ لفظ صلوة لغت کے اعتبار سے اسی میں ہوا ہے جس کے لئے وہ موضوع ہے)

حاصل یہ ہے کہ ہر اصطلاح کا جدا جدا حکم ہے، بعض الفاظ ایک اصطلاح میں حقیقت اور دوسرے میں مجاز و بالعکس ہوتے ہیں، تو لفظ ”لاء“ جو کہ لغت نلفی جنس واصل کے لیے ہے، شرع میں نلفی کمال کے لیے ہونا قریب قریب حقیقت ہو گیا، تو احناف اس کو اسی پر محمول کرتے ہیں تو کیا مضائقہ ہے؟

جسے رکوع مل گیا اسے رکعت مل گئی

ابھی ناظرین نے دیکھ لیا کہ مسلک حنفی نے کسی حدیث کے خلاف نہیں کیا ہے بلکہ تمام پیش کردہ احادیث کا صحیح مطلب و معنی بیان کر کے ان کو ان کے صحیح و مناسب موقعہ و محل میں رکھ دیا ہے، اور اس کی تائید بہت سی احادیث کرتی ہیں، اور ان میں سے ایک وہ حدیث بھی ہے جس میں ارشاد ہے کہ: ”من أدرك الركعة فقد أدرك الصلاة“ (جس نے رکوع پا لیا اس نے نماز کو پا لیا) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی کو امام کے ساتھ رکوع مل گیا تو اس کو وہ رکعت مل گئی، لہذا مقتدی کے ذمہ قرأت نہ ہونا اس سے مفہوم ہوتا ہے، اگر مقتدی کے ذمہ قرأت ہوتی تو اس کی یہ رکعت شمار نہ ہونا چاہئے تھا۔

ہمارے مؤلف صاحب نے جب دیکھا کہ یہ بات حنفیہ کی تائید میں جارہی ہے تو اس کے جواب کی کوشش فرمائی اور کہا کہ:

”اور امام بخاری اور امام شوکانی نے اسی لیے رکوع کی رکعت کو نہیں مانا، حضرت عائشہ اور حضرت ابو ہریرہ اور دیگر صحابہ نے بھی نہیں مانا؛ کیوں کہ بغیر فاتحہ کے وہ قیام ہی اور وہ رکعت ہی نہیں، بلکہ پوری نماز بے کار ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی رکوع کی رکعت کے دلائل زیادہ زور دار نہیں۔ اس صورت میں ”لاصلوة“ میں لافنی کمال نہیں، لافنی ذات ہے۔“ (حدیث نماز: ۸۰)

اس بیان میں کئی باتیں قابل گرفت ہیں: ایک تو یہ کہ مؤلف نے حضرت عائشہ و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کا مسلک تو قبول کیا کہ وہ اس رکعت کو نہیں مانتے، مگر جمہور صحابہ کا مسلک کیوں نظر انداز کر دیا؟ حالانکہ جمہور صحابہ و تابعین، ائمہ اربعہ و محدثین

رحمہم اللہ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس کو رکعت مل گئی۔

علامہ کشمیریؒ نے ”فصل الخطاب“ میں لکھا ہے:

”صحابہ میں سے ایسا کوئی معلوم نہیں جو یہ کہتا ہو کہ بدون رکعت رکوع پانے والا مدرک رکعت نہیں ہے۔ اس کے بعد تقریباً ایک صفحہ میں اس کے شواہدات نقل کیے اور فرمایا کہ: ادراک رکعت با دراک رکوع کا مسئلہ گویا ایک بدیہی حکم شرعی تھا کہ ادراک رکوع سے ادراک رکعت ہوتا ہے، اب جب سارے صحابہ دیکھتے تھے کہ رکوع تک امام کے ساتھ مل جانے سے رکعت مل جاتی ہے، تو ان کو اس بارے میں بھی کوئی تردد نہ تھا کہ مقتدی پر قرأت فاتحہ واجب نہیں ہے اور اس میں وہی تردد کر سکتا ہے جو بداہت اور حقیقت کو لغو قرار دے اور الفاظ پر جمود کر بیٹھے۔ (فصل الخطاب: ۸۲-۸۳)

رہا حضرت عائشہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کا قول تو عرض ہے کہ اس میں ان حضرات سے صحیح سند کے ساتھ صاف و واضح کوئی بات مروی نہیں ہے، غالباً حضرت عائشہ کے متعلق یہ بات امام بخاری کے رسالہ ”جزء القراءة“ میں روایت کردہ اس اثر سے اخذ کی گئی ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت ابوسعید خدریؓ کا ارشاد ہے کہ فاتحہ پڑھنے سے پہلے رکوع نہ کرنا چاہئے۔ (جزء القراءة: ۴)

مگر اس کا اس مسئلہ ادراک رکعت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ منفرد کے لیے حکم بیان کیا کہ بغیر سورہ فاتحہ پڑھے رکوع نہ کرنا چاہئے۔ مسبوق و مقتدی کے لیے یہ حکم نہیں ہے؛ کیونکہ حضرت عائشہؓ و جب قرأت خلف الامام کی قائل نہیں تھیں..... اور حضرت ابو ہریرہؓ کے متعلق یہ بات ان کے اس قول سے اخذ کی گئی ہے کہ: ”إذا أدركت القوم ركوعاً لم تعد بتلك الركعة“ (جب تو قوم کو رکوع کی حالت

میں پائے تو اس رکعت کو شمار نہ کر) (جزء القراءۃ: ۴) امام بخاریؒ نے لکھا کہ:
 ”حضرت ابو ہریرہؓ ادراک رکعت با دراک رکوع کو اس وقت مانتے تھے کہ جب کہ
 مقتدی اپنے امام کو قیام کی حالت میں پائے۔“

اس کا جواب یہ ہے کہ:

اولاً: تو یہ حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے اور مرفوع کے خلاف ہے۔

ثانیاً: خود ان سے مروی دیگر اقوال کے بھی خلاف ہے۔

ثالثاً: ابن عبد البر التمہید میں کہتے ہیں کہ: ہم نہیں جانتے کہ فقہاء میں سے
 کسی نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور نہ فقہاء تابعین میں سے کسی نے اختیار کیا۔
 (التمہید: ۷۳/۷)

رابعاً: اس کے راویوں میں محمد بن اسحاق کا واسطہ ہے جو عنعنہ کے ساتھ ہے،
 اس لئے روایت ضعیف ہے۔ ابن عبد البر کہتے ہیں کہ: اس کی سند میں نظر و اشکال
 ہے۔ (التمہید: ۷۳/۷)

خامساً: اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ادراک رکوع سے ادراک رکعت
 ہو جاتا ہے؛ کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ نے تو یہ فرمایا ہے کہ: رکوع سے قبل مل جانا
 چاہئے، یہ تو انہوں نے بھی نہیں فرمایا کہ: اتنا قبل مل جانا چاہئے کہ سورہ فاتحہ بھی پڑھی
 جاسکے، یہ تفصیل تو کہیں بھی ثابت نہیں۔ لہذا اس سے امام بخاریؒ اور ان کے تبعین
 کو کیا فائدہ حاصل ہوگا؟

غرض یہ کہ صحابہ کرام میں سے کوئی ایسا نہیں جو ادراک رکوع سے ادراک
 رکعت کا قائل نہ ہو، اور مؤلف نے کئی صحابہ کا مبہم لفظ بول کر جو دعویٰ کیا ہے کہ یہ اس
 کے قائل نہ تھے، یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ مسلک وہ ہے جس پر علماء امت کا اتفاق نقل کیا گیا ہے۔
تیسرے یہ کہ مؤلف نے اس مسئلہ کے دلائل کو ضعیف کہا ہے، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں؛ کیونکہ اس مسئلہ پر جمہور کے پاس صحیح دلائل موجود ہیں، ملاحظہ کریں:

(۱) امام بخاری نے اپنی ”صحیح“ میں حدیث ابی بکرہ روایت کی ہے کہ:
”حضرت ابو بکرؓ (مسجد میں پہنچے) جبکہ نبی کریم ﷺ رکوع میں تھے، یہ دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ نے صف سے پہلے ہی رکوع کر لیا (اس خیال سے کہ صف میں جانے تک رسول اللہ ﷺ رکوع سے نہ اٹھ جائیں) (بعد نماز) رسول اللہ ﷺ کو یہ بات بتلائی گئی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ: ”زادک اللہ حرصاً ولا تعد“ (اللہ تعالیٰ تمہاری نیکی کی حرص بڑھائے، مگر پھر ایسا نہ کرنا۔) (یعنی سب سے پیچھے نہ رہ جانا یا تاخیر نہ کرنا) (بخاری: ۱۰۸۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی امام کو رکوع میں پالے تو اس کی رکعت ہو جائے گی، اگر رکعت نہ ہوتی اور سورہ فاتحہ مقتدی پر واجب ہوتی، تو حضرت ابو بکرؓ کو رسول اللہ ﷺ ضرور اعادہ کا حکم فرماتے اور یہ ثابت نہیں۔

(۲) ”مطالب عالیہ“ میں حافظ ابن حجرؒ نے صحیح سند سے ایک انصاری صحابی کی روایت نقل کی ہے کہ:

”ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا، نبی کریم ﷺ نے اس کی جوتیوں کی آواز سن لی، جب سلام پھیرا تو فرمایا کہ: تو نے ہمیں کس حالت میں پایا؟ اس نے کہا کہ: سجدہ کی حالت میں پایا اور میں نے سجدہ کر لیا تھا، فرمایا کہ: ایسا ہی کرو اور سجدہ کی وجہ سے (رکعت) شمار نہ کر لو جب تک کہ رکوع نہ پالو اور جب تم امام کو کھڑا ہوا دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ اور رکوع میں دیکھو تو رکوع کر لو اور سجدہ میں دیکھو تو سجدہ کر لو

اور بیٹھے ہوئے دیکھو تو بیٹھ جاؤ۔ (فصل الخطاب: ۸۳)

(۳) حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ“ (جس نے نماز میں سے رکوع پالیا اس نے نماز پالی)۔ (بخاری: ۸۲۱، مسلم: ۲۲۱/۱، ابوداؤد: ۱۵۹/۱، مسند احمد: ۲۷۰/۲، مؤطا مالک: ۴)

(۴) حضرت ابو ہریرہ ہی نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا کہ: ”مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَهَا قَبْلَ أَنْ يُقِيمَ الْإِمَامُ صَلْبَهُ“ (جس نے نماز میں سے رکوع پالیا تحقیق اس نے (نماز) پالی اس سے پہلے کہ امام اپنی پیٹھ ٹھیک کر لے) (صحیح ابن خزیمہ: ۲۵/۳، صحیح ابن حبان: ۳۲۸/۴)

(۵) ”سنن ابن ماجہ“ میں ”باب ماجاء في صلوة رسول الله في مرضه“ میں ایک طویل روایت ہے جس میں ہے کہ: ”نبی کریم ﷺ حجرہ مبارکہ سے مسجد نبوی تشریف لائے اور حضرت ابو بکرؓ نماز پڑھا رہے تھے، وہ آپ ﷺ کو محسوس کر کے پیچھے ہٹنے لگے، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اپنی جگہ ٹھہرے رہو، پھر آپ ان کی دائیں جانب بیٹھ گئے..... حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ: ”أَخَذَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنَ الْقِرَاءَةِ مِنْ حَيْثُ كَانَ بَلَغَ أَبُو بَكْرٍ“ (رسول اللہ ﷺ نے وہیں سے قرأت شروع فرمائی جہاں تک حضرت ابو بکرؓ پہنچ چکے تھے۔) (ابن ماجہ: ۸۷/۱)

انور الباری میں حافظ ابن حجرؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ: یہ سند قوی ہے۔
(انور الباری: ۸۰/۱۴) اور ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ اس وقت تشریف لائے تھے کہ

حضرت ابو بکرؓ کچھ حصہ پڑھ چکے تھے، یا تو سورہ فاتحہ پوری ہو چکی تھی یا اس کا کچھ حصہ ہو چکا تھا، اور آپ ﷺ نے وہیں سے شروع فرمایا، تو اس آخری فعل رسول اللہ ﷺ سے بھی معلوم ہوا کہ مقتدی کے ذمہ قرأت نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ منصف و حق شناس کے لیے یہی بہت ہے۔

اس سے مؤلف کے دعویٰ بلا دلیل کی تردید ہوگئی کہ ادراک رکوع سے ادراک رکعت کے دلائل کمزور ہیں، حالانکہ ”بخاری“ کی صحیح روایت اس پر دال ہے۔ اور ان احادیث میں صاف موجود ہے کہ رکوع پانے سے رکعت شمار کر لی جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ رکوع میں قرآن پڑھنا مکروہ ہے، جیسا کہ ”مسلم شریف“ میں کئی احادیث میں نہیں وارد ہوئی ہے۔ (مسلم شریف: ۱۹۱/۱)

لہذا یہ رکعت بلا قرأت ہی کے ہوگی اور صحیح ہوگی، اگر قرأت مقتدی کے لیے بھی واجب اور فرض بلکہ رکن ہوتی اور اس کے بغیر نماز باطل اور کالعدم تھی، تو آپ ﷺ نے اس رکعت کو کیسے شمار فرمایا اور شمار کر لینے کو کیسے فرمایا؟ معلوم ہوا کہ مقتدی کے ذمہ قرأت ہے ہی نہیں، اس لیے بلا قرأت یہ رکعت، بلا کراہت صحیح ہوگی۔

حافظ ابن حجر کا بیان

اس کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نے حافظ ابن حجر کا یہ قول بحوالہ ”نیل الاوطار“ پیش کیا ہے کہ ”لا صلوة“ سے شرعی نماز مراد ہے (جس میں رکوع، سجدہ، التحیات، وغیرہ سب شامل ہیں، پس سورہ فاتحہ کے بغیر یہ سب چیزیں ناقص ہیں)۔ (حدیث نماز: ۸۰-۸۱)

میں کہتا ہوں کہ: سبھی اس کے قائل ہیں کہ صلوة سے مراد شرعی نماز ہے

اور قرأت فاتحہ کے بغیر نماز خداج اور ناقص ہے، مگر مقتدی کے لیے نہیں؛ کیونکہ مقتدی کے ذمہ اقتداء ہے اور قرأت میں اس کی اقتداء انصاف اور خاموشی ہے ”
 إذا قرأ فأنصتوا“ مسلم کی حدیث صحیح میں ہے، کما سیاتی تحقیقہ۔

شاہ ولی اللہ کے حوالے کی حقیقت

اس کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نے متعدد بزرگان دین و علماء حنفیہ کے اقوال سے اپنے مسلک کو ثابت کرنے کی زحمت اٹھائی ہے، اور ان میں سے ایک حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں۔ چنانچہ مؤلف نے بحوالہ ”آیات اللہ الکاملہ ترجمہ اردو حجۃ اللہ البالغۃ“ نقل کیا کہ:

”حداول میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کو آنحضرت ﷺ نے رکعت

کے لفظ سے بیان کیا ہے جیسے آپ ﷺ نے فرمایا ”لا صلوة إلا بفاتحة

الکتاب“ (بغیر فاتحہ نماز نہیں ہوتی)۔“ (حدیث نماز: ۸۱)

مگر یہ حوالہ ایک دھوکہ کے سوا کچھ نہیں؛ کیونکہ اس جگہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے مقتدی کے مسائل بیان نہیں کیے ہیں بلکہ مطلق نماز میں سورہ فاتحہ کا درجہ کیا ہے اس کو بیان کرنا چاہتے ہیں، رہا مسئلہ مقتدی کے حق میں سورہ فاتحہ کا کیا حکم ہے، اس کے بارے میں حضرت شاہ صاحب نے اسی بیان میں ذرا آگے چلکر واضح و کھلے الفاظ میں لکھا ہے کہ:

”وإن كان ماموماً وحب عليه الإنصات والاستماع ، فإن جهر

الإمام لم يقرأ إلا عند الإسكاتة ، وإن خافت فله الخيرة“ (اور اگر وہ نمازی

مقتدی ہے تو اس پر خاموشی اور سننا واجب ہے، پس امام اگر زور سے پڑھے تو کچھ

بھی نہ پڑھے الا یہ کہ سکتے کے وقت جائز ہے اور اگر امام آہستہ پڑھے تو اس کو پڑھنے یا نہ پڑھنے کا اختیار ہے) (حجۃ اللہ البالغۃ: ۲/۴۳۳)

کیا اس واضح بیان کے ہوتے ہوئے ایک انصاف پسند آدمی غیر متعلق عبارت سے ایک مسئلہ نکال کر کسی کی طرف منسوب کر سکتا ہے؟ اس کو حوالہ کہیں یا دھوکہ؟

حضرت شیخ جیلانیؒ کا حوالہ

دوسرے بزرگ جن کا حوالہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے دیا ہے وہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ہیں، آپ کی کتاب ”عدیۃ الطالبین“ کے حوالہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ: قرأت فاتحہ فرض ہے اور یہ رکن ہے، جس کے ترک سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ (حدیث نماز: ۸۱)

یہاں بھی وہی جواب ہے کہ یہ مسئلہ آپ نے مقتدی کے لیے بیان نہیں کیا؛ کیونکہ حضرت جیلانیؒ امام احمدؒ کے تبعین میں سے ہیں اور امام احمدؒ کا مسلک جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے قرأت نہ کرنا ہے اور دوسری روایت میں مستحب ہونے کا ہے، تو پھر وہ رکنیت کے کیسے قائل ہو گئے؟ معلوم ہوا کہ مقتدی کے حق میں نہیں بیان کیا گیا ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے، وہ بیان مطلق نماز کے مسائل میں ہے۔ اور امام احمدؒ کے نزدیک امام و منفرد کے لیے سورہ فاتحہ فرض اور رکن ہے، اس کو یہاں حضرت جیلانیؒ نے بیان کیا ہے، نہ کہ مقتدی کے لئے، اس لئے یہ حوالہ بھی ایک دھوکہ ہے۔

احناف پر علامہ شوکانیؒ کی تعریض اور اس کا رد

مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”نیل الاوطار“ سے علامہ شوکانیؒ کی احناف پر تعریض اس جگہ نقل کی ہے کہ:

”بہت سے لوگ سنت مطہرہ کو بغیر دلیل کے رد کر دیتے ہیں، شریعت کسی چیز کے بارے میں کہتی ہے: ”یہ بات کافی نہ ہوگی،“ مقبول نہ ہوگی،“ مگر یہ اہل الرائے کہتے ہیں کہ: ”مقبول ہو جائے گی،“ اور ”صحیح ہو جائے گی۔“ اس لیے سلف صالحین نے اہل الرائے سے احتراز اور اجتناب کیا ہے۔“ (حدیث نماز: ۸۱-۸۲)

میں کہتا ہوں کہ: یہ اعتراض شوکانی کی جانب سے اگر علماء حنفیہ اور ان کے مسلک پر ہے تو یہ سو فی صد غلط ہے؛ کیونکہ اگر علماء نے کسی جگہ ”لا یجزی“ یا ”لا یقبل“ کو تاویل کر کے دوسرے معنی دئے ہیں تو اس کی وجہ خود آیات یا دوسری احادیث ہیں۔

مثلاً ”لا صلاة لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب“ سے علماء حنفیہ اگر رکنیت سورہ فاتحہ کو نہیں مانتے تو وہ اپنی رائے سے یہ نہیں کہتے، بلکہ ان کے پاس اس کی دلیل قرآن سے بھی ہے اور حدیث سے بھی ہے، قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ”فَاقْرَأْهُ وَامَّا تيسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ“ (جو بھی آسان ہو قرآن میں سے پڑھو) [مزل: ۲۰] اس سے معلوم ہوا کہ خاص سورہ فاتحہ رکن نہیں بلکہ مطلق قرأت رکن و فرض ہے، نیز حدیث میں بغیر سورہ فاتحہ کے نماز کو ناقص کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ فرض نہیں ہے، اگر فرض ہوتا تو باطل کہنا چاہئے تھا۔ ان دلائل کی وجہ سے حنفیہ ”لا صلاة“ والی حدیث میں تاویل کرتے ہیں تو ان پر کیا اعتراض؟

نیز ”لا صلاة لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب“ کو اگر علماء حنفیہ مقتدی کے حق میں نہیں مانتے تو اس کی وجہ ایک تو سورہ انفال کی آیت ہے جس میں قرآن کی تلاوت کے وقت خاموش رہنے کا حکم ہے اور دوسرے مسلم کی حدیث ہے جس

میں یہی بات آئی ہے کہ جب امام پڑھے تو تم خاموش رہو، جیسا کہ ہمارے دلائل کے تحت میں ذکر کروں گا۔ لہذا اس پر یہ تعریض کہ اللہ کے نبی تو ”لاصلاة“ فرماتے ہیں اور یہ لوگ اس کو نہیں مانتے سوائے الزام تراشی و بے سبب سبھی کے کچھ نہیں۔

رہا یہ کہنا کہ: سلف اہل الرائے سے اجتناب کرتے تھے، اس سے فقہاء کرام مراد نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو دین و شرع کو اپنی عقل کی بنیاد پر رد کر دیتے ہیں؛ کیونکہ فقہاء اہل حق میں سے ہیں اور متقدمین میں اہل حق کے دو گروہ تھے: ایک اہل الرائے یعنی فقہاء، دوسرے اہل حدیث یعنی محدثین۔ جو حضرات فقہ میں زیادہ لگے رہتے اور ان کا کام ہی استنباط احکام و استخراج مسائل تھا، ان کو اہل الرائے کہا جاتا تھا اور یہ لقب زیادہ تر امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے لیے بولا جاتا تھا؛ کیونکہ یہ حضرات اہل عقل تھے اور عقل کا استعمال شریعت کو سمجھنے کے لئے بھرپور طریقے پر کیا کرتے تھے۔ دوسرے اہل الحدیث ان کا طرہ امتیاز حدیث کی چھان بین اور احوال سند کی جستجو تھا، مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اہل الرائے اپنی عقل و رائے سے احکام بیان کرتے تھے، بلکہ قرآن و حدیث ہی سے احکام کا استخراج فرماتے تھے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر شافعی فرماتے ہیں کہ: تمہارے لیے ضروری ہے کہ علماء کے اس قول کا جو امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے بارے میں ہے کہ وہ اصحاب الرائے ہیں، یہ مطلب نہ سمجھنا کہ وہ اپنی رائے کو حضور اکرم ﷺ کی سنت پر یا صحابہ کے اقوال پر ترجیح دیتے ہیں؛ کیونکہ وہ اس سے بالکل بری ہیں۔ (دیکھو: شریعت و طریقت کا تلازم: ۷۸)

پھر اہل رائے یعنی فقہاء کی رائے سے سلف نے احتراز اگر کیا ہوتا تو یحییٰ بن معین امام فن جرح و تعدیل و رئیس النقاد یہ نہ فرماتے کہ: فقہ تو امام ابوحنیفہ کی فقہ ہے،

اور امام الحدیثین رأس الفقه ممدوح امام بخاری عبداللہ بن المبارک یہ نہ کہتے کہ: ابوحنیفہ سب سے بڑے فقیہ تھے، نیز فرمایا کہ: اگر اللہ نے ابوحنیفہ اور سفیان کے ذریعہ میری مدد نہ فرمائی ہوتی تو میں دیگر لوگوں کی طرح ہوتا۔ اور امام یزید بن ہارون یہ نہ کہتے کہ: میں نے ایک ہزار لوگوں سے علم حاصل کیا ہے مگر پانچ لوگ ایسے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ بڑا فقیہ دیکھا، نہ ان سے بڑا متقی دیکھا، نہ ان سے بڑا علم والا دیکھا، اور ان میں سے بھی ابوحنیفہ اول ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا کہ: امام اعظم ابوحنیفہؒ کے تمام لوگ فقہ میں محتاج ہیں، اور امام ابو داؤد نے کہا کہ: اللہ ابوحنیفہ پر رحم کرے، وہ امام تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۱۲۷/۱، الجواہر المصنیۃ: ۵۷/۱، تہذیب التہذیب: ۴۰۲/۱۰)

حکایت امام محمدؒ

حاشیہ عقیدۃ الطحاوی، میں محدث ضمیری سے نقل ہوا ہے کہ: محدث بن سمامہ نے نقل کیا کہ عیسیٰ بن ابان محدث ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے، مگر امام محمد کی مجلس درس میں حاضر نہیں ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ: یہ حدیث کی مخالفت کرتے ہیں، ایک دن ہم ان کو باصرار و تکرار ان کی مجلس میں لے گئے، تو انہوں نے امام محمدؒ سے کہا کہ: تم لوگ احادیث کی مخالفت کرتے ہو؟ آپ نے فرمایا کہ: میرے بھائی ہم نے کس حدیث کی مخالفت کی ہے؟ انہوں نے پچیس حدیثوں کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے ان احادیث مسؤلہ کو بالذکر لائل منسوخ ثابت کیا، تو وہ راضی و خوشی آپ کے تلامذہ میں شامل ہو گئے اور آپ کو لازم پکڑا اور علم حاصل کیا۔

الغرض اہل الرائے سے احتراز کرنے والے اہل وہم ہی تھے، اہل فہم کوئی

نہیں تھے، یا اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو فقہاء کے علاوہ گمراہ فرقوں سے متعلق لوگ ہیں اور قرآن و حدیث کو محض اپنی رائے سے نفس و شیطان کی چالوں میں مبتلا ہو کر رد کر دیا کرتے ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاء کی تجویز

(۱) مؤلف ”حدیث نماز“ نے بحوالہ حضرت مولانا عبدالحی حسنی ندوی کی کتاب ”نزہۃ الخواطر“ نقل کیا ہے کہ: حضرت شیخ خواجہ نظام الدین اولیاء باوجود حنفی ہونے کے فاتحہ خلف الامام اپنے مریدین کے لیے تجویز فرماتے اور خود بھی پڑھتے تھے، بعض اصحاب نے آپ سے عرض کیا کہ (بعض صحابہ سے) مروی ہے کہ جو امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے اس کے منہ میں انگارا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سے ”لا صلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب“ حدیث صحیح ثابت ہے اور پہلی حدیث میں وعید ہے اور دوسری میں نماز کا بغیر فاتحہ باطل ہونا بیان ہوا ہے اور میں وعید کو برداشت کر لینا پسند کرتا ہوں، نماز کا باطل ہونا میں پسند نہیں کرتا۔

مؤلف اس کے بعد لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے سورہ فاتحہ نماز میں نہ پڑھنے کے لیے یہ روایت گھڑی ہے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے پر منہ میں انگارا رکھا جائے گا۔ خواجہ صاحب نے اس بے سند اور من گھڑت روایت کو بڑی حکمت سے ٹال دیا اور صحیح روایت پر عمل کیا۔ الخ (حدیث نماز: ۸۲-۸۳)

(۲) اسی طرح بحوالہ ”امام الکلام“ حضرت عبدالرحیم صاحبؒ والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے نقل کیا کہ: مجھے یہ پسند ہے کہ قیامت کے دن انگارا ہو مگر ایسا نہ کہا جائے کہ تیری کوئی نماز نہیں ہے۔ (ایضاً)

اس کا جواب یہ ہے کہ:

اولاً: تو ان حضرات نے برسبیل احتیاط جواز پر عمل کو اختیار فرمایا ہے اور اکثر احناف امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے جواز کے قائل ہیں، بشرط یہ کہ مخل استماع والنصت اور باعث منازعت امام نہ ہو، لہذا اگر یہ حضرات اس شرط کے ساتھ اختیار کرتے ہیں، تو عین مذہب حنفی ہے، مگر اس قاعدہ کو عام کیسے کہہ دیا جاسکتا ہے؟ کیا عوام ان شرائط کا لحاظ کر سکتے ہیں؟ یہ بات مشاہدہ اور عادات عوام الناس سے بالکل ظاہر ہے کہ وہ اسکی رعایت نہیں کر سکتے اور اگر کرتے ہوں تو ہم منع نہیں کرتے، مگر مؤلف ”حدیث نماز“ کو اپنے دعویٰ پر نظر کرنی چاہئے کہ دعویٰ تو وجوب بلکہ فرضیت قرأت للمقتدی کا ہے، نہ کہہ برسبیل احتیاط جواز پر عمل کا۔ تو یہ عبارت نقل کرنا مؤلف کو کیا مفید ہوگا؟

ثانیاً: اگر یہ حضرات وجوب فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں، تو ہم نے ان کی تقلید کا کب التزام کیا ہے کہ ان کے قول سے احناف پر حجت قائم کی جاسکے، ہم نے تو امام اعظم کی تقلید کا التزام کیا ہے، جب ان کا قول دیگر احناف پر ہی حجت نہیں ہو سکتا، تو بھلا خود مجتہد اعظم امام ابوحنیفہ پر کیسے حجت ہو جائے گا؟

ثالثاً: ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ”من كان له إمام فقراءه الإمام له قراءة“ اور ”إذا قرأ فأنصتوا“ اور ”إذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا“ احناف کے دلائل نہیں ہیں؟ کیا صرف انکارے کی حدیث احناف کی دلیل ہے؟ پھر ان حضرات کا ان تمام دلائل سے قطع نظر صرف ایک روایت کے متعلق یہ کہہ کر کہ ہم اس کو برداشت کر لیں گے پیچھا چھڑانا احناف پر حجت قائم کر دے گا؟

رابعاً: یہ قول کہ ہم منہ میں انکارا برداشت کر لیں گے، زیادہ سے زیادہ ان حضرات سے ایک حال ہے، جس کو مسئلہ کی حیثیت نہیں دی جاسکتی، جیسے خواجہ نظام

الدین تو سماع کو بھی جائز قرار دیتے تھے مگر احناف نے ان کے قول کو نہیں لیا؛ کیوں کہ یہ ان کا ایک حال تھا۔

قرأت خلف الامام پر وعید

خامساً: ان حضرات کا یہ قول بعض صحابہ کبار کے قول کے مخالف و معارض ہے؛ کیونکہ امام بیہقی نے اپنے جزء ”القرءة خلف الامام“ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: مجھے قرأت خلف الامام سے زیادہ یہ بات پسند ہے کہ میں انکار ادا نیتوں سے پکڑ لوں۔ (امانی: ۱۵۷/۳)

اسی طرح حضرت سعدؓ کا قول نقل فرمایا گیا ہے کہ: ”میں چاہتا ہوں کہ جو امام کے پیچھے پڑھتا ہے، اس کے منہ میں انکار اہو“۔ (موطأ امام محمد: ۱۰۱، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۳۰/۱)

یہ روایت اگرچہ کہ منقطع ہے، مگر قرن اول و ثانی کا انقطاع علماء حنفیہ کے یہاں قاصر نہیں ہے، نیز یہ اوپر ذکر کردہ روایت سے مؤید ہے۔

اور عبدالرزاق نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ جو امام کے پیچھے قرأت کرے اس کے منہ میں پتھر ہو۔ (مصنف عبدالرزاق: ۱۳۸/۲، یہ مرسل صحیح ہے، کذافی امانی الاحبار: ۱۵۷/۳)

نیز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اور امام عبدالرزاق نے مصنف میں روایت بیان کی، آپ نے فرمایا کہ: ”کاش کہ جو امام کے پیچھے قرأت کرے اس کا منہ مٹی سے بھر جائے“۔ (شرح معانی الآثار: ۱۶۰/۱، مصنف عبدالرزاق: ۱۳۸/۲)

اس کی سند میں معاویہ بن خدیج الکوئی ایک راوی ہے جس کے بارے میں

اختلاف کیا گیا ہے، علامہ عینی نے لکھا ہے کہ: یحییٰ بن معین سے مروی ہے کہ: یہ راوی کچھ حیثیت نہیں رکھتا اور امام نسائی نے کہا کہ: ضعیف ہے، اور امام ابو حاتم نے کہا کہ: اس کا مقام سچائی کا ہے۔ (نخب الافکار: ۵۶۸/۲)

اسی اختلاف کے پیش نظر علامہ ظہیر الدین شوق نیموی نے کہا کہ: اس کی سند حسن ہے۔ (آثار السنن: ۸۹/۱)

اور حضرت اسود بن یزید سے بھی روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ: ”و ددت أن الذي يقرأ خلف الإمام ملئ فوه تراباً“ (میں چاہتا ہوں کہ جو امام کے پیچھے قرأت کرے اس کا منہ مٹی سے بھر جائے) (ابن ابی شیبہ: ۳۳۰/۱، عبد الرزاق: ۱۳۹/۲، اس کی سند صحیح ہے اور تمام رجال صحاح کے رجال ہیں، کذا فی اعلیٰ السنن: ۹۰/۴)

اب غور کیا جائے کہ ایک طرف حضرت عبداللہ بن مسعود جیسی شخصیت یہ کہے کہ قراءۃ خلف الامام سے بہتر یہ ہے کہ منہ میں انکار الے لو، اور دوسری جانب حضرت نظام الدین اولیاء یہ کہیں کہ مجھے وعید برداشت ہے، مگر یہ برداشت نہیں کہ امام کے پیچھے خاموش رہوں، ان دو میں کس کا قول قابل ترجیح ہے؟

اب بتائیے کہ صحابہ کا تو یہ قول ہے اور ان حضرات کا اس کے خلاف، تو ان حضرات کا قول کیسے معتبر اور احناف پر کیسے حجت ہو سکتا ہے؟ یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے جو ان روایات و آثار صحابہ کو من گھڑت کہا ہے، یہ محض اٹکل ہے۔ موصوف نے یہ تو کہہ دیا کہ من گھڑت روایت بیان کرنا حرام ہے، مگر یہ نہ دیکھا کہ ثابت شدہ حدیث کو من گھڑت بتانا بھی جرم عظیم ہے۔

سری نمازوں میں قرأت خلف الامام کا استحباب

(۳) مؤلف ”حدیث نماز“ نے علامہ عینیؒ سے نقل کیا کہ: ہمارے بعض اصحاب (حنفی) قرأت خلف الامام کو علی سبیل الاحتیاط تمام نمازوں میں مستحسن قرار دیتے ہیں۔ (حدیث نماز: ۸۴)

اولاً تو یہ بعض کی رائے ہے جو سب پر حجت نہیں، دوسرے بر سبیل احتیاط اس کی اجازت میں کسی کو اشکال نہیں، یہ قول امام محمد سے بھی نقل کیا گیا ہے جیسا کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا۔ مگر اس سے ہمارے مؤلف ”حدیث نماز“ کو کوئی فائدہ نہیں؛ کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ جواز، اور وہ بھی سری نمازوں میں ثابت ہوتا ہے، لہذا اس جواز کے قول سے وجوب پر استدلال بے معنی ہے۔

(۴) اسی طرح حضرت جہانیاں جہاں گشت حنفی سے بھی جواز قرأت خلف الامام بحوالہ ”نزہۃ الخواطر“ نقل کیا ہے۔ (ایضاً)

اس کا جواب بھی اوپر کے مذکورہ جوابات سے معلوم ہو جائے گا، اعادہ و طول لاطائل کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر اگر یہ چند حضرات حنفی خلف الامام قرأت کے قائل ہیں اور وجوب کے بھی قائل ہیں، تو ان کے خلاف ہزاروں لاکھوں منع بھی کرتے ہیں، تو اس سے کیا کسی پر حجت قائم ہوگی؟ حجت تو دلائل قرآنیہ و احادیث نبویہ، یا صحابہ کے آثار سے ہوتی ہے، اور پھر اگر صحابہ میں اختلاف ہو، تو مجتہد جس کو اقرب الی القرآن والسنة سمجھے وہی مختار ہے۔ (فانہم ولا تغفل)

(۵) مؤلف ”حدیث نماز“ نے علامہ سندھی حنفی سے نقل کیا ہے کہ:

”حق یہ ہے کہ حدیث ”لاصلوۃ“ سے اس نماز کا باطل ہونا معلوم ہوتا ہے کہ جس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو۔ پس ترک فاتحہ سے

نماز کا وجود شرعی باطل و ختم ہو جاتا ہے۔“ (حدیث نماز: ۸۴-۸۵)
 اس کا جواب یہ ہے کہ اس عبارت کو فاتحہ خلف الامام سے کیا تعلق؟ جب کہ
 علامہ سندھی نے اس کے چند سطر بعد یہ بھی لکھا ہے:

”نعم يمكن أن يقال : قراءة الإمام قراءة للمقتدى كما ورد به
 بعض الأحاديث فلا يلزم بطلان صلوة المقتدى إذا ترك الفاتحة ، والله
 أعلم“ (ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے جیسا کہ بعض
 روایات میں آیا ہے، پس ترک فاتحہ سے مقتدی کی نماز کا بطلان لازم نہیں آتا)
 (حاشیۃ السنن علی البخاری: ۹۱/۱)

معلوم ہوا کہ مؤلف کی پیش کردہ عبارت فاتحہ خلف الامام کے بارے میں
 نہیں بلکہ رکنیت فاتحہ کا مستقل مسئلہ وہاں بیان کیا ہے۔ لہذا مؤلف ”حدیث نماز“
 کا اس آخری عبارت کو حذف کر کے صرف اوپر کی عبارت نقل کرنا علمی خیانت
 ہے۔ رہا ترک فاتحہ سے امام و منفرد کی نماز کا بطلان اس پر ہم اوپر کلام کر چکے ہیں۔
 (۶) اس کے بعد مؤلف نے ”زبدۃ المقامات“ سے مجدد الف ثانی کا عمل نقل
 کیا کہ آپ امام کے پیچھے قرأت فاتحہ کرتے تھے اور اس کو مستحسن قرار دیتے تھے۔
 (حدیث نماز: ۸۵)

اس کا جواب بھی ہماری سابقہ تقریر سے نکل آیا کہ ان کا قول صاحب مذہب
 پر حجت نہیں ہو سکتا۔ اور دلائل سے امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ کا قول ثابت ہو چکا ہے۔
 لہذا اس کے خلاف ان مقلدین کا قول پیش کرنا بے فائدہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا فتویٰ

آپ نے ”حجت اللہ البالغہ“ میں تحریر فرمایا جس کو مؤلف نے بحوالہ ”آیت

اللہ اکاملہ، نقل کیا ہے کہ:

”اگر کوئی مقتدی ہو تو اس پر خاموش رہنا اور امام کی قرأت سننا واجب ہے، پھر اگر امام جہر کرے تو اس کے خاموش رہنے کے وقت پڑھ لے، اور اگر امام آہستہ پڑھ رہا ہے، تو مقتدی کو اختیار ہے کہ جب چاہے پڑھ لے، اگر پڑھنا چاہے، تو سورہ فاتحہ پڑھ لے، مگر اس طرح کہ امام کو تشویش نہ ہو۔ اور میرے نزدیک سب سے بہتر یہی ہے۔ اور اس سے تمام روایات کی تطبیق ہو سکتی ہے۔“ (حدیث نماز: ۸۵)

راقم کہتا ہے کہ: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا یہ فیصلہ بعینہ وہ ہے، جو ہم پہلے سے ثابت کرتے آرہے ہیں کہ مقتدی کے لیے امام کے پیچھے قرأت کرنا بشرطیکہ کہ امام کو تشویش نہ ہو اور قرأت باعث منازعت نہ ہو اور قرأت امام کے سننے میں خلل انداز نہ ہو تو جائز ہے، مگر واجب نہیں ہے۔ اور حضرت نے بھی یہی فیصلہ فرمایا کہ اگر پڑھنا ہو تو پڑھ لے منع نہیں ہے مگر مؤلفؒ ”حدیث نماز“ اپنے مدعا کے اثبات میں اس کو بے سوچے سمجھے نقل کر رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت نے تو پہلے شرط بیان کی کہ سکوت امام کے وقت پڑھے یا سری میں جب چاہے پڑھے، مگر امام کو تشویش نہ ہو۔ اس کے بعد فرمایا کہ: اگر پڑھے تو سورہ فاتحہ پڑھے۔ یہ جملہ صاف اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اس پر پڑھنا واجب تو نہیں ہے، البتہ پڑھے تو منع بھی نہیں ہے بشرطیکہ ان شرائط کا لحاظ رکھا جائے۔

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا ذکر

مؤلف نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بحوالہ ”فتاویٰ خاندان ولی اللہ“ یہ فتویٰ نقل کیا جس کو ہم اول بعینہ نقل کرتے ہیں، پھر انشاء اللہ اس پر تبصرہ اور

اس کا مفصل جواب لکھیں گے۔ وہ فتویٰ مؤلف کے مطابق یہ ہے:

”شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ جسے شیخ اکمل شاہ ولی اللہ نے بیان فرمایا کہ: آنحضرت ﷺ مدینہ شریف کی مسجد میں نماز ادا فرما رہے تھے اور صحابہ کرام بھی اقتداء کر رہے تھے، جب آنحضرت ﷺ نے سورہ فاتحہ کے بعد سورہ ”سبح اسم ربك الاعلیٰ“ ملائی، تو صحابہ نے بھی آنحضرت ﷺ کی متابعت میں پڑھنا شروع کر دی، تو یہ آیت کریمہ (إذا قرأ القرآن ارج) نازل ہوئی، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”قراءة الإمام قراءة له.“ یہاں سے صاف ثابت ہوا کہ مذکورہ آیت میں سورہ فاتحہ کے بعد پڑھی جانے والی سورت کے پڑھنے سے منع فرمایا گیا ہے، نہ کہ سورہ فاتحہ سے۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ صحابہ کرام ہمیشہ آپ کی متابعت میں سورہ فاتحہ پڑھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے سورہ فاتحہ سے کبھی منع نہیں فرمایا۔ پس ضروری ہے کہ جملہ مفسرین اور محدثین کی اتباع کرتے ہوئے مقتدی امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھے؛ کیونکہ سورہ فاتحہ کے نہ پڑھنے سے اس کا عمل صحیح حدیث کے خلاف ہوگا۔ باقی رہا امام ابوحنیفہ کا فتویٰ، تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ ان تک یہ حدیث صحیح سند سے نہ پہنچی ہو، مگر بہر حال جب سینکڑوں نہیں ہزار ہا علماء محققین مثلاً امام بخاری، امام مسلم وغیرہم کے نزدیک یہ حدیث صحیح ثابت ہو چکی ہے، تو سورہ فاتحہ کا ترک کرنا قابل ملامت اور مستوجب لعن ہوگا۔ فقط (فتاویٰ خاندان ولی اللہی)

فتویٰ مذکور پر نقد

ہمارے پاس ”فتاویٰ خاندان ولی اللہی“ نہیں ہے، اور نہ یہ کوئی معروف کتاب ہے اور اس کا درجہ استناد بھی معلوم نہیں کہ شاہ صاحب کے خاندان کی جانب اس کی نسبت صحیح بھی ہے یا نہیں؟ اور احقر کو باوجود تلاش بسیار کے دستیاب بھی نہ ہو سکی، اس لیے ہم براہ راست اس فتویٰ کی جانب مراجعت نہیں کر سکے، اور ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اس فتوے کی نسبت حضرت شاہ صاحب کی طرف صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کے مندرجات و مشمولات حضرت شاہ صاحب کے عالمانہ و فاضلانہ ذہن و مزاج سے ہم آہنگ نظر نہیں آتے، تاہم مؤلف ”حدیث نماز“ کی نقل پر اعتماد کرتے ہوئے اس کا جواب دیا جاتا ہے، اگرچہ مؤلف کی نقل پر ہمیں اعتماد نہیں؛ کیونکہ مؤلف نقل میں اکثر جگہ تلبیس سے کام لیتے ہیں، جیسا کہ آپ نے گذشتہ صفحات سے جان لیا ہے، مگر یہاں بجزوری اس پر اعتماد کیا جاتا ہے، اور جن کے پاس یہ مجموعہ فتاویٰ ہو وہ اس کی مراجعت کر لیں۔

قولہ: یہاں سے صاف معلوم ہوا کہ مذکورہ آیت میں سورہ فاتحہ کے بعد پڑھی جانے والی سورت کے پڑھنے سے منع کیا گیا ہے نہ کہ فاتحہ سے۔ اھ۔

اقول: یہ صاف معلوم ہونا غیر مسلم ہے؛ کیونکہ آیت ظاہر ہے کہ بعد فراغ من الصلوٰۃ نازل ہوئی اور اس میں مطلقاً حکم ہے کہ قرآن کے پڑھتے وقت استماع و انصات ہو، نیز حدیث ”من کان له امام فقراءه الإمام له قراءه“ میں بھی مطلق قرأت کا لفظ ہے، جو فاتحہ وغیر فاتحہ سب کو شامل ہے، لہذا یہ تخصیص کہاں سے ماخوذ ہے؟ اس کی خود کیا دلیل کہ اس آیت کا نزول ”سبح اسم ربك الاعلیٰ“ میں صحابہ کی متابعت پر ہوا؟ سورہ فاتحہ کے پڑھنے پر نہیں ہوا؟

قولہ: صحابہ ہمیشہ آپ کی متابعت میں پڑھتے تھے۔ **اقول:** یہ قول محتاج دلیل ہے کہ صحابہ ہمیشہ آپ کے پیچھے پڑھتے تھے، جب کہ بہت سے صحابہ کرام پڑھنے سے منع بھی کرتے تھے، خود تو کیا پڑھیں گے۔ چنانچہ علامہ عبدالحی صاحب نے اپنی کتاب ”السعیہ میں ”کشف الاسرار“ سے نقل کیا کہ: حضرت زید بن اسلم نے فرمایا کہ: دس صحابہ کرام قرأت خلف الامام سے سختی سے منع کرتے تھے۔ یہ صحابہ بحوالہ علامہ عینی یہ ہیں: حضرت ابو بکر، عمر، عثمان، علی، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، ابن مسعود، زید بن ثابت اور ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اس سے پہلے علامہ عینی ہی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اسی صحابہ سے منع قرأت للمقتدی منقول ہوا ہے، جن میں سے حضرت علیؓ اور عبداللہؓ ثلاثہ ہیں، جن کے نام محدثین کے یہاں معروف ہیں۔ (السعیہ: ۲/۲۹۶) (اس پر کلام ہم آگے کریں گے، جہاں مؤلف نے اس روایت پر کلام کیا ہے)

قولہ: رسول اللہ ﷺ نے سورہ فاتحہ سے کبھی منع نہیں کیا۔ **اقول:** آپ ﷺ نے اس کو برا ضرور جانا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ کے سوال سے ظاہر ہے کہ کیا تم میں سے بھی کوئی امام کے پیچھے پڑھتا ہے؟ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خال حنیہا“ (اس پڑھنے والے نے مجھے خلیجان میں ڈالا)۔ اس طرح کے الفاظ سے آپ ﷺ کا اس کو اچھا نہ سمجھنا معلوم ہوتا ہے؛ بلکہ ایک حدیث میں منع بھی فرمایا ہے، چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن ثوبان حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”ما کان من صلاة یجہر فیہا الامام بالقراءۃ فلیس لأحد أن یقرأ معہ“ (جو نماز کہ امام اس میں جہر کرے، کسی کو اس میں قرأت کی اجازت نہیں)۔ (بیہقی کتاب القراءۃ: ۱۴۴)

اس حدیث کو روایت کر کے امام بیہقی نے منکر کہا ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس کی کوئی مضبوط دلیل نہیں پیش کی کہ یہ کیوں منکر ہے؟ جبکہ اس کے تمام راوی ثقہ و قابل اعتبار ہیں، اور بظاہر کوئی علت اس میں نہیں ہے۔

قولہ: مقتدی فاتحہ پڑھے؛ کیوں کہ فاتحہ نہ پڑھنے سے اس کا عمل حدیث صحیح کے خلاف ہوگا۔ **اقول:** جب یہ حدیث مقتدی کے حق میں ہے ہی نہیں، جیسا کہ اوپر ثابت ہوا، تو پھر عمل اس کے خلاف کہاں اور کیونکر ہوگا، بلکہ پڑھنا اور پھر پڑھنے کو واجب جاننا البتہ خلاف قرآن و حدیث ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ اپنے ”رسالہ تنوع العبادات“ میں فرماتے ہیں کہ:

”وكان الذي يقرء حال الجهر قليل ، وهذا منهي عنه بالكتاب والسنة وعلى النهي عند جمهور السلف والخلف . وفي بطلان صلوة بذلك نزاع ، ومن العلماء من يقول : يقرء حال جهره بالفاتحة و إن لم يقرء بها ففي بطلان صلوته أيضا نزاع . فالنزاع من الطرفين ؛ لكن الذين ينهون عن القراءة مع الإمام هم جمهور السلف والخلف ومعهم الكتاب والسنة الصحيحة والذين أوجبوها على المأموم في حال الجهر هكذا، فحدثيهم قد ضعّفهم الأئمة الخ“ . (مجموعۃ الفتاوی: ۲۲/۳۴۰)

(جو حضرات امام کے جہر کی حالت میں پڑھتے تھے وہ تھوڑے تھے، اور یہ کتاب و سنت کی وجہ سے ممنوع ہے، اور ممنوع ہونے ہی پر جمہور سلف و خلف قائم ہیں، اور امام کی جہر کے وقت پڑھنے سے نماز کے باطل ہونے میں اختلاف ہے، اور بعض علماء کہتے ہیں کہ امام کے

جہر کے وقت سورہ فاتحہ پڑھنا چاہئے، اور اگر نہ پڑھا تو اس کی نماز کے باطل ہونے میں بھی اختلاف ہے، لہذا اختلاف دونوں جانب سے ہے، لیکن جو لوگ امام کے ساتھ پڑھنے سے منع کرتے ہیں وہ جمہور سلف و خلف ہیں اور ان کے ساتھ کتاب و سنت صحیحہ ہے، اور جو لوگ امام کے جہر کے وقت مقتدی پر فاتحہ کو واجب قرار دیتے ہیں ان کی حدیث کو ائمہ نے ضعیف کہا ہے)

غرض یہ کہ قرآن کی کوئی رعایت کیے بغیر اس طرح اس کو پڑھنا اور پھر واجب ماننا ضرور خلاف قرآن و سنت ہے۔ رہا جواز یا زیادہ سے زیادہ مستحب کما عند بعض الائمة، یہ البتہ احادیث سے ثابت ہو سکتا ہے، اور ہم اس کے قائل ہیں۔

قولہ: رہا ابو حنیفہ کا فتویٰ تو اس میں تعجب کیا ہے کہ ان تک حدیث صحیح سند کے ساتھ نہ پہنچی ہو۔ **اقول:** جس طرح یہ بات ممکن ہے کہ امام ابو حنیفہ کو حدیث صحیح طریق سے نہ پہنچی ہو، اسی طرح یہ اس سے بھی زیادہ ممکن ہے کہ پہنچی ہو اور آپ نے اس کو اپنی اصل پر رکھا ہو کہ غیر مقتدی کے حق میں ہے جیسا کہ امام احمد وغیرہ کا بھی مسلک ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس امکان کے خلاف کئی دلیل نہیں ہے۔ پھر ایک امام کے بارے میں جب دونوں احتمال ہیں تو ان میں سے اقرب الی القبول یہی ہے کہ ان کو حدیث پہنچی ہو، لہذا خواہ مخواہ بے دلیل اس سے عدول و انصراف کی کیا وجہ سکتی ہے، خصوصاً امام اعظمؒ کے بارے میں، جن کا زمان و مکان منبع علوم و مخزن حقائق تھا، کوفہ جہاں ہزاروں صحابہ نے سکونت اختیار فرما کر اپنے علوم کو شائع و ذائع فرمایا، کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ”لا صلوة“ والی حدیث آپ تک نہ پہنچی ہو؟۔

قولہ: بہر حال جب سینکڑوں نہیں ہزاروں علماء محققین مثلاً امام بخاری، امام

مسلم وغیرہم کے نزدیک یہ حدیث صحیح ثابت ہو چکی ہے کہ سورہ فاتحہ کا ترک کرنا قابل ملامت و مستوجب لعن ہوگا۔ **اقول:** اس میں ایک بات تو یہ قابل مواخذہ ہے کہ سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کو مستوجب لعنت قرار دیا ہے، جو شاہ صاحب جیسی صاحب علم و بصیرت سے نہایت مستبعد ہے، اس لئے ہمارا یہ خیال ہے کہ فتویٰ شاہ صاحب کے نام پر گھڑا گیا ہے، کیونکہ دنیا کے کسی امام کے نزدیک بھی ترک فاتحہ قابل لعنت نہیں ہے، یہ بات کسی جاہل کے دماغ کی پیداوار تو ہو سکتی ہے، شاہ صاحب ایسی بات کہیں یہ بہت ہی بعید ہے، دوسرے امام بخاریؒ و مسلمؒ کے نزدیک اگر صرف ”لا صلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب“ صحیح ثابت ہوئی ہے، تو امام ابوحنیفہ و بہت سے ائمہ نزدیک اس حدیث میں اس سے بھی زیادہ لفظ ”فصاعداً“ صحیح طریق سے ثابت ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ حدیث مقتدی کے حق میں نہ ہو، بلکہ غیر مقتدی کے متعلق ہو۔ لہذا اگر یہ حضرات لفظ ”فصاعداً“ کو حدیث سے گرا دیں، جیسا کہ امام بخاریؒ نے گرا دیا اور اس پر عمل نہ کریں اور منشاء حدیث کے مطابق ان کا عمل نہ ہو، تت دوسروں پر ان کی اتباع کہاں سے لازم آگئی؟

اس تبصرے سے معلوم ہوا کہ یہ جواب اور فتویٰ مخدوش ہے، اور شاہ صاحب جیسے صاحب علم و فقہ کے قلم کے بجائے کسی بے بصیرت و جاہل کے قلم کا لکھا ہوا ہے، لہذا جمہور احناف کے خلاف یہ فتویٰ قابل قبول نہیں ہے۔

ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ

یہاں جب بات آئی تو یہ بھی بیان کر دینا مناسب ہے کہ امام اعظمؒ بلکہ تمام ہی ائمہ کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ:

”إذا صح الحدیث فهو مذہبی“ اس کو پیش کر کے بعض لوگ کہتے ہیں

کہ امام صاحب کے قول کے مطابق اس پر عمل کرو اور امام صاحب کے قول کو چھوڑو، جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب سے مؤلف نے نقل کیا ہے، مگر یہ بات مغالطہ آمیز ہے، اس لیے یہاں اسکی بھی وضاحت کی جاتی ہے۔

حضرت شیخ زکریا صاحب نے اپنی کتاب ”شریعت و طریقت کا تلازم“ میں ایک عنوان ”اذاصح الحدیث فهو مذہبی“ کا باندھا ہے، اور اس میں لکھا ہے کہ یہ ائمہ اربعہ کا مقولہ ہے، جو مختلف الفاظ سے نقل کیا گیا ہے، لیکن حافظ نے ”فتح الباری“ میں ”باب رفع الیدین إذاقام من الرکعتین“ میں اس پر طویل بحث کرتے ہوئے، ابن دقیق العید کا قول نقل کیا کہ: امام شافعی کے اصول کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس میں (یعنی قعدہ اولی سے اٹھتے وقت) رفع یدین مستحب ہو.....

..... باقی یہ بات کہ امام شافعی کا مذہب ہونا چاہئے، اس لیے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ ”اذاصح الحدیث فهو مذہبی“ کہ جب کوئی حدیث صحیح مل جائے، تو وہی میرا مذہب ہے، تو اس میں اشکال ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: وجہ اشکال یہ ہے کہ امام شافعی کے اس مقولہ پر عمل اس وقت ہوگا جب یہ محقق ہو جائے کہ امام شافعی تک حدیث نہیں پہنچی، لیکن جب یہ معلوم ہو جائے کہ ان تک یہ حدیث پہنچی اور انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا، یا اس میں کوئی تاویل کی، تو اس وقت اس پر کوئی عمل نہیں ہوگا۔ حافظ کا کلام صحیح ہے۔ حضرت امام مالک نے ”موطا“ میں ابن عمر کی روایت نقل کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ جب رکوع سے اٹھتے تھے تو رفع یدین کرتے تھے۔ اور ”مدونہ“ میں امام مالک کا مقولہ مشہور ہے کہ امام مالک کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے علاوہ وضع یدین ضعیف ہے۔ نیز امام مالک کا مقولہ ہے کہ میں رفع یدین تکبیر تحریمہ کے علاوہ کسی جگہ اٹھنے بیٹھنے میں نہیں پاتا، ”- اوجز المسالک

“میں اس پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ”بذل المجدود: ۱۳۷/۵“ میں ”باب السارق“ میں متعدد روایات چور کو قتل کرنے کے بارے میں نقل کی گئی ہیں، اس کے بعد شیخ ابن القیم سے نقل کیا گیا ہے کہ: امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا کہ آپ نے اس حدیث کو کیوں چھوڑا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ: حضرت عثمانؓ کی حدیث کی بنا پر کہ مسلمان کو قتل کرنا صرف تین وجہ سے جائز ہے، اس میں چوری نہیں ہے۔ ”بذل المجدود“ میں اس پر طویل کلام ہے۔ مجھے تو صرف یہ ذکر کرنا ہے کہ قتل سارق کی روایات امام احمد کے پاس پہنچیں، مگر انہوں نے ان پر عمل نہیں کیا۔ پانی کے مسئلہ میں امام احمدؒ کا مذہب قلتین کا ہے، مگر بیزضاء کی حدیث کو امام احمد نے صحیح بتایا ہے، جیسا کہ ”معنی: ۲۵/۱“ میں ہے۔ لہذا حافظ کا یہ کہنا صحیح ہو گیا۔ (شریعت و طریقت کا تلازم: ۸۲-۸۳)

اس سے معلوم ہوا کہ صحت حدیث اور چیز ہے، اس کی حکم پر دلالت اور چیز ہے، جب تک دونوں نہ ہوں اس وقت تک ایجاب عملی نہ ہوگا۔ امام مالکؒ نے ”موطا“ میں تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھنے کی روایات ذکر کی ہیں، مگر ان کو نہیں اپنایا اور ارسال کے قائل ہوئے، تو یہ حدیث ان کو پہنچی، مگر ممکن ہے کہ کوئی وجہ ان کے ترک کرنے کی ہو، جو ہمیں معلوم ہونا ضروری نہیں۔

چنانچہ امام تیمیہؒ نے اپنے رسالہ ”رفع الملام“ میں کہا ہے کہ: کسی امام کو حدیث پہنچ کر بھی وہ کئی وجوہ سے اس کو اختیار نہیں کرتا، مثلاً حدیث کو صحیح نہیں مانتا، یا وہ اس کے شرائط پر نہ اترے۔ پھر لکھا ہے کہ بعض وجوہ پر ہم واقف بھی نہیں ہو سکتے، بہت سے رموز علماء کے سینے میں پوشیدہ ہوتے ہیں، جس کو کبھی عالم بیان کرتا ہے، کبھی راز میں رکھتا ہے۔ (رفع الملام: ۸۴)

راقم کہتا ہے کہ: ممکن ہے کہ امام مالکؒ نے ان روایات کو سنیت پر محمول نہ کیا ہو اور صرف جواز پر محمول کیا ہو (واللہ اعلم) لہذا اس کو مخالفت حدیث سے تعبیر کرنا نہایت ہی موحش اور خلاف ادب ہے۔

پس جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ امام کے پاس حدیث نہیں پہنچی، اس وقت تک اس مقولہ کو پیش کرنا کہ ”إذ اصح الحديث فهو مذهبي“ صحیح نہیں۔
(واللہ اعلم وعلمہ وتم واحکم)

مزید حوالے

مؤلف نے حضرت اسماعیل صاحب شہیدؒ اور ملا جیون اور مرزا حسن علی لکھنوی مرزا مظہر جان جانا، شیخ حسن حنفی، شاہ شمس الدین وغیرہ حضرات سے ان کا قول نقل کیا کہ: مقتدی کا امام کے پیچھے قرأت کرنا ترک کرنے سے اولیٰ ہے یا ان کا اس پر عمل نقل کیا ہے۔

راقم کہتا ہے کہ: بہت سے فقہاء و علماء کو اس کے خلاف ترک قرأت ہی اولیٰ معلوم ہوتا ہے، اور ان کی بھی ایک طویل فہرست ہے جس کا احصاء و احاطہ نہایت مشکل ہے، اور جو حضرات اختلاف ائمہ سے اور اس سلسلہ کی کتب سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اس کو خوب جانتے ہیں، پھر احادیث ہی سے نہیں قرآن سے بھی اس مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ احناف میں سے بہت سے حضرات صرف سری نمازوں میں قرأت کے قائل ہیں اور وہ بھی صرف استحباب کے نہ کہ وجوب کے، جیسا کہ خود مؤلف نے یہاں نقل کیا ہے، اور ہم بھی اسی کے قائل ہیں، لہذا اس سے مطلق قرأت کا وجوب ثابت کرنا یا ان حضرات کی جانب اس کو منسوب کرنا صحیح نہیں۔

امام محمد کے مذہب کی تحقیق

مؤلف ”حدیث نماز“ نے یہاں امام ابوحنیفہؒ کے مشہور شاگرد امام محمد کا قول ہدایہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ: امام کے پیچھے قرأت کرنا مستحسن ہے۔ (حدیث نماز: ۸۸)

راقم کہتا ہے کہ: یہ صحیح ہے کہ امام محمد سے ایک روایت یہی ہے جیسا کہ صاحب ہدایہ نے نقل کیا ہے، مگر یہاں دو باتیں قابل تنقیح ہیں: ایک تو یہ کہ یہ آپ کا مذہب نہیں ہے بلکہ صرف ایک روایت ہے، جیسے امام شافعی کے ایک ایک مسئلہ میں دو دو تین تین اقوال نقل کئے گئے ہیں، اور ان میں سے بعض ان کا مذہب ہیں اور بعض اقوال پر نہ فتویٰ ہے اور نہ وہ ان کا مذہب، اسی طرح دوسرے ائمہ سے بھی متعدد اقوال بعض بعض مسائل میں نقل کئے گئے ہیں، امام محمد سے بھی یہ ایک روایت ہے، مگر آپ نے اپنی مشہور کتب میں ترک قراءۃ خلف الامام ہی کو اپنا مذہب بتلایا ہے، جیسا کہ ”موطا“ اور ”کتاب الآثار“ میں مذکور ہے، اسی طرح اور دوسری کتب ظاہر الروایہ میں آپ نے ترک قراءت ہی اپنا اور امام صاحب کا مذہب بتایا ہے۔

اسی لئے جب ملا علی قاریؒ نے ”شرح مشکوٰۃ“ میں اس مسئلہ میں آپ کو امام شافعی کے موافقین میں سے شمار کیا تو علامہ عبدالحی صاحبؒ نے ”التعلیق الممجد“ میں اس کی تردید کی ہے اور فرمایا کہ: امام محمد کے اقوال ملا علی قاریؒ کے قول کی صریح تردید کرتے ہیں۔ (”التعلیق الممجد“: ۶۹)

اسی طرح علامہ ابن الہمامؒ نے صاحب ہدایہ کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ: یہ روایت امام محمدؒ نے اپنی مشہور کتابوں میں ذکر نہیں کی ہے اور

ظاہر الروایہ کے خلاف ہے۔ لہذا حق یہ ہے کہ امام محمد کا قول بھی شیخین (امام ابوحنیفہ و امام ابو یوسف) کی طرح ہے۔ (فتح القدیر: ۱/۲۹۷)

ہاں یہ ان کی ایک روایت ہے، اس کا نکار نہیں، علامہ کشمیری نے فرمایا کہ: صاحب ”ہدایہ“ نے جو کہا، وہی درست ہے؛ کیوں کہ اول تو ان دو کتابوں ”موطا“ اور ”کتاب الآثار“ میں حصر نہیں ہے۔ دوسرے ضروری نہیں ہے کہ ہر بات کتابوں میں بھی ہو، بلکہ محض شہرت و نقل بھی کافی ہے۔ (انور الباری: ۳/۳۱۱۴)

مگر نقل و سند کے لحاظ سے یہ روایت ضعیف ہے؛ کیونکہ صحیح سند سے اس کا ثبوت نہیں ہے، جیسا کہ علامہ ابن الہمام نے فرمایا ہے۔ (فتح القدیر: ۲۹۷)

اور علامہ مہدی حسن صاحب نے فلاندالازہار شرح کتاب الآثار میں تفصیلی کلام کرنے کے بعد حضرت مولانا نور شاہ صاحب سے عدم کراہت و جواز کو احناف کا مشہور قول بتلایا ہے اور امام محمد کی اس روایت کے بارے میں کہا کہ: یہ ان کی ایک روایت ہے، ان کا مذہب اور قول نہیں ہے جو اس کا دعویٰ کرے اس پر بیان لازم ہے۔ (فلاندالازہار شرح کتاب الآثار: ۹/۲)

مگر بہت سے محققین علماء حنفیہ نے امام محمد کے قول کو درایۃ قوی مان کر اختیار کیا ہے، جیسا کہ علامہ عبدالحی صاحب نے ”امام الکلام“ میں اور حضرت علامہ کشمیری نے (کمانی المعارف) اور علامہ ظفر احمد صاحب نے ”اعلاء السنن“ میں جس پر حضرت محقق فقیہ الامت مجدد ملت شیخ وقت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کی تقریظ مثبت ہے، جس سے آپ کا بھی اس سے متفق ہونا معلوم ہوتا ہے۔ (امام الکلام: ۱۵۶، معارف السنن: ۳/۱۸۸، اعلاء السنن: ۴/۹۲)

غرض یہ کہ محققین نے اس روایت کو درایۃ قوی مانا ہے، لہذا اس پر اگر عمل کیا جائے تو درست اور صحیح ہے؛ کیونکہ امام صاحب کے قول پر بھی قراءت خلف

الامام منع نہیں ہے، اگرچہ کہ نہ پڑھنا آپ کے نزدیک مختار و پسندیدہ ہے۔ پس امام محمد کی یہ روایت درایت کے لحاظ سے صحیح ہے۔ مگر مؤلف ”حدیث نماز“ کو اس سے کیا فائدہ؟ کیونکہ اس سے وجوب ثابت نہیں ہوتا، بلکہ وجوب کا تو کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ اور ان کو ثابت یہی کرنا ہے جس کی کوئی دلیل وہ پیش کر ہی نہ سکے۔

امام عبداللہ بن المبارک کا مذہب

مؤلف ”حدیث نماز“ نے بحوالہ ”سنن ترمذی“ حضرت عبداللہ بن المبارک کا قول بھی وجوب کا نقل کیا ہے کہ: بغیر سورہ فاتحہ پڑھے نماز نہیں ہوتی۔ (حدیث نماز: ۸۸)

راقم کہتا ہے کہ: مؤلف ”حدیث نماز“ کا اس کو فاتحہ خلف الامام کے بارے میں نقل کرنا صحیح نہیں؛ کیونکہ یہ قول آپ کا غیر مقتدی یعنی منفرد امام کے حق میں ہے کہ بلا فاتحہ پڑھے نماز نہ ہوگی۔ اسی لیے امام ترمذی نے اس کو ”باب ماجاء لاصلوٰۃ لمن لم یقرا بفاتحة الكتاب“ میں ذکر کیا ہے اور خود امام عبداللہ بن المبارک کا مقتدی کے حق میں عدم وجوب کا قول ”باب ترك القراءة خلف الامام“ میں ذکر کیا۔

چنانچہ امام ترمذی نے فرمایا کہ عبداللہ بن المبارک سے نقل کیا گیا کہ انہوں نے فرمایا کہ: میں امام کے پیچھے قراءت کرتا ہوں اور لوگ بھی کرتے ہیں، سوائے کوفین کے، اس کے بعد فرمایا کہ میرے نزدیک جو شخص امام کے پیچھے قرأت نہ کرے اس کی نماز جائز ہوگی اور بعض لوگ ترک قرأت خلف الامام میں تشدد کرتے ہیں کہ حکم لگا دیا کہ بغیر فاتحہ کے کسی کی بھی نماز نہیں ہوتی اگرچہ امام کے پیچھے ہو۔ (ترمذی: ۴۲۱)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ آپ کا معمول اگرچہ قرأت کا تھا، مگر آپ اس

کو واجب نہیں مانتے تھے، بلکہ مستحب خیال فرماتے تھے۔ لہذا مؤلف کا اس قول کو چھوڑ کر قول اول پیش کرنا نہایت تعجب انگیز امر ہے؛ کہ اتنی بدیہی بات بھی مؤلف نے نہ سمجھی؟ پس وجوب یا فرضیت فاتحہ خلف الامام تو کہیں سے بھی نہ ثابت ہو سکا۔ تو اس طول لا طائل اور خوامخواہ کے حوالوں سے مؤلف کو کیا فائدہ ہوا؟ رہا ان حوالوں سے یہ مقصد کہ یہ احناف کے خلاف جاتے ہیں لہذا ان پر حجت ہیں، تو ہم کئی مرتبہ اس قسم کی باتوں کا جواب دے چکے ہیں کہ اس مسئلہ میں صحابہ و تابعین سے ہی اختلاف چلا آ رہا ہے اور دونوں طرف بڑے بڑے حضرات صحابہ و تابعین ہیں، اس لئے ایک کو دوسرے کے خلاف حجت بنانے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ مناسب ہے، اور ہم نے اس بحث میں پڑنے کو بھی مناسب نہیں جانا، صرف مؤلف ”حدیث نماز“ کی بے تکی و بے جوڑ باتوں اور غلط حوالوں اور ائمہ کے خلاف اور مسلک حنفی کے خلاف ان کے بیانات کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں یہ کلام کرنا پڑا۔

امام اعظمؒ کے مذہب کی تحقیق

یہاں مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو اپنے مسلک کے موافق ثابت کرنے کی بھی ناکام کوشش کی ہے اور ”امام الکلام“ کے حاشیہ ”غیث الغمام“ مؤلفہ علامہ عبدالحی صاحب لکھنوی سے ایک عبارت نقل کی ہے، جو دراصل علامہ عبدالحی صاحب نے علامہ شعرانی سے نقل کی ہے۔ مؤلف نے ان کا نام حذف کر دیا اور پھر دوسرے صفحہ پر جا کر اس عبارت کے آخری ٹکڑے کو علامہ شعرانی کی طرف منسوب کر کے لکھا۔ غالباً تعدد و نقول سے مرعوب کرنا مقصود ہو جیسا کہ مؤلف کی یہ بھی ایک عادت ہے، مگر مؤلف کو یہ مفید نہیں اور احناف کو مضر نہیں جیسا کہ معلوم ہو جائے گا۔

پہلے ”غیث الغمام“ کی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں، علامہ عبدالحی لکھنوی

فرماتے ہیں:

”علامہ شعرانی نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے اس سلسلہ میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ مقتدی پر سورہ فاتحہ نہ واجب ہے نہ سنت، اور ان حضرات کا پہلا قول ہے جس کو امام محمدؒ نے اپنی قدیم تصانیف میں داخل کیا اور یہ کتابیں چاروں طرف منتشر ہو گئیں، اور ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ احتیاطاً پڑھ لینا مستحسن ہے اور امام کے آہستہ پڑھنے کے وقت مکروہ نہیں ہے، جس کی دلیل یہ حدیث مرفوع ہے کہ ”لَا تَفْعَلُوا إِلَّا بِأَمِّ الْقُرْآنِ“ (کہ سورہ فاتحہ کے علاوہ کچھ نہ پڑھو) اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ”میں جب جہر کروں تو سوائے فاتحہ کے کچھ نہ پڑھو“ اور حضرت عطا کا ارشاد ہے کہ: ”وہ (صحابہ کرام) مقتدی پر سری و جہری نمازوں میں قرأت کے قائل تھے۔ لہذا ان دونوں (امام ابوحنیفہؒ و امام محمدؒ) نے اپنے قول اول سے دوسرے قول کی طرف احتیاطاً رجوع کر لیا۔ (غیث الغمام: ۱۵۶)

میں کہتا ہوں کہ: مؤلف ”حدیث نماز“ کے لیے یہ نقل و حوالہ بالکل بے سود ہے؛ کیونکہ محض کسی کے نقل رجوع سے رجوع کا ثبوت بلا دلیل نہیں ہو سکتا، اسی لیے خود مولانا عبدالحی صاحب نے اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد فرمایا:

”لکن کتب الحنفیة اکثرها خالیة عن ذکر الرجوع ، ولو ثبت ذلك كان قاطعاً للنزاع“ (اکثر کتب حنفیہ رجوع کے ذکر سے خالی ہیں، اگر بالفرض یہ ثابت ہو جائے، تو نزاع کے لیے قاطع ہوگا) (غیث الغمام: ۱۵۶)

اس سے معلوم ہوا کہ خود مولانا لکھنوی اس رجوع کی روایت پر اعمتاً نہیں رکھتے، ورنہ ”لو ثبت“ نہ فرماتے جو کسی شی کے فرض کرنے کے لیے آتا ہے۔ لہذا ہم مؤلف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ پہلے امام صاحب کا رجوع بدلیل ثابت کریں،

پھر اس عبارت کو پیش کریں۔ البتہ امام محمدؒ سے اس سلسلہ میں استحسان کی روایت آئی ہے، جس کی تحقیق ہم نے پہلے کر دی ہے۔

دوسرے امام شعرانیؒ کی یہ بات امام صاحبؒ کے بارے میں ”مقدمہ غزنویہ“ کی عبارت کے معارض ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ فصل الخطاب میں مقدمہ غزنویہ سے (جو کہ احناف کی فقہی کتاب ہے) نقل کرتے ہیں کہ ہمارے بعض اصحاب نے مقتدی کے لیے خلف الامام قرأت کو ساری نماز میں اختیار کیا ہے اور یہ امام ابوحنیفہؒ کا قول اول ہے۔ اس کے بعد علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ امام صاحبؒ کا رجوع (اس قول مذکور سے) ترک قرأت کے اختیار کی طرف ہوا ہے، یعنی آپ نے ترک قرأت کو پسند فرمایا ہے، پڑھنے کو مکروہ نہیں سمجھا۔ (فصل الخطاب: ۹۴)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قول قدیم امام صاحبؒ کا وہ تھا جس کو علامہ شعرانی نے جدید کہا ہے۔ لہذا یہ دونوں قول آپس میں معارض ہیں۔

پھر امام صاحبؒ کا قول جدید جیسا کہ علامہ شعرانی نے نقل کیا ہے صرف استحسان و استحباب و عدم کراہت کا ہے، نہ کہ وجوب کا۔ لہذا اگر کوئی احتیاط کی وجہ سے پڑھے، تو ہم یہی کہتے ہیں کہ کوئی کراہت نہیں اور درست ہے۔ اور امام صاحبؒ کا مشہور قول بھی جواز ہی کا ہے جیسا کہ علامہ کشمیری نے ”فصل الخطاب“ میں اس کی تحقیق فرمائی ہے۔ (دیکھو فصل الخطاب: ۹۴-۹۵)

مگر یاد رہے کہ مقتدی کے حق میں قرأت کا یہ جواز یا استحسان دو شرائط کے ساتھ مشروط ہے، ایک یہ کہ جہری نماز میں مخل استماع نہ ہو اور دوسری یہ کہ سڑی میں باعث نزاع نہ ہو، لہذا اس کتابت امام میں اور ساری نمازوں میں بڑی احتیاط کے ساتھ ہونا چاہئے، ورنہ یہ جواز اور استحسان باقی نہ رہے گا۔

چنانچہ مؤلف نے بھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا فتویٰ اور نقل کیا تھا، جس میں اجازت قرأت اسی شرط کے ساتھ آپ نے دی تھی۔

اسی طرح حضرت مولانا عبدالحیؒ نے بھی یہ شرط لگائی ہے اور اس کو مؤلف نے اس کے بعد نقل بھی کیا ہے، اس میں بھی علامہ موصوف نے امام محمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ سے سری نمازوں میں قرأت کے مستحب ہونے کی روایت نقل کر کے فرمایا کہ: سکتا امام میں بھی استحسان کا انکار نہیں کیا جاسکتا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ محل استماع نہ ہو۔ (عمدة الرعاية: ۱۴۱/۱)

اس کے بعد سوال یہ ہے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام ابوحنیفہ و امام محمد کے ان اقوال کو جو اپنے مدعا کے اثبات میں پیش کیا ہے، کیا ان سے ان کا مدعی پورا ہوتا ہے؟ جواب یہی ہے کہ یہ اقوال ان کو مفید نہیں؛ کیونکہ یہ حضرات وجوب کے قائل ہی نہیں ہیں، بلکہ صرف استحباب و عدم کراہت کے قائل ہیں، جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، اور اگر اس کو پیش کرنے سے مؤلف کا مقصود احناف پر حجت قائم کرنا ہے، تو ہم اس کے منکر ہی کب ہیں کہ امام محمد سے استحسان کی روایت آئی ہے، اور امام ابوحنیفہ سے بھی ایک روایت شعرانی نے یہ نقل کی ہے؟ مگر روایت یہ ضعیف ہیں، اگرچہ درایت بعض حضرات نے ان کو قوی مانا ہے، مگر یہ مؤلف کو یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی اس استحسان پر عمل نہ کرے اور اس بات کا قائل ہو کہ امام کی قرأت مقتدی کے لئے کافی ہوتی ہے، تو وہ بالکل حق اور احادیث صحیحہ سے ثابت ایک بات پر عمل کرنے والا ہے۔

ایک اہم بات

ہم نے جو بتلایا کہ مقتدی کے حق میں قرأت کا جواز یا استحسان ہے، اس میں شرط بھی ہم نے بیان کر دی اور ان شرائط کے دلائل آگے آئیں گے، اب یہاں یہ

بات کہنا ہے کہ احناف کا اس پر فتویٰ نہیں ہے یعنی عام فتویٰ کہ اس پر ہر کس و ناکس عمل شروع کر دے، بلکہ یہ اجازت صرف ان لوگوں کو ہے، جو ان شرائط کی رعایت کر سکتے ہیں، عام لوگوں کو اس کی اجازت اس لیے نہیں دی جاتی کہ ان شرائط کے مطابق عوام کا عمل کرنا بے حد مشکل ہے، اور یہ استحسان اس شرط پر تھا کہ محلِ استماع و باعثِ نزاع نہ ہو، جب شرط فوت ہوئی، تو یہ مشروط بھی فوت ہو گیا۔

حضرت قطب عالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی فرماتے ہیں:

”جو روایات مرفوعہ اور موقوفہ میں مقتدی کے لیے قرأت فاتحہ کی اباحت ثابت ہوئی، یہ ان خواص کے لیے اجازت ہے، جو سکتا امام کی رعایت کرتے ہوں، یعنی باعثِ نزاع ان کی قرأت نہ ہوتی ہو۔“ (سبیل الرشاد: ۲۰)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ اجازت مطلقاً نہیں ہے۔ لہذا عوام کو اس روایت پر عمل کے لیے مجبور کرنا سراسر حماقت ہے اور شانِ فقہ سے بعید بلکہ ابعاد ہے۔

کیا تمام صحابہ کرام قرأت خلف الامام کرتے تھے؟

مؤلف نے بحوالہ ”غیث الغمام: ۱۵۷“ حضرت عطاء سے نقل کیا کہ:

”کانوا یرون علی المأموم القراءۃ فیما یجہر فیہ الإمام و

فیما یسیر (صحابہ کرام جہری و سری دونوں طرح کی نمازوں میں مقتدی

کے لیے سورہ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے)۔“ (حدیث نماز: ۹۱)

میں کہتا ہوں کہ: یہ عبارت بھی اوپر امام صاحب کے رجوع کے ضمن میں گذر گئی، مگر مؤلف کو تعددِ نقول سے مرعوب کرنا منظور ہے، اس لیے پھر اس کو نقل کیا ہے، مگر اس سے ان کا مقصود پورا نہیں ہوتا؛ کیونکہ:

اولاً: تو یہ تمام صحابہ کے بارے میں صحیح نہیں؛ کیونکہ بہت سے صحابہ تو قرأت

خلف الامام سے منع بھی کرتے تھے، جیسا کہ اوپر گزر چکا۔
 شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ:

” ومعلوم أن النهي عن القراءة خلف الإمام في الجهر متواتر عن الصحابة والتابعين ومن بعدهم ، كما أن القراءة خلف الإمام في السر متواترة عن الصحابة والتابعين ومن بعدهم ، بل نفي وجوب القراءة على المأموم مطلقاً مما هو معروف عنهم “ (اور یہ معلوم ہے کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت سے منع کرنا صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ سے متواتر طور پر ثابت ہے جس طرح کہ نہری نمازوں میں امام کے پیچھے پڑھنا بھی صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے حضرات سے متواتر طور پر ثابت ہے، بلکہ مقتدی پر مطلقاً قرأت کے واجب ہونے کی نفی و انکار بھی ان حضرات سے معروف و مشہور ہے) (مجموعۃ الفتاوی: ۲۳۳/۳۰۷)

اس سے معلوم ہوا کہ تمام صحابہ نہیں پڑھتے تھے بلکہ صحابہ سے امام کے جہر کے وقت پڑھنے کو وہ حضرات منع کرتے تھے، اور یہ بات ان سے متواتر طور پر مروی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ و تابعین میں سے کوئی بھی امام کے پیچھے پڑھنے کو واجب نہیں کہتے تھے۔

ثانیاً: اس میں حضرت عطاء نے ”کانوا یرون“ فرمایا ہے جس سے لازمی طور پر وجوب ہی مراد نہیں ہوتا، بلکہ جواز کے لیے بھی یہ استعمال ہوتا ہے، لہذا حضرت عطاء کے اس قول میں قرأت خلف الامام کا جواز مراد ہے، یا زیادہ سے زیادہ استحسان و استحباب مراد ہے، لہذا یہ قول احناف کے خلاف نہیں، بشرطیکہ محل استماع و باعث نزاع نہ ہو۔ اسی لئے حضرت عطاء اور حضرت حماد نے امام سے پہلے یا امام

کے پڑھنے کے بعد پڑھنے کو کہا ہے، جیسا کہ خود مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس کے بعد نقل کیا ہے۔

حضرت حماد کا حوالہ

اس کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام بخاری کی ”جزء القراءة“ کے حوالے سے حضرت امام ابوحنیفہ کے استاذ حضرت حماد کے بارے میں نقل کیا ہے کہ:

حضرت حنظلہ بن ابی المغیرة نے کہا کہ: میں نے حضرت حماد سے ظہر و عصر میں قرأت خلف الامام کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ: حضرت سعید بن جبیر پڑھتے تھے، میں نے کہا کہ: آپ کو کیا پسند ہے؟ کہا کہ: پڑھنا پسند ہے۔“ (حدیث نماز: ۹۲)

یہاں قابل غور یہ ہے کہ حضرت حماد سے جو نقل کیا ہے، وہ صرف عصر اور ظہر یعنی سری نمازوں میں پڑھنے کی بات ہے اور سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کا جواز و استحسان حنفیہ کے بہت سے ائمہ کے نزدیک ثابت ہے اور یہاں بھی اسی کو حضرت حماد نے بتایا ہے اور لفظ ”أحبُّ“ بھی عدم وجوب پر دلالت کر رہا ہے۔ الغرض یہ مسلک احناف کے خلاف نہیں ہے۔ جیسا کہ اوپر اس کی توضیح ہو چکی ہے۔ (فانہم)

حضرت ابن مسعودؓ کے مذہب کی تحقیق

مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام بیہقی کی ”کتاب القراءة“ سے نقل کیا کہ:

”حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے امام کے پیچھے پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور دوسری سورت پڑھی، اور ”طحاوی“ کے حوالے سے بھی نقل

کیا کہ ”حضرت ابو مریم اسدی نے کہا کہ: میں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ظہر میں پڑھتے ہوئے سنا“، اور امام بخاریؒ کی ”جزء القراءة“ سے بھی ابو مریم سے نقل کیا کہ: آپ امام کے پیچھے پڑھتے تھے۔ (حدیث نماز: ۹۳)

میں کہتا ہوں کہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو صحیح طریق سے مروی ہے، وہ قرأت نہ کرنا ہی ہے۔ چنانچہ امام محمدؒ نے اپنی سند سے بیان کیا کہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے، نہ جہری نماز میں، نہ سری میں، نہ اول رکعتوں میں، نہ پچھلی رکعتوں میں۔ (موطا: ۱۰۰، کتاب الحج: ۳۱)

اس کی سند کے سب راوی ثقہ ہیں، سوائے محمد بن ابان بن صالح القرظی کے، اور محدثین کے نزدیک ان میں کلام ہے، اور جمہور نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، امام احمد، امام بخاری و امام نسائی وغیرہ نے ان کو ضعیف کہا ہے اور ان کے حافظہ کی وجہ سے ان کو حجت نہیں سمجھا، تاہم امام احمد نے کہا کہ: ان سے حدیث لکھی جاسکتی ہے مگر حجت نہیں پکڑی جاسکتی۔ (لسان المیزان: ۳۱/۵)

مگر درحقیقت یہ راوی مختلف فیہ ہیں؛ کیونکہ امام محمدؒ جیسے مجتہد نے اس روایت سے احتجاج کیا ہے، اور مجتہد کا کسی روایت سے احتجاج کرنا اس روایت کے اس کے نزدیک صحیح ہونے کی علامت ہے۔ لہذا امام محمدؒ کے نزدیک محمد بن ابان ثقہ ہیں۔ (اعلاء السنن: ۸۰۴، قلاندالازہار: ۱)

لہذا یہ محدثین کے اصول کے مطابق حسن الحدیث ہیں، اور حسن الحدیث راوی کی حدیث سے احتجاج اسی طرح درست ہے جس طرح صحیح حدیث کے راوی سے احتجاج صحیح ہے۔

نیز ”مجمع الزوائد“ میں حضرت ابراہیم نخعی سے مروی ہے کہ: حضرت ابن مسعود امام کے پیچھے قرات نہیں کرتے تھے۔ (قلائد الازہار: ۶۲/۲)

اور یہ معلوم ہی ہے کہ حضرت ابراہیم نخعیؒ کے مراسیل مقبول و حجت ہیں؛ کیونکہ آپ نے خود فرمایا کہ: میں جب تک بات مختلف طرق سے ثابت نہ ہو جائے ارسال نہیں کرتا۔ (طحاوی: ۱۱۱/۱، نخب الافکار: ۶۱۶/۲)

رہی اوپر کی پیش کردہ روایات، تو اولاً اس میں ایک مرتبہ کا بیان ہے کہ ابو مریم اسدی نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو ظہر کی نماز میں پڑھتے ہوئے سنا، اس سے یہ تو نہیں معلوم ہوتا کہ آپ اس کو سنت یا واجب سمجھتے تھے؟

اس میں اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے سورہ فاتحہ کے ساتھ سورت بھی تلاوت کی ہے، جیسا کہ خود مؤلف نے نقل کیا ہے، حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے اور اس میں خود وہ بھی تاویل سے کام لیں گے تو ہم بھی اس کی تاویل کریں گے۔

حضرت ابن عباس کا مذہب

مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام بیہقی کی کتاب ”القرائن“ سے نقل کیا کہ:

”حضرت حریش نے کہا کہ: میں نے حضرت ابن عباسؓ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھو۔ امام بیہقی نے فرمایا کہ: اس حدیث کی سند صحیح ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں۔ (حدیث نماز: ۹۴)

جواب اس کا یہ ہے کہ اس اثر کو اگرچہ امام بیہقی نے صحیح کہا ہے مگر محدثانہ طریقے پر جانچ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بات ایسی نہیں ہے؛ کیونکہ اس کی سند میں ایک

راوی مروان بن معاویہ الفزازی ہیں جو اگرچہ کہ ثقہ ہیں مگر اسی کے ساتھ مدلس ہیں اور مجہول راویوں سے روایت کرنے کے عادی ہیں، اس لئے ائمہ جرح و تعدیل نے لکھا ہے کہ: ان کی صرف وہ روایت مقبول ہے جو معروف راویوں سے آئی ہو، اور جو روایت غیر معروف لوگوں سے ہو وہ نامقبول ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۱۰/۸۸)

اور یہ اصول معلوم ہے کہ مدلس راوی اگر عنعنہ سے روایت کرے تو قبول نہیں یہاں یہ روایت انھوں نے عنعنہ سے بیان کی ہے۔ لہذا یہ بھی ناقابل قبول ہوگی۔

دوسرے اس میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے وجوب پر کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ اس کے خلاف یہ ثابت ہے کہ آپ اس کے وجوب کے قائل نہیں تھے، چنانچہ امام طحاویؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت بیان کی کہ حضرت ابو حمزہ نے آپ سے سوال کیا کہ امام کے ہوتے ہوئے میں قراءت کروں؟ تو فرمایا: نہیں۔ (طحاوی: ۱۰۸/۱)

امام عینی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے اور علامہ نیوی نے فرمایا کہ: اس کی سند حسن ہے۔ (نخب الافکار: ۲/۵۷۱، آثار السنن: ۱/۸۵)

تیسرے یہ کہ اس میں سری وجہی نمازوں کی تعیین نہیں ہے، ممکن ہے کہ سری نماز کے بارے میں فرمایا ہو، یا سکتات امام کے وقت پڑھنے کے لئے کہا ہو، اور ہم سکتات اور سری نمازوں کے بارے میں مذہب احناف بیان کر چکے ہیں۔

اور مؤلف نے اس کے بعد امام بیہقی کی ”کتاب القراءۃ“ سے جو نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ: سورہ فاتحہ مت چھوڑو خواہ امام جہر کرے یا نہ کرے۔ (حدیث نماز: ۹۴)

اس کی سند میں ایک راوی عقبہ بن عبد اللہ الاصم ضعیف ہے، اس کے بارے میں ابن معین نے کہا کہ: ”لیس بشیء“ اور امام نسائی نے کہا کہ: ”لیس بثقہ“ اور

فلاس نے کہا کہ: ”واہی الحدیث“ اور امام ابو حاتم نے کہا کہ: ”لین الحدیث“، امام ابوداؤد نے کہا کہ: ضعیف ہیں۔ (تہذیب التہذیب: ۲۱۷/۷)

معلوم ہوا کہ یہ اثر ضعیف ہے، اس سے احتجاج کرنا صحیح نہیں، نیز امام بیہقی نے اس کو ایک دوسری سند سے بھی روایت کیا ہے، جس کے بارے میں علامہ ظفر احمد صاحب نے اعلیٰ السنن میں فرمایا کہ: اس سند میں ابوطیب کراہیسی ہیں، جن کا پتہ نہیں چلا، کہ کون ہیں، اور حاشیہ میں لکھا کہ: ایک شخص کراہیسی لقب کے ہیں جن کا نام حسین بن علی الفقیہ ہے، لیکن ان کو کسی نے ابوطیب سے ملقب نہیں کیا، اور کتاب انساب میں ”کراہیسی“ لقب کے دو شخص ہیں جن میں سے کسی کی کنیت بھی ابوطیب نہیں ہے، لہذا اگر اس سے مراد یہی حسین بن علی ہیں تو وہ مختلف فیہ راوی ہیں، بعض نے ان کی توثیق کی، اور اگر اس سے مراد کوئی اور ہے تو معلوم نہیں کہ وہ کون ہے؟ (اعلاء السنن: ۸۱/۴)

دوسرے یہ کہ اس کو بھی استجاب پر محمول کرنا چاہئے نہ کہ وجوب پر، تاکہ دونوں قسم کی روایات کو جمع کیا جاسکے کہ اثبات و امر کو استجاب اور جواز پر محمول کیا جائے اور نفی کو نفی وجوب پر محمول کیا جائے اور یہی ہمارا عین مذہب ہے۔

حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کا مسلک

مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام بخاری کی ”جزء القراءة“ سے نقل کیا کہ حضرت مجاہد نے کہا کہ: امام کے پیچھے قراءت نہ کرے تو نماز لوٹائے اور حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ بھی اسی طرح فرماتے تھے۔ (حدیث نماز: ۹۴)

راقم کہتا ہے کہ: امام بخاری نے اس کی کوئی سند پیش نہیں کی، اور ایسے معاملہ میں بے سند بات کو کون مانتا ہے؟ پھر یہ اعادہ والی بات دوسرے تمام ہی صحابہ کے خلاف ہے

حضرت مجاہد نے خود آیت: ﴿إِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا﴾
[اعراف: ۲۰۴] کا شان نزول یہ بتایا کہ جب ایک انصاری صحابی نے قرأت کی
اور رسول اللہ ﷺ نے سنی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (کتاب لقراءۃ: ۷۸)

پھر بھی آپ اعادہ کا حکم کیسے دے سکتے ہیں؟ نیز امام احمدؒ نے یہاں تک
فرمایا کہ: ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ اگر امام جہراً قرأت
کرے تو بھی مقتدی کو اس کی قرأت کافی نہ ہوگی، اور فرمایا کہ: ”یہ رسول اللہ ﷺ
اور آپ کے صحابہ ہیں، اور یہ امام مالک اہل حجاز میں سے ہیں، اور یہ امام ثوری اہل
عراق میں سے ہیں، اور یہ امام اوزاعی اہل شام میں سے ہیں، اور یہ امام ابو الیث
اہل مصر میں سے ہیں، ان حضرات نے یہ نہیں کہا کہ: آدمی نماز پڑھے اور اس کا امام
قرأت کرے اور وہ خود قرأت نہ کرے تو اس کی نماز باطل ہے۔ (المغنی: ۳۹۳۱)
تو حضرت مجاہد اور حضرت عبداللہ بن الزبیر سے یہ نقل یا تو صحیح نہیں یا اس
کا مطلب وہ نہیں جو بیان کرتے ہیں، پس جواز و استحباب ہی پر ان کے اقوال کو بھی
محمول کیا جائے گا، ورنہ دیگر صحابہ ان کے خلاف ہیں۔

پھر مؤلف کو اس نقل سے کیا فائدہ؟ کہ صحابہ کے اعمال و اقوال ان کے یہاں
معتبر و حجت نہیں۔ خصوصاً جب کہ قرآن و حدیث کے مخالف ہوں اور یہ قول
بغیر تاویل کے لیا جائے تو خلاف قرآن و سنت ہے؛ کیونکہ اعادہ کے حکم کا مطلب یہ
ہوا کہ نماز صحیح نہیں ہوئی، اور حدیث میں ہے کہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت
ہے، اور نماز صحیح ہے اور ”بخاری“ کی حدیث ابو بکرہ بھی اوپر گزر چکی ہے، جس میں
رکوع میں شامل ہونے سے اعادہ کا حکم نہیں دیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فتویٰ و مذہب

مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام بخاری کی ”جزء القراءۃ“ سے نقل کیا کہ

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے قراءۃ خلف الامام کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ: صحابہ کرام سورہ فاتحہ کو دل میں پڑھنے سے کچھ حرج نہیں سمجھتے تھے اور ”کنز العمال“ سے نقل کیا کہ آپ نے فرمایا کہ جو امام کے ساتھ ہو وہ امام سے پہلے یا جب وہ سکتے کرے، پڑھے۔ (حدیث نماز: ۹۴-۹۵)

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عمر نے جو فرمایا ہے یہ بات بالکل مذہب احناف کے موافق ہے؛ کیونکہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ امام کے پیچھے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، مگر امام کے ساتھ ہرگز نہ پڑھے، بلکہ سکتا میں پڑھے۔ اور یہ مؤلف کے دعوے کے بالکل خلاف ہے؛ کیونکہ وہ سورہ فاتحہ کا پڑھنا مقتدی کے حق میں بھی واجب قرار دیتے ہیں، لہذا اس کو نقل کرنے سے ان کو کیا فائدہ کہ مدعی تو وجوب فاتحہ خلف الامام کا ہے اور دلیل میں استحباب یا عدم کراہت پیش کرتے ہیں، یا سکتا امام میں پڑھنے کی بات نقل کرتے ہیں۔ نیز آپ تو دل میں پڑھنے کو فرما رہے ہیں نہ کہ زبان سے اور اس سے مراد تدبر و تفکر ہے جیسا کہ گزرا۔

دوسرے خود حضرت ابن عمرؓ سے ”موطا امام مالک“ اور ”موطا امام محمد“ اور طحاوی میں عن مالک عن نافع سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے سوال ہوا کہ کیا کوئی امام کے ساتھ پڑھے؟ تو فرمایا: جب تم میں سے کوئی امام کے ساتھ نماز پڑھے تو اس کی قراءت ہی کافی ہے، اور اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ اگر امام کے ساتھ ہوتے تو نہیں پڑھتے تھے۔ (موطا امام مالک: ۲۹، محمد: ۹۵، طحاوی: ۱۶۰)

اور یہ سند اصح الاسانید کہلاتی ہے کہ امام مالک، نافع اور وہ ابن عمرؓ سے روایت کریں۔ امام عینی کہتے ہیں کہ: یہ سند غایت درجہ صحیح ہے۔ (نخب الافکار: ۲/۵۶۹)

نیز حضرت زید بن اسلم کہتے ہیں کہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے تھے۔ (مصنف عبدالرزاق: ۱۴۰/۲)

اعلاء السنن میں علامہ ظفر احمد عثمانی نے کہا کہ: صحیح سند ہے اور داؤد بن قیس مسلم کے راویوں میں سے ثقہ راوی ہیں۔ (اعلاء السنن: ۸۵/۴)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ آپ کا مذہب ترک قرأت خلف الامام ہے، اگرچہ امام مالک نے اس کو جہری نمازوں پر محمول کیا ہے، مگر امام محمد نے اس کو مطلق رکھا ہے۔ غرض یہ کہ احناف کا فتویٰ آپ کے موافق ہے۔ لہذا ہمارے مؤلف کو اس کو پیش کرنے سے کوئی نفع نہیں۔

حضرت عمرؓ کا فتویٰ

مؤلف ”حدیث نماز“ نے طحاوی کی ”شرح معانی الآثار“ اور امام بخاری کی ”جزء القراءة“ سے نقل کیا کہ حضرت یزید بن شریک ابو ابراہیم التیمی نے کہا کہ: میں نے حضرت عمرؓ سے قرأت خلف الامام کے بارے میں سوال کیا، تو آپ نے فرمایا کہ: پڑھو، تو میں نے کہا کہ: اگرچہ میں آپ کے پیچھے ہوں؟ تو فرمایا کہ: ہاں! اگرچہ تم میرے پیچھے ہو، پھر میں نے کہا کہ: اگرچہ آپ قرأت کر رہے ہوں، تو فرمایا کہ: ہاں اگرچہ میں پڑھوں تب بھی تم پڑھو۔ (حدیث نماز: ۹۵)

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ سے اس کے خلاف بھی فتویٰ منقول ہے۔

چنانچہ موسیٰ بن عقبہ صاحب مغازی سے مروی ہے کہ:

”أن رسول الله ﷺ و أبا بكر و عمر و عثمان كانوا ينهون عن القراءة خلف الإمام“ (نبی کریم ﷺ حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ قرأت خلف الامام سے منع کرتے تھے۔) (مصنف عبدالرزاق: ۱۳۹/۲)

صاحب ”اعلاء السنن“ نے لکھا کہ یہ مرسل صحیح ہے، اور موسیٰ بن عقبہ ثقہ صاحب مغازی ہیں، اور ان سے عبدالرزاق کا لقاء ممکن ہے۔ (اعلاء السنن: ۸۴/۴)

راقم کہتا ہے کہ: امکان لقاء صحت کے لیے کافی ہے، جیسا کہ جمہور کا مذہب ہے، لہذا یہ روایت صحیح ہے اور مرسل ہے اور ہمارے نزدیک مرسل قابل احتجاج ہوتا ہے؛ کیونکہ ارسال کوئی قدر نہیں۔

نیز حضرت عمر سے امام محمد و امام عبدالرزاق نے روایت کیا کہ: آپ نے فرمایا کہ کاش جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرے اس کے منہ میں پتھر ہو۔ (مؤطا امام محمد: ۱۰۲، مصنف عبدالرزاق: ۱۲۸/۲)

اگر کوئی یوں کہے کہ یزید بن شریک کی روایت موصول ہے اور دوسری روایت مرسل اور مرسل سے موصول اولیٰ ہے، تو جواب یہ ہے کہ مرسل دوسرے دلائل سے حکم موصول میں ہو گیا؛ کیونکہ یہ قرآن وحدیث اور دیگر صحابہ کے فتاویٰ کے موافق ہے۔

چنانچہ حضرت علیؓ بن ابی طالب سے بھی مروی ہے کہ جو شخص قرأت خلف الامام کرے، وہ فطرت پر نہیں ہے۔ (مصنف عبدالرزاق: ۱۳۹/۲)

اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے مروی ہے کہ جو امام کے پیچھے قرأت کرے، میں چاہتا ہوں کہ اس کے منہ میں انگارا ہو۔ (مؤطا امام محمد: ۱۰۱، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۳۰/۱)

الغرض دوسری روایت اگرچہ مرسل ہے مگر دیگر وجوہ کی بنا پر مقدم ہے۔

دیگر صحابہ و تابعین کی روایات

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس کے بعد لکھا ہے کہ: عبداللہ بن مغفلؓ، حضرت انسؓ، حضرت علیؓ، حضرت عروہ بن الزبیرؓ، حضرت ابوسلمہؓ، محمد بن عمروؓ اور حضرت جابرؓ

سے بھی (مختلف کتابوں میں) امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کا ثبوت ہے۔ (مخلص از حدیث نماز: ۹۶)

راقم کہتا ہے کہ: حضرت علیؓ، حضرت جابرؓ سے نہ پڑھنے کا ثبوت ہی قوی ہے، چنانچہ حضرت علیؓ کا ایک اثر ہم نے اوپر نقل کیا تھا کہ آپ نے فرمایا کہ: جو امام کے ساتھ پڑھے وہ فطرت پر نہیں ہے، نیز آپ سے ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ امام کے ساتھ قرأت کرنا فطرت نہیں ہے۔ (مصنف عبدالرزاق: ۱۳۸/۲)

یہ دوسری روایت اگرچہ ضعیف ہے؛ کیونکہ اس میں ابن ابی لیلیٰ راوی ضعیف ہے، تاہم یہ پہلی روایت کی تائید تو کر سکتی ہے، اس کی تحقیق ”قلائد الازہار“ میں قابل مطالعہ ہے۔

اور حضرت جابر کا قول اوپر گزر چکا ہے کہ ”جو شخص کوئی رکعت سورہ فاتحہ کے بغیر پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو،“ اس روایت کو امام ترمذی نے ”حسن صحیح“ کہا ہے۔

اور حضرت انسؓ سے جو روایت ہے وہ حضرت ثابت بنانی نے روایت کی ہے کہ حضرت انس بن مالک ہمیں امام کے پیچھے قرأت کا حکم دیا کرتے تھے اور میں حضرت انسؓ کے پہلو میں کھڑا ہوتا تھا اور وہ سورہ فاتحہ اور مفصل کی سورتوں میں سے کوئی سورت بھی پڑھتے تھے۔ (کتاب القراءة للبیہقی: ۶۸)

مگر اس میں سورہ فاتحہ کے ساتھ ایک اور سورت کے پڑھنے کا بھی ذکر ہے جس کو کوئی بھی نہیں مانتا، نہ اہل حدیث مانتے ہیں اور نہ احناف مانتے ہیں، تو پھر اس کا کیا جواب ان حضرات کے پاس ہے جو اس سے استدلال کرتے ہیں؟ ان کا جو جواب ضم سورت کے بارے میں ہوگا وہی ہم سورہ فاتحہ کے بارے میں دیں گے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مغفل سے جو روایت آئی ہے، اس کو امام بخاری نے اپنے جزء القراءۃ میں روایت کیا ہے، اس میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل ظہر و عصر کی پہلی دو رکعتوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ اور دوسری دو سورتیں پڑھتے تھے اور پچھلی دو رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھتے تھے۔ (جزء القراءۃ: ۱۳)

مگر یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ اس کی سند کے ایک راوی عمر بن ابی تحیم کو اگرچہ امام ابن حبان نے ثقات میں داخل کیا ہے مگر امام ذہبی نے اس کو مجہول قرار دیا ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۳۹۵/۷)

دوسرے اس میں صرف ان کے عمل کا ذکر ہے جس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ واجبی طور پر پڑھتے تھے، تیسرے یہ کہ آپ کا یہ پڑھنا بھی صرف ظہر و عصر میں تھا، باقی نمازوں میں پڑھنے کا ثبوت اس میں کہاں؟ چوتھے یہ کہ اس میں یہ بھی ہے کہ آپ پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ ایک اور سورت بھی پڑھتے تھے، حالانکہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ امام کے پیچھے دیگر سورت پڑھنا جائز ہے۔ معلوم ہوا کہ اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔

اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ: جن حضرات سے بھی پڑھنا یا پڑھنے کا حکم دینا وارد ہوا ہے وہ یا تو علی سبیل الوجوب نہیں، بلکہ علی سبیل الجواز یا علی سبیل الاستحسان ہے، یا بعض صرف سری میں قرأت کے قائل ہیں اور بعض سکتات امام میں قائل ہیں، مطلقاً ہر نماز میں امام کے پیچھے وجوب کا قول ان آثار سے ثابت نہیں ہوتا، لہذا ہمارے مؤلف ”حدیث نماز“ کا ان سب کو اس طرح لپیٹ کر سب کو موجبین میں داخل کرنا، مقام حیرت ہے اور بے دلیل ہے۔

اس کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا کہ: ہم نے ان اصحاب کرام کا نام

اسی لیے لیا ہے کہ ان سے ممانعت (قرأت خلف الامام) کی دلیلیں بھی لائی جاتی ہیں۔ تو عرض ہے کہ حنفی مذہب کا اصول ہے کہ جس راوی صحابی کا عمل اس کی روایت کے خلاف ثابت ہو، تو وہ روایت ہی منسوخ ہے، یا پھر اس روایت کا مطلب ہی کچھ اور ہے۔ اور الحمد للہ یہ ثابت ہو گیا کہ حکم صرف سورہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھنے کا ہے اور جہاں ممانعت ہے، وہ سورہ فاتحہ کے علاوہ دوسری قرأت کی ہے..... پھر آگے چل کر کہا کہ: تمام صحابہ کا عمل سورہ فاتحہ اقتداء کی حالت میں پڑھنے کا تھا۔ (حدیث نماز: ۹۶)

راقم کہتا ہے کہ: اول تو مؤلف ”حدیث نماز“ نے جن صحابہ کا ذکر کیا، ان سب کا عمل نقل نہیں کیا بلکہ بعض کا صرف قول ہی نقل کیا ہے، جیسے حضرت عمرؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابن الزبیرؓ، کا فتویٰ نقل کیا ہے، اور ہم نے یہ بتا دیا تھا کہ ان حضرات سے اس کے خلاف قوی سندوں سے ثابت ہو چکا ہے، لہذا قوی کا اعتبار کیا جائے گا۔

دوسرے ان روایات سے وجوب ثابت نہیں ہوتا، بلکہ پڑھنے کا ثبوت ہوتا ہے، مگر یہ کہ یہ پڑھنا وجوب کے طور پر تھا یا استحباب کے طور پر؟ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا، بلکہ یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ وجوب کا کسی کا بھی قول نہیں۔

پھر جن راوی صحابہ سے احناف نے ترک فاتحہ خلف الامام اختیار کیا ہے، ان صحابہ کرام کا عمل بھی اسی کے مطابق ہے، جیسا کہ اپنے موقع پر ہم واضح کریں گے۔ لہذا مؤلف کا بے سوچے سمجھے یہ قاعدہ لکھ دینا کہ صحابی کا عمل اس کی روایت کے خلاف ہو تو وہ منسوخ ہوتا ہے، قصور فہم پر دلالت کرتا ہے۔

حدیث میں قرأت خلف الامام سے نہی آئی ہے

مؤلف ”حدیث نماز“ نے ایک عنوان قائم کیا کہ ”تمام صحابہ سورہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھنے کے قائل تھے“ اور اس کے بعد مولانا عبدالحی صاحب کی کتاب ”غیث الغمام“ سے نقل کیا ہے کہ: کسی روایت میں یہ نہیں آیا کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھو، یا اس کے مثل کوئی سورت، یا یہ کہ نبی کریم ﷺ نے قرأت فاتحہ خلف الامام کو منع کیا، ایسا ہرگز وارد نہیں، جیسا کہ جانب مقابل میں قرأت فاتحہ للمقتدی پر دلالت کرنے والی حدیث پائی جاتی ہے، جیسے ”لا تفعلوا إلا بفتح الکتاب“۔
(مخلص از حدیث نماز: ۹۸)

راقم کہتا ہے کہ: اولاً تو یہ بات بالکل اسی نہج کی ہے جو عوامی ذہنیت کی تراشیدہ ہوتی ہے، جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں کہیں یہ نہیں ہے کہ ڈاڑھی منڈانا حرام ہے لہذا یہ کام جائز ہے، مگر کیا اس شبہ کا کوئی درجہ ہے؟ اہل علم کے پاس اس کی کوئی حیثیت نہیں، اسی طرح یہ کہنا کہ ”کسی حدیث میں یہ نہیں آیا ہے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھو یا یہ کہ سورہ فاتحہ سے کسی حدیث میں منع نہیں کیا“ اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں، جبکہ متعدد احادیث میں مطلقاً امام کے پیچھے قرأت سے منع وارد ہے۔

چنانچہ ایک حدیث میں عبدالرحمن بن ثوبان حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”ما کان من صلاة یجهر فیہا الامام بالقراءة فلیس لأحد أن یقرأ معہ“ (جو نماز کہ امام اس میں جہر کرے، کسی کو اس میں قرأت کی اجازت نہیں)۔ (کتاب القراءة للبیہقی: ۱۴۴)

اس حدیث کو روایت کر کے امام بیہقی نے منکر کہا ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس کی کوئی مضبوط دلیل نہیں پیش کی کہ یہ کیوں منکر ہے؟ جبکہ اس کے تمام راوی ثقہ و قابل اعتبار ہیں، اور بظاہر کوئی علت اس میں نہیں ہے۔

اس میں جہری نمازوں میں پڑھنے کی ممانعت تو لی آئی ہے، اور قرأت عام ہے سورہ فاتحہ وغیر فاتحہ سب کو۔

دوسری روایت وہ ہے جس کو دارقطنی نے عمران بن حصین سے روایت کیا کہ: رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے، اور ایک آدمی آپ کے پیچھے پڑھ رہا تھا، جب آپ ﷺ فارغ ہوئے تو فرمایا کہ: کس نے مجھ سے میری سورت کے ساتھ منازعت (جھگڑا) کیا؟ اس کے بعد ”فنہام عن القراءۃ خلف الإمام“ (پھر آپ نے قرأت خلف الامام سے منع فرمادیا)۔ (دارقطنی: ۳۲۶/۱)

امام دارقطنی نے اس روایت کو ذکر کر کے اس کے ایک راوی حجاج بن ارطاة کو ”فنہام عن القراءۃ خلف الإمام“ کی زیادتی میں متفرد قرار دیا ہے اور حجاج کو ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔

مگر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے اس پر تعقب فرمایا اور عجلی، ثوری، شعبہ وغیرہ سے ان کی توثیق نقل فرمائی، اور یہ نقل کیا کہ ان پر انکار صرف ارسال و تدلیس کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ (بذل: ۵۹/۲)

اس پر علامہ مہدی حسن صاحب نے لکھا کہ میں کہتا ہوں کہ: ہمارے یہاں تدلیس کوئی جرح نہیں اور امام ترمذی سے ان کی روایت کی تحسین نقل فرمائی، پھر ”تنسیق النظام“ سے نقل کیا کہ: اگر اس زیادتی کو غیر محفوظ بھی مانا جائے تو بھی نہیں کے معنی آپ ﷺ کے قول کہ ”مجھ سے منازعت کیا“ سے بطریق اشارہ سمجھ میں آتے ہیں۔ لہذا اس حدیث سے نبی عن القراءۃ خلف الامام ثابت ہوئی۔ (فلائد الازہار: ۲۳/۲)

راقم کہتا ہے کہ: لہذا مدعا اس سے ہمارا ثابت ہے کہ سری و جہری میں فاتحہ

وغیر فاتحہ کی قرأت مطلقاً ممنوع ہے، حاصل یہ کہ خاص سورہ فاتحہ کے بارے میں نہ سہی مطلق قرأت سے نہی ثابت ہے، جس میں سورہ فاتحہ سے نہی بھی ثابت ہو جاتی ہے، لہذا یہ کہنا کہ اس کے بارے میں نہی نہیں آئی صحیح نہیں ہے۔ (فللہ الحمد)

دوسرے یہ کہ مولانا عبدالحی صاحب کا مطلب اس عبارت سے صرف یہ بتانا ہے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کا پڑھنا ممنوع نہیں ہے، بلکہ جائز ہے؛ کیونکہ صریح طور پر اس سے نہی نہیں آئی ہے، اور یہ بات ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ احناف کے نزدیک بھی اس شرط کے ساتھ قرأت خلف الامام جائز ہے کہ امام جہر نہ کر رہا ہو یا اس وقت جبکہ محل استماع نہ ہو، لہذا مولانا مرحوم بھی یہی بتانا چاہتے ہیں، مگر اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے مؤلف ”حدیث نماز“ کو کیا نفع ہوا؟ جبکہ وہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کو واجب کہتے ہیں۔ کیا واجب اور جائز دونوں کا ایک مطلب و مفہوم ہوتا ہے؟

ایک لطیفہ

یہاں یہ لطیفہ بھی قابل توجہ ہے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے یہاں عنوان تو باندھا ہے کہ ”تمام صحابہ سورہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھنے کے قائل تھے“ اور اس کے تحت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کے حوالے سے یہ بیان کیا کہ سورہ فاتحہ سے نہی وارد نہیں ہوئی۔ کیا عجیب معنون و عنوان کا جوڑ اور ترجمہ باب و دلیل میں کیا خوب مناسبت ہے؟ (فللہ در المؤلف)

علامہ ابن الہمام کا حوالہ یاد دھوکہ

مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”عین الہدایۃ“ کے حوالہ سے ذکر کیا کہ امام ابن الہمام نے (حضرت عبادہ کی) ”ثقلت القراءة“ والی حدیث کے روای کو ثقہ بتا کر

کہا ہے کہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جہری نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھے۔
(عین الہدایہ: ۴۲۹/۱)

مگر یہ صریح دھوکہ دہی ہے؛ کیونکہ ”عین الہدایہ“ میں علامہ ابن الہمام سے صرف محمد بن اسحاق کی توثیق نقل کی ہے، آگے کا جملہ کہ ”اس سے معلوم ہوا کہ فاتحہ پڑھی جائے“، یہ قول ابن الہمام کا نہیں۔

اس کے بعد ملاحظہ فرمائیے کہ مؤلف نے اتنی عبارت تو نقل کر دی مگر اس کے بعد کا جملہ نقل نہیں کیا اور صاف خداع کا معاملہ کیا۔ ”عین الہدایہ“ میں مذکورہ جملہ کے بعد لکھا ہے کہ ”یہ تو امام شافعیؒ کا استدلال تھا اور اس استدلال میں بہت کچھ کلام باقی ہے، جو عنقریب مذکور ہوگا“۔

اس سے معلوم ہوا کہ اوپر کی عبارت سے وہ کوئی اپنا نظریہ بیان نہیں کر رہے ہیں بلکہ امام شافعیؒ کے استدلال کا طریق و تقریر بیان کر رہے ہیں اور اس سے راضی نہیں، چنانچہ اس کے بعد اس استدلال کا خوب رد کیا ہے۔ (دیکھو: عین الہدایہ: ۴۳۳-۴۳۴)

اس سے اندازہ کیجئے کہ مؤلف ”حدیث نماز“، نقل و روایت میں کس قدر علمی امانت داری کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں؟

التفات

مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”عین الہدایہ“ سے جو عبارت نقل کی ہے، اس عبارت کے دو سطر بعد یہ بھی قابل ملاحظہ ہے کہ:

”ہمارے زمانے میں بعض جہال جن کو جہل مرکب یہ سمایا ہے کہ ان کو اجتہادی قوت ہے، میں نے ایک مغرور کو دیکھا کہ اس نے اپنی کتاب میں وجوب فاتحہ کے

یہ دلائل جو امام شافعیؒ کے استدلال میں گزر رہے ہیں، نقل کرنے کے بعد لکھا کہ پھر جو رکوع میں ملنے سے رکعت مل جانے کا مسئلہ جمہور کا قول ہے، یہ ضعیف ہے۔ اس کے بعد مسلم کی حدیث نقل کی کہ جس کو رکوع مل گیا اس کو رکعت مل گئی۔ (عین الہدایۃ: ۴۲۹)

یہ ہمارے مؤلف کے بارے میں بالکل فٹ اور ان کے بالکل مطابق ہے، انہوں نے بھی ادراک رکوع سے ادراک رکعت کے دلائل کو ضعیف کہا تھا، ہم نے اس پر مفصل رد اوپر کر دیا ہے، مگر مؤلف کو یہ تمام چیزیں پڑھ کر بھی کوئی باک نہیں ہوتا اور روایات صحیحہ کا خود ہی انکار و تضعیف کرتے ہیں اور خود ہی احناف کو الزام دیتے ہیں۔ (فیاللعجب!)

علامہ عبدالحی کی عبارت کا مطلب

مؤلف ”حدیث نماز“ نے عنوان قائم کیا ہے: ”سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کے تمام دلائل کا درجہ“ اس کے بعد مولانا عبدالحیؒ سے بحوالہ ”حاشیہ مؤطا امام محمد“ یہ عبارت نقل کی جس کا ترجمہ یہ ہے: ”کسی بھی مرفوع صحیح حدیث میں قرأت فاتحہ خلف الامام سے نہی وارد نہیں ہوئی، جو کچھ (تاریکین قرأت) مرفوعاً بیان کرتے ہیں، یہ یا تو بے اصل ہے یا صحیح نہیں ہے۔ (حدیث نماز: ۹۸)

راقم کہتا ہے کہ: یہاں کئی مناقشات ہیں: ایک تو یہ کہ مؤلف کا دعوے تو ہے عام اور دلیل میں جو عبارت پیش کی ہے وہ صرف یہ بتا رہی ہے کہ کسی مرفوع صحیح حدیث میں قرأت خلف الامام سے منع نہیں کیا گیا ہے۔ اس سے اس سلسلہ کے تمام

دلائل کا درجہ کہاں سے اور کس منطق سے معلوم ہو گیا؟ دوسرے یہ کہ علامہ لکھنویؒ کا یہ بیان کہ ”کسی صحیح مرفوع حدیث میں نہیں وارد نہیں“ یہ صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ اس بارے میں قابل اعتبار احادیث وارد ہوئی ہیں، جیسا کہ ہم نے اوپر ثابت کیا ہے، لہذا اگر مولانا لکھنویؒ کو ان روایات کی تحقیق نہیں ہوئی، تو اس سے لازم نہیں آتا کہ دوسرے علماء کو بھی اس کی تحقیق نہ ہو۔

تیسرے یہ کہ علامہ لکھنویؒ کی اس عبارت میں یہ بھی دیکھنا چاہئے تھا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، بلا سوچے سمجھے اس کو نقل کر دینا بھی قابل حیرت و تعجب ہے!! اہل بیان کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ کلام میں اگر کوئی قید مذکور ہو تو مقصود کلام وہی قید ہوتی ہے، اور یہاں مولانا عبدالحیؒ نے جس قسم کی حدیث کی نفی کی ہے اس کے ساتھ دو قیدیں لگائی ہیں: ایک مرفوع ہونے کی، دوسرے صحیح ہونے کی۔ اور علامہ کی مراد یہ ہے کہ کسی ایسی حدیث میں قرأت فاتحہ خلف الامام سے منع وارد نہیں ہوا جو مرفوع بھی ہو اور صحیح بھی ہو۔ رہا روایات موقوفہ میں نہیں وارد ہونا یا حسن احادیث میں وارد ہونا تو اس کی نفی آپ نہیں کر رہے ہیں، اور یہ بات معلوم ہے کہ کسی روایت کو غیر صحیح کہنے سے حسن نہ ہونا لازم نہیں آتا۔ لہذا علامہ کا مقصد یہ ہے کہ صحیح مرفوع حدیث میں نہیں آئی ہے، ہاں حسن میں ہو سکتی ہے، اور ہم ثابت کر چکے ہیں کہ قابل اعتبار روایات میں نہیں آئی ہے۔

جھوٹا اور غلط حوالہ

مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”نور الہدایہ ترجمہ شرح وقایہ“ سے نقل کیا ہے کہ: امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کی احادیث ضعیف ہیں۔ (حدیث نماز: ۹۸) راقم کہتا ہے کہ یہ مؤلف کا دھوکہ اور تلبیس ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ

”نور الہدایہ“ میں دارقطنی وغیرہ سے دلائل احناف کی تضعیف نقل کر کے، اس کے مفصل جوابات دیے گئے ہیں۔ مؤلف ”حدیث نماز“ کو کم از کم ذرا تو خدا کا خوف ہونا چاہئے کہ ہمیں ایک دن خدا کے سامنے کھڑے ہو کر جوابدہی کرنی ہے، ہر جگہ اس طرح کا دھوکہ دینا اور عوام کو فتنہ میں ڈالنا کیا ایک نیک مسلمان جائز رکھ سکتا ہے؟ کیا علماء کی جانب غلط بات کی نسبت کرنا روا اور درست ہے؟ کیا اہل حدیث ہونے کا یہی نتیجہ و ثمرہ ہے؟ مؤلف صاحب غور کر لیں اور اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ کیا یہ ان کا کام حق پرستی اور خدا ترسی کے تحت ہوا ہے؟ یا نفس پرستی اور خدا فراموشی کے تحت؟

إذا صح الحديث فهو مذهبي

اس کے بعد امام الائمہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کا مشہور مقولہ نقل کیا کہ ”جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے“، اس کے بعد لکھا کہ الحمد للہ یہ ثابت ہو گیا کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کی حدیث نہ صرف مرفوع متصل اور صحیح ہے، بلکہ صحیح کی اونچی قسم متواتر ہے، پھر ”غایۃ الاوطار“ سے نقل کیا کہ حدیث متواتر کا منکر کافر ہے۔ (حدیث نماز: ۹۹)

میں کہتا ہوں کہ: ہاں ”إذا صح الحديث فهو مذهبي“ بے شک امام صاحب کا مقولہ ہے، اسی لئے آپ نے ”إذا قرأ فأنصتوا“ والی حدیث صحیح کو اپنا مذہب بنایا، اور ”من كان له إمام فقراءه الإمام له قراءه“ والی حدیث کو اپنا مذہب بنایا اور ”لا صلوة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب فصاعداً“ کو اپنا مذہب بنایا کہ غیر مقتدی (منفرو امام) کے لیے سورہ فاتحہ اور دوسری سورت کو واجب قرار دیا؛ کیوں کہ ”إلا أن يكون وراء الإمام“ بھی موقوفاً و مرفوعاً صحیح ثابت ہوا ہے،

لہذا اس استثناء کو بھی اپنا مذہب بنایا اور احناف نے بھی ”لاصلوۃ“ والی حدیث کو مان کر اس کو تسلیم کر کے اس کے مطابق عمل کیا کہ منفرد و امام پر سورۃ فاتحہ و دیگر سورت کو واجب کہا اور عمل کیا، نہ کہ انکار کیا۔ ہاں مقتدی پر سورۃ فاتحہ کو واجب کہنے والوں نے ان تمام احادیث کو ترک کر دیا۔ اب فرمائیے کہ تارک حدیث کون ہے؟

کیا یہ حدیث متواتر ہے؟

یہاں مؤلف ”حدیث نماز“ نے دعویٰ کیا ہے کہ حدیث : ”لاصلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الكتاب“ متواتر ہے، مگر اس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حدیث خبر واحد ہے، نہ کہ متواتر، ہاں امام بخاری نے اس کو متواتر قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف دعویٰ سے کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی، دلیل لائی جائے۔ اس کے علاوہ اس حدیث کا انکار ہی کون کرتا ہے؟ انکار کرنے والوں کو پوچھا جائے کہ تم نے کفر کیوں کیا۔ احناف کے بارے میں مؤلف کا یہ نقل کرنا، مؤلف کے غایت تعصب کی دلیل ہے؛ کیونکہ احناف اس حدیث کا انکار و رد نہیں کرتے بلکہ اس کو دل و جان سے مانتے ہیں اور اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ امام و منفرد کے لئے سورۃ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔ اور صرف احناف نہیں بلکہ صحابہ میں حضرت جابر اور ائمہ میں امام احمد بن حنبل بھی یہی فرماتے ہیں۔ اس کا نام انکار کو کسی زبان میں ہے؟

محدث سبزمونی کی روایت

مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا ہے کہ سبزمونی ایک جھوٹا اور مجروح شخص تھا، اس نے بیان کیا کہ اسی (۸۰) صحابہ امام کے پیچھے قرأت سے منع کرتے تھے، پھر مؤلف نے علامہ عبدالحی صاحب سے بحوالہ ”امام الکلام“ نقل کیا ہے کہ یہ بات

بے سند ہے، اس کا راوی سبذ مونی محدثین کے نزدیک مجروح ہے اور پھر ان صحابہ میں سے بہت سوں سے اس کے خلاف ثابت ہے۔ اس کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا ہے کہ: حضرت عطاء کہتے ہیں کہ: صحابہ کرام سری و جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے۔ بولے ان دونوں (سبذ مونی و حضرت عطاء) میں سے صحابہ کرام کے بارے میں کس کی بات قبول کی جائے گی۔ (حدیث نماز: ۹۹-۱۰۰)

راقم کہتا ہے کہ: ہم کسی خاص عدد کو بیان کیے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے صحابہ منع کرتے تھے، ان میں سے دس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اور موسیٰ ابن عقبہ کے مرسل میں اوپر ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کا ذکر آچکا ہے۔ لہذا اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ و سعد بن ابی وقاصؓ سے منع گزر چکا ہے، اور حضرت زید بن ثابتؓ سے منع وارد ہے۔ (قلاند الازہار: ۲/۳۸)

اور ”مصنف ابن ابی شیبہ“ میں محمد بن سیرینؒ سے مروی ہے کہ فرمایا کہ: ”لا أعلم القراءة خلف الإمام من السنة“ (میں قرأت خلف الامام کو سنت میں سے نہیں جانتا)، علامہ نیوی نے فرمایا کہ: اس کی اسناد صحیح ہے۔ (ابن ابی شیبہ: ۳۳۱/۱، والتعلیق الحسن: ۹۰/۱)

غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر تمام صحابہ قرأت خلف الامام کے قائل تھے اور پڑھتے تھے، جیسا کہ مؤلف نے حضرت عطاء کے قول کا مطلب سمجھا ہے، تو کیا ابن سیرینؒ جو علوم صحابہ کے ماہر و عالم تھے، اس کی سنیت کا انکار کرتے؟ اور محمد ابن سیرینؒ کوئی معمولی درجہ کے آدمی نہیں تھے، بلکہ حضرت سعید بن جبیرؒ سے زیادہ فقیہ و عالم تھے، یہ کہتے ہیں کہ قرأت خلف الامام سنت نہیں۔

اب دونوں باتوں میں تقابل کیجئے اور غور کیجئے کہ کیا اگر تمام صحابہ کا یہ عمل ہوتا اور پھر مؤلف کے دعویٰ کے مطابق وجوب کا ہوتا، تو محمد بن سیرین کا یہ کہنا ممکن تھا؟ معلوم ہوا کہ حضرت عطاء نے جو فرمایا اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ حضرات قرأت خلف الامام کو جائز رکھتے تھے، واجب یا سنت نہیں۔ اسی کو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ صحابہ قرأت خلف الامام میں حرج خیال نہیں فرماتے تھے، یعنی جائز سمجھتے تھے۔ اب دیکھئے کہ کس کا قول روایت و درایت کے موافق ہے۔

ہماری مراد یہ نہیں کہ کوئی بھی صحابی قرأت خلف الامام نہیں کرتے تھے، یا مستحب بھی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ مراد یہ ہے کہ تمام صحابہ اس کے قائل نہیں تھے، ہاں بعض صحابہ پڑھتے بھی تھے اور بعض مستحب جانتے بھی تھے، مگر وجوب کے قائل کے دے تھے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر ”فصل الخطاب“ سے نقل کیا تھا۔

حاصل یہ کہ صحابہ میں بے شمار ایسے بھی تھے جو نہیں پڑھتے تھے، البتہ منع کرنے والے کہ پڑھنے کو مکروہ خیال کرتے ہوں، یہ ان سے کم تھے، جیسا کہ بعض کا ذکر اوپر گزرا، ہاں جواز کے قائل زیادہ تھے، اسی کو حضرت عطاء نے بیان فرمایا ہے۔

قرأت خلف الامام سے فسادِ صلوة؟

مؤلف ”حدیث نماز“ نے مولانا عبداللحی لکھنوی کی کتاب ”امام الکلام“ سے نقل کیا ہے کہ: بعض لوگ قرأت خلف الامام سے فسادِ نماز کو صحابہ سے نقل کرتے ہیں، مگر یہ روایات غیر مستند ہیں۔ (حدیث نماز: ۱۰۰-۱۰۱)

راقم کہتا ہے کہ: یہ صحیح ہے کہ صحابہ سے یہ ثابت نہیں، مگر بعض ائمہ سے اس قسم کی روایات منقول ہیں، اگرچہ مختار نہ ہوں، جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے ”فتاویٰ“ میں

ذکر کیا ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۳۰/۲۶۶)

بہر حال یہ بات ممکن ہے کہ کوئی صحابی امام کے پیچھے قرأت کرنے سے فساد نماز کے قائل ہوں، مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اسی لیے مولانا عبدالحی صاحب نے اس کا رد فرمایا ہے، اور احناف بھی یہی کہتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، بلکہ پڑھنا جائز ہے۔

احناف کے دلائل

یہاں تک مؤلف کے ذکر کردہ دلائل و عبارات کا مفصل و مدلل جائزہ لیا گیا ہے، اور اب یہاں ہم احناف کے دلائل اور مذہب احناف کا پورا نظریہ پیش کریں گے، (انشاء اللہ العزیز) مگر صرف ان ہی دلائل کو پیش کریں گے جن سے مؤلف نے تعرض کیا ہے؛ کیونکہ اس مختصر سے رسالہ میں احاطہ دلائل کی گنجائش نہیں ہے۔

پہلی دلیل: آیت شریفہ

قرآن پاک میں ہے کہ

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾

[الاعراف: ۲۰۴]

(جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو (کان لگا کر) سنو اور خاموش رہو؛ تاکہ تم

پر رحم کیا جائے)

اس آیت کے بارے میں مختلف اقوال ہیں کہ اس کا شان نزول کیا ہے؟ بعض نے خطبہ جمعہ کے بارے میں نازل ہونے کا دعویٰ کیا، اور بعض نے کچھ اور کہا، مگر اکثر سلف سے منقول یہ ہے کہ یہ آیت امام کے پیچھے قرأت کے سلسلہ میں

نازل ہوئی، اور یہی قول صحیح ہے۔

امام بغوی نے اس سلسلہ کے اقوال نقل کر کے لکھا ہے کہ: ”والأول أولها وهو أنها في القراءة في الصلاة ؛ لأن الآية مكية والجمعة وجبت بالمدينة ، واتفقوا على أنه مأمور به بالإنصات حالة ما يخطب الإمام“ (ان اقوال میں سے پہلا قول سب سے بہتر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ آیت نماز میں قرأت کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے؛ کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور نماز جمعہ مدینہ میں فرض ہوئی ہے، ہاں علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام کے خطبہ دینے کی حالت میں خاموش رہنے کا حکم ہے) (معالم التنزيل: ۳۱۸/۱)

اور امام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ:

”وقول الجمهور هو الصحيح، فإن الله سبحانه وتعالى قال: وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا لعلكم ترحمون ، قال أحمد: أجمع الناس على أنها نزلت في الصلاة“۔ (اور اس بارے میں جمہور کا قول ہی صحیح ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ: ”جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور خاموش رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے،“ امام احمد نے کہا کہ لوگوں یعنی صحابہ نے اجماع کیا ہے اس پر کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی) (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۴۱۲/۲)

اور علامہ عبدالحی لکھنوی اپنی کتاب ”امام الکلام“ میں اس سلسلہ کے متعدد اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

”اب یہ بات خوب ظاہر ہوگئی کہ آیت شریفہ کی راجح تفسیر اور اس کا راجح شان نزول دوسرا قول ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ آیت قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی، اور اسی قول کو بچھد وجوہ ترجیح ہے: اول یہ کہ آثار و اخبار اس قول کے

معارض نہیں ہیں، اور اہل علم کے نزدیک اس میں کوئی خدشہ اور مناقضہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ قول بغیر معارضات کے ائمہ ثقات سے منقول ہے۔ تیسرے یہ کہ جمہور صحابہ کا یہی قول ہے، حتیٰ کہ بعض نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے، جیسا کہ بیہقی نے امام احمد سے روایت کی تخریج کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ: لوگوں نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی، اور ابن عبدالبر نے ”الاستذکار“ میں فرمایا کہ: یہ (آیت) اہل علم کے نزدیک قرآن کے نماز میں سننے کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور علماء نے اس میں اختلاف نہیں کیا کہ یہ اسی بارے میں نازل ہوئی نہ کہ دوسرے میں۔ پس معلوم ہوا کہ حنفیہ کے استدلال کو رد کرنے کے لیے اس آیت کو خطبہ کے بارے میں نازل ماننا یا اسی طرح دوسرے اقوال کو اختیار کرنا بالکل انصاف سے بعید ہے اور باوجود اس کو جاننے کے جو ہم نے ثابت کیا، دوسرے اقوال کا قائل ہونا ظلم و اعتساف سے خالی نہیں۔ (امام الکلام: ۱۰۱)

اس بیان سے چند باتیں مستفاد ہوئیں:

- (۱) آیت کے بارے میں اگرچہ بعض کا اختلاف ہے، مگر راجح قول یہ ہے کہ آیت قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی۔
- (۲) اسی پر صحابہ کرام کا اتفاق ہے، اسی طرح علماء کا اور جو اس سے اختلاف کرتے ہیں ان کا یہ قول لائق التفات نہیں۔
- (۳) دوسرے اقوال کو اختیار کرنا جادۃ انصاف سے بعید ہے۔

احناف کا طریق استدلال

اس آیت شریفہ میں دو چیزوں کا حکم دیا گیا ہے، استماع اور انصات، استماع

(سننا) یہ جہری نمازوں کے ساتھ خاص ہے؛ کیونکہ سننا اسی وقت ہوگا جب کہ کوئی شئی مسموع بھی ہو، اور انصات (خاموشی) یہ عام ہے، اور اس لئے جہری و سری دونوں نمازوں میں ہو سکتا ہے؛ کیونکہ انصات کے معنی خاموش رہنے کے ہیں، چنانچہ ”قاموس“ میں ہے: ”نصت ینصت وأنصت وانتصت: سکت“۔
(القاموس المحیط: ۹۸/۱)

اس سے معلوم ہوا کہ انصات کے معنی خاموش رہنے کے ہیں، البتہ ”أنصت لہ“ کے دو معنی ہیں، جیسا کہ قاموس ہی میں ہے: ایک ”سکت لہ“ (یعنی خاموش رہا) دوسرے: ”استمع لحدیثہ“ (یعنی اس کی بات کی طرف کان لگایا) مگر چونکہ آیت میں پہلے استماع کا ذکر ہو گیا، تو اب انصات کے معنی سکوت کے متعین ہو گئے، اگر یہاں بھی استماع ہی مراد لیں، تو تکرار ہوگا، اور تکرار سے تائیس اولی ہے، لہذا یہاں انصات کے معنی سکوت کے ہونا چاہئے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ مقتدی کو سری و جہری دونوں نمازوں میں خاموشی کا حکم ہے اور جہری میں خاموشی کے ساتھ ساتھ کان لگا کر قرأت سننے کا بھی امر ہے۔ (مزید اس کی تفصیل اعلیٰ السنن: ۴/۲۷۷ میں دیکھی جائے)

امام بیہقی کے اعتراض کا جواب

اس موقع پر امام بیہقی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ: اس آیت میں سکوت کا حکم تو ہے، مگر یہ باتیں کرنے سے سکوت کا حکم ہے کہ صحابہ پہلے نماز میں بات کرتے تھے اور دوسرے یہ کہ یہ سکوت کا حکم جہر بالقرأت سے ہے، نہ کہ قرأت سے۔ (کتاب القراءۃ: ۷۸)

راقم کہتا ہے کہ: جی ہاں بات کرنے سے بھی سکوت کا حکم آیا ہے، مگر اس سے

یہ کہاں لازم آیا کہ قرأت سے سکوت کا حکم نہیں؟ ایک آیت کے متعدد شان نزول ہو سکتے ہیں، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ”الفوز الکبیر“ میں تصریح کی ہے، اسی طرح علامہ سیوطی نے ”لباب التزیل“ کے مقدمہ میں اور ”اتقان“ میں تصریح کی ہے۔

بہر حال اس سے انکار کرنا کہ یہ آیت قرأت خلف الامام کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے، بقول علامہ عبدالحی صاحب کے بعد از انصاف و سراسر انتصاف ہے۔ اور اس انصاف کو انصاف عن الجہر پر محمول کرنا تو عجیب ہی نہیں بلکہ حیرت انگیز بھی ہے؛ کیونکہ انصاف مطلقاً خاموش رہنے کو کہتے ہیں، اس میں بالکل ہی پڑھا نہیں جاتا، ورنہ وہ انصاف نہیں۔

رہا امام بیہتی کا آہستہ قرأت کو سکوت قرار دینا اور انصاف کے اس کے منافی نہ ہونے پر ”بخاری“ کی ایک روایت سے استدلال کرنا تو یہ بھی خالی از بحث و نظر نہیں، تفصیل اس کی یہ ہے کہ بخاری کے ”باب ما یقرأ بعد التکبیر“ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ تکبیر اور قرأت کے درمیان سکوت فرماتے تھے، ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ: میں نے پوچھا کہ یہ سکوت کیا ہے؟ تو فرمایا: میں ”اللہم باعد بینی“ والی دعاء پڑھتا ہوں، اس سے امام بیہتی نے سمجھا کہ سکوت اور سری قرأت میں منافات نہیں۔ مگر یہ استدلال غلط ہے، علامہ کشمیری نے فرمایا کہ: یہاں سکوت کا اطلاق قرأت سری پر نہیں ہوا ہے، جیسا کہ امام بیہتی نے سمجھا، بلکہ مراد سکوت سے سکوت عن التکبیر ہے (کہ آپ تکبیر پڑھ کر خاموش ہوئے) تو یہ ماقبل سے متعلق ہے نہ کہ مابعد سے (فیض الباری: ۲/۲۶۸)

میں کہتا ہوں کہ: اگر ایسی ہی بات ہے جیسا کہ امام بیہتی نے کہا ہے، تو پھر سکوت تو ”تکلم بالجہر“ پر بھی بولا جاسکتا ہے، چنانچہ بولتے ہیں ”سَكَّتَ عَلَیْهِ“

(یعنی اس پر رد نہیں کیا)، اگر کوئی کسی کی توثیق و تصدیق کرے تو بھی بولتے ہیں: ”سکت علیہ“ تو کیا اس پر بھی سکوت کا اطلاق ہوگا؟ اگر ہوگا تو پھر جہر و سر تو کوئی چیز ہی نہیں رہے گی۔

معلوم ہوا کہ ”سکت علیہ“ کے معنی یہ ہیں کہ رد کرنے سے خاموش رہا، اگرچہ دوسرا کلام کیا ہو، اسی طرح مذکورہ حدیث میں قرأتِ سری پر سکوت کا اطلاق نہیں، بلکہ تکبیر سے فارغ ہونے کو سکوت کہا گیا ہے۔ (فافہم و تدبیر)

الغرض یہ آیت کریمہ مذہبِ احناف پر صاف و صریح ہے کہ سری و جہری میں قرأت نہ کی جائے، بلکہ خاموش کھڑا رہے اور سنا کرے۔

امام بخاریؒ کے اعتراضات

امام بخاری نے ”جزء القراءۃ“ میں احناف پر اس سلسلہ میں اعتراضات کی بھرمار کی ہے، اور اس آیت سے حکم انصاف اخذ کر کے قرأت سے منع کرنے پر احناف پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر کوئی تکبیر تحریمہ کے بعد قرأت کے وقت آئے تو احناف اس کو ثناء پڑھنے کی اور خود تکبیر تحریمہ کہنے کی اجازت دیتے ہیں، نیز فجر میں جماعت کی اقامت کے بعد فجر کی سنتیں پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ (جزء القراءۃ:)

ان کے مفصل جوابات علماء احناف نے دئے ہیں، مختصر یہ کہ تکبیر تحریمہ ہمارے یہاں شرط نماز ہے اور شرط شیء سے خارج ہوتی ہے، لہذا یہ نماز میں داخل ہی نہیں، لہذا تکبیر کے وقت حکم انصاف و استماع ابھی متوجہ ہوا ہی نہیں، اس لئے حنفیہ تکبیر تحریمہ کے وقت تکبیر کہنے کی اجازت دیتے ہیں، یہ حکم خاموشی و سننے کا نماز میں داخل ہونے کے بعد کا ہے، خارج نماز استماع و انصاف اگرچہ واجب، جیسا کہ مشہور قول

حنفیہ ہے، مگر اسکو اتنا عام رکھنا کہ تکبیر تحریمہ کے لئے بھی اجازت نہ دی جائے، یہ حکم ہے، پھر یہ محقق قول بھی نہیں ہے، حضرت اشرف علی تھانویؒ نے اس قول مشہور پر رد فرمایا ہے، اور محقق قول یہ ذکر کیا ہے کہ خارج نماز قرأت کا سننا اور خاموشی واجب نہیں ہے۔ (بیان القرآن: ۴/۳۲۳)

اور ثناء کا اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا؛ کیونکہ احناف امام کی قرأت سے پہلے ثنا پڑھنے کا حکم کرتے ہیں، نہ کہ قرأت کے وقت اور جو بعد میں آئے اسکو بھی یہی حکم ہے کہ نہ پڑھے۔ اور سنت فجر کا اعتراض بھی غلط ہے؛ کیونکہ احناف خود یہ کہتے ہیں کہ سنت فجر مسجد میں نہ ہو، بلکہ باہر ہو، یا مسجد کے دروازے کے پاس ہو، پھر اعتراض کیا ہے؟ نیز یہ داخل نماز بھی نہیں، اور استماع و انصات کا حکم داخل فی الصلوٰۃ کو ہے۔

جماعت مدینہ میں یا مکہ میں

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس آیت کو لکھنے کے بعد لکھا کہ:

”یہ آیت نماز باجماعت فرض ہونے سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی

، اور نماز باجماعت مدینہ میں فرض ہوئی، اور کسی چیز کے فرض ہونے سے

پہلے اس کے مسائل بیان کرنا امر محال ہے۔“ (حدیث نماز: ۱۰۱)

میں کہتا ہوں کہ: مؤلف نے جو کہا کہ جماعت کی فرضیت مدینہ میں ہوئی ہے محض خام خیالی اور وہم ہے، جماعت سے نماز پڑھنے کا مشروع ہونا اول نبوت ہی سے تھا، چنانچہ:

(۱) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے، جس میں نبی کریم ﷺ کے ایک سفر کا

قصہ بیان ہوا ہے، جس میں جنات کا آپ کی قرأت سننا مذکور ہے، اسی روایت میں

یہ الفاظ ہیں: ”وہو یصلی بأصحابہ صلاة الفجر“ کہ آپ اپنے اصحاب کو

نماز فجر پڑھا رہے تھے۔ (بخاری: ۷۳۴۲، مسلم: ۱۸۴۱)

یہ واقعہ مکہ کا ہے، علامہ نوویؒ اسی حدیث کے تحت فرماتے ہیں: کہ حدیث ابن عباس اول امر نبوت کی ہے، جب کہ جن آئے اور ”قُلْ أَوْحَىٰ إِلَيَّ“ کی قرأت سنی۔ (شرح مسلم: ۱۸۴۱)

اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ”فتح الملہم“ میں نقل کیا ہے کہ: مورخ ابن سعدؒ نے اس واقعہ کو نبوت کے دسویں سال کا قرار دیا ہے، اور اس صورت میں بھی اس کا مکہ ہی میں ہونا ظاہر ہے۔ پھر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ابن سعد کے قول پر قیل و قال نقل کر کے بحوالہ ابن حجر لکھا ہے کہ آثار و اخبار اسی کو بتاتے ہیں کہ یہ واقعہ اول بعثت کا ہے اور یہی معتمد ہے، پس یہ جنات کا قصہ اول بعثت کا ہے۔ (فتح الملہم: ۷۳۲)

علامہ نوویؒ اسی حدیث کے تحت فوائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: اس سے اثبات ہوا کہ جماعت کی نماز سفر میں مشروع ہے اور یہ کہ یہ اول نبوت سے ہی مشروع ہے۔ (شرح مسلم: ۱۸۴۱)

(۲) مسلم نے ابو مسعود سے اور ترمذی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ: حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور آپ نے حضور اقدس ﷺ کو نماز پڑھائی، ”ترمذی“ میں ”عند البیت“ (یعنی بیت اللہ کے پاس) کے الفاظ بھی ہیں۔ (مسلم: ۱۲۱/۱، ۲۲۲/۱، ترمذی: ۲۱/۱)

اور عبدالرزاق کی روایت میں یہ بھی ہے کہ جبرئیلؑ نے نماز پڑھائی، رسول ﷺ نے پڑھی اور محمد بن اسحاق نے ”کتاب المغازی“ میں لکھا ہے کہ امامت کا واقعہ اسی صبح کا ہے، جس کی رات میں نماز فرض کی گئی اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔ (فتح الملہم: ۱۸۹/۲)

ظاہر ہے کہ یہ امامتِ جبرئیل جو بیت اللہ کے پاس ہوئی، مکہ ہی میں تو ہے، پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ معراج کا واقعہ مکہ ہی میں پیش آیا، اس سے صاف معلوم ہوا کہ جماعت کی نماز مکہ میں مشروع ہوئی ہے۔

(۳) مکہ میں مشروعیتِ جماعت کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَن سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ﴾ [القلم: ۲۹] (جس دن حق تعالیٰ شانہ ساق کی تجلی فرمائیں گے (جو ایک خاص قسم کی تجلی ہوگی) اور لوگ اسی دن سجدہ کے لئے بلائے جائیں گے، تو یہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے، انکی آنکھیں شرم کے مارے جھکی ہوئی ہوں گی اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، اس لئے کہ یہ لوگ دنیا میں سجدہ کی طرف بلائے جاتے تھے جبکہ صحیح سالم تندرست تھے (پھر بھی سجدہ نہیں کرتے تھے)۔

اس آیت کی منجملہ تفاسیر کے ایک تفسیر ابن مردویہ نے حضرت کعب احبار سے نقل کی ہے، وہ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ: یہ آیت فرض نمازوں کو جماعت سے ایسی جگہ پڑھنے کے بارے میں نازل ہوئی، جہاں اذان ہوتی ہو (یعنی جماعت کی نماز مراد ہے) اور یہ آیت سورہ قلم کی ہے جو مکی ہے، تو اگر مکہ میں جماعت کا حکم نہ ہوا ہوتا تو اس وقت اس کے نہ کرنے پر وعید کیوں نازل ہوتی؟

اور امام رازی نے اس آیت کی تفسیر یہی کی ہے کہ جو لوگ جماعت کی نماز میں شرکت نہ کرتے تھے، ان کو قیامت میں سجدہ کی استطاعت نہ ہوگی، اور وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جماعت میں نہ آنے والے پر وعید بیان کی گئی ہے۔ (تفسیر کبیر: ۸۵/۳۰)

اور حضرت امام ثناء اللہ پانی پٹیؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

”فالذین لا يستطيعون السجود هم المؤمنون الذین لم یکنوا
مصلین أصلاً أو لم یکنوا مصلین بجماعة الا اتقاء كأهل الأهواء من
الروافض و غیرهم أو كانوا یسجدون رياء للناس من غیر إخلاص فی
العمل“ (پس ان لوگوں سے مراد جو سجدہ نہ کر سکیں گے یا تو وہ مومن ہیں جو بالکل ہی
نماز نہیں پڑھتے تھے یا وہ مومن مراد ہیں جو جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے تھے مگر
صرف ڈر کر، جیسے روافض وغیرہ میں سے ہوا پرست لوگ، یا وہ مومن مراد ہیں
جو دکھاوے کے لئے بغیر اخلاص کے نماز پڑھتے تھے) (التفسیر المظہری: ۴۲/۱۰)
الغرض نماز باجماعت کی مشروعیت مکہ ہی میں ہو گئی تھی اور پڑھی بھی جاتی تھی،
البتہ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے پہلے چھپ کر گھروں میں یا کسی اور مقام پر
صحابہ نماز پڑھتے تھے، جب حضرت عمرؓ ایمان لائے تو پھر بیت اللہ میں باقاعدہ نماز
ہونے لگی، جیسا کہ یہ بات مشہور ہے اور تاریخ کی کتابوں سے معلوم کی جاسکتی ہے۔
اس سے مؤلف کے خیالات واہیہ کا اندازہ خوب خوب ہو گیا اور اس سے
مؤلف کی تصور نظری بھی واضح ہو گئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ جماعت کے ساتھ نماز کی
مشروعیت مکہ مکرمہ ہی میں ہو گئی تھی۔

سلف کا اتفاق

مؤلف ”حدیث نماز“ نے آگے لکھا ہے:

”تھوڑی دیر کے لئے ہم مان لیتے ہیں کہ آیت مدینہ میں نازل
ہوئی، تو اس کا شان نزول نماز ہی ہے، اس کے متعلق سلف کا اتفاق نہیں،
بہت سے اس کو خطبہ کے بارے میں مانتے ہیں۔ اس کے بعد ”عین

الھدایہ“ سے نقل کیا کہ کافروں نے قرآن کی آواز نہ سننے کے لئے آپس میں کہا کہ: قرآن مت سنو اور شور مچاؤ، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔“ (حدیث نماز: ۱۰۲)

میں کہتا ہوں کہ: آیت کو مدنیہ کون کہتا ہے کہ آپ تھوڑی دیر کے لئے اس کو مدنی مانیں، اور ہم نے اوپر علامہ عبدالحی صاحب کے حوالہ سے امام احمد کا قول نقل کیا تھا کہ سلف کا اسی پر اجماع ہے کہ یہ آیت قرأت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی، نیز علامہ عبدالحی صاحب نے لکھا تھا کہ: اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے، تو پھر اس کو اتفاق سلف نہیں کہا جائے گا؟ رہے بعض لوگ جو اختلاف کرتے ہیں، ان کا اختلاف کرنا اس اجماع کا قادح نہیں ہو سکتا، کیونکہ کسی کسی کا اختلاف جمہور کے اجماع کے بعد کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ دوسرے اس سے استدلال کرنے کے لئے اس پر اجماع ہونا کیا ضروری ہے؟ کہ جب تک سب کا اجماع نہ ہو، استدلال درست نہ ہو، بلکہ اس کا ارجح و اقوی ہونا کافی ہے، لہذا اس سے استدلال صحیح ہو گیا، اور یہ ہم حنفیہ نے ہی نہیں، بلکہ حضرت ابن مسعود نے بھی اس آیت سے قرأت خلف الامام کے انکار پر استدلال کیا ہے۔

چنانچہ جب آپ نے لوگوں کو امام کے ساتھ قرأت کرتے سنا تو بعد فراغت فرمایا کہ: ”أما آن لكم أن تفقهوا، أما آن لكم أن تعقلوا: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ كما امركم الله۔ (کیا تمہارے سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں آیا کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو، جیسا کہ اللہ نے حکم فرمایا ہے) (رواہ الطبری: ۱۶۱/۶، قال العثماني: ورجالہ ثقات فالحدیث صحیح بلا غبار، اعلاء السنن: ۴۴/۴)

غرض یہ کوئی قاعدہ نہیں کہ بغیر اجماع کے اس سے استدلال درست نہ ہو اور جو

حضرات اس آیت کو خطبہ کے بارے میں مانتے ہیں، ان کا جواب ہم نے پہلے لکھ دیا کہ یہ خلاف تحقیق اور بعید از انصاف ہے اور ”عین الہدایہ“ سے جو نقل کیا کہ یہ آیت کفار کے بارے میں نازل ہوئی، اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ یہ آیت نماز کے سلسلہ میں ہے ہی نہیں؟ کیا ایک آیت کے متعدد شان نزول نہیں ہو سکتے؟ پھر خود ”عین الہدایہ“ ہی میں اسی موقعہ پر لکھا ہے کہ یہ عام ہے، جس کی فرمانبرداری اہل ایمان کو بدرجہ اولیٰ لازم پڑی۔ پھر لکھا کہ اہل ایمان پر ہر حالت میں اس کی تعلیم واجب ہے اور خاص نماز کی حالت میں اور بھی تاکید کے ساتھ واجب ہے۔ پھر ”تفسیر ابن کثیر“ سے اس کا نماز کے بارے میں ہونا بیان کیا کہ: یہ خاموشی کا حکم فرض نماز کی حالت میں زیادہ تاکید کے ساتھ ہے جبکہ امام جہر کر رہا ہو۔ (عین الہدایہ: ۱/۵۵۰-۵۵۱)

مگر افسوس کہ مؤلف ”حدیث نماز“ کو صحیح بات نظر ہی نہیں آتی، اس کو کیا کیا جائے اور اس کا کسی کے پاس کیا علاج ہے؟

زبردستی وزیادتی؟

مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا کہ:

”اس آیت سے نماز میں سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کی دلیل لینا زبردستی ہی نہیں، زیادتی بھی ہے۔ اس طرح کہ قرآن مجید جن پر نازل ہوا یعنی رسول اللہ ﷺ نے خود جب سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا اور امت کے طبقہ اول صحابہ کرام وغیرہ نے پڑھا اور پڑھنے کا فتویٰ دیا، تو اب ہم کون ہوتے ہیں اس آیت کی آڑ لے کر مقتدی کو سورہ فاتحہ سے روکنے والے؟“

(حدیث نماز: ۱۰۲)

غور فرمائیے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس آیت کو قرأت خلف الامام کے

بارے میں ماننے کو زبردستی اور زیادتی قرار دیا ہے، جب کہ جمہور علماء اور صحابہ اس کو قرأت خلف الامام کے بارے میں مانتے ہیں، اگر یہ زیادتی وزبردستی ہے، تو ہمیں بہت خوشی ہے کہ اس زبردستی وزیادتی میں ہمارے ساتھ بہت سارے صحابہ، فقہاء اور علماء ہیں اور خود رسول اللہ ﷺ بھی ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس آیت کے موافق حکم صادر فرمایا کہ ”اِذَا قَرَأْتَ فَانصِتُوا“ (جب امام پڑھے تو خاموش رہو) اور جو مؤلف نے کہا کہ آپ ﷺ نے اور صحابہ نے اور دیگر علماء نے سورہ فاتحہ پڑھا اور پڑھنے کا حکم دیا، تو اس بارے میں گزارش ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مقتدی کے لئے حکم نہیں دیا، بلکہ جب خود کسی صحابی نے حالت اقتداء میں پڑھا، تو آپ ﷺ نے بادلِ ناخواستہ اجازت عطا فرمائی کہ تم پڑھنا ہی چاہتے ہو تو پڑھو، چنانچہ بعض روایات میں آپ کے یہ الفاظ آئے ہیں کہ جب کسی نے آپ کے پیچھے قراءت کی تو آپ نے فرمایا:

”منکم من أحد یقرأ شیئاً من القرآن“ (کیا تم میں کوئی ہے جو کچھ قرآن پڑھتا ہو؟) (دارقطنی: ۳۲۰/۱)

آپ ﷺ نے یہ نہیں پوچھا کہ تم سب پڑھتے ہو؟ کیونکہ آپ نے مقتدی کے لئے کبھی فاتحہ یا غیر فاتحہ کسی بھی چیز کو مشروع ہی نہیں کیا تھا، جب کسی نے پڑھا تو آپ نے یہ سوال کیا اور پھر مرجوح اباحت واجازت دی۔

اور جو بعض لوگوں نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو سوال کیا کہ کیا تم میں سے کوئی امام کے پیچھے پڑھتا ہے؟ یہ اصل قرأت کے بارے میں سوال نہیں تھا، بلکہ کسی نے جہر کر دیا، تو آپ ﷺ نے جہر کے بارے میں پوچھا اور جہر سے منع کیا، یہ بات صحیح نہیں؛ کیونکہ اگر آپ ﷺ کو یہ معلوم ہوتا کہ صحابہ قرأت کرتے ہیں اور آپ ﷺ

صرف جہر کے بارے میں سوال کرتے تو یہ سوال فرماتے کہ کس نے جہر کیا؟ مگر آپ تو فرماتے ہیں کہ کسی نے قرأت کی یا تم میں سے کوئی قرأت کرتا ہے؟ کیا یہ اس پر صریح دلیل نہیں کہ صحابہ نہیں پڑھتے تھے، اور کسی نے پڑھا تو آپ ﷺ نے کراہت ظاہر کرتے ہوئے، استعجاب سے سوال فرمایا کہ کیا کوئی امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے؟ اور قرأت خلف الامام کا رواج نہ ہونے پر یہ واقعہ بھی دلالت کرتا ہے کہ رجاء بن حیوۃ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ: میں نے حضرت عبادہؓ کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور میں نے آپ کو امام کے پیچھے قرأت کرتے سنا، جب ہم نماز سے فارغ ہوئے، تو ہم نے کہا، اے ابوالولید (یہ حضرت عبادہؓ کی کنیت ہے) کیا آپ امام کے پیچھے قرأت کرتے ہیں؟ تو فرمایا تیرا ناس ہو، بغیر قرأت کے نماز نہیں ہوتی۔ (مصنف عبدالرزاق: ۱۳۰/۲)

اس سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے کا رواج نہیں تھا، ورنہ یہ سوال کیوں ہوتا؟ رہے حضرت عبادہؓ تو یہ آپ نے اپنے اجتہاد سے سمجھ لیا تھا کہ مقتدی پر بھی قرأت ہے۔

اسی بات کو علامہ ابن تیمیہ نے لکھا کہ:

”ففي هذا الحديث بيان أن النبي ﷺ لم يكن يعلم هل يقرءون وراءه بشيء أم لا، ومعلوم أنه لو كانت القراءة واجبة على المأموم لكان قد أمرهم بذلك، وأن تأخير البيان عن وقت الحاجة لا يجوز ولو بين ذلك لهم لفعله عامتهم، لم يكن يفعل الواحد والاثنان منهم ولم يكن يحتاج إلى استفهامه، فهذا دليل على أنه لم يوجب عليهم قراءة خلفه حال الجهر“
(اس حدیث میں یہ بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ یہ نہیں جانتے تھے کہ صحابہ آپ

کے پیچھے پڑھتے ہیں یا نہیں؟ اور یہ بات معلوم ہے کہ اگر مقتدی پر قرأت واجب ہوتی تو آپ ﷺ ان کو اس کا حکم دیتے؛ کیونکہ وقت ضرورت بیان کرنے میں تاخیر جائز نہیں، اور اگر آپ نے اس کو بیان کیا ہوتا تو تمام صحابہ اس پر عمل بھی کرتے، اور صرف ایک دو حضرات عمل نہ کرتے اور نہ آپ ﷺ کو اس کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت ہوتی، پس یہ دلیل ہے اس کی کہ آپ ﷺ نے جہر کی حالت میں اپنے پیچھے قرأت کو واجب نہیں کیا تھا) (فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ: ۳۱۶/۲۳)

الغرض مؤلف کا دعویٰ کہ صحابہ اور دیگر فقہاء و ائمہ سب ہی امام کے پیچھے پڑھنے کے قائل ہیں، بلا دلیل دعویٰ ہی دعویٰ ہے، اب غور کر لیں کہ اس آیت کو فاتحہ خلف الامام سے منع کرنے کے بارے میں ماننا زیادتی و زبردستی ہے، یا نہ ماننا؟ اور مؤلف ”حدیث نماز“ نے جو یہ کہا کہ ہم کون ہوتے ہیں فاتحہ پڑھنے سے روکنے والے؟ تو بیشک نہ مجھے حق ہے نہ آپ کو، یہ تو اللہ و رسول کا حق ہے اور قرآن و حدیث سے اس سے منع کرنا ثابت ہو گیا۔

مؤلف کی عجیب زیادتی

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس کے بعد لکھا ہے کہ:

”تاہم زبردستی گھسیٹ گھساٹ کر اس آیت کریمہ کو نماز میں آہستہ آواز سے بھی سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کے بارے میں بیان کرتے ہو، تو اس کے آگے ہی دوسری آیت سے کیوں دامن بچاتے ہو۔ دوسری آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آہستہ آواز میں صبح و شام کی جہری نمازوں میں سورہ فاتحہ پڑھ لیا کرو۔ چنانچہ دوسری آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَإِذْ كُرِّرَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ

”نور الانوار“ میں ہے کہ دو دلیلوں میں تعارض ہو تو کسی سے بھی دلیل نہیں دے سکتے، اور مثال میں انہی دو آیتوں کو پیش کیا ہے، پھر بھی آپ اس کو ثبوت میں پیش کرتے ہیں، تعجب ہے! (حدیث نماز: ۱۰۳-۱۰۴)

اس کا جواب یہ ہے کہ کلام باری تعالیٰ میں تعارض حقیقی کا پایا جانا محال ہے؛ کیونکہ تعارض کلام سفاہت پر دلالت ہے، اور اللہ تعالیٰ سفاہت سے پاک اور منزہ ہے۔ لہذا دونوں آیتوں کو اپنے مقام و محل پر رکھنا چاہئے اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ”اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ“ کو مقتدی کے لیے مانا جائے، جیسا کہ اس کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے، اور ”فَأَقْرَهُ وَامَّا تَبَسَّرَ“ کو منفرد امام کے لیے مانا جائے، اور یہ محض عقلی احتمال اور کھینچا تانی نہیں بلکہ واقعہ بھی یہی ہے، چنانچہ ’اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ‘ کا شان نزول اس پر دال ہے کہ یہ آیت مقتدی کے حق میں وارد ہوئی ہے اور دوسری آیت تہجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جس کا قصہ یہ ہوا کہ بعض صحابہ کرام آپ ﷺ کی اطباع کی خواہش میں رات میں نماز پڑھا کرتے تھے، بعض ان میں سے ایسے تھے کہ انہیں یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ کتنی رات ہوگئی؟ اور وہ پوری پوری رات عبادت میں گزار دیتے تھے، حتیٰ کہ پاؤں پر دم آجاتا اور پھول جاتے، تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اتنی مشقت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ جتنا آسانی و سہولت کے ساتھ پڑھ سکو اتنا پڑھو۔ (دیکھئے جلالین شریف: ۴۷۹)

تو یہ انفرادی نماز کے بارے میں حکم ہے کہ اس میں قرآن جس قدر آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے اس قدر پڑھو، لہذا کوئی تعارض نہیں۔

نیز اس دوسری آیت کے غیر مقتدی (امام و منفرد) کے حق میں ہونے کی

تائید اہل بلاغت کے بیان کردہ اس قاعدے سے بھی ہوتی ہے کہ لفظِ دال علی الوصف سے اگر کوئی مانع نہ ہو، تو موصوف بالذات ہی مراد ہوا کرتا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس آیت میں بالاتفاق خطاب ”مصلی“ کو ہے اور مصلی کا لفظ وصفِ صلوة پر دلالت کرتا ہے، لہذا اس قاعدے کی وجہ سے اس سے مراد وہ ہونا چاہئے جو اس وصف سے بالذات متصف ہے اور وہ امام یا منفرد ہے، مقتدی نہیں؛ کیونکہ مقتدی تو امام کی نماز کے ضمن میں اپنی نماز ادا کرتا ہے، اسی لیے حدیث سے ثابت ہے کہ امام کا سترہ ہی مقتدیوں کا سترہ ہے، چنانچہ امام بخاریؒ نے ”باب سترۃ الإمام سترۃ من خلفہ“ میں اس قسم کی احادیث بیان کی ہیں، نیز اگر امام کی نماز فاسد ہو جائے تو مقتدیوں کی بھی نماز فاسد ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ بہت سے دلائل ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتدی کی نماز دراصل امام کی نماز سے مستفاد ہے، اس لیے حدیث میں ”الإمام ضامن“ آیا ہے۔

علامہ کشمیریؒ نے ”فصل الخطاب“ میں بڑی تفصیل سے اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی ہے۔ حاصل یہ کہ امام و منفرد ہی وصفِ صلوة سے متصف بالذات ہیں، مقتدی نہیں۔ لہذا یہ خطاب اس قاعدہ مذکورہ کے تحت امام و منفرد کو ہوگا، مقتدی کو نہیں۔ حضرت اقدس مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ تحریر فرماتے ہیں:

”نوازشِ ثانی یہ ہے کہ لفظِ دال علی الوصف سے حقائق شناسوں کے نزدیک موصوف بالذات ہی مراد ہوگا، ہاں اگر کوئی قرینہ صارفہ ہو تو اس وقت موصوف بالعرض بھی مراد لے سکتے ہیں۔ (توثیق الکلام: ۴۴)

غرض دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں۔ رہے صاحب ”نور الانوار“ کہ انہوں نے ان میں تعارض مانا ہے، تو بات یہ ہے کہ صاحب نور الانوار بھی ان میں

حقیقی تعارض کے قائل نہیں اور نہ کوئی ہو سکتا ہے؛ کیونکہ انھوں نے خود اس سے پہلے یہ وضاحت کی ہے کہ اللہ کے کلام میں حقیقی تعارض کا پایا جانا ناممکن ہے، اس لئے کہ یہ عجز پر دلالت کرتا ہے اور اللہ کی ذات اس سے پاک و منزہ ہے، بلکہ تعارض سے مراد ظاہری و صوری تعارض ہے جو ہمارے ناسخ و منسوخ کو نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہو رہا ہے۔ (دیکھو نور الانوار: ۱۹۷)

لہذا وہ فرماتے ہیں کہ اس ظاہری تعارض کو ختم کرنے کی صورت یہی ہے کہ ہم حدیث رسول کی طرف مراجعت کریں، اور حدیث میں یہ ہے کہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے، لہذا معلوم ہوا کہ قرأت کا کام مقتدی کا نہیں، بلکہ امام یا منفرد کا ہے۔ یہ ہے خلاصہ صاحب نور الانوار کے کلام کا، جس کو ہمارے مؤلف نے خطبہ کر کے پیش کیا ہے۔ اب بتائیے کہ کیا اعتراض ہے؟

ایک شبہ اور جواب

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ: ﴿فَاقْرَأْ وَ اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعْ لَهُ لَعَلَّ يَرْحَمَكَ رَبُّكَ وَمَا جَاءَكَ مِنَ الْقُرْآنِ ظَنًّا﴾ میں سورہ فاتحہ کو تمام پر واجب قرار دیا ہو، اور ”اذا قرأ القرآن“ میں سورہ فاتحہ علاوہ سے منع کیا ہو، تو کیا عجب ہے، اور اس طرح بھی دفع تعارض ہو سکتا ہے؟
راقم کہتا ہے کہ یہ صورت کئی وجہ سے فاسد ہے:

اولاً: اس لیے کہ اس دوسری آیت کے شان نزول سے ظاہر ہے کہ ”مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ“ سے مطلقاً قرآن جتنا ہو سکے، پڑھنے کا امر فرمایا ہے، سورہ فاتحہ مراد نہیں، اور مراد متکلم کے خلاف مراد لینا بدیہی البطلان ہے۔

ثانیاً: اس لیے کہ اس صورت میں اس آیت کو بعض کے حق میں عام اور بعض کے حق میں خاص کرنا ہوگا؛ کیونکہ آیت میں غیر مقتدی بھی داخل ہی ہوں گے، تو ان

کے لیے ”مَا تَيْسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ“ کو عام رکھنا ہوگا کہ سورہ فاتحہ اور دوسری سورتیں جو چاہے پڑھو، اور مقتدی کے حق میں اس عموم کو ختم کرنا ہوگا؛ کیونکہ مقتدی کے لیے کوئی بھی سورہ فاتحہ کے علاوہ دیگر سورتیں پڑھنے کا قائل نہیں اور ایک ہی لفظ کو کبھی عام اور کبھی خاص رکھنا خلاف اصل اور فاسد ہے۔

ثالثاً: اس لیے کہ اس صورت میں دونوں آیتوں میں واقع لفظ ”القرآن“ میں عدول و تصرف کرنا ہوگا، کیونکہ ”مَا تَيْسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ“ میں قرآن کو سورہ فاتحہ کے ساتھ خاص کرنا پڑے گا، اور آیت ”إِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ“ میں قرآن کو غیر فاتحہ کے ساتھ خاص کرنا ہوگا، اور اس میں انصات و استماع کو بھی غیر فاتحہ کے ساتھ خاص کرنا ہوگا، اور یہ سوائے تجاوز عن الحد اور خواہ مخواہ کھینچا تانی کے کچھ نہیں؛ کیونکہ قرآن میں سورہ فاتحہ تو ام القرآن ہے، تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے آیت ”إِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ“ کو اس لیے نازل فرمایا کہ قرآن کی عظمت اور اس کا احترام اور آداب سکھائے جائیں، تو جو قرآن کا اصل تھا اس کو قرآن سے نکال دیا جائے اور اس کے ساتھ استماع و انصات کا معاملہ نہ کیا جائے، کیا یہ عققل میں بات آتی ہے؟

غرض اس صورت کے تجویز کرنے میں فساد ہی فساد ہے، برخلاف اس کے کہ دونوں آیات کو اپنے اپنے موقع پر رکھا جائے، اور یوں کہا جائے کہ ایک آیت میں مقتدیوں کو حکم ہے کہ قرآن نہ پڑھو بلکہ خاموش رہو اور سنو اور دوسری آیت میں غیر مقتدی کو حکم ہے کہ جو میسر ہو اس کو پڑھو، تو نہ تعیم کی ضرورت، نہ تخصیص کی ضرورت ہے، دونوں اپنے عموم و خصوص پر رہیں گی، اس سے مؤلف کے تمام اعتراضات کا قلعہ بہترین اسلوب پر فتح ہو گیا۔

مؤلف کی ایک غلط فہمی کا ازالہ

مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا ہے کہ: حدیث ”لا صلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب“ کو سبھی مانتے ہیں اور دو تہائی مسلمان مقتدی کے لیے سورہ فاتحہ پڑھنا واجب مانتے ہیں..... اور حنفی مسلک والے بھی واجب ہی مانتے ہیں، مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ”لا صلوة“ میں ”لا“ نفی کمال کا ہے، یعنی بغیر سورہ فاتحہ نماز کامل نہیں ہوتی۔ تو میں کہتا ہوں کہ کامل چھوڑ کر ناقص پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ امام تو کامل پڑھے اور مقتدی ناقص..... اور ناقص پڑھنے کا کیا وبال ہے وہ اس کتاب کے ص: ۱۴ سے ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیے۔ (حدیث نماز: ۱۰۴)

اس بیان میں مؤلف پر کئی موخذات ہیں: ایک تو یہ ہے کہ مؤلف کی یہ بات تو صحیح ہے کہ ”لا صلوة“ والی حدیث صحیح ہے، مگر ہمارے نزدیک اس کے ساتھ اسی حدیث میں لفظ ”فصاعدا“ بھی صحیح طور پر ثابت ہے، اور حضرت جابرؓ کی روایت میں ”إلا أن یکون وراء الإمام“ کا استثناء بھی موقوفاً و مرفوعاً ثابت ہے، اس لیے یہ حدیث مقتدی کے حق میں نہیں ہے، امام و منفرد کے لیے ہے، لہذا مقتدی سے اس حدیث کا کوئی تعلق نہیں۔

دوسرے یہ کہ مؤلف نے جو یہ کہا کہ دو تہائی مسلمان مقتدی کے لیے سورہ فاتحہ کو واجب مانتے ہیں، یہ بالکل غلط ہے، وجوب کے قائل تو نہ امام ابوحنیفہؒ ہیں، نہ امام احمدؒ ہیں، نہ امام مالکؒ ہیں، حتیٰ کہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ کا آخری قول جو ان کی کتاب ”الام“ میں ہے، استحباب ہی کا ہے، اور صحابہ کے بارے میں ہم نے ثابت کیا تھا کہ وجوب کے ایک دو ہی قائل تھے، جتنے تھے سب جواز یا زیادہ سے

زیادہ استحباب کے قائل تھے، وجوب کے تو بس امام بخاریؒ یا غیر مقلدین اور بعض ہی لوگ قائل ہیں، اور امام مالکؒ تو جہری میں پڑھنے کے قائل بھی نہیں، صرف سری میں استحباب کے قائل ہیں، اور امام احمدؒ بھی سری میں استحباب یا جواز کے قائل ہیں، اور جہری میں قائل نہیں۔ (اس تفصیل کے حوالے ہم نے پہلے ہی بیان کر دیے ہیں) اور احناف بھی سری میں جواز کے اور جہری میں سکتات میں جواز کے قائل ہیں، جس کی دلیل وہ استثناء ہے جو بعض احادیث میں آیا ہے مگر نہ پڑھنا ہی افضل ہے؛ کیونکہ آیت نے مطلقاً روکا ہے اور نبی کریم ﷺ نے بادلِ خواستہ اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ اس لیے علامہ کشمیریؒ ”فصل الخطاب“ کے آخری صفحہ پر فرماتے ہیں کہ قائلین وجوب کو تو اس کو غنیمت جانا چاہئے کہ آپ ﷺ نے جواز کے لیے استثناء فرمادیا، ورنہ تو اس جواز کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

غرض مؤلف کا یہ دعویٰ کہ دو تہائی مسلمان وجوب کے قائل ہیں، بے دلیل ہے اور واقعہ کے خلاف ہے۔

تیسرے یہ کہ مؤلف نے ”لا صلوة“ میں لا کو احناف کے نزدیک نفی کمال کا بیان کر کے جو کہا کہ ناقص پڑھنے کی کیا ضرورت ہے، تو یہ مؤلف کے تصورِ فہم کا نتیجہ ہے، اور یہ وہی غلط فہمی ہے جس کا ہم نے گذشتہ صفحات میں بھی ذکر کیا ہے اور اس کا ازالہ بھی کیا ہے، مؤلف نے اسی غلط فہمی کا دوبارہ شکار ہو کر یہ بات کہی ہے، بات یہ ہے کہ احناف جب اس حدیث کو مقتدی کے لیے مانتے ہی نہیں، تو پھر اس کو مقتدی کے حق میں مان کر کمالِ صلوة و نقصانِ صلوة کی بات نکالنا کیا زبردستی و زیادتی نہیں؟ اور ”لا“ کو احناف لائے نفی کمال جو کہتے ہیں، وہ امام و منفرد کے لیے کہتے ہیں کہ اگر منفرد یا امام سورہ فاتحہ نہ پڑھے گا، تو اس کی نماز ناقص ہوگی اور واجب

الاعادہ ہوگی، تو یہ رکنیت اور فرضیت فاتحہ کا اختلافی مسئلہ ہے، جس پر ہم کلام کر چکے ہیں، مگر مؤلف بے سمجھے ہی لکھتے چلے جاتے ہیں اور یہ بھی خبر نہیں رہتی کہ کیا لکھ رہا ہوں۔

غرض اگر امام یا منفرد اس کو نہ پڑھے تو بے شک اس کی نماز ناقص اور قابل گرفت حرکت ہوگی، مگر مقتدی کو نہ پڑھنا چاہئے؛ کیونکہ اس کے احکام جدا ہیں۔

سکنت امام کی بحث

مؤلف ”حدیث نماز“ نے حضرت شیخ المشائخ قطب الاقطاب محدث زماں، فقیہ دوراں مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے رسالہ ”سبیل الرشاد“ سے نقل کیا کہ آپ لکھتے ہیں:

”الحاصل جب آپ ﷺ کو قرأت میں منازعت اور نقل ہوا اور لوگوں کا پڑھنا معلوم ہوا، تو آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ ”لا تفعّلوا إلبفاتحة الكتاب فإنه لا صلوة إلبفاتحة الكتاب“ پس جب اس (سورہ فاتحہ) کو اس قدر خصوصیت بالصلوة ہے، تو اگر سکنت میں اس کو پڑھ لو تو رخصت ہے اور یہ قدر قلیل آیات ہیں، محل ثناء میں ختم ہو سکتی ہیں اور خلط امام کی نوبت نہیں آتی۔“ (حدیث نماز: ۱۰۵-۱۰۶)

راقم عرض کرتا ہے کہ: یہ عبارت مؤلف کے مدعی سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتی؛ کیونکہ حضرت گنگوہیؒ یہاں پر جو بیان فرما رہے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ اول تو رسول اللہ ﷺ نے بحالت اقتداء لوگوں کو قرأت مشروع نہیں فرمائی، بعض صحابہ نے اپنے اجتہاد سے قرأت کرنی شروع کی، تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہ لوگ امام کے پیچھے پڑھتے ہیں، تو آپ ﷺ نے سورہ فاتحہ کی اس خصوصیت کی وجہ سے کہ یہ

امام و منفرد کی نماز میں واجب علی التعمین ہے اور لوگوں کی زبانوں پر بار بار پڑھنے کی وجہ سے چڑھی ہوئی ہے اور آیات بھی قدرِ قلیل ہیں کہ بنسبت دوسری سورتوں کے اس میں منازعتِ امام کی نوبت نہیں آتی، مقتدی کے لیے اس کی اجازت و رخصت دی کہ پڑھ لو۔

اس کی پوری تفصیل ہم شروع میں کر چکے ہیں، تو اس سے وجوب کہاں ثابت ہوتا ہے، جبکہ حضرت نے رخصت بیان فرمائی ہے اور پورے رسالہ میں یہ ثابت فرمایا کہ نہ پڑھنا ہی اولیٰ و افضل ہے، اور یہ صرف اجازت ہے سورہ فاتحہ کی بعض خصوصیات کی وجہ سے، دوسری سورتوں سے امتیاز کی وجہ سے دی گئی ہے، اور پھر یہ سکتا میں اجازت آپ ﷺ نے ہر کس و ناکس کے لیے نہیں دی ہے، چنانچہ حضرت نے آگے فرمایا کہ: یہ سکتا میں مقتدی کو جو اجازت ہے، یہ ان خواص کے لیے ہے جو سکتا امام کی رعایت بھی کرتے ہوں۔ (سبیل الرشاد: ۲۰)

غرض مؤلف کو اس عبارت سے کیا حاصل ہوا، اس میں تو مذہبِ احناف بیان کیا گیا ہے اور سکتا میں پڑھنا نہ مستحب ہے، نہ واجب؛ کیونکہ خود امام پر سکتا مستحب یا واجب نہیں، اگر مقتدی پر سکتا میں پڑھنا واجب یا کم از کم مستحب ہوتا، تو امام پر سکتا کرنا بھی واجب یا مستحب ہوتا۔ لہذا یہ صرف جائز ہے اور وہ جائز بھی بجوازِ مرجوح ہے۔

علامہ ابن تیمیہ اور سکتا امام کی بحث

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے سکتا امام اور اس میں مقتدی کی قرأت پر طویل بحث فرمائی ہے اور واضح فرمایا کہ شرعاً سکتا کی بات کوئی شی نہیں، یہاں مناسب ہے کہ ہم اس کو نقل کر دیں، چنانچہ آپ نے فرمایا:

”اگر بالفرض جہری نماز میں بھی مقتدی پر قرأت واجب ہو، تو دو چیزوں میں سے ایک لازم ہے، یا تو (مقتدی) امام کے ساتھ ساتھ پڑھے گا یا یہ کہ امام پر سکتہ واجب ہوگا، تاکہ مقتدی پڑھ لے، ہم سکتہ کے امام پر واجب نہ ہونے میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں جانتے۔ اور امام کے ساتھ پڑھنا قرآن و حدیث سے ممنوع و منہی عنہ ہے۔ بس ثابت ہوا کہ مقتدی پر امام کے ساتھ بھی قرأت واجب نہیں ہے (بلکہ جائز بھی نہیں ہے) بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ حالت جہر میں مقتدی پر اگر قرأت مستحب بھی ہوتی تو امام کے لیے سکتہ مستحب ہوتا اور یہاں پر علماء کے نزدیک امام کے لیے سکتہ مستحب بھی نہیں۔ یہی امام مالکؒ، ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ و غیر ہم کا مذہب ہے اور ان حضرات ائمہ کی حجت و دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ مقتدیوں کے پڑھنے کی غرض سے سکوت نہیں فرماتے تھے اور کسی نے بھی آپ ﷺ سے یہ نقل نہیں کیا، بلکہ آپ ﷺ سے ”صحیح بخاری“ میں تکبیر کے بعد سکوت دعائے استفتاح (ثناء) کے لیے ثابت ہوا ہے، اور ”سنن“ میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ کے دو سکتے ہوتے تھے: ایک قرأت سے پہلے، ایک قرأت کے بعد، اور یہ سکتہ بہت لطیف (تھوڑا) ہوتا تھا تاکہ فصل ہو جائے، جس میں قرأت فاتحہ کی گنجائش نہیں۔ اور آپ ﷺ سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ دوسرا سکتہ سورہ فاتحہ کے بعد ہوتا تھا (تاکہ سورہ فاتحہ اور دوسری سورت میں فصل ہو جائے) اور کسی نے (علماء یا صحابہ میں سے) یہ نہیں کہا کہ آپ ﷺ کے تین سکتے ہوتے تھے، یا چار سکتے ہوتے تھے، جس نے یہ کہا اس نے ایسا قول کہا جس کو مسلمین میں سے کسی نے نقل نہیں کیا اور جو سکتہ آپ ﷺ سے ”ولا الضالین“ کے بعد مروی و منقول ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آیتوں پر سکتہ ہوتا ہے اور اس جیسے ٹھہرنے کو سکتہ نہیں کہتے۔..... اور یہ معلوم ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ ایسا

سکتے فرماتے کہ جس میں قرأت فاتحہ کی جاسکے، تو البتہ یہ ان چیزوں میں سے ہوتا کہ اس کی نقل پر ہمتیں کمر بستہ ہو جائیں، پس جب کسی نے نقل نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ ایسا سکتے نہیں تھا،..... اس کے بعد سکتے کی حدیث، جس میں دو سکتے آئے ہیں، اس کے بارے میں فرمایا کہ..... یہ سکتے سکتے یسیر تھا، جس کو سکتے میں شمار نہیں کرتے، اسی بنا پر حضرت عمران بن حصینؓ نے اس کا انکار فرمایا..... اور یہ معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے دو ہی سکتے فرمائے تھے، ایک طویل، دوسرا ہر حالت میں قصیر، جو قرأت فاتحہ کی گنجائش نہیں رکھتا۔ (اور اول ثناء کے لیے تھا جیسا کہ ”بخاری“ میں ہے) نیز اگر صحابہ کرام سب کے سب آپ ﷺ کے پیچھے سکتے اولیٰ یا سکتے ثانیہ میں فاتحہ کی قرأت کرتے تھے، تو اس کی نقل پر ہمتیں کمر بستہ ہو جائیں۔ پس کیا حال ہے جب کہ کسی ایک صحابی سے بھی یہ منقول نہیں کہ صحابہ سکتے ثانیہ میں فاتحہ پڑھتے تھے، اس کے علاوہ اگر یہ مشروع ہوتا تو صحابہ اس کے جاننے کے زیادہ حقدار تھے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ بدعت ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۷۶/۲۳-۲۷۹)

غرض یہ بات معلوم ہوئی کہ سکتے میں پڑھنا کوئی شرعی حکم نہیں، زیادہ سے زیادہ اگر قرأت کرنا محل استماع و باعث منازعت نہ ہو تو جائز کہا جاسکتا ہے، جیسا کہ علامہ محدث رشید احمد صاحب نور اللہ مرقدہ نے فرمایا ہے۔ ورنہ وجوب کا قول قرآن و حدیث سے ثابت نہیں بلکہ بدعت ہے جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے۔

حضور ﷺ نے نماز کی اصلاح کی

یہاں یہ بات سنتے چلیں کہ علماء حنفیہ نے نماز میں سورہ فاتحہ کے فرض نہ ہونے پر ایک حدیث سے استدلال کیا ہے جس کو حدیث مسیء الصلاة کہتے ہیں یعنی وہ

حدیث جس میں ہے کہ ایک شخص نے نماز میں غلطی کی تو حضور ﷺ نے اس کی اصلاح کی، مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”بخاری شریف“ سے اس حدیث مسی الصلوٰۃ کو نقل کر کے، احناف کے اس سے استدلال پر اعتراضات کئے ہیں، ہم یہاں مولف کے ان اعتراضات کے جوابات دینا چاہتے ہیں، لہذا اولاً وہ حدیث ملاحظہ کیجئے۔

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ مسجد میں داخل ہوئے، پھر ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور نماز پڑھ کر اس نے آپ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے جواب دیا اور فرمایا کہ جا اور نماز پڑھ؛ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی (کیونکہ ان صاحب نے نماز میں کچھ غلطیاں کی تھیں) چنانچہ وہ شخص گیا اور دوبارہ نماز پڑھ کر آیا اور سلام پیش کیا، آپ ﷺ نے پھر اس سے وہی کہا، ایسا ہی تین مرتبہ ہوا، تو اس نے کہا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں اس سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا، آپ ﷺ ہی مجھے تعلیم فرمائیے۔ تو آپ ﷺ نے اس کو تعلیم فرمائی اور کہا کہ:

”اذا قمت الى الصلوة فكبر ثم اقرأ ماتيسر معك من القرآن ثم اركع حتى تطمئن راكعاً ثم ارفع حتى تعتدل قائماً ثم اسجد حتى تطمئن ساجداً ثم ارفع حتى تطمئن جالساً وافعل في صلاتك كلها“ (جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو تکبیر کہو، اس کے بعد جتنا قرآن تم کو یاد ہو اس کو پڑھو، پھر رکوع کرو، یہاں تک کہ رکوع میں اطمینان ہو جائے، پھر سر اٹھاؤ یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ، پھر سجدہ کرو، یہاں تک کہ سجدہ میں اطمینان ہو جائے، پھر سر اٹھاؤ، یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ، اور اپنی پوری نماز میں اسی طرح کرو۔ (بخاری: ۱۰۵۱/۱، مسلم: ۱۷۰/۱)

اس حدیث کے بارے میں علماء حنفیہ کہتے ہیں کہ چونکہ اس حدیث میں اللہ

کے نبی ﷺ نے تمام امور نماز کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ صرف فرائض و ارکان کا ذکر کیا ہے، اس لئے اس میں جو باتیں مذکور ہیں وہ فرض ہوں گی اور جو مذکور نہیں ہیں وہ غیر فرض ہوں گی خواہ وہ واجب کے درجے کی ہوں یا سنت و مستحب درجے کی، اور چونکہ اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے اس شخص کو سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا اس لئے سورۃ فاتحہ پڑھنا واجب ہے فرض نہیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی بھی ضروری ہے کہ احناف نے اس حدیث سے فرائض و ارکان کا اثبات نہیں کیا ہے، اسی طرح یہ بھی نہیں کہ جو کچھ اس حدیث میں وارد ہے، اس کو احناف فرض کہتے ہیں، بلکہ اس حدیث سے جو استدلال تھا، وہ صرف اتنا کہ مقام تعلیم میں فرائض کو بیان کرنا ضروری ہے، اس میں فاتحہ کا ذکر نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ یہ فرض نہیں، یہ استدلال نہیں تھا کہ اگر یہاں فاتحہ کا ذکر ہوتا تو وہ فرض ہوتا، ہرگز ایسا نہیں، اسی طرح اگر اس میں مستحبات کا ذکر ہوتا، یا سنن کا بیان ہوتا، تو اس کو فرض نہ کہا جاتا؛ کیونکہ مقام تعلیم میں فرض نہ بیان کرنا تو ممکن نہیں، مگر مستحبات کا مقام تعلیم میں بیان کرنا صحیح ہے۔

اس تفصیل کے بعد اب ملاحظہ کیجئے کہ حنفیہ کے اس استدلال پر مؤلف ”حدیث نماز“ نے کچھ اعتراضات کئے ہیں، ہم ان کا ایک ایک کر کے اس جگہ جواب دیں گے۔

مؤلف کی نا فہمیوں کا جواب

اس سے پہلے کہ ہم ان کے اعتراضات کا جواب دیں یہ بھی سن لیجئے کہ علماء احناف اس حدیث سے مقتدی کے حق میں کچھ اخذ نہیں کرتے؛ کیونکہ آپ ﷺ نے اس شخص کو جو تعلیم فرمائی، یہ اقتداء کی حالت کے متعلق نہیں، بلکہ حالت افراد کے

بارے میں ہے، لہذا حنفیہ اس حدیث کو منفر د کے لیے مانتے ہیں۔ لہذا مؤلف کا اس موقع پر اس حدیث کو پیش کرنا بالکل لغو اور کوتاہ فہمی کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد مؤلف کے اعتراضات اور ان کے جوابات سنئے:

(۱) مؤلف نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں ہاتھ باندھنے کا ذکر نہیں ہے۔ مالکی ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں آپ ان کو غلط بتاتے ہیں..... وہ حضرات مالکیہ اگر آکر کہیں کہ اس حدیث میں قیام و تکبیر کا ذکر ہے، ہاتھ باندھنے کا ذکر نہیں ہے، تو آپ اس کا جواب یہی دیں گے کہ دوسری صحیح حدیثوں سے اس کا ثبوت ہے۔ (مخلص از حدیث نماز: ۱۰۷)

اس کا جواب یہ ہے کہ مؤلف کو اتنی بھی خبر نہیں کہ نماز میں ہاتھ باندھنا فرض ہے یا صرف سنت؟ اگر ہم اس کو فرض کہتے، تو ہم پر آپ یہ اعتراض وارد کر سکتے تھے، لیکن ہم تو ہاتھ باندھنے کو فرض تو کیا بلکہ واجب بھی نہیں کہتے، سنت کہتے ہیں اور ہم نے اوپر بتا ہی دیا کہ یہ مقام تعلیم ہے، جس میں فرائض اور ارکان کا بیان ہونا تو ضروری ہے، سنت اور مستحب چیزوں کا ہونا ضروری نہیں، حتیٰ کہ واجبات کا بیان نہ ہونے میں بھی مضائقہ نہیں، تو اگر یہ مالکی حضرات (آپ کی تحریک پر، ورنہ اس قدر بے حقیقت سوال کوئی عقل مند نہیں کرے گا) ہم سے پوچھنے لگیں کہ اس حدیث میں تو ہاتھ باندھنے کا ذکر نہیں ہے اور یہ مقام تعلیم ہے، تو ہم یہ جواب دیں گے کہ ہاں یہ مقام تعلیم ہے اور مقام تعلیم میں فرائض کا بیان نہ ہونا تو درست نہیں، سنن کا بیان نہ ہونا صحیح ہے۔ لہذا یہاں سنن بیان نہیں کیے، دوسری جگہ بیان فرمائے گئے ہیں۔ مزید یہ بھی سن لیں کہ مؤلف کا یہ اعتراض خود ہی ہمارا ایک جواب ہے، کہ چونکہ اس میں ہاتھ باندھنے کا ذکر نہیں، اس لیے ہاتھ باندھنا ہمارے نزدیک فرض نہیں۔ (فافہم)

(۲) مؤلف نے دوسرا اعتراض یہ کیا کہ اس میں تورکوع میں جاتے وقت،

سجدہ میں جاتے اٹھتے وقت، ”اللہ اکبر“ کہنے کا ذکر نہیں اور رکوع و سجدہ، قومہ کی دعائیں نہیں ہیں، تو کیا اس کے بغیر رکوع سجدہ کر سکتے ہیں؟ تو آپ کا جواب یہ ہوگا کہ نہیں کر سکتے؛ کیونکہ دوسری حدیثوں میں اس کا ذکر ہے، اس طرح ”جو آسان ہے پڑھ لو“ کا صحیح طریقہ دوسری ٹھوس اور مضبوط حدیثوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ بتایا گیا ہے۔

اس کا بھی جواب یہی ہے کہ ان مذکورہ چیزوں کو حنفیہ ضروری اور فرض کہتے ہی نہیں، اور نہ کوئی اور امام ان کو ضروری و فرض کہتا ہے، تو پھر ہم پر یہ اعتراض کرنا لغو اور خام خیالی اور خوش فہمی کے علاوہ کچھ نہیں۔

رہا مؤلف کا یہ کہنا کہ ”جو آسان ہے پڑھ لو“ کا صحیح طریقہ دوسری حدیثوں میں آیا ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھ لو، تو راقم کہتا ہے کہ یہ مقتدی کے لیے نہیں اور جو احادیث میں آیا ہے اس کی ہی وجہ سے ہم بھی کہتے ہیں کہ امام و منفرد پر سورہ فاتحہ واجب ہے، ہاں فرض اور رکن نہیں مانتے۔

رہا ”ما تیسر“ کو سورہ فاتحہ پر محمول کرنا یہ تحکم کے سوا کچھ نہیں؛ کیونکہ خود دوسری حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ”ما تیسر“ آپ ﷺ نے سورہ فاتحہ کے علاوہ دیگر سورتوں کو کہا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو سعید سے مروی ہے کہ: ”أمرنا - و في رواية : أمرنا نبينا ﷺ - أن نقرأ بفاتحة الكتاب و ما تيسر“ (ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم سورہ فاتحہ اور جو آسان ہو اس کو پڑھیں) (ابو داؤد: ۱۱۶۱، مسند احمد: ۴۵/۳، صحیح ابن حبان: ۹۲/۵)

یہاں اس حدیث میں سورہ فاتحہ کے بعد دوسری سورت کو ”ما تیسر“ کہا ہے، معلوم ہوا کہ اللہ کے نبی ﷺ کے نزدیک اس لفظ میں سورہ فاتحہ نہیں، بلکہ اس کے بعد

کی سورت داخل ہے، اب فرمائیے کہ جس لفظ میں اللہ کے نبی کے نزدیک ایک بات داخل نہیں اس کو اس میں داخل کرنا اور جو اس میں داخل ہے اس کو اس سے خارج کرنا کہاں تک روا ہے؟ اور اس کی کیا دلیل ہے؟ کیا یہ بات اللہ کے نبی کے فیصلے کے خلاف نہیں کہ آپ ﷺ تو سورہ فاتحہ کے علاوہ دوسری سورت کو ”ماتیسر“ میں داخل کریں اور مؤلف صاحب اسی کو اس سے خارج کریں؟

مؤلف کے تحقیقی جواب کا جائزہ

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس کے بعد حنفیہ کے مذکورہ بالا استدلال کا بزعم خود تحقیقی جواب دیتے ہوئے علامہ شوکانی کی ”نیل الاوطار“ سے نقل کیا کہ:

”یہی حدیث مسند احمد و سنن ابی داؤد اور صحیح ابن حبان میں بھی آئی ہے اور اس میں ہے ”ثم اقرأ بأم القرآن“ کہ سورہ فاتحہ پڑھو۔ پس درایت و روایت دونوں طرح سے ثابت ہوا کہ سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کی دلیل اس حدیث سے قطعاً نہیں لے سکتے۔“ (مخلص از حدیث نماز: ۱۰۸)

راقم کہتا ہے کہ: مؤلف ”حدیث نماز“ نے یہاں بھی وہی خلط بحث کیا ہے جو گزشتہ بھی بار بار کرتے آئے ہیں، مؤلف کو معلوم ہونا چاہئے کہ علامہ شوکانی کی یہ بات بھی رکنیت فاتحہ کے بارے میں ہے، مقتدی کی قرأت کے بارے میں نہیں ہے لہذا اس موقع پر اس کو پیش کرنا ایک علمی خیانت ہے یا جہالت ہے۔

پھر یہ بھی جان لیجئے کہ یہاں حدیث میں سورہ فاتحہ کا ذکر ہو تو لازم نہیں کہ وہ فرض ہو؛ کیونکہ جو کچھ حدیث میں آیا ہے وہ فرض نہیں ہے، اسی لئے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ہمارا حدیث سے جو استدلال تھا، وہ صرف اتنا کہ مقام تعلیم میں فرائض کو بیان کرنا ضروری ہے، اس میں فاتحہ کا ذکر نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ یہ فرض نہیں، یہ

استدلال نہیں تھا کہ اگر یہاں فاتحہ کا ذکر ہوتا تو وہ فرض ہوتا، چنانچہ اس حدیث میں اطمینان و تعدیل ارکان کا بھی ثبوت ہے، یہ ہمارے نزدیک فرض نہیں، واجب ہے، اسی طرح ”ابوداؤد“ وغیرہ کی بعض روایات میں اس حدیث میں تکبیرات رکوع و سجود اور تسمیہ و تحمید کا بھی ذکر ہے، جو جمہور ائمہ کے یہاں سنن و مستحبات میں سے ہیں۔

اس سے علامہ شوکانی کے ان احادیث کو پیش کرنے کا جواب ہو گیا، جس میں سورہ فاتحہ کا ذکر ہے کہ اس کے ہونے سے یہ لازم نہیں کہ یہ فرض و رکن ہو۔
(ہذہ نکتہ جیدۃ فاحفظہا تجدہا نافعۃ فی مواضع)

احناف کی دوسری دلیل

حنفیہ اور حنابلہ نے امام کے پیچھے مقتدی پر قرأت نہ ہونے اور قرأت کی جگہ انصاف کے فرض ہونے پر دوسری دلیل حدیث سے لی ہے۔

چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور سنتیں بیان کیں اور نماز سکھائی، پس آپ نے کہا کہ: ”إِذَا صَلَّيْتُمْ فَأَقِيمُوا صُفُوفَكُمْ ثُمَّ لِيَوْمِكُمْ أَحَدُكُمْ فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا وَإِذَا قَالَ ”غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ“ فَقُولُوا آمِينَ.“

(جب تم نماز پڑھو تو اپنی صفوں کو درست کر لو اور تم میں سے ایک شخص امامت کرے، پس وہ (امام) تکبیر کہے، تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ ”غیر المغضوب علیہم ولا الضالین“ کہے تو تم آمین کہو) (مسلم: ۱۷۱/۱، ابوداؤد: ۱۴۰/۱، مسند احمد: ۴/۱۵۴، دارقطنی: ۳۳۰/۱ وغیرہ)

علامہ ابن عبدالبر مالکی نے ”الاستدکار“ میں کہا کہ ہم نے یہ حدیث حضرت ابو

ہریرہ اور حضرت ابو موسیٰ دونوں سے اس کی اسانید و طرق کے ساتھ تمہید میں ذکر کی ہے اور امام احمد نے اس حدیث کے الفاظ کو صحیح قرار دیا ہے۔ (الاستذکار: ۱: ۴۶۶)

علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی نے فرمایا کہ: اس حدیث کی امام احمد، امام اسحاق، ابو بکر بن اثرم، امام مسلم، امام نسائی، ابن جریر، ابو عمر بن عبد البر، ابن حزم، منذری، ابن کثیر، امام ابن تیمیہ، پھر حافظ ابن حجر (فی الفتح) اور جمہور مالکیہ اور حنابلہ نے صحیح کی ہے۔ (فصل الخطاب: ۲۷، فتح الملہم: ۲۲۲)

جیسا کہ عرض کیا گیا اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت بھی کیا ہے اور اس کی تصحیح بھی کی ہے، اور دیگر محدثین نے بھی اس کو صحیح کہا ہے، مگر بعض حضرات اس حدیث پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس کے راوی سلیمان التیمی ”إذ قرأ فأنصتوا“ کی زیادتی میں متفرد ہیں اور ان کا کوئی ساتھی اس میں ان کی تائید و متابعت نہیں کرتا، لیکن یہ بات صحیح نہیں، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے ”امانی الاحبار“ میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ: سلیمان التیمی کی متابعت دارقطنی، بیہقی و ابن عدی کے پاس عمر بن عامر و سعید بن ابی عروبہ نے کی ہے، پھر سلیمان التیمی خود ثقہ و قابل احتجاج بزرگ ہیں، جن کے بارے میں امام شعبہ نے کہا کہ: میں نے ان سے زیادہ سچا کسی کو نہیں دیکھا، اور الخلال نے کہا کہ: میں نے امام احمد سے پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ تیمی نے اس میں خطا کی ہے تو فرمایا کہ: جس نے یہ کہا اس نے سلیمان التیمی پر بہتان باندھا اور ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ انھوں نے دوسروں کی مخالفت کی ہے بلکہ انھوں نے ایک اضافہ بیان کیا ہے اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے۔ (امانی الاحبار: ۱۳۶/۳)

اس حدیث صحیح میں بھی مقتدی کو مطلقاً انصت کا حکم دیا گیا ہے اور انصت کے معنی خاموش رہنے کے ہیں، اس میں سری قرأت کی بھی نفی ہے؛ کیونکہ قرأت

سری کو انصاف نہیں کہا جاتا ہے، اس کی تفسیر آیت شریفہ کے تحت ہم کرائے ہیں، اور اس میں سورہ فاتحہ وغیر فاتحہ سب برابر ہیں؛ کیوں کہ حدیث میں قرأت کے وقت انصاف کا حکم ہے، اور اگر قرأت فاتحہ ہوگی تو انصاف کہاں ہوگا؟

احناف کی تیسری دلیل

علماء حنفیہ نے اپنے مسلک پر تیسری دلیل میں یہ حدیث پیش کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ”إنما جعل الإمام ليؤتم به ، فإذا كبر فكبروا ، وإذا قرأ فانصتوا ، وإذا قال : ”سمع الله لمن حمده“ فقولوا : اللهم ربنا لك الحمد“ (امام توبس اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے، لہذا جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو، اور جب وہ قرأت پڑھے تو تم خاموش رہو، اور جب وہ ”سمع الله لمن حمده“ کہے تو تم: ”اللهم ربنا لك الحمد“ کہو) (نسائی: ۱۰۷۱، ابوداؤد: ۸۹/۱، ابن ماجہ: ۶۱/۱، مسند احمد: ۲۴۰/۲، دارقطنی: ۳۲۷/۱)

علامہ ابن الترمذی نے ”الجوہر النقی“ میں فرمایا کہ: اس حدیث کی ابن حزم اور امام مسلم نے تصحیح کی ہے اور ابن عبد البر نے تمہید میں ذکر کیا کہ: امام احمد بن حنبل نے حضرت ابو موسیٰ و حضرت ابو ہریرہ دونوں کی حدیثوں کو صحیح قرار دیا ہے۔ (الجوہر النقی علی سنن البیہقی: ۲۲۴/۲)

اور علامہ بدر الدین العینی نے ”نخب الافکار“ میں اور حضرت مولانا یوسف صاحب کاندھلوی نے ”امانی الاحبار“ میں اس حدیث پر بڑا طویل اور محکم دلائل کے ساتھ کلام کیا ہے اور اس کو صحیح ثابت کیا ہے۔ نیز اس کے بارہ طرق بالاستیعاب بیان

کیے ہیں۔ (نخب الافکار: ۲/۵۵۰-۵۵۲، امانی الاحبار: ۳/۱۳۵-۱۳۷)

ہمیں یہاں اتنا ہی لکھنا کافی ہے؛ کیوں کہ مؤلف نے بھی اس حدیث کو صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ہم اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ (حدیث نماز: ۱۱۰)

کیا امام کے پیچھے صرف زور سے قرأت منع ہے؟

(۱) اس حدیث کو مؤلف نے صحیح تسلیم کرنے کے باوجود اس سے احناف کے استدلال کو صحیح نہیں تسلیم کیا، اور اس پر لکھا کہ اس حدیث میں آہستہ پڑھنے کی اول تو ممانعت نہیں۔ (حدیث نماز: ۱۱۰)

مگر مؤلف کا یہ دعویٰ بھی بلا دلیل ہے، جیسا کہ ہم آیت کے تحت بیان کر چکے کہ انصاف کے معنی خاموشی اور قطع کلام کے ہیں، اور امام بیہوشی کے استدلال کا جواب بھی ہم دے چکے۔ وہاں مراجعت کی جائے۔

دوسرے اس حدیث میں ”إِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا“ وغیرہ سے ظاہر ہے کہ مقتدی کو تکبیر بلند آواز سے کہنے کا حکم نہیں، بلکہ آہستہ ہی پڑھنے کا حکم ہے، تو اگر قرأت امام کے وقت مقتدی کو صرف جہر سے روکنا تھا تو آپ یہاں بھی یہی فرمادیتے کہ ”جب امام قرأت کرے تو تم بھی قرأت کرو“، جیسا کہ تکبیر کہنے کا حکم فرمایا اور وہ جہر سے نہیں کہا جاتا، ایسا ہی یہ بھی مراد ہوتا، مگر آپ ﷺ نے لفظ انصاف استعمال فرمایا، جس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً منع کرنا مقصود ہے، جہراً بھی سرّاً بھی؛ کیونکہ اگر آپ ﷺ یوں فرماتے ”إِذَا قَرَأَ فَاقْرَأْ وَا“ تو کوئی بھی اس سے جہر سے قرأت مراد نہ لیتا، بلکہ سرّاً پڑھنا ہی مراد لیتا، تو پھر آپ نے اس سے عدول کیوں فرمایا؟

غرض مؤلف کا یہ کہنا کہ اس میں سری قرأت سے منع نہیں کیا ہے، نہ لغت کے

موافق، نہ سیاق و سباق حدیث کے مطابق ہے۔

چہ فرمود؟

(۲) اس کے بعد مؤلف نے دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ یہ (انصات کا) حکم عام ہے، جو حکم خاص کو رد نہیں کر سکتا، اس کو بناء العام علی الخاص کہتے ہیں۔ یہ اصولِ احناف کی کتابوں میں موجود ہے اور مقبول بھی ہے۔ یہاں بھی قبول کرنا پڑے گا۔ (حدیث نماز: ۱۱۰)

راقم کہتا ہے کہ: مؤلف حدیث نماز کو چاہئے کہ پہلے سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم مقتدی کے لیے قرآن یا حدیث سے دکھلائیں، پھر قواعدِ احناف بیان فرمائیں۔ جب ایک حکم بھی اس کا ثابت نہیں، تو یہ قاعدہ بیان کرنے سے کیا فائدہ؟

اور ”لاصلوۃ“ والی حدیث مقتدی کے لیے ہے ہی نہیں، امام و منفرد کے لیے ہے، جس کی پوری بحث رسالہ کے اوائل میں ہم نے کر دی ہے، اور ”لا تفعّلوا إلا بفتح الکتاب“ سے صرف جواز نکلتا ہے اور ہم اس کے قائل ہیں کہ پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں، ہاں اصل حکم مقتدی کے لیے انصات ہی کا ہے، فاتحہ وغیرہ سب میں یہی حکم ہے۔ اور اس کی مثالیں اور نظیریں قرآن و حدیث میں بے شمار ہیں کہ اصل حکم ایک ہے، مگر کسی وجہ سے بعض چیزوں کی رخصت عطاء فرمادی ہے، مگر اس سے اصل حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ”ابوداؤد“ میں ”باب مسح الحصى في الصلوة“ میں ایک حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ”لا تمسح و أنت تصلي، فإن كنت لا بد فاعلاً فواحدةً تسويةً للحصى“ (کنکریاں حالت نماز میں چھوؤ مت، اگر ضروری ہی ہو، تو ایک مرتبہ کنکریاں درست کر لو۔) (ابوداؤد: ۱۳۶/۱)

اس میں ظاہر ہے کہ جو رخصت آپ ﷺ نے دی ہے، یہ کوئی نماز کا حکم شرعی نہیں، بلکہ ضرورت کی بناء پر بادل نخواستہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ضروری ہو تو ایک مرتبہ کنکریاں درست کر لو۔ اگر اس بات کو لے کر کوئی کہنے لگے کہ ایک مرتبہ کنکریاں درست کرنا ضروری ہے، یا مستحب ہے، لہذا کرتے رہو، اور ہرگز ترک نہ کرو، تو ظاہر ہے کہ سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں۔

ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی اس طرح کنکریوں کو درست کر لے تو حدیث سے رخصت ثابت ہے، بالکل اسی طرح زیر بحث مسئلہ میں بھی ہے، یہاں بناء العام علی الخاص نہیں ہے، بلکہ مؤلف کا ”بناء الفاسد علی الفاسد“ ہے، نیز مؤلف کو احناف کا یہ قاعدہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ مطلق اپنے اطلاق پر رہا کرتا ہے، اس کی تخصیص جائز نہیں، اسی طرح عام کی تخصیص ناجائز ہے، جب کہ حکم قرآن میں نسخ و تبدیل کو مستلزم ہو، اور یہاں ایسا ہی ہے کہ قرآن مطلقاً منع کرتا ہے، تو ہم خبر واحد سے اس کی تخصیص کیسے کر سکتے ہیں۔ (فافہم)

احناف کے قواعد بیان کرنے سے پہلے ایک مرتبہ کسی طالب علم سے مؤلف کو اس کی مراد اور مطلب سمجھ لینا چاہئے، ورنہ خواجواہ قصور فہم کا اظہار ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا مسلک

(۳) مؤلف ”حدیث نماز“ نے تیسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھنے کی حدیث کے راوی بھی اس حدیث کی طرح حضرت ابو ہریرہؓ ہیں اور آپ اس حدیث کو روایت کرنے کے باوجود سورہ فاتحہ پڑھنے کا فتویٰ دیتے تھے، اور خود پڑھتے تھے۔ (ملخص از حدیث نماز: ۱۱۰)

راقم کہتا ہے کہ: یہ بات بھی مؤلف کی صحیح نہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ مطلقاً سورہ فاتحہ پڑھنے کا فتویٰ دیتے، یا اس پر عمل کرتے تھے؛ کیونکہ آپ صرف سری نمازوں میں پڑھنے کے قائل تھے۔

چنانچہ ”سنن کبریٰ بیہقی“ میں حضرت ذکوان سے مروی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ و حضرت عائشہؓ دونوں سری نماز میں امام کے پیچھے قرأت کا حکم کرتے تھے، اور ابوصالح سے روایت ہے کہ یہ دونوں حضرات امام کے پیچھے ظہر و عصر کی پہلی دو رکعت میں فاتحہ اور کچھ قرآن پڑھنے کو فرماتے تھے اور حضرت عائشہؓ آخری دو رکعت میں صرف فاتحہ پڑھا کرتی تھیں۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۲/۲۴۴)

نیز اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جہری نماز میں قرأت سے منع کرنے کی روایت آپ ہی سے مروی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عبدالرحمن بن ثوبان نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”ما كان من صلاة يجهر فيها الامام بالقراءة فليس لأحد أن يقرأ معه“ (جو نماز کہ امام اس میں جہر کرے، کسی کو اس میں قرأت کی اجازت نہیں۔) (بیہقی کتاب القراءة: ۱۴۴)

یہ حدیث ہم نے اوپر بھی ایک جگہ پیش کی ہے اور وہیں بتایا تھا کہ اس حدیث کو روایت کر کے امام بیہقی نے منکر کہا ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس کی کوئی مضبوط دلیل نہیں پیش کی کہ یہ کیوں منکر ہے؟ جبکہ اس کے تمام راوی ثقہ و قابل اعتبار ہیں، اور بظاہر کوئی علت اس میں نہیں ہے۔

تو معلوم ہوا کہ آپ جہری میں قرأت کے قائل نہیں تھے۔ اور ”اقرأ بها في نفسك“ میں بھی یہ احتمال ہے کہ سری کے لیے بیان فرمایا ہو، یا یہ کہ مراد تدبر

ونفکر ہو۔

الحاصل جب راوی روایت کو بیان کرنے کے بعد کوئی تاویل کرے (جو ان کا اجتہاد ہوگا) اور یہ روایت کے خلاف ہو، تو یہ اس کی روایت میں قادح نہیں؛ کیونکہ یہ ان کا حدیث میں اجتہاد ہے اور احناف کے یہاں (بچند قیود) فہم راوی معتبر نہیں، اور احناف کے اس قاعدہ میں کہ راوی حدیث کی مخالفت کرے تو یہ روایت میں قادح ہے، راز یہ ہے کہ اس مخالفت سے نسخ کا احتمال آجاتا ہے، ورنہ وہ اس کے خلاف کیوں کرتا، لیکن جب معلوم ہو جائے کہ یہ مخالفت نہیں، بلکہ تاویل ہے، تو پھر یہ قادح نہیں۔ (فہم)

لہذا حضرت ابو ہریرہؓ نے اگر اس روایت کے بعد یہ فتویٰ دیا کہ سری میں قرأت کرو اور خود کرتے بھی تھے تو اس تاویل سے کہ منع جہر میں ہے، جیسا کہ عبدالرحمن بن ثوبان کی روایت میں عن ابی ہریرہ عن النبی ﷺ جہر کی قید منع کے ساتھ ہے، اور ہم نے بتایا کہ فہم راوی حجت نہیں؛ کیونکہ بہت سے دیگر صحابہ نے اس کو سری و جہری، فاتحہ وغیر فاتحہ، سب کے حق میں سمجھا ہے اور اس حدیث میں جہر کی قید پر احناف اس لیے عمل نہیں کرتے کہ ہمارے نزدیک نصوص میں مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں۔ لہذا حدیث انصاف قادح سے بالکل سالم ہے۔

حوالہ کے نام پر ایک اور دھوکہ

(۴) مؤلف ”حدیث نماز“ نے ایک اعتراض ان الفاظ میں کیا ہے کہ:
”یہ بات ہمارے لیے کتنی پیاری اور آپ کے لیے کتنی سبق آموز ہے کہ آپ ہی کے مذہب کی کتاب ”شرح وقایہ کا ترجمہ اردو بنام

نور الہدایہ: ۱۰۱“ پر اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔“ (حدیث نماز: ۱۱۰) راقم کہتا ہے کہ: مؤلف نے یہاں پر صریح دھوکہ دیا ہے، اور اللہ سے بے خوفی اور غفلت عن الآخرت کا مظاہرہ کیا ہے؛ کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ یہاں صاحب ”نور الہدایہ“ نے امام ابوداؤد وغیرہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے نقل کیا ہے کہ امام ابوداؤد وغیرہ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، اس کے بعد ہی اس کا جواب انہوں نے دیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ”اور نہ التفات کیا گیا اس طرف بعد صحت طریق اور اسناد کے“۔ (نور الہدایہ: ۱۰۱)

حاصل ان کے کہنے کا یہ ہوا کہ ابوداؤد وغیرہ نے اس کو ضعیف کہا ہے، مگر ان کی بات کو قبول نہیں کیا گیا؛ کیونکہ حدیث کا طریق اور اس کی سند صحیح ثابت ہوگئی، مگر مؤلف نے دھوکہ دینے کے لیے اس جواب کو نقل نہیں کیا اور کسی کا قول کسی کے سر تھوپ دیا۔ (ما هذا إلا ظلم عظیم و فعل قبیح)

اس سے مؤلف کی سچائی، حق شناسی کا اندازہ لگائیے، اور داد دیجئے کہ اہل حق ہونے کے عریض دعوے کے ساتھ اس طرح کا علمی دھوکہ؟

امام ابوداؤد کی جرح کا جواب

(۵) ایک اعتراض مؤلف ”حدیث نماز“ نے یہ کیا ہے کہ امام ابوداؤد نے فرمایا ہے کہ حدیث: ”إذا قرأ فأنصتوا“ ایک راوی نے زیادہ کر دیا ہے (یعنی حدیث میں یہ نہیں ہے)۔ (حدیث نماز: ۱۱۰)

راقم کہتا ہے کہ: امام ابوداؤد نے اس روایت کو بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ: ”إذا قرأ فأنصتوا“ کی زیادتی غیر محفوظ ہے اور ہمارے نزدیک اس میں وہم ابو خالد کی طرف سے ہے۔ (ابوداؤد: ۸۹/۱)

حاصل اس اعتراض و نقد کا یہ ہے کہ ابو خالد اس زیادتی کو ابن عجلان سے روایت کرتے ہیں اور ابن عجلان کے دوسرے شاگرد اس زیادتی کو ذکر نہیں کرتے، لہذا معلوم ہوا کہ یہ ابو خالد کا وہم ہے، مگر امام ابو داؤد کا یہ نقد و دعویٰ صحیح نہیں؛ کیونکہ یہ ابو خالد سلیمان بن حبان ہیں، ان سے اصحاب صحاح ستہ نے روایت کیا ہے، اور اسحاق بن ابراہیم کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت وکیع سے ابو خالد کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا کہ: کیا ابو خالد ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں سوال کیا جائے؟ یعنی یہ تو اس قدر بڑے ہیں کہ ان کے بارے میں پوچھا نہیں جاسکتا، نیز ابن معین، نسائی، ابن المدینی، نے ان کی توثیق کی ہے، اور ابو ہشام نے ان کو ثقہ اور امین کہا ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۱۶۲/۴، عمدۃ القاری: ۷۰۳/۷)

پھر ان کی متابعت بھی موجود ہے، امام نسائی و دارقطنی نے اس کو روایت کیا ہے، جس میں ابن عجلان سے ان کے ایک دوسرے شاگرد ابو سعد محمد بن سعد الانصاری نے اس زیادتی کو اس روایت میں بیان کیا ہے۔ (سنن نسائی: ۱۰۷/۱، دارقطنی: ۳۲۸/۱)

اور یہ ابو سعد محمد بن سعد ثقہ ہیں، چنانچہ خود امام نسائی و دارقطنی نے اسی جگہ سنن میں کہا کہ: مخرمی نے ان کو ثقہ کہا، اور تہذیب التہذیب میں ہے کہ عثمان دارمی نے کہا کہ میں نے یحییٰ بن معین سے محمد بن سعد کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ: ثقہ ہیں اور نسائی نے کہا کہ: ثقہ ہیں اور ابن حبان نے ان کو ثقافات میں ذکر کیا ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۱۶۲/۹)

اور ”عمون المعبود“ میں منذری سے نقل کیا کہ ابو سعد کی تحیٰ بن معین، محمد بن عبداللہ مخرمی اور نسائی نے توثیق کی ہے۔ (عمون المعبود: ۲۳۵/۱)

اس کے علاوہ اس کی مزید دو متابعات اور ہیں، ایک اسماعیل بن ابن الغنوی نے اور دوسرے ابوسعید محمد بن میسر نے، اسماعیل کی متابعت سنن دارقطنی میں اور محمد بن میسر کی متابعت دارقطنی و مسند احمد میں ہے۔ (دارقطنی: ۳۲۹/۱-۳۲۰ و مسند احمد: ۳۷۶/۲)

دارقطنی نے ان دونوں کو ضعیف کہا ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ متابعات میں ضعیف راوی کی روایت بھی کھپ جاتی ہے۔

الغرض اولاً تو ابو خالد کے ثقہ ہونے کے بعد ان کی طرف وہم کی نسبت کرنا، دشوار بلکہ غیر صحیح ہے، اور پھر جبکہ ان کی متابعات بھی موجود ہیں، تو اس روایت کو غیر محفوظ قرار دینا مقام حیرت ہے؟ اور اگر بالفرض عدم متابعت کو تسلیم کر لیں تو ثقہ کی زیادتی معتبر و مقبول ہوتی ہے، پھر یہ زیادتی غیر محفوظ کیسے ہو سکتی ہے؟

اس کے علاوہ مؤلف ”حدیث نماز“ کے تصور فہم و قلت نظر کو دیکھئے کہ صرف ابوداؤد ہی کی روایت پر اس حدیث کا مدار سمجھ لیا، حالانکہ دوسرے طریق سے ”مسلم شریف“ میں یہ حدیث حضرت ابو موسیٰ اشعری سے موجود ہے، جیسا کہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔

اس کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نے جو کچھ کہا ہے کہ جب تک اس حدیث پر امام ابوداؤد کے اعتراض کا جواب نہ دو گے اور حضرت ابو ہریرہ کے فتوے کو غلط نہیں ٹھہراو گے، وغیرہ وغیرہ، اس کا جواب اوپر کی تفصیل سے واضح ہے اور حضرت ابو ہریرہ کے اجتہاد کا جواب بھی ہم نے اوپر دیدیا ہے۔

احناف کی چوتھی دلیل

علماء حنفیہ کی چوتھی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”مَنْ صَلَّى خَلْفَ الْإِمَامِ فَإِنَّ قِرَاءَةَ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ“ (جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے، تو امام کی قرأت ہی اس کی قرأت ہے۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۲۲۷/۲، کتاب الآثار: ۱۷، مؤطا امام محمد: ۹۸، مسند ابوحنیفہ: ۲۲۷، دارقطنی: ۳۲۵/۱)

اس حدیث کو سفیان ثوری، ابو الاحوص، شعبہ اور امام ابوحنیفہ وغیرہ نے روایت کیا ہے، امام محمد نے ”مؤطا“ میں امام ابوحنیفہ کے طریق سے مرفوعاً و مسنداً اور اسرائیل کے طریق سے مرسللاً روایت کیا ہے، اور ”کتاب الآثار“ میں بھی مسنداً امام صاحب سے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے متن کو حضرت جابر کے مشاہیر میں سے کہا ہے۔ (تلخیص الحمیر: ۸۷/۱)

اور اس کے بعد جو یہ کہا کہ ایک جماعت صحابہ سے یہ روایت مختلف طرق سے ہے، جو سب کے سب معلول ہیں، یہ روایت جابر کے بارے میں نہیں، دوسرے طرق صحابہ کے بارے میں ہے۔

اس حدیث کے تمام رجال ثقہ ہیں، امام ابوحنیفہ تو امام ہیں ہی، اس کے بعد آپ کے شیخ ابوالحسن موسیٰ بن ابی عائشہ کبارتا بعین میں سے ہیں، اور رجال ستہ میں سے ہیں، اسحاق بن منصور نے ابن معین سے نقل کیا کہ یہ ثقہ ہیں، اور ابن حبان نے ان کو ثقافت میں ذکر کیا ہے اور ابو حاتم نے ان کی روایت کو جو مضطرب کہا ہے، یہ تعنت ہے، ورنہ ان کی حدیث صحیح ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۳۱۴/۱۰)

اور اس کے بعد حضرت عبداللہ بن شداد بن الہاد ہیں، اور یہ بھی کبارتا بعین میں سے ہیں، فتح الباری میں ہے کہ عبداللہ صغار صحابہ میں سے ہیں اور ابن عبد البر نے ذکر کیا کہ: یہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں پیدا ہوئے، انہوں نے بہت سے

کبار صحابہ سے روایت کی ہے، ابو زرہ، نسائی، ابن سعد وغیرہ نے ان کو ثقہ کہا ہے۔
(فتح الباری: ۹/۳، تہذیب: ۲۲۲/۵)

اس کے بعد حضرت جابر صحابی رسول ﷺ ہیں اور عبد اللہ بن شداد کا سماع و لقاء حضرت جابر سے ممکن ہے؛ کیونکہ آپ عہد رسول میں پیدا ہوئے ہیں اور پھر بہت سے صحابہ سے آپ نے روایت کی ہے، لہذا امکان لقاء کے بعد جمہور کے مسلک پر انقطاع کا دعویٰ کرنا تعنت ہے، پس روایت متصل اور صحیح ہے۔ چنانچہ علامہ عینی نے فرمایا کہ: یہ سند صحیح ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔ (عمدة القاری: ۶۸/۳، نخب الافکار: ۵۵۳/۲)

اس کے بعد یہ بھی ملاحظہ کریں کہ اس حدیث کو بعض محدثین جیسے امام بیہقی و دارقطنی وغیرہ نے ضعیف قرار دینے کی کوشش کی ہے، مگر صحیح وہی ہے جو عرض کیا گیا، امام بیہقی و دارقطنی نے لکھا ہے کہ: اس حدیث کو ابو حنیفہ کے سوا دوسرے تمام راوی بغیر حضرت جابر کے حوالے کے مرسل روایت کرتے ہیں، یعنی ابو حنیفہ اس کو موصولاً بیان کرنے میں منفرد ہیں۔ (سنن دارقطنی: ۳۲۵/۱، سنن بیہقی: ۲۲۷/۲)

مگر یہ بات صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ امام ابو حنیفہ کے ساتھ اس کو موصولاً بیان کرنے میں حضرت سفیان ثوری، شریک، جریر اور ابوالزہیر بھی شریک ہیں۔ علامہ ابن الہمام نے مسند احمد بن منیع اور مسند عبد بن حمید سے اس کی متعدد متابعات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: ”فہؤلاء سفیان و شریک و جریر و أبو الزہیر فرفعوه بالطرق الصحیحة، فبطل عدہم فیمن لم یرفعہ، ولو تفرد الثقة و جب قبولہ، لأن الرفع زیادة، و زیادة الثقة مقبولة، فکیف ولم ینفرد؟“

(پس یہ سفیان، شریک، جریر، ابوالزہیر نے اس کو صحیح سندوں کے ساتھ مرفوعاً

بیان کیا ہے، لہذا ان لوگوں کا ان محدثین کو مرفوع بیان نہ کرنے والوں میں شمار کرنا باطل ہو گیا، اور اگر ثقہ اس کو تنہا بھی بیان کرتا تب بھی اس کو قبول کرنا واجب ہوتا، اس لئے کہ مرفوع بیان کرنا ایک زیادتی ہے اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہوا کرتی ہے، جب یہ بات ہے تو پھر اس کے بیان کرنے میں وہ منفرد نہ ہو تو کیوں نہ مقبول ہوگا؟ (فتح القدر: ۳۴۶/۱)

اس کے علاوہ اس کی متابعت قاصرہ بھی موجود ہے، وہ یہ کہ امام ابو حنیفہ کے شیخ بواسطہ یعنی عبداللہ بن شداد کی بھی ابوالزبیر نے رفع میں متابعت کی ہے، اور اس کو ابن ابی شیبہ و ابو نعیم نے اور احمد بن منیع نے اپنی اپنی سند سے بیان کیا ہے۔ (الجوہر النقی: ۲۲۸/۲، فلائد الازابار: ۵۸/۲)

عبد بن حمید کی سند میں ان کے شیخ ابو نعیم ہیں، یہ رجال جماعت میں سے ہیں، اور باقی سند میں سب ثقہ رجال مسلم ہیں۔ (اعلاء السنن: ۷۱/۴)

اور ابن ابی شیبہ کی سند صحیح ہے، جیسا کہ ”الجوہر النقی“ میں ہے، اب رہا امام بیہقی کا یہ کہنا کہ اس کی سند میں حسن بن صالح اور ابوالزبیر کے درمیان جابر جعفی اور لیث بن ابی سلیم کا واسطہ ہے اور یہ دونوں ناقابل احتجاج ہیں، تو جواب اس کا یہ ہے کہ ابو نعیم نے مالک بن اسماعیل کی لیث اور جابر کو ذکر نہ کرنے میں متابعت کی ہے۔ لہذا درمیان میں یہ واسطہ قاصرہ نہیں؛ کیونکہ ممکن ہے کہ حسن نے ابوالزبیر سے کبھی ان کے واسطہ سے سنا ہو اور کبھی بلا واسطہ سنا ہو، اور حسن کا ابوالزبیر سے لقاء و سماع ممکن ہے، پس اتصال کیلئے امکان لقاء جمہور کے نزدیک کافی ہے (دیکھو: الجوہر النقی: ۲۲۸/۲)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس حدیث کو موصولاً بیان کرنے میں امام ابو

حنیفہ منفرد نہیں ہیں، بلکہ بڑے بڑے ائمہ حدیث بھی ان کے ساتھ ہیں اور اگر بالفرض مان لیں کہ امام ابوحنیفہ اس میں تنہا ہیں تو بھی اس میں کوئی اشکال نہیں؛ کیونکہ ابوحنیفہ ثقہ امام ہیں، اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے، جیسا کہ اس سے قبل بھی کئی دفعہ بیان کیا جا چکا ہے، الغرض اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ مقتدی کے ذمہ قرأت نہیں ہے، امام کا پڑھنا ہی مقتدی کا پڑھنا ہے، اور اس حدیث میں امام کے پیچھے نماز پڑھنے پر یہ حکم مرتب فرمایا ہے کہ امام کی قرأت مقتدی کی ہے، اور جب کسی حکم کو کسی وصف پر مرتب کیا جاتا ہے تو وہ وصف ہی علت حکم ہوتا ہے۔ (بیضاوی: ۲۱/۱)

لہذا جب بھی اور جو بھی نماز امام کے پیچھے ہوگی، خواہ سری ہو یا جہری، اس میں امام کی قرأت ہی مقتدی کی قرأت ہوگی۔

اس سے ان لوگوں کا قول رد ہو گیا جو اس کو جہری نماز کے ساتھ خاص کرتے ہیں؛ کیونکہ اگر صلوة جہری پر حکم کو مرتب کرنا تھا تو یہ فرمادیتے کہ جب امام جہر کرے تو امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے۔ نیز امام محمدؒ نے ”موطا“ میں اس کو بطریق اسرائیل مرسللاً بیان کیا ہے، جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ کے پیچھے قرأت کی، تو ایک صحابی نے اس کو اشارہ سے منع کیا، جب نماز سے فارغ ہوئے، تو دونوں میں نزاع ہو اور نبی کریم ﷺ نے یہ سن لیا، تو فرمایا کہ: ”من كان له إمام فإن قراءته له قراءه“ (جس شخص کا امام ہو، اس امام کی قرأت ہی مقتدی کیلئے قرأت ہے) (موطا امام محمد: ۱۰۱)

اس حدیث میں عصر کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ حکم جہری کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سری کیلئے بھی یہی حکم ہے اور اس حدیث میں آپ ﷺ نے مطلق قرأت کا حکم بیان

فرمایا کہ فاتحہ ہو یا غیر فاتحہ، کوئی بھی مقتدی کے ذمہ نہیں ہے، اس کو غیر فاتحہ کے ساتھ خاص کرنا حکم محض ہے۔

شبہ اور جواب

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ اگر مقتدی نہ پڑھے، تو امام کی قرأت کافی ہو جائے گی، اس سے وجوب کی تو نفی ہوگئی، مگر استحباب کی نفی نہیں ہوئی، لہذا سورہ فاتحہ پڑھنا چاہئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا شان و رود بتاتا ہے کہ یہاں محض یہ بیان کرنا مقصود نہیں کہ مقتدی کے لئے سورہ فاتحہ پڑھنا واجب و ضروری نہیں، بلکہ اس سے مقصود منع کرنا ہی ہے۔ ہاں موقعہ کی مناسبت سے آپ ﷺ نے ایسے الفاظ استعمال فرمائے جس سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ مقصود وجوب کی نفی ہے۔ چنانچہ ابھی مذکور ہوا کہ آپ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے، (موطا کی مرسل روایت کے مطابق عصر پڑھا رہے تھے) تو کسی نے قرأت کی تو ایک صحابی نے اس کو اشارہ سے منع کیا، نماز سے فراغت کے بعد اس نے کہا کہ تم مجھے آپ ﷺ کے پیچھے قرأت سے روکتے اور منع کرتے ہو؟ بس دونوں میں نزاع ہو گیا، ”موطا کی“ مرسل روایت میں ہے کہ جس نے روکا تھا اس نے کہا کہ: میں قرأت خلف الامام کو مکروہ سمجھتا ہوں، تو آپ ﷺ نے یہ سن لیا اور پھر اس پڑھنے والے سے فرمایا کہ جو امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے ان الفاظ سے قرأت خلف الامام کو مکروہ سمجھنے والے اور اس سے منع کرنے والے کی تصدیق فرمائی تھی، تو اس سے خود معلوم ہوا کہ آپ ﷺ بھی اس کو مکروہ و ناپسند فرماتے تھے، اور یہ الفاظ جو محض وجوب نفی پر

دلالت کرتے ہیں، یہ آپ ﷺ نے اس لئے فرمائے تھے کہ وہ پڑھنے والا شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ امام کے پیچھے بھی قرأت ہے، تو آپ ﷺ نے اس کے گمان کو رد کرنے کے لئے فرمایا: نہیں، اس کے ذمہ قرأت نہیں ہے، امام کا پڑھنا ہی اس کے لئے کافی ہے۔

اس کی نظیر قرآن کی آیت ہے: ﴿ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ﴾ [بقرہ: ۱۵۸] (جو شخص حج یا عمرہ کرنے آئے، تو اس پر صفا و مروہ کا طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں) حالانکہ یہ بات مسلم ہے کہ صفا اور مروہ کی سعی اور طواف واجب و لازم ہے، اور یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ ان کے طواف میں کوئی حرج نہیں، جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طواف محض جائز ہے، واجب و فرض نہیں۔ یہی سوال حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضرت عروہ نے کیا تھا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب ارشاد فرمایا کہ یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی، جو اسلام لانے کے بعد طواف صفا و مروہ میں حرج سمجھتے تھے، تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اس میں کوئی گناہ نہیں۔ (بخاری: ۲۲۲۱)

چنانچہ حضرت انسؓ سے جب عاصم نے سوال فرمایا کہ کیا آپ لوگ سعی بین الصفا و المروہ کو مکروہ سمجھتے تھے؟ تو فرمایا: ہاں، اس لئے کہ وہ شعائر جاہلیت میں سے تھے، یہاں تک کہ اللہ نے ﴿ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ﴾ والی آیت نازل فرمائی۔ (بخاری: ۲۲۳۱)

تو جس طرح یہاں خصوصیت مقام کی وجہ سے فرض و واجب کو ”لا جُنَاحَ“ سے بیان فرمایا، اسی طرح حدیث میں اقتضائے مقام کی وجہ سے نہی و منع کو کافی ہونے سے تعبیر فرمایا ہے۔ لہذا اس سے احناف کا مسلک بالکل واضح ہے۔

افادہ

راقم کہتا ہے کہ: اگر غور کیا جائے تو اس حدیث سے خود نہی نکلتی ہے، تقریر اس

کی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ”من صلی خلف الإمام“ کو شرط بنایا، اس کے بعد اس کی جزا کو آپ ﷺ نے حذف فرمادیا اور اس کی جگہ اس کی علت میں ”فإن قرائته له قراءه“ بیان فرمایا ہے، ورنہ یہ جملہ: ”فإن قراءه له قراءه“ ”من صلی خلف الإمام“ کی جزا بن نہیں سکتا، لامحالہ جزا کو محذوف ماننا پڑے گا، اور وہ ہے: ”من صلی خلف الإمام فلا یقرأ“ (یعنی جو امام کے پیچھے نماز پڑھے وہ قرأت نہ کرے) اس کے بعد اس کی علت بیان فرمائی کہ ”کیونکہ امام کی قرأت ہی مقتدی کی قرأت ہے“، اس لئے نہ پڑھے، تو یہاں کافی ہونے کی بات ہے ہی نہیں، بلکہ حکم تو ”فلا یقرأ“ کا ہے کہ نہ پڑھو، اور اس طرح کا حذف کرنا کلام میں شائع و ذائع ہے

چنانچہ کسی شاعر کا شعر ہے:

ومن يك امسى بالمدينة رحله في انبي وقيار بها لغريب
(جس شخص کا گھر مدینہ میں ہو) تو اس کا حال بہتر ہوتا ہے) اور میرے
گھوڑے قیار کا حال برا ہے) کیونکہ میں اور قیار تو مسافر ہیں)
اس شعر میں ”ومن يك“ کی جزا ”حسن حاله و أسائت حالتي
وحالة قيار“ محذوف ہے، پھر آگے ”فانی“ سے اس جزا کی علت بیان کی ہے،
ایسا ہی حدیث میں ہے۔ (فانہم)

اور ”فلا یقرأ“ کی تقدیر کا قرینہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ فرمان و ارشاد قرأت
خلف الامام کو مکروہ سمجھنے والے اور اس سے منع کرنے والے کی تصدیق و تائید
میں بیان فرمایا ہے، لہذا اس کے مناسب یہی تقدیر ہے، اور ”فإن قراءه الإمام
له قراءه“ اس تقدیر کے خلاف نہیں؛ کیونکہ یہ جیسا کہ مذکور ہوا خصوصیت مقام کی
وجہ سے ہے۔ چنانچہ اس تقدیر کی تائید دوسری حدیث سے ہوتی ہے، وہ یہ کہ کتاب

القرآۃ میں بیہتی نے حضرت یحییٰ بن عبداللہ بن سالم اور حضرت یزید بن عیاض رحمۃ اللہ علیہما سے صاف یہی الفاظ روایت کئے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ”من کان منکم له إمام فائتم بہ فلا یقرأ معہ ، فإن قراءتہ له قراءۃ“ (تم میں سے جس کا امام ہو، جس کی وہ اقتداء کرتا ہے، وہ اس کے ساتھ قرأت نہ کرے؛ کیونکہ امام کی قرأت ہی اس کی قرأت ہے) (کتاب القراءۃ للبیہقی: ۲۰۸)

اس میں مراد بالکل واضح ہے، بیہتی نے اس کے راوی یحییٰ بن عبداللہ کے بارے میں ”فیہ نظر“ لکھا اور یزید بن عیاض کے بارے میں لکھا ہے کہ: تمام ہی محدثین نے اس پر جرح کی ہے۔ صاحب ”اعلاء السنن“ نے اس کا جواب دیا کہ یحییٰ رجال مسلم میں سے ہیں، نسائی نے ان کی توثیق کی اور مستقیم الحدیث کہا اور دارقطنی نے بھی ثقہ کہا۔ (تہذیب: ۲۴۰/۱۱) اور یزید کی یحییٰ نے متابعت کی ہے، پس جب مرسل کی دوسرے طریقے سے تائید ہوئی تو قوی ہو گیا، اور باقی راوی سب ثقہ ہیں۔ (اعلاء السنن: ۸۶/۴)

نیز دارقطنی و بیہتی نے امام شععیؒ سے مرسل روایت کیا کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”لا قرأۃ خلف الإمام“ (یعنی امام کے پیچھے کوئی قرأت نہیں) (دارقطنی: ۳۳۰/۱، کتاب القراءۃ: ۱۸۸)

یہ حدیث مرسل ہے، دارقطنی نے اس کو موصولاً بھی ذکر کیا ہے، مگر اس پر ضعف کا حکم لگایا ہے اور کہا کہ مرسل جو اول مذکور ہوا ہے، اس موصول سے زیادہ صحیح ہے۔ اور ہمارے یہاں اول تو مراسیل حجت ہیں اور شععیؒ کے مراسیل کے بارے میں احمد و عجل نے فرمایا کہ: شععی کے مراسیل صحیح ہوتے ہیں، یہ حدیث صحیح کا ہی ارسال کرتے ہیں، اور اس کے ایک راوی محمد بن سالم ضعیف ہیں، مگر علامہ سیوطیؒ

کی ”کشف الاحوال“ سے ”اعلاء السنن“ میں نقل کیا کہ: یہ رجالِ ترمذی میں سے ہیں اور غیر متہم بالوضع ہیں، اور ”تہذیب“ سے نقل کیا کہ ائمہ ثقافت نے ان سے روایت کی ہے۔ (اعلاء السنن: ۸۲/۴-۸۳)

غرض یہ کہ یہ اگرچہ ضعیف ہے، مگر ناقابلِ احتجاج نہیں، لہذا یہ روایت اعتبار و استشہاد میں ہر طرح مقبول ہوئی۔ اس روایت کی اس ضعیف موصول روایت سے بھی تائید ہوگئی، تو کیوں نہ قابلِ احتجاج ہو؟

رہا یہ کہ امامِ شعی کا فتویٰ ہے کہ امام کے پیچھے ظہر اور عصر کی اول دو رکعتوں میں فاتحہ اور دوسری سورت پڑھو اور آخری دو رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھو۔ (کتاب القراءۃ: ۱۰۵)

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے امامِ شعی نے ”لا قراءۃ خلف الإمام“ کو جہری نمازوں پر محمول کیا ہو، ظہر اور عصر میں سری ہونے کی بناء پر اجازت یا حکم دیا ہو، لہذا فتویٰ اور حدیث میں تعارض نہیں اور کوئی راوی حدیث بیان کر کے کسی تاویل سے اس کے خلاف حکم یا عمل کرے، تو احناف کے نزدیک یہ بات روایت میں قادح نہیں ہے اور ان کی تاویل ہم پر لازم نہیں ہے۔

اس شبہ کا ایک دوسرا جواب صاحب ”اعلاء السنن“ نے یہ دیا ہے کہ احناف کا قاعدہ اس وقت ہے جبکہ یہ ثابت ہو جائے کہ فتویٰ روایت کے بعد کا ہے، اور اگر فتویٰ روایت سے پہلے کا ہے، تو پھر فتویٰ موجبِ قدرح نہیں، نیز کہا کہ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں؛ کیونکہ ”لا قراءۃ“ سے ممکن ہے کہ وجوب کی نفی مراد لی ہو، اور فتویٰ میں استحباب مراد ہو۔ پس تاویل کے بعد روایت میں قدرح نہیں۔ (اعلاء السنن: ۸۲/۴) (واللہ تعالیٰ اعلم)

راقم کہتا ہے کہ: فتویٰ میں ظہر و عصر کی قید ہماری تاویل کی ظاہراً تائید کر رہی ہے، اور صاحب ”اعلاء السنن“ کا پہلا جواب بھی بڑا قیمتی ہے۔ (فاحفظہ)
 الحاصل ”من صلی خلف الإمام“ میں جزا ”فلا یقرأ“ کا محذوف ہونا مؤید بالقرآن ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس حدیث سے مقتدی کو سری و جہری دونوں نمازوں میں قرأت فاتحہ وغیر فاتحہ سب سے منع کیا گیا ہے اور دوسری روایات کا استثناء محض اباحتِ مرجوحہ ہے، جو اس مطلق منع کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لہذا نہ پڑھنا ہی منشأ حدیث ہے، ہاں کوئی پڑھ لے تو حرج کچھ نہیں، جائز ہے۔

ضعف و ارسال کی بحث

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس حدیث ”من کان له إمام الخ“ پر ضعف و ارسال کا حکم لگایا اور اس حدیث کو صحیح حدیث کے مقابل ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول قرار دیا۔ (حدیث نماز: ۱۰۹)

مگر مؤلف نے اس ضعف و ارسال کی وجہ و دلیل بیان نہیں کی تو بلا دلیل کسی کا حکم کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ ہم نے اوپر علامہ ابن الہمام و امام ابن منیع و علامہ عینی کے اقوال اس حدیث کے سلسلہ میں بیان کئے تھے، کہ یہ حدیث صحیح اور علی شرط الشیخین ہے، تو ہم مؤلف کی بات کو کیسے مان لیں، جب کہ مؤلف نے اس کے ضعف و ارسال کی کوئی دلیل نہیں دی؟ کیا امام ابوحنیفہ ضعیف ہیں، جس کی وجہ سے حدیث میں ضعف آیا یا اور کوئی راوی ہیں؟ جن کے تراجم اوپر مذکور ہوئے یا اور کوئی وجہ ضعف ہے، اور مرسل ہے، تو کیوں ہے؟ جب کہ اسکی سند متصل ہے، ہاں ایک طریق ”موطا“ میں مرسل بھی ہے، مگر اس کے مرسل ہونے سے تمام طرق کا مرسل ہونا لازم نہیں آتا، پھر کس دلیل سے مؤلف نے ارسال کا حکم لگایا؟

بات یہ ہے کہ یہ دراصل امام بخاریؒ اور امام بیہقیؒ کی تقلید میں مؤلف نے حکم لگایا ہے، اگرچہ بے دلیل ہونے کی وجہ سے جواب دہی کی ہمیں ضرورت نہ تھی، تاہم کسی کو ان حضرات کے کلام سے غلط فہمی نہ ہو اس لئے اس کا جواب ہم یہاں بعون اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں۔

امام دارقطنیؒ نے ”سنن“ میں ابوحنیفہؒ کے طریق سے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرمایا کہ: موسیٰ بن ابی عائشہ سے سوائے ابوحنیفہ اور حسن بن عمارہ کے کسی نے اس کو مسنداً بیان نہیں کیا اور ابوحنیفہ اور حسن بن عمارہ دونوں ضعیف ہیں، ان دونوں کے علاوہ ابوالحسن موسیٰ بن ابی عائشہ سے روایت کرنے والے سفیان ثوری، ابوالاحوص، شعبہ، اسرائیل، شریک، ابو خالد الدالانی اور سفیان بن عیینہ وغیرہم نے اس حدیث کو مسلاً بیان کیا ہے اور یہی صواب ہے، اور امام بیہقی نے بھی لکھا ہے کہ: اس حدیث کو ابوحنیفہ کے سوا سب نے مسلاً روایت کیا ہے۔ (سنن دارقطنی: ۳۲۵/۱، سنن بیہقی: ۲۲۷/۲)

حاصل اس کا دو اعتراضات ہیں: ایک یہ کہ یہ روایت مرسل ہے، مسند نہیں، اور دوسرے یہ کہ ابوحنیفہؒ ضعیف راوی ہیں، اور انہوں نے اپنے وہم کی وجہ سے اس کو مسنداً روایت کر دیا ہے۔

کیا ابوحنیفہ ضعیف ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ امام دارقطنیؒ نے باوجود اس کے کہ بڑے پایہ کے محدث اور عالم تھے، یہ بات جو فرمائی کہ امام ابوحنیفہؒ ضعیف ہیں، بڑی ہی نازیبا حرکت کی، جو ان کی شایان شان نہیں تھی، کیا کوئی دارقطنی کی اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے؟ وہ امام ابوحنیفہؒ جن کی تعریف میں تمام ہی امت کے اکابر اور ائمہ، علماء، صلحاء،

مشائخ و صوفیاء رطب اللسان ہیں اور آپ کے گیت گا کر اپنے قلب کو سکون پہنچاتے ہیں اور جن کے علم و فقہ سے ساری دنیا فیض یاب ہو رہی ہے، اور جنہوں نے ساری عمر دین حق کی تدوین و تحقیق میں گزاری، یہ کیا اسی قابل تھے کہ ان پر ضعف کا حکم لگایا جائے اور ان کو ذلیل و رسوا کرنے کی ناکام و بیہودہ کوشش کی جائے؟

اسی وجہ سے علامہ عینیؒ نے ”عمدة القاری“ میں غضبناک لہجہ میں لکھا کہ: ”لو تأدب الدارقطنی واستحیی لما تلفظ بهذه اللفظة في حق أبي حنيفة، فإنه إمام طبق علمه الشرق والغرب“ (اگر دارقطنی کو ذرا بھی ادب ہوتا اور ذرا بھی شرم و حیاء ہوتی، تو امام ابوحنیفہؒ کی شان میں ایسا لفظ اور کلمہ نہ کہتے؛ کیونکہ وہ تو امام ہیں جن کا علم مشرق و مغرب میں پھیلا ہوا ہے) (عمدة القاری: ۴/۴۴۹)

پھر آپ کی توثیق کرنے والوں کے نام اور اقوال لکھ کر فرمایا کہ: اس سے دارقطنی کا امام ابوحنیفہؒ پر ظلم کرنا اور ان کا فاسد تعصب ظاہر ہو گیا، اور دارقطنی کی تو ان مؤثقیں حضرات کے مقابلے میں کوئی قدر و منزلت ہی نہیں کہ یہ ایسے امام پر نقد کرنے لگے، جو ان مؤثقیں سے بھی دین و تقویٰ اور علم میں مقدم ہیں۔ (عمدة القاری: ۴/۴۴۹)

یہاں امام صاحب کے وہ سارے مناقب بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، جو اسماء الرجال و تاریخ کی کتابوں میں سنہری حروف سے لکھے گئے ہیں، یہ تو ساری دنیا جانتی ہے۔ البتہ بطور نمونہ بعض اہم اقوال یہاں ذکر کر دینا مناسب ہے تاکہ حقیقت واضح ہو جائے۔

(۱) امام یحییٰ بن معین جو فن اسماء الرجال کے امام ہیں، انھوں نے فرمایا کہ: ابوحنیفہ حدیث میں ثقہ و قابل اعتماد تھے اور آپ وہی حدیث بیان کرتے تھے جو حفظ

ہوتی اور جو حفظ نہ ہوتی اس کو بیان نہیں کرتے تھے۔ (تہذیب الکمال: ۲۹/۴۳۴،

تہذیب التہذیب: ۴۰۱/۱۰)

(۲) امام یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا کہ ابوحنیفہ کے بارے میں کیا رائے ہے؟ تو فرمایا کہ: وہ ثقہ ہیں، میں نے کسی کو ان کی تضعیف کرتے نہیں سنا، یہ شعبہ ہیں جو ابوحنیفہ کو لکھتے ہیں کہ: آپ حدیث بیان کریں، اس کا ان کو حکم دیتے ہیں، اور شعبہ تو شعبہ ہیں۔ (الانتقاء: ۱۹۷)

(۳) امام علی بن المدینی جو امام بخاری کے استاد ہیں وہ کہتے ہیں کہ: امام ابوحنیفہ سے سفیان ثوری اور ابن المبارک نے روایت کیا ہے اور وہ ثقہ تھے، ان میں کوئی خرابی نہیں۔ (الجواہر المصنیۃ: ۲۹/۱)

(۴) امام ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ اسماعیل بن داؤد نے کہا کہ: امام ابن المبارک، امام ابوحنیفہ کی ہر خوبی بیان کرتے اور ان کی توثیق و تعدیل کرتے اور ان کی تعریف فرماتے تھے۔ (الانتقاء: ۲۰۶)

(۵) یزید بن ہارون محدث نے فرمایا کہ: میں نے ایک ہزار آدمیوں سے ملاقات کی اور ان میں سے اکثر سے حدیث کا علم حاصل کیا، لیکن پانچ حضرات سے زیادہ علم و فقہ میں اور تقویٰ میں کسی کو نہیں دیکھا اور ان پانچ میں اول نمبر پر ابوحنیفہ ہیں۔ (تاریخ بغداد: ۳۶۳/۱۳)

یہ چند اقوال ہیں جن میں امام ابوحنیفہ کی جلالت و عظمت بڑے بڑے ائمہ حدیث نے بیان کی ہے، اس سلسلہ میں ائمہ حدیث و فقہ کے اقوال کا احاطہ کیا جائے تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے جیسا کہ بعض حضرات نے امام ابوحنیفہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، امام ابن عبدالبر کی کتاب ”الانتقاء فی مناقب الائمة الثلاثة

الفقهاء، امام سیوطی کی کتاب ”تبییض الصحیفۃ“، امام ابن حجر مکی کی کتاب ”الخیرات الحسان“، امام محمد بن یوسف شافعی کی ”عقود الجمان فی مناقب النعمان“ اور امام ذہبی کا رسالہ وغیرہ کتابیں دیکھ لیں۔

لہذا دارقطنی کا امام صاحب کی تضعیف کرنا باطل و مردود ہے؛ کیونکہ محدثین کا قاعدہ ہے کہ ”ان من صحت عدالتہ و ثبتت فی العلم أمانتہ و بانت ثقته و عنایتہ بالعلم لم یلتفت فیہ الی قول أحد إلا أن یأتی فی جرحته ببینة عادلة“ (جس کی عدالت صحیح طور پر ثابت ہو اور علم کے بارے میں اس کی امانت معلوم ہو، اس کی ثقاہت و علم کے بارے میں اس کی خدمت ظاہر ہو، اس کے بارے میں کسی کا قول بھی قابل توجہ نہیں مگر یہ کہ وہ کوئی عادل گواہ لائے) (جامع بیان العلم: ۱۳۹/۲)

جب امام ابوحنیفہؒ کی عدالت و ثقاہت، امانت و دیانت مسلمات میں سے ہے تو اس کے خلاف کسی کا لب کشائی کرنا نہایت درجے مکروہ حرکت ہے جس کی طرف التفات کا بھی سوال نہیں ہوتا۔ مؤرخ شہیر علامہ ابن خلدون اپنے معرکہ الآراء ”مقدمہ“ میں فرماتے ہیں کہ:

”بعض بغض و عناد رکھنے والے لوگ کہتے ہیں کہ مجتہدین میں سے بعض حدیث کے بارے میں قلیل البضاعت تھے، اسی لئے ان کی روایت حدیث کم ہوگئی مگر ائمہ کبار کے بارے میں اس اعتقاد کی کوئی گنجائش نہیں؛ کیونکہ شریعت تو کتاب و سنت ہی سے اخذ کی جاتی ہے اور جو حدیث میں کم سرمایہ رکھنے والا ہو اس پر یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی طلب و جستجو میں لگے تا کہ اصول صحیح سے دین حاصل کرے اور احکام کو ان کے اصل مبلغ سے حاصل کر سکے اور امام ابوحنیفہ نے

جو روایت کم کی ہے تو اس کی وجہ روایت اور اس کے تحمل کے شرائط میں ان کا سخت ہونا ہے، یہ نہیں کہ انہوں نے عمداً حدیث کی روایت ترک کر دی تھی اور حدیث کے علم میں آپ کے کبار مجتہدین میں ہونے پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ علماء کے درمیان آپ کے مذہب پر اعتماد اور بھروسہ ہے اور رداً و قبولاً اس کا اعتبار کیا جاتا ہے (مقدمہ ابن خلدون: ۴۴۴)

الغرض جس کی امامت ثابت ہو جائے اور جس کی تعریف کرنے والے زیادہ ہوں، تو پھر کسی کی جرح قبول نہیں کی جائے گی، بلکہ ایسے کی جرح کرنے والا خود ہی مجروح قرار دیا جائے گا۔ اور اگر کسی کا کسی پر جرح کرنا ہر صورت میں قابل لحاظ سمجھا جائے تو پھر دنیا میں کوئی بھی قابل اعتبار راوی و محدث نہ ملے گا؛ کیونکہ ہر ایک پر کوئی نہ کوئی جرح موجود ہے۔ زیادہ کیا کہا جائے، فن اسماء الرجال کے امام، رأس المحدثین علی بن المدینی سے کون صاحب علم ناواقف ہوگا، ان کی جلالت و عظمت، ان کی علم حدیث میں مہارت و لیاقت ایک مسلمہ بات ہے، مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان کو امام عقیلی نے ضعفاء میں شامل کیا ہے، لیکن یہ جرح اور ان کو ضعیف قرار دینا معتبر نہیں سمجھا گیا، بلکہ حافظ ذہبی کو امام عقیلی کی اس حرکت پر ”بئسَ مَا صَنَعَ“ کہنا پڑا، اور جب برداشت نہ ہو تو چیخ کر یہ کہنا پڑا کہ: ”أَفَمَا لَكَ عَقْلٌ يَا عَقِيلِي؟“ (اے عقیلی! تمہیں کیا عقل نہیں ہے؟ کیا جانتے نہیں کہ کس کے بارے میں کلام کر رہے ہو؟) (میزان الاعتدال: ۱۶۹/۵)

اسی طرح امام الحدیث و امیر المؤمنین فی الحدیث سیدنا امام بخاری کی ثقاہت و عظمت کس سے پوشیدہ ہے؟ مگر آپ کے بارے میں ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ: میرے والد ابو حاتم اور ابو زرعة نے ان سے حدیث سنی، پھر ان کی حدیث کو ترک

کر دیا تھا جبکہ محمد بن یحییٰ نسیسا بوری نے ان کو لکھا تھا کہ: امام بخاری نے ان کے پاس اس بات کا اظہار کیا کہ قرآن کا تلفظ مخلوق ہے۔ (الجرح والتعديل: ۱۹۱/۷)

اب فرمائیے کہ کیا عقیلی کے ابن المدینی کو ضعفاء میں شامل کر دینے اور ابو حاتم و ابو زرعة و محمد بن یحییٰ نسیسا بوری کے امام بخاری کو ترک کر دینے سے دنیا نے ان حضرات کو ضعیف و ناقابل سمجھ کر چھوڑ دیا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ معلوم ہوا کہ ہر جرح کا اعتبار نہیں ہوتا، پس یہی حال دارقطنی کی جرح کا بھی ہے جو امام ابو حنیفہ کے بارے میں انھوں نے کی ہے۔ لہذا ان کی جرح کا کوئی ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوگا، پس امام ابو حنیفہؒ، ثقہ، عادل، ضابط، متقن، سبھی کچھ ہیں، اس میں شک کرنا فن اسماء الرجال سے اعتماد کو ہٹانے کے مترادف ہے۔

ارسال کا جواب

اب رہا امام دارقطنیؒ کا یہ کہنا کہ اس روایت کو موسیٰ ابن ابی عائشہ سے روایت کرنے والے بہت سے لوگ ہیں، جنہوں نے اس کو مرسللاً روایت کیا ہے، مسنداً صرف ابو حنیفہؒ اور حسن بن عمارہؒ نے روایت کیا۔

مگر یہ بات صحیح نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر اس پر کلام کیا ہے؛ کیونکہ امام ابو حنیفہ کے ساتھ اس کو موصولاً بیان کرنے میں حضرت سفیان ثوری، شریک، جریر اور ابوالزبیر بھی شریک ہیں۔ ہم نے وہیں پر علامہ ابن الہمام کے حوالے سے مسند احمد بن منیع اور مسند عبد بن حمید سے اس کی متعدد متابعات نقل کی تھیں۔

پس سفیان، شریک و جریر اور ابوالزبیر اس کو مرقولاً روایت کرنے میں امام ابو حنیفہؒ کی متابعت کر رہے ہیں، پس معلوم ہوا کہ امام ابو حنیفہؒ مسنداً بیان کرنے میں متفرق نہیں ہیں، بلکہ اس کی متابعات کاملہ و قاصرہ موجود ہیں، اور اگر بالفرض ہم مان

لیں کہ امام صاحب اس کی اسناد کرنے میں متفرد ہیں، تو خود محدثین کے قواعد سے ثابت ہے کہ ثقہ کا تفرّد اور اس کی زیادتی مقبول ہوتی ہے۔ (کما مراراً)
 تو کیا امام صاحب ثقہ نہیں ہیں؟ اگر کسی کے نزدیک امام صاحب اس کی جہالت یا تجاہل کی وجہ سے ثقہ نہ ہوں، تو کیا ہمارے لیے اس جہالت کی اتباع و تقلید لازم ہے؟ کہ ہم آپ کو ضعیف مان کر روایت کو ترک کر دیں؟
 اب رہا حسن بن عمارہ کا ضعف، اس سے ہمیں کیا لینا ہے، ہم اس سے احتجاج ہی نہیں کرتے اور پھر جب اتنے ثقات اس کو مسند کرنے میں حسن کے ساتھ ہیں، تو پھر اس ضعف کا انجبار ہو ہی جاتا ہے۔

حدیثِ مرسل کی مقبولیت

اور اگر اس حدیث کو مرسل ہی مان لیں جیسا کہ بعض لوگوں کا اصرار ہے تو بھی اس سے احتجاج میں کوئی اعتراض نہیں؛ کیونکہ دور اول میں مرسل سے احتجاج ہی جمہور کا مسلک رہا ہے، اور اگرچہ کہ مرسل کے بارے میں جمہور محدثین کی رائے یہ ہے کہ وہ ناقابل اعتبار ہے، اسی لیے وہ اس کو مردود کے اقسام میں شمار کرتے ہیں، مگر اس سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے حتیٰ کہ بعض نے یہاں تک کہا ہے کہ مرسل سے احتجاج کا سلسلہ برابر رہا ہے اور سب سے پہلے جنہوں نے اس کو ناقابل احتجاج قرار دیا، وہ امام شافعی ہیں۔

امام ابو داؤد نے اہل مکہ کے نام جو خط لکھا تھا، اس میں وہ فرماتے ہیں:

”اما المراسیل فقد کان یحتج بہا العلماء فی ما مضی مثل سفیان الثوری و مالک و الاوزاعی حتی جاء الشافعی فتکلم فیہ و تابعہ علی ذلک أحمد بن حنبل و غیرہ“۔ (رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکة: ۲۴)

اور امام ابن جریر الطبری نے کہا کہ:

”وأجمع التابعون بأسرهم على قبول المرسل ولم يأت عنهم إنكاره ولا عن أحد من الائمة بعدهم إلى رأس المأتين، قال ابن عبد البر: كأنه يعنى أن الشافعي أول من رده.“ (تدريب الراوي: ۱۰۴/۱)

اگرچہ یہ اجماع کا دعویٰ محل نظر ہے جیسا کہ حافظ نے ”النکت علی ابن الصلاح“ میں اور حافظ سخاوی نے ”فتح المغیث“ میں لکھا ہے۔ تاہم اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جمہور تابعین کے نزدیک مرسل کو قابل احتجاج سمجھا جاتا تھا۔ مالکیہ نے امام مالک کا مذہب یہی لکھا ہے کہ: وہ مرسل کو حجت قرار دیتے تھے۔ (التمہید لابن عبد البر: ۲/۱)

اور امام ابو حنیفہ کا بھی یہی مسلک ہے، ابن الصلاح نے فرمایا کہ:

”والاحتجاج به مذهب مالك وأبي حنيفة وأصحابهما رحمهم الله في طائفة“۔ (مقدمہ ابن الصلاح: ۳۱)

اور امام نووی فرماتے ہیں:

”وقال مالك وأبو حنيفة وأصحابهما وطائفة من العلماء يحتج به.“

(ارشاد الطلاب: ۱۷۲/۱)

امام ابو حنیفہ کا مسلک اس سلسلہ میں یہ ہے کہ:

تابعین اور تبع تابعین کے مرسلات مقبول ہیں اور اس کے بعد والوں کے مرسلات قابل قبول نہیں، الا یہ کہ راوی کی عادت ہو کہ وہ صرف ثقہ سے روایت کرتا ہو، تب اس کی مرسل حدیث قبول کی جاسکتی ہے۔
علامہ ابن حنبلہ ”تقوالاثر“ میں فرماتے ہیں:

”والمختار في التفصيل قبول مرسل الصحابي مطلقاً ومرسل أهل القرن الثاني والثالث عندنا (أي الحنفية) وعند مالك مطلقاً — وأما مرسل من دون هؤلاء فمقبول عند بعض أصحابنا، مردود عند آخرين إلا أن يروي الثقات مرسله كما رووا مسنده، فإن كان الراوي يرسل عن الثقات وغيرهم فعن أبي بكر الرازي من أصحابنا وأبي الوليد الباجي من المالكية عدم قبول مرسله إتفاقاً.“ (فتاوى الاثر: ۱/۶۷)

(اس مسئلہ کی تفصیل میں مختار قول یہ ہے کہ صحابی کی مرسل حدیث مطلقاً اور دوسرے اور تیسرے قرن کی مرسل حدیث (حنفیہ کے نزدیک) قابل قبول ہے، اور امام مالک کے نزدیک بھی مطلقاً مقبول ہے، اور رہیں ان کے بعد والوں کی مرسل حدیثیں تو وہ ہمارے بعض اصحاب کے نزدیک مقبول ہیں اور بعض دیگر حضرات کے نزدیک مردود ہیں مگر یہ کہ اس راوی کی مرسل حدیث ثقہ حضرات روایت کریں جیسے اس کی مسند روایت کرتے ہیں، پس اگر راوی ایسا ہے کہ ثقہ وغیر ثقہ سب سے ارسال کرتا ہو تو ہمارے اصحاب میں سے ابو بکر رازی سے اور مالکیہ میں سے ابو الولید باجی سے مروی ہے کہ بالاتفاق اس کی مرسل حدیث نامقبول ہے)

امام بزدویؒ ”کنز الاصول إلی معرفة الاصول“ میں فرماتے ہیں:

”وأما إرسال القرن الثاني والثالث فحُجَّة عندنا، وهو فوق المسند، كذا ذكره عيسى بن أبان وأما إرسال من دون هؤلاء فقد اختلف فيه، فقال بعض مشائخنا يُقبَلُ إرسال كلِّ عدل، وقال بعضهم لا يُقبَلُ، أما وجه الأول فما ذكرنا، وأما الثاني فلأن الزمان زمان فسق فلا بد من البيان إلا أن يروي الثقات مرسله كما رووا مسنده مثل إرسال محمد بن حسن“۔ (اصول بزدویؒ: ۱۷۱-۱۷۲)

اور امام حسام الدینؒ نے فرمایا:

”فالمُرسل من الصحابي محمول على السماع ، ومن القرن الثاني والثالث علي أنه وضح له الأمر واستبان له الإسناد ، وهو فوق المسند فإن من لم يتضح له الأمر نسبه إلى من سمعه منه ليحمله ما تحمل عنه لكن هذا ضرب مزية يثبت بالاجتهاد فلم يجز النسخ بمثله ، وأما مراسيل من دون هؤلاء فقد اختلف فيه إلا أن يروي الثقات مرسله كما رَوَوْا مسنده-“ (منتخب حسامی مع شرح النامی: ۱۳۶/۱-۱۳۷)

ان عبارات سے مستفاد ہوا کہ احناف کے نزدیک:

(۱) ایک صحابی دوسرے صحابی سے جو حدیث مرسلًا بیان کرے وہ باتفاق علماء مقبول ہے۔

(۲) قرن تابعین و تبع تابعین کی مرسل احادیث بھی مطلقاً مقبول اور حجت ہیں۔

(۳) اس کے بعد کے لوگوں کی مرسل حدیث کے بارے میں احناف میں اختلاف ہے، بعض فرماتے ہیں کہ ہر عادل وثقہ کی مرسل حدیث مقبول ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ چونکہ قرون مشہود لہا بالخیر کے بعد کذب اور فسق پھیلا ہوا تھا، لہذا بعد کے دور کی مرسل حجت نہ ہوگی۔

(۴) لیکن اگر بعد کے دور کی مرسل حدیث کو ثقات و لائق اعتماد محدثین روایت کریں جس طرح اس راوی کی مسند روایت کو روایت کرتے ہیں، تو وہ بھی باتفاق احناف مقبول و حجت ہے۔

اور امام شافعیؒ بھی مطلقاً مرسل حدیث کو رد نہیں فرماتے بلکہ بعض شرائط کے ساتھ ان کے نزدیک وہ حجت ہے۔ ان شرائط کی تفصیل یہ ہے:

(۱) مرسل کی تقویت کسی مسند حدیث سے ہو۔

(۲) مرسل کی تقویت کسی اور مرسل حدیث سے ہو جو دوسرے راوی سے

آئے۔

(۳) بعض صحابہ کا قول اس مرسل حدیث کے موافق ہو۔

(۴) اکثر اہل علم کا قول اس کے موافق ہو۔

امام نوویؒ مقدمہ ”شرح مسلم“ میں لکھتے ہیں:

”ومذهب الشافعي أنه إذا انضم إلى المرسل ما يعضده احتج به ،
وذلك بأن يُروى أيضاً مُسنداً أو مرسلًا من جهة أخرى أو يعمل به بعضُ
الصحابة أو أكثر العلماء۔“ (مقدمہ شرح مسلم: ۱۷۱)

حافظ ابن رجب حنبلیؒ نے فرمایا کہ:

”واحتج بالمرسل أبو حنيفة وأصحابه ومالك وأصحابه ، وكذا
الشافعي وأحمد وأصحابهما إذا اعتُضدَ بمُسنَدٍ آخر أو مرسل آخر
بمعناه عن آخر ، فيدُلُّ على تعدُّد المنخرج أو وافقه قول بعض الصحابة
أو قال به أكثر أهل العلم۔“ (تعلیق مقدمہ اعلاء السنن لأبي غدة: ۱۴۰)

خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ و امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک قرن
ثانی و ثالث کی حدیث مرسل تو مطلقاً مقبول ہے اور اس کے بعد کی وہ مرسل بھی
مقبول ہے جس کو ائمہ ثقافت روایت کریں، اور امام شافعی و احمد کے نزدیک چار شرائط
سے جن کا اوپر ذکر ہوا، مرسل حدیث مقبول ہے، اور اسی وجہ سے امام شافعیؒ نے سعید
بن مسیب کی مراسیل کو مقبول فرمایا ہے جیسا کہ امام نوویؒ نے ”ارشاد الطلاب“ میں
اور ابن الصلاح نے ”مقدمہ“ میں اور امام سیوطی نے تدریب الراوی میں اور دیگر
حضرات نے بھی لکھا ہے۔ (ارشاد الطلاب: ۱۷۱، مقدمہ ابن الصلاح: ۳۱،

تذریب الراوی: ۱۰۴۱)

جب حدیث مرسل کے بارے میں معلوم ہو گیا کہ اس کا کیا مقام ہے تو اب غور کیجئے کہ زیر بحث یہ روایت اگر مرسل ہے، تو مرسل صحابی ہے؛ کیونکہ ابن عبد البر وغیرہ نے عبد اللہ بن شداد کو مولودنی عہد رسول اللہ قرار دیا ہے، اور حافظ ابن حجر نے تصریح کر دی کہ عبد اللہ بن شداد بن الہاد صغیر صحابہ میں سے ہیں۔ (فتح الباری: ۹۳)

اور یہ مرسل دوسرے مرسل شعی سے اور حدیث مسند مرفوع صحیح ”اذا قرأ فأنصتوا“ سے اور عبد اللہ بن عمرؓ و عبد اللہ بن مسعودؓ وغیرہما کے فتاویٰ و عمل سے اور آیت پاک ”اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْمِعُوا“ سے مؤید ہے، لہذا ایسی مرسل حدیث تمام ائمہ امت و فقہاء کے نزدیک حجت ہے، پھر اس سے احتجاج پر احناف کو مطعون کیسے کیا جاسکتا ہے؟ یہ کلام ہم نے علی الترتیل کیا ہے، ورنہ اوپر معلوم ہو گیا کہ یہ روایت مرسل ہی نہیں، بلکہ مسند بھی ہے، اور صحیح علی شرط ایشخین ہے۔

اس بحث سے مؤلف ”حدیث نماز“ کے باطل دعویٰ کی قلعی خوب کھل گئی اور معلوم ہو گیا کہ مؤلف نام کے تو اہل حدیث ہیں مگر کام ان کا دوسرے لوگوں کی تقلید میں حدیث صحیح کو ضعیف اور مسند کو مرسل کہتے چلے جانا ہے۔

اس تفصیل اور اوپر کی تحقیق کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ کا یہ کہنا اور تاویل کرنا کہ اگر یہ روایت تسلیم کر لیں تو مطلب وہی ہوگا جو شاہ عبدالعزیزؒ نے بتایا اور خود امام ابوحنیفہؒ اس روایت میں ہیں، جو قرأت خلف الامام کے قائل ہیں اور امام محمدؒ بھی اور عبد اللہ بن المبارکؒ وغیرہ بھی قائل ہیں۔ (ملخصاً از حدیث نماز: ۱۰۹)

ایک بے موقعہ بات ہے، ہم نے شاہ عبدالعزیزؒ کے فتویٰ کا جواب اوپر دیدیا ہے، فتویٰ کے ساتھ ہی اس کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اور امام صاحبؒ کا مذہب کیا ہے

اس کو بھی ہم بیان کر چکے، لہذا اب مزید کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔

احناف کی پانچویں دلیل

حنفی مسلک کی پانچویں دلیل یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ نے جہری نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ: ”هَلْ قَرَأَ مَعِيَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ آفِئاً؟“ (کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ اس وقت قرأت کی؟) ایک شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں نے کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”مَالِي أَنَا زُعُ الْقُرْآنُ“ (یہی تو میں کہتا ہوں کہ مجھ سے قرآن کیوں چھینا جاتا ہے)، پس لوگوں نے اس کو سنا تو جہری نمازوں میں قرأت کرنے سے رک گئے۔ (ترمذی: ۱۷۱/۱، ابوداؤد: ۱۲۰/۱، سنن نسائی: ۱۰۶/۱، سنن کبریٰ للنسائی: ۳۱۹/۱، مسند احمد: ۲۸۲/۲، صحیح ابن حبان: ۱۵۷/۵، مصنف عبدالرزاق: ۱۳۵/۲، سنن بیہقی: ۲۲۵/۲، شرح معانی الآثار: ۱۵۸/۱)

اس حدیث کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہے کہ اس کا کیا درجہ ہے؟ محدث ابن الملقن نے ”خلاصة البدر المنير“ میں کہا کہ: امام بیہقی و حمیدی نے اس کو ضعیف کہا ہے اور امام ترمذی نے حسن اور امام ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ (خلاصة البدر المنير: ۱۱۸/۱)

ملا علی القاری نے ”مرقات شرح مشکاۃ“ میں اس کو نقل کر کے فرمایا کہ: اس سے معلوم ہوا کہ امام نووی کا یہ کہنا کہ: اس حدیث کے ضعیف ہونے پر حفاظ حدیث کا اتفاق ہے، یہ صحیح نہیں۔ (مرقات: ۵۳۶/۲)

اس حدیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شارح علیہ السلام کی جانب سے ابتدائی واصولی طور سے مقتدی کے حق میں نہ قرأت فاتحہ مشروع ہوئی اور نہ کوئی

اور سورت، نہ جہری نمازوں میں، نہ سری میں، اور آپ ﷺ اس سے بالکل خالی الذہن تھے کہ مقتدی قرأت کرتے ہیں یا نہیں؟ اور جب صحابہ میں سے کسی نے از خود آپ ﷺ کے پیچھے اپنے اجتہاد سے پڑھا؛ کیونکہ ”لاصلوۃ“ والی احادیث سے عموم سمجھا، تو آپ ﷺ کو نماز میں الجھن اور خلجان پیدا ہوا؛ کیونکہ نبی کریم ﷺ پر مقتدیوں کی حرکات و سکنات روشن ہو جاتی تھیں، حتیٰ کہ قلبی خشوع و خضوع بھی، چنانچہ ”صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہ“ میں حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ”فواللہ ما ینخفی علیٰ خشوعکم، ولا رکوعکم، وانی لأراکم من وراء ظہری“ (خدا کی قسم! مجھ پر نہ تمہارا خشوع مخفی ہوتا ہے، اور نہ رکوع، اور میں تم کو پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں) (بخاری: ۱۰۲۱، مسلم: ۱۸۰۱)

الغرض جب کسی شخص نے آپ ﷺ کے پیچھے قرأت کی تو یہ بات آپ پر روشن و واضح ہو گئی اور اس کا اندازہ آپ ﷺ کو ہو گیا، لہذا آپ نے بعد فراغت سوال فرمایا کہ: کیا کسی نے قرأت کی؟ جب ایک شخص نے جواب دیا کہ: میں نے قرأت کی، تو آپ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: یہی تو میں کہتا ہوں کہ: مجھ سے قرآن چھینا کیوں جاتا ہے؟ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ مقتدی کو پڑھنے کا حکم آپ کی جانب سے نہیں دیا گیا تھا، دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ صحابہ کرام بھی امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے، بلکہ اتفاق سے ایک صاحب نے پڑھ دیا تھا اور تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس شخص کے پڑھنے پر آپ نے نکیر کی ہے۔ اس سے علماء حنفیہ نے یہ اخذ کیا کہ قرأت کرنا مقتدی کا کام و ذمہ داری نہیں، بلکہ اس کو خاموش رہ کر امام کی قرأت سننا چاہئے۔

افادہ راقم

اس حدیث میں سوال کا انداز ”هل قرأ معی أحد منکم“ بتلارہا ہے کہ آپ ﷺ کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ کوئی میرے پیچھے قرأت کرتا ہے؛ کیونکہ یہاں آپ ﷺ نے لفظ ”هل“ موقع استفہام میں استعمال فرمایا ہے، اور ”هل“ وہاں استعمال ہوتا ہے، جہاں مقصود طلب تصدیق ہو، یعنی نسبت تامہ کا ادراک مقصود ہو، جیسے ”هل قام زيد؟“ (کیا زيد کھڑا ہوا)؟، یہ وہاں استعمال ہوتا ہے، جہاں سائل کو نہ قیام کا علم ہو، نہ قائم (کھڑے ہونے والے) کا علم ہو۔ لہذا ”هل“ کے ذریعہ سوال سے دونوں باتوں کا ادراک مقصود و مطلوب ہوتا ہے، اور اگر طلب تصور مقصود ہو تو ”هل“ کا استعمال قبیح ہوتا ہے، جیسے: ”هل عمرو اعرفت؟“ (کیا تم نے عمر کو پہچانا؟) اس میں مفعول کی تقدیم نفس فعل کے علم کو مقتضی ہے؛ کیونکہ یہ وہاں بولا جاتا ہے، جہاں پہچاننا تو معلوم ہو مگر کس کو پہچانا یہ معلوم نہ ہو، لہذا اس جگہ ”هل“ کا استعمال قبیح ہے۔ (مختصر المعانی: ۲۱۰-۲۱۱)

جب یہ معلوم ہو گیا تو اب یہاں غور کیجئے کہ نبی کریم ﷺ نے ”هل“ کا استعمال فرمایا تو اس سے معلوم ہو گیا کہ آپ کو نفس فعل (قرأت) کا علم نہیں تھا، اگر اس کا علم ہوتا تو پھر ”هل“ سے استفہام نہ فرماتے۔

اگر یہ شبہ ہو کہ پھر آپ ﷺ نے یہ سوال ہی کیوں فرمایا، تو جواب یہ ہے کہ دراصل آپ ﷺ کو تشویش اور خلجان واقع ہوا، جیسا کہ مقتدیوں میں خشوع نہ ہونے اور وضوء میں اسباغ نہ ہونے سے آپ ﷺ کو تشویش ہوتی تھی اور فراست سے آپ ﷺ نے قرأت کا صرف اندازہ لگایا، مگر چونکہ علم و تصدیق نہ ہوئی تھی اس لیے آپ نے انکار کے لہجے میں سوال فرمایا کہ: کیا تم میں سے کسی نے قرأت کی ہے؟

اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ صحابہ کے قرأت کرنے کا آپ کو علم نہ تھا۔ اب مقتدی پر قرأت کو واجب قرار دینے والے حضرات غور کر لیں کہ کیا وجوب کی یہی شان ہوتی ہے، جس کا خود شارع علیہ السلام کو بھی علم نہ ہو؟ (ان هذا لشیء عجیب)

نیز آپ نے سوال میں یہ فرمایا کہ: ”هل قرأ معي أحد منكم“ (کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قرأت کی ہے؟) یہ نہیں فرمایا کہ: ”کیا تم لوگوں نے قرأت کی ہے؟ مخاطب صرف ایک کو بنایا، اگر قرأت مقتدی کے ذمہ ہوتی تو آپ سب کو مخاطب فرماتے؛ کیونکہ جب ان کے ذمہ ہے تو سبھی پڑھتے ہوں گے، پھر سوال میں ”کوئی“ کہنے کی کیا وجہ ہے؟ الغرض اگر مقتدی کے ذمہ قرأت ہوتی تو سوال ہی کی نوبت کیوں آئی؟ دوسرے یہ بھی قابل لحاظ امر ہے کہ آپ کے اس پوچھنے پر اس کا جواب صرف ایک شخص دیتا ہے کہ ہاں یا رسول اللہ! میں نے قرأت کی ہے، اگر صحابہ سب کے سب قرأت کرتے تھے تو پھر سبھی کہتے کہ ہاں ہم نے قرأت کی ہے اور یہ کہ یہ آپ ہی کے حکم پر ہم قرأت کرتے ہیں۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ ”جزء القراءة“ میں امام بخاری نے اس روایت میں ”قلنا: نعم“ (ہم نے کہا: ہاں) روایت کیا ہے۔ (جزء القراءة: ۱۳)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرأت کرنے والے بہت تھے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت امام مالک نے ”موطا“ میں، امام محمد نے امام مالک سے ہی ”موطا“ امام محمد میں، امام طحاوی نے ”معانی الآثار“ میں، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ نے اپنی اپنی ”سنن“ میں روایت کی ہے، مگر سب نے ”قال رجل: نعم“ یا ”قال رجل: أنا“ ہی روایت کیا ہے۔ (دیکھئے، موطا امام مالک: ۲۹، موطا امام محمد: ۹۸، معانی الآثار: ۱۵۸، نسائی: ۱۰۶۱، ترمذی: ۴۲۱، ابن ماجہ: ۶۱/۱)

اس سے ظاہر ہے کہ ان دونوں کے معنی میں منافات ہے، لہذا امام بخاریؒ کے الفاظ غیر محفوظ ہیں۔ اور جو ابوداؤد میں حضرت عبادہؓ کی روایت میں ہے کہ صحابہ نے کہا کہ: ہم نے یا رسول اللہ (ابوداؤد: ۱۱۹/۱)

تو ممکن ہے یہ واقعہ (واللہ اعلم) حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کے واقعہ سے پہلے کا ہو، کہ پہلے واقعہ میں بعض صحابہ پڑھنے والے تھے، بعض نہیں، جیسا کہ ”ابوداؤد“ میں ہے کہ جب آپ ﷺ نے سوال فرمایا تو بعض نے کہا: ہاں (ابوداؤد: ۱۱۹)

پھر جب آپ ﷺ نے ناگواری کا اظہار فرمایا اور صرف اباحتِ مرجوحہ عطا فرمائی، تو وہ بعض بھی رک گئے اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ سمجھا کہ اب تو کوئی بھی قرأت نہیں کرتا ہے۔ پھر یہ واقعہ پیش آیا تو آپ ﷺ نے انکار کے لہجہ میں پوچھا کہ کسی نے قرأت کی ہے؟ تو ایک نے جواب دیا کہ میں نے کی ہے، اور اس طرح حضرت عمران بن حصین کی روایت میں صرف ایک آدمی کا پڑھنا آیا ہے اور یہ اور قصہ ہے۔ (ابوداؤد: ۱۲۰) اور یہ عمرانؓ کی حدیث کا قصہ سہری نماز کا ہے۔

غرض اول تو بعض پڑھتے تھے، پھر کوئی کوئی قرأت کرتا تھا، جس کے بعض واقعات احادیث میں مذکور ہیں اور جن روایات میں ”بعض“ کا لفظ نہیں ہے، مطلقاً ”قلنا: نعم“ آیا ہے، وہاں بھی سب مراد نہیں اور اس طرح ہوا ہی کرتا ہے کہ بعض کے کام کو ”ہم“ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ (فافہم)

مؤلف کا اعتراض اور جواب

اس حدیث کے بارے میں مؤلف ”حدیث نماز“ نے کہا کہ:
 ”اس میں بھی آہستہ پڑھنے کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ امام کو تشویش میں مبتلا کر دے اُس قرأت کی ممانعت ہے، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ

صحابہ کرام کو سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیں اور امام کی دوسری قرأت سننے کی تاکید فرمائیں اور صحابہ کرام سورہ فاتحہ بھی چھوڑ دیں ایسی نافرمانی صحابہ کرام نے ہرگز نہیں کی۔“ (حدیث نماز: ۱۱۱-۱۱۲)

راقم کہتا ہے کہ: مؤلف کو جب اس حدیث کا کوئی جواب بن نہ پڑا، اور دلیل ملی لانے سے عجز و عذر لاحق ہوا تو دلیل انی سے اپنے مسلک کی تائید اور حدیث کا جواب دینے کی ناکام کوشش فرمائی ہے۔

حاصل مؤلف کی دلیل انی کا یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کو حکم فرمایا ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھو، اور یہاں صحابہ اس سے رک جائیں اور آپ ﷺ کی نافرمانی کریں، یہ ممکن نہیں۔

اور احناف کا اس حدیث سے جو استدلال ہے وہ بطریق دلیل ملی ہے کہ آپ ﷺ نے ”ما لی أنارُع القرآن“ (مجھ سے قرآن کیوں چھینا جاتا ہے) فرمایا اور یہ الفاظ موقعہ مذمت و ملامت میں استعمال ہوتے ہیں، ”شرح زرقانی“ میں ہے کہ: ”وهو بمعنی التثريب واللوم لمن فعل ذلك“ (اس کے معنی اس کے فاعل پر ملامت اور مذمت کرنے کے ہیں)۔ (شرح الزرقانی: ۲۵۸/۱)

جب آپ ﷺ نے قرأت کا سوال فرما کر اس جملہ سے امام کے پیچھے مقتدی کے لئے قرأت کی مذمت کی تو صحابہ میں سے جو بھی قرأت کرنے والے تھے، وہ سب قرأت سے رک گئے۔

حاصل یہ کہ منع کرنا ان کے رکنے کی علت ہے مگر مؤلف نے اس سے اعراض کرتے ہوئے کلام کا طرز بدل کر دلیل انی بیان کی ہے، وہ یہ کہ صحابہ کرام چونکہ حضور ﷺ کی مخالفت ہرگز نہیں کر سکتے، اس لئے ایسا نہیں ہو سکتا کہ صحابہ نے سورہ

فاتحہ نہ پڑھی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ دلیل لمی میں دلالت قطعی ہوتی ہے اور دلیل انی میں ظہیر ہوتی ہے۔ اب بتائیے کہ کونسی دلیل اختیار کریں؟

پھر یہ دلیل انی بھی مخدوش ہے؛ کیونکہ اس کے ایک مقدمہ میں کلام ہے کہ آپ ﷺ نے سورہ فاتحہ پڑھنے کا صحابہ کو حکم فرمایا۔ پہلے اس مقدمہ کو مدلل کریں کہ آپ ﷺ نے اس کا حکم فرمایا تھا۔ اور ہم نے پہلے ثابت کر دیا ہے کہ ”لا صلوة“ والی حدیث مقتدی کے حق میں نہیں ہے، اور ”لا تفعلوا الا بأمر القرآن“ سے بادل ناخواستہ اباحتِ مرجوحہ ہی کا ثبوت ہوتا ہے، نہ کہ اس کا حکم۔ اور ابھی اوپر شرح حدیث میں ہم نے بتا دیا کہ آپ ﷺ کی جانب سے ابتدائی اور اصولی طور پر کوئی حکم مشروع ہی نہیں ہوا، حتیٰ کہ آپ ﷺ کو اس کے پڑھنے کا علم بھی نہیں تھا، ورنہ آپ لفظ ”هل“ کے ساتھ اس کا استفہام نہ فرماتے۔

غرض یہ کہ پہلے اس مقدمہ کو مدلل کریں، پھر یہ کہیں کہ آپ ﷺ نے حکم فرمایا تو پھر صحابہ اس کی کیسے مخالفت کر سکتے ہیں؟ جب حکم ہی ثابت نہیں تو یہ کہنا فضول ہے۔

سوال قرأت کا یا جہر کا؟

رہا مؤلف ”حدیث نماز“ کا یہ دعویٰ کہ اس حدیث میں آہستہ پڑھنے کی ممانعت نہیں ہے، تو یہ دعویٰ بے دلیل ہے؛ کیوں کہ حدیث میں آپ ﷺ نے نفس قرأت کے متعلق سوال فرمایا ہے کہ: ”هل قرأ معي أحد منكم؟“ (کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قرأت کی ہے؟) پھر اسی پر ملامت بھی فرمائی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے نفس قرأت ہی سے آپ نے ناپسندیدگی ظاہر فرمائی ہے، لہذا اس سے سر او جہر دونوں طرح قرأت سے کراہت ثابت ہوئی۔

اور اگر آپ کا مقصود جہر سے روکنا ہوتا، جیسا کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے سمجھا ہے تو پھر نفسِ قرأت کا سوال حرف ”ہل“ کے ذریعہ کرنا بے معنی ہوتا؛ کیونکہ اگر وہ شخص جہری قرأت کرتا اور آپ نے اس کی قرأت سنی ہوتی تو آپ کو اس کی قرأت کا علم ہو ہی جاتا، اور آپ اس کو اس طرح سوال فرماتے کہ کس نے جہر کیا ہے؟ اور پھر تمام صحابہ کے سکوت و انصات کے وقت ایک صحابی جہر کیوں کر کرتے؟ معلوم ہوا کہ یہ شخص سری ہی قرأت کر رہے تھے اور ”بخاری“ کی روایت کے مطابق آپ ﷺ کو چونکہ بطور معجزہ صحابہ کا رکوع و خشوع سب معلوم ہو جاتا تھا، لہذا آپ کو اس کا اندازہ ہو گیا تو آپ نے سوال فرمایا اور اس پر نکیر فرمائی۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ قرأت ہی سے آپ ﷺ نے منع کیا تھا، خواہ سری ہی کیوں نہ ہو اور اگر یہ شخص جہری کر رہا تھا تب بھی آپ ﷺ نے سوال جہر کے متعلق نہیں کیا، بلکہ نفسِ قرأت کے متعلق سوال کیا تھا، اور اس پر نکیر کی تھی، جس سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے قرأت مشروع چیز نہیں، جیسا کہ اوپر تفصیل گزری، اور ہمارا مقصود اسی سے ہے۔

الغرض اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اصل قرأت ہی سے کراہت کا اظہار فرمایا ہے اور مؤلف کا یہ کہنا کہ ایسی قرأت سے منع کیا ہے، جو باعثِ تشویش ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے مانا کہ منازعت قرأت سے منع کیا ہے، مگر اس سے پڑھنے کا وجوب کہاں ثابت ہوا؟ صرف یہ معلوم ہوا کہ اگر پڑھنے میں امام سے منازعت کا اندیشہ نہ ہو تو منع نہیں ہے اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ منع نہیں ہے، مگر نا پڑھنا ہی اصل ہے۔

مقتدی کا قرأت نہ کرنا ہی اصل ہے

اور مقتدی کی قرأت کا اصل نہ ہونا اور اس کے لئے خاموشی و انصات کا اصل ہونا کئی دلائل اور قرائن پر مبنی ہے، یہاں چند پیش کئے جاتے ہیں:

(۱) آیت میں ”إِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَعْمُوا لَهُ وَانصتُوا“ میں سری و جہری ہر طرح کی قرأت سے منع کیا گیا ہے۔

(۲) حدیث ”إذا قرأ فأنصتوا“ میں بھی یہی صورت ہے۔

(۳) حدیث مرسل بطریق متعددہ ”لا قراءۃ خلف الإمام“ میں بھی منع وارد ہے۔

(۴) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت (عند الیہتی) بطریق محمد بن عبدالرحمن بن ثوبان میں جہری میں قرأت سے منع فرمایا ہے اور اس کے شواہد ہیں۔ (دیکھئے فلاند الا زہار: ۲۰۲)

(۵) یہاں اس زیر بحث حدیث میں بھی تمام صحابہ کا نہ پڑھنا معلوم ہوتا ہے اور نبی کریم ﷺ کا انکار بھی اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ مقتدی کا قرأت کرنا غیر مشروع و غیر اصل ہے۔

پس معلوم ہوا کہ مقتدی کے لئے اصل نہ پڑھنا ہی ہے اور پڑھنا مباح باباحہ موجود ہے، اس سے زیادہ نہیں، اور ہم اس کے قائل ہیں، اور امام ابو حنیفہؒ کا یہی مسلک و مذہب ہے۔

بے موقعہ حوالہ

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس کے بعد حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی صاحبؒ کی ”عمدة الرعاية“ سے ایک عبارت نقل کی ہے، جس کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ اس

حدیث سے صرف اس قرأت سے منع مفہوم ہوتا ہے، جس سے امام کو تشویش و خلجان ہو، اگر ایسی قرأت نہ ہو، بلکہ سری نماز میں سر اور جہری میں سلکاتِ امام میں پڑھے تو منع نہ ہونا چاہئے اور خود حضرت ابو ہریرہؓ (جو اس حدیث کے راوی ہیں وہ) سری نماز میں فاتحہ پڑھنے کا فتویٰ دیتے تھے اور پھر حدیث عبادہ بھی جواز کو مقتضی ہے۔ (حدیث نماز: ۱۱۲-۱۱۳)

میں کہتا ہوں کہ: مؤلف ”حدیث نماز“ کو اس حوالے کے نقل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں؛ کیونکہ مولانا عبدالحی صاحبؒ بھی صرف یہ فرما رہے ہیں کہ اگر کوئی سری نماز میں قرأت کر لے، یا سلکات میں کر لے تو جائز ہونا چاہئے۔ اور ہم اس کو اوپر لکھ آئے ہیں، اور ہمارے مؤلف صاحب تو مقتدی کے لئے قرأت کو واجب قرار دیتے ہیں جس کے علامہ عبدالحی لکھنوی قائل نہیں، پھر اس حوالہ سے مؤلف کا کیا بنا؟ اور رہا حضرت ابو ہریرہؓ کا فتویٰ تو وہ بھی وجوب پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ اباحت کو ترجیح دیتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ استحباب پر دلالت کرتا ہے۔ (فصل الخطاب: ۳۴)

اور پھر مؤلف ”حدیث نماز“ کی دیانت دیکھئے کہ مولانا لکھنوی کی ایک ایسی عبارت جس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنا جائز ہے واجب نہیں، اس کو اپنے مسلک کو ثابت کرنے کے لئے بے موقعہ پیش کیا ہے تاکہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہیں اور خود مولانا عبدالحی صاحبؒ کی اس صاف عبارت کو جس میں انھوں نے مسلک حنفیہ کے دلائل کی روشنی میں قوی ہونے کا نہایت بلند الفاظ میں ذکر کیا ہے اس کو چھوڑ دیا، کیا اسی کا نام انصاف و دیانت ہے؟ لیجئے ہم مولانا عبدالحی کی وہ عبارت پیش کرتے ہیں، آپ نے ”امام الکلام“ اور اس کے حاشیہ ”غیث الغمام“ میں احناف کے دلائل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ:

”فظہر أن قول أصحابنا بكفاية قراءة الإمام وعدم افتراض القراءة للمأموم في غاية القوة ، وكذا قولهم بکراهة القراءة مع قراءة الإمام في الجهرية بحيث يخل بالاستماع ، أو بالحرمة ، ووجوب السكوت عند ذلك في نهاية الوثيقة - وقال في ”غيث الغمام“: لثبوت ذلك بنص الآية والروايات الكثيرة والقول بالقراءة عند القراءة لا يخلو عن مخالفة الدلائل الواضحة“۔ (امام الکلام وغيث الغمام: ۱۵۵)

(اس بحث سے ظاہر ہو گیا کہ احناف کا قول کہ امام کی قرأت مقتدی کے لیے کافی ہے اور مقتدی پر قرأت فرض و واجب نہیں، غایت قوت میں ہے، اسی طرح ان کا یہ قول کہ امام کے ساتھ قرأت کرنا جہری نمازوں میں جب کہ وہ محل استماع ہو، مکروہ یا حرام ہے اور یہ کہ (امام کی) قرأت کے وقت خاموش رہنا واجب ہے، نہایت مضبوطی میں ہے؛ کیونکہ اس کا ثبوت نص قرآن یعنی آیت شریفہ سے اور بے شمار روایات سے ہے اور یہ قول کہ امام کی قرأت کے وقت قرأت کرنا چاہئے، واضح دلائل کی مخالفت سے خالی نہیں)

اس عبارت سے یہ باتیں مستفاد ہوئیں:

(۱) امام کی قرأت مقتدی کے لیے کافی ہے اور مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے، اور اس کے دلائل غایت درجہ قوی ہیں؛ کیونکہ قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہے۔

(۲) امام کے ساتھ پڑھنا جہری نمازوں میں جب کہ وہ محل استماع ہو، یہ مکروہ ہے (ایک قول میں) یا حرام ہے (دوسرے قول پر) اور اس کے دلائل بھی

قوی ہیں۔

(۳) قرأتِ امام کے وقت سکوت واجب ہے، اور اس کے دلائل بھی نہایت قوی ہیں، اس کے خلاف کرنا قرآن وحدیث کے واضح دلائل کے خلاف ہے۔

انتباہ

یہاں یہ بات عرض کر دینا مناسب ہے کہ اس جگہ حضرت علامہ عبدالحی صاحب نے سری نمازوں میں پڑھنے کی اجازت دی ہے اور اس طرح سکنت امام میں قرأت کی اجازت دی ہے، اور علامہ موصوف نے سری نماز میں منع کے دلائل کو قوی تسلیم نہیں کیا، اسی طرح سکنت میں منع کے دلائل کو قوی نہیں مانا ہے۔

راقم کہتا ہے کہ: سکنت میں پڑھنے کا شرع میں کوئی حکم ثابت نہیں ہے، جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے اس کی خوب خوب اور کافی وثافی وضاحت کر دی ہیں اور ہم نے اس کو اوپر پیش کر دیا ہے۔ لہذا جہری نمازوں کا مسئلہ اس طرح ختم ہوا، غرض یہ کہ شریعت نے جہری نماز میں پڑھنے کی کوئی جگہ نہیں رکھی۔

اور سری نمازوں میں ہم نے بتا دیا کہ اس میں بھی اصل حکم کے لحاظ سے قرأت منع ہی ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ کی ”کتاب الآثار“ کی روایت میں جو واقعہ ہے کہ کسی نے قرأت کی جس پر کسی نے نکیر کی اور نبی کریم ﷺ نے ”من کان له إمام فقراء الإمام له قراءۃ“ فرمایا تھا، یہ واقعہ سری نماز ہی کا ہے۔ چنانچہ ”موطا“ کی مرسل روایت میں عصر کی نماز کی تصریح ہے، اور اس حدیث سے منع کا ثبوت ہم نے اوپر پیش کر دیا ہے۔ اور جو یہ کہا جاتا ہے کہ اس شخص نے ﴿سَبَّحَ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ پڑھی تھی، جس پر آپ ﷺ نے نکیر فرمائی تھی، نہ کہ سورہ فاتحہ پڑھنے پر، اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ واقعہ میں اس سورت کے پڑھنے

کا ذکر ہے، مگر آپ نے منع تو قرأت سے کیا ہے، بلکہ اس قسم کے جتنے واقعات آئے ہیں ان تمام میں اصل قرأت ہی سے بحث ہے، سورہ فاتحہ اور غیر فاتحہ کا کسی بھی روایت میں ذکر نہیں۔

غرض یہ کہ یہ تاویلاتِ رکیکہ مردود و باطل ہیں، صاف بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے سری نمازوں (ظہر و عصر) میں مطلق قرأت سے منع فرمایا ہے، لہذا سری و جہری تمام نمازوں میں منع کا قول مدلل ہے۔

رہا اس پر قبیل و قال کا ہونا جس کی بنا پر علامہ موصوف نے سری میں ترک کے قول کو قوی ماننے سے انکار کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا تو ہر جگہ ہوتا ہی ہے اور بحث و مباحثہ تمام ہی مسائل میں ہوتا ہے، اس کی وجہ سے اس کو قوی نہ ماننا قابلِ تعجب بات ہے اور پھر قرآن میں انصاف کا حکم عام ہونا بھی پہلے معلوم ہو چکا ہے، جس سے بھی صاف منع نکلتا ہے، اور فاتحہ کا حضرت عبادہؓ کی حدیث سے استثناء، وجوب پر یا استتباب پر دلالت نہیں کرتا، جس کے محکم دلائل شروع رسالہ میں گزر چکے ہیں، اور مزید تحقیق و تفصیل ”معارف السنن“ اور ”فصل الخطاب“ میں ملاحظہ فرمائیے۔

لہذا محض اباحتِ مرجوحہ کی وجہ سے اس حکم عام سے فاتحہ کو خارج کرنا حکم کے سوا کچھ نہیں؛ کیوں کہ عارضی احکام اور رخصت کو اصل قرار دینا منشاءِ شارع کے خلاف ہے۔ پس اباحت کو اپنی جگہ رکھنا چاہئے اور اصل کو اپنی جگہ، جس کا حاصل یہ ہے کہ مقتدی کے لئے ترک قرأت ہی اصل ہے۔ لہذا اس کو اختیار کرنا چاہئے، اور مقتدی کا پڑھنا غیر اصل و عارضی حکم ہے، جس پر عمل کر لیں تو کوئی حرج نہیں، امام ابوحنفیہؒ کا یہی مذہب ہے۔ (کمانی فصل الخطاب: ۹۴)

مؤلف ”حدیث نماز“ کی ایک اور خام خیالی

اس بحث کے آخر میں مؤلف ”حدیث نماز“ نے ایک عنوان قائم کیا ہے: ”سورہ فاتحہ پڑھنے پر اللہ تعالیٰ سے مناجات یعنی ہمکلامی“ پھر بحوالہ ”مشکوٰۃ“ مسند احمد کی ایک حدیث نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مصلیٰ (نماز پڑھنے والا) اپنے رب سے سرگوشی (آہستہ کلام کرتا ہے) پس اپنی سرگوشی پر دھیان رکھے (اور توجہ سے پڑھے) اور قرآن پڑھنے میں ایک دوسرے پر آواز بلند نہ کرے۔ اس کے بعد لکھا کہ اس حدیث سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جب صف بستہ اور اجتماعی نماز ہو، تو خاموش کھڑے رہنا نہیں چاہئے اور آہستہ آہستہ پڑھنا چاہئے۔ (حدیث نماز: ۱۱۴)

راقم عرض کرتا ہے کہ: یہ بھی مؤلف کی خام خیالی ہے، پہلے یہ ثابت کیجئے کہ یہ حدیث مقتدی کے بارے میں ہے۔ دوسرے یہ ثابت کیجئے کہ یہاں پڑھنے سے مراد سورہ فاتحہ پڑھنا ہی ہے، جب تک یہ دو باتیں ثابت نہیں کر دیتے اس وقت تک اس سے استدلال کا حق نہیں ہے۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ: یہ حدیث امام و منفرد کے بارے میں ہے، جب آپ مناجات اور الفاظ قرآن سے صرف سورہ فاتحہ مراد لیتے ہیں جو کہ بے دلیل دعویٰ ہے، تو پھر ہم بدلائل گزشتہ اس کو منفرد و امام کے ساتھ خاص کیوں نہیں کر سکتے؟ اور لفظ مصلیٰ جو کہ دال علی الوصف ہے، اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہ اس نمازی کے بارے میں ہے، جو وصف نماز سے متصف بالذات ہو۔ (کما مر) اور ایسا مصلیٰ تو صرف منفرد و امام ہی ہے، جس کے دلائل کتب احناف میں بے شمار ہیں۔ دو تین تو ہم نے اوپر لکھ دیے ہیں۔ نیز ”من کان له إمام“ وغیرہ سے خوب واضح ہے کہ مناجات میں مقتدی بھی برابر ہے، مگر اس کی

مناجات اور اس کا وظیفہ صرف مناجاتِ امام کو ہی سننا ہے اور خاموش رہنا ہے، یہی اس کے لیے مناجات ہے، اور ”لایجہر بعضکم علی بعض بالقرآن“ سے مؤلف نے جو یہ سمجھا ہے کہ مراد جماعت کی نماز ہے، جیسا کہ مؤلف کی عبارت میں لفظ ”صف بستہ اور اجتماعی نماز“ اس پر دال ہیں، یہ بھی اس مراد پر صریح نہیں؛ کیوں کہ یہ بھی اس کا مطلب ہو سکتا ہے، بلکہ ہونا چاہئے کہ سنن و نوافل وغیرہ پڑھنے والے اگر قریب قریب نماز پڑھ رہے ہوں تو ایک دوسرے پر آواز بلند نہ کرو، تاکہ دوسروں کو خلل نہ ہو، اور اس کی مناجات میں فرق نہ آئے، بلکہ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ نمازی اللہ سے مناجات کرتا ہے، لہذا کوئی اور شخص خواہ وہ نماز میں ہو یا نہ ہو، قرآن کو زور سے پڑھ کر اس کو تشویش میں نہ ڈالے، چنانچہ شارح مشکاۃ ملا علی قاری نے اس کی شرح میں یہ وضاحت کی ہے کہ یہاں ”بعضکم“ سے مراد عام ہے خواہ وہ نماز میں ہو یا خارج نماز۔ (مرقات: ۵۳۶/۲)

اور چوں کہ مقتدی پر مناجات ہی نہیں اس لئے وہاں کا یہ حکم بھی نہیں؛ کیونکہ پڑھنے ہی کا سوال نہیں، تو جہر کا کیا سوال؟ غرض اس سے مؤلف کا استدلال صحیح نہیں ایک اور استدلال پر نظر

مؤلف ”حدیث نماز“ نے پھر اسی سے آگے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے مناجات اور قرآن سے سورہ فاتحہ مراد ہونے پر استدلال کیا ہے، وہ حدیث یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کے شاگرد حضرت سلمان کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ: ”رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: جس نے ایسی نماز پڑھی جس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی ہو تو وہ نماز ناقص ہے، آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ لفظ فرمایا: اس کی نماز پوری نہیں ہوتی، حضرت ابو ہریرہ سے (ان کے

شاگردوں کی طرف سے) کہا گیا کہ ہم (اگر) ہم امام کے پیچھے ہوں تو انہوں نے جواب دیا کہ تو سورہ فاتحہ کو آہستہ سے اپنے جی میں پڑھ لو؛ کیونکہ میں نے (اس سورت کی فضیلت میں) رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے نماز اپنے اور بندے کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کر دی ہے، اور میرے بندے کے لئے وہی ہے جو وہ مانگے، جب بندہ (پہلی آیت) پڑھتا ہے کہ ”تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے“ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری تعریف بیان کی اور جب بندہ کہتا ہے ”بہت رحمت کرنے والا اور نہایت ہی مہربان ہے“ تو پروردگار کہتا ہے: میرے بندے نے میری خوبی بیان کی اور جب وہ کہتا ہے ”بدلے کے دن کا مالک ہے“ تو اللہ کہتا ہے کہ میرے بندے نے میری بڑائی بیان کی اور جب بندہ کہتا ہے ”ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں“ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہی (فرق) ہے میرے اور میرے بندے کے درمیان اور میرے بندے کو وہ دوں گا جس کا وہ سوال کرتا ہے، جب بندہ کہتا ہے ”ہم کو سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کی راہ دکھا جن پر تو نے اپنا کرم و انعام فرمایا، ان کی راہ مت دکھا جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ان کی راہ دکھا جو گمراہ ہوئے“ اللہ فرماتا ہے کہ یہ حصہ (سورہ فاتحہ کا) میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو مانگتا ہے۔ (حدیث نماز: ۱۱۵-۱۱۶)

مگر اس سے مؤلف کا یہ استدلال نہایت ضعیف ہے؛ کیونکہ اس روایت میں خود یہ بات آئی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جب یہ حدیث بیان فرمائی کہ بغیر سورہ فاتحہ

نماز ناقص ہے، تو حضرت سلمانؓ نے عرض کیا کہ میں تو کبھی امام کے پیچھے ہوتا ہوں، تو کیا کروں؟ فرمایا کہ: دل میں پڑھ لے؛ کیونکہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ: نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کر دی گئی ہے (یا میں نے تقسیم کی ہے) اور میرے بندے کو جو مانگے ملے گا۔ الخ

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خود حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد حضرت سلمانؓ جنہوں نے سوال کیا تھا، فاتحہ خلف الامام کو جانتے ہی نہ تھے اور وہاں یہ روانہ ہی نہ تھا، ورنہ ان کو اس سوال کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ فرمانا کہ اپنے جی میں پڑھ لو، اس سے مراد قرآن میں تفکر و تدبر ہے، جیسا کہ اوپر تفصیلی کلام گزر چکا ہے، اور جو لوگ اس سے آہستہ قرأت مراد لیتے ہیں، ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ آہستہ پڑھنے کو قرأت فی النفس کہہ بھی نہیں سکتے، بلکہ وہ بھی قرأت باللفظ ہی ہے اور پھر یہ بھی قابل غور بات ہے کہ یہاں حضرت سلمان کا سوال یہ تو نہیں تھا کہ ”میں جہر سے پڑھوں“؟ بلکہ صرف قرأت کا سوال تھا اور سب جانتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت آہستہ ہی کی جاتی ہے، تو اس پر حضرت ابو ہریرہ کا جواب دینا کہ آہستہ پڑھو، تحصیل حاصل ہے۔ لہذا قرأت فی النفس کے معنی تدبر و تفقہ کے ہیں اور اس کی بحث اوپر گزر چکی۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ نے جو اس حدیث سے استدلال فرمایا اس میں بھی مفتدی کے پڑھنے کا کہاں ذکر ہے؟ پس ان کی مراد یہ ہے کہ جب امام پڑھے تو چونکہ اس کی خاص فضیلت ہے، اس لیے اس پر غور و فکر کرو۔

یہاں تک مسئلہ قرأت خلف الامام پر مؤلف ”حدیث نماز“ کے پیش کردہ دلائل کا جائزہ اور احناف کے دلائل، نیز مولف کی بے جا اور غیر متعلق باتوں، غلط

فہمیوں اور غلط حوالوں پر تفصیلی کلام کر کے حقائق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ اتباع حق کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿مسئلہ آئین بالجہر والسر﴾

نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد ”آمین“ کہنا سنت ہے اور اس میں سب کا اتفاق ہے، اور یہ بھی اکثر ائمہ کے نزدیک مسلم ہے کہ امام و مقتدی اور منفرد سب اس کو کہیں گے۔ ہاں امام مالک کے نزدیک امام آئین نہیں کہے گا اور امام ابوحنیفہ سے بھی ایک روایت یہ ہے کہ امام آئین نہ کہے، مگر آپ کا مشہور مذہب وہی ہے جو جمہور کا ہے۔ اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ سری نمازوں میں بھی اور انفرادی نمازوں میں بھی آئین آہستہ کہی جائے۔ البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ جہری نمازوں میں امام و مقتدی آئین بلند آواز سے کہیں یا آہستہ سے؟ یہ مسئلہ بھی شروع دور سے معرکہ آراء و انظار رہا ہے۔

اس مسئلہ پر بھی مؤلف ”حدیث نماز“ نے اپنی عادت کے مطابق لکھا ہے اور مذہب احناف کو کمزور و ضعیف قرار دیا ہے مگر آگے چل کر پچھلے مسائل کی طرح معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت میں کونسا مذہب قوی ہے۔

اب اولاً مؤلف ”حدیث نماز“ کے دلائل اور ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیے، پھر اس کے بعد ہم مذہب احناف کے دلائل بیان کریں گے۔

آئین بالجہر کی پہلی دلیل

مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”بخاری“ وغیرہ کے حوالہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث بیان کی ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”إِذَا أَمَّنَ الْإِمَامُ“

فَأَمَّنُوا ، فَإِنَّهُ مَنْ وَافَقَ تَأْمِينَهُ تَأْمِينَ الْمَلَائِكَةِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ ، قَالَ ابن شهاب : كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ آمِينَ ، (جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو؛ کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے مل جائے، اس کے گزشتہ گناہ بخش دیے جاتے ہیں اور ابن شہاب نے کہا کہ نبی کریم ﷺ آمین کہتے تھے)۔ (بخاری: ۱۰۸۱)

اس کے بعد مؤلف نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کی آمین سن کر مقتدی بھی آمین بولے۔ (حدیث نماز: ۱۱۹)

میں کہتا ہوں کہ مؤلف ”حدیث نماز“ کے استدلال کا حاصل یہ ہے کہ مقتدی کو آمین کہنے کا حکم امام کی آمین پر موقوف ہے، اور امام کی آمین مقتدی کو اس وقت معلوم ہوگی جب کہ امام زور سے آمین کہے۔ لہذا امام کا زور سے آمین کہنا ثابت ہو گیا اور مقتدی بھی امام کی موافقت میں زور سے کہے گا۔

مگر یہ استدلال صحیح نہیں ہے، مخدوش ہے؛ کیونکہ اس حدیث میں ”إِذَا أَمَّنَ الْإِمَامُ فَأَمَّنُوا“ میں لفظ ”إِذَا“ آیا ہے جو شرط کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور ظرف کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لہذا مؤلف کو اولاً اس کی تعیین کرنا چاہئے کہ یہاں ”إِذَا“ شرطیہ ہے یا ظرفیہ؟ اگر شرطیہ ہے تو مؤلف کا استدلال صحیح ہو سکتا ہے؛ کیونکہ اب مطلب یہ ہوگا کہ امام آمین کہے تو تم آمین کہو، ورنہ نہیں، اور اس صورت میں مؤلف کے استدلال کے مطابق آمین میں جہر کا ہونا معلوم ہوگا۔ اگرچہ یہ استدلال بھی مخدوش ہے، تاہم گنجائش ہے۔ اور اگر یہ ظرفیہ ہو تو پھر مؤلف کا استدلال صحیح نہیں؛ کیونکہ اب مطلب یہ ہوگا کہ جس وقت امام آمین کہے، اسی وقت تم بھی کہو، تاکہ موافقت ہو جائے۔ اس صورت میں آمین سن کر کہنے کی بات ہی

نہیں، بلکہ یہ مقصود ہے کہ دونوں کی آمین ایک ہی وقت ہونا چاہئے۔ اور اس صورت میں امام کی آمین سن کر بعد میں آمین کہے گا تو حدیث کے خلاف ہوگا۔

اب مؤلف ”حدیث نماز“ نوٹ کر لیں کہ کون سی صورت حدیث میں مراد ہے؟ شرطیہ والی یا ظرفیہ والی، ہمارے نزدیک یہاں ظرفیہ والی صورت ہے، لہذا ہم یہاں یہ ثابت کرتے ہیں کہ حدیث میں صورت ثانیہ ہی مراد ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی ایک طویل حدیث میں یہ الفاظ ہیں: ”وَإِذَا قَالَ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ فَقُولُوا آمِينَ“۔ (جب امام ”غیر المغضوب علیہم ولا الضالین“ کہے تو تم آمین کہو) (مسلم شریف: ۱۷۴/۱)

اس حدیث سے صاف یہ بات معلوم ہوئی کہ جب امام سورہ فاتحہ ختم کر دے تو مقتدی بھی آمین کہے، اور یہ ظاہر ہے کہ امام بھی آمین کہے گا، جیسا کہ پہلی حدیث سے معلوم ہوا۔ ان دونوں حدیثوں کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اور مقتدی دونوں ایک ہی وقت میں آمین کہیں گے اور یہ اسی وقت ہوگا جب کہ ہم اول حدیث میں ”إِذَا“ کو ظرفیہ مانیں اور دوسری حدیث میں شرطیہ، چنانچہ امام نوویؒ نے ”شرح مسلم“ میں فرمایا کہ:

”قوله ﷺ: ”وَإِذَا قَالَ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ فَقُولُوا آمِينَ“ فيه دلالة ظاهرة لما قاله أصحابنا وغيرهم إن تأمين المأموم يكون مع تأمين الإمام لا بعده ، فإذا قال الإمام: ”ولا الضالين“ قال الإمام والمأموم معاً آمين“ (رسول اللہ ﷺ کے اس قول میں اس پر دلالت ظاہرہ ہے جو ہمارے اصحاب وغیر ہم کہتے ہیں کہ امام کی آمین کے ساتھ مقتدی کی آمین ہونا چاہئے، بعد نہ ہونا چاہئے، پس جب امام ”ولا الضالین“ کہے تو امام اور مقتدی

دونوں آمین ایک ساتھ کہیں۔ (شرح مسلم: ۱۷۴/۱)

اسی طرح علامہ ابو بکر ابن العربی نے اپنی شرح موطا "القبس" میں لکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: "قوله: إذا أمن الإمام. الحديث. قيل معنى قوله: "إذا أمن": إذا بلغ موضع التأمین، كقولهم: "أحرم": إذا بلغ موضع الحرم، و"أنجد": إذا بلغ موضع العلو. وذلك كقوله: "إذا قال الإمام: غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا آمين؛ ليجتمع الحدیثان۔ (رسول اللہ ﷺ کا ارشاد کہ جب امام آمین کہے، اس کا ایک معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ "جب امام آمین کہنے کے موقعہ کو پہنچے، جیسے عرب لوگوں کا قول ہے "أحرم" یعنی حرم کی جگہ پہنچا، اور "أنجد" یعنی بلندی کو پہنچا، اور یہ اللہ کے رسول کے اس ارشاد کی طرح ہے کہ "جب امام "غير المغضوب عليهم ولا الضالين" کہے تو تم آمین کہو، تاکہ دونوں احادیث میں جمع تطبیق ہو جائے) (القبس: ۲۳۶/۱)

اسی طرح مولانا عبدالحی صاحب نے شرح الوقایہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ: اس حدیث میں آمین کا وقت بتانا مقصود ہے کہ جس وقت امام آمین کہے اسی وقت مقتدی کو بھی کہنا چاہئے۔ (عمدة الرعاية: ۱۴۵/۱)

اور تقریباً یہی بات علامہ خطابی کے حوالے سے مشہور اہل حدیث عالم شیخ شمس الدین عظیم آبادی نے عون المعبود شرح ابو داود میں نقل کی ہے۔ (عون المعبود: ۱۴۷/۳)

حاصل یہ ہے کہ احادیث میں غور و تامل کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام و مقتدی کی آمین ایک ساتھ ہونی چاہئے۔ لہذا اگر "إذا أمن" سے یہ مراد لی جائے کہ امام کی آمین سن کر مقتدی آمین کہے تو یہ مقصد شارع کے خلاف ہے۔

لہذا یہاں ”اذا“، ظرفیہ ہے کہ جس وقت امام آمین کہے، اسی وقت تم بھی کہو، لہذا اس سے جہر امام پر استدلال صحیح نہیں ہے۔

اور رہا مقتدیوں کا آمین میں جہر تو وہ اس حدیث سے اشارۃً بھی ثابت نہیں ہوتا؛ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر ”اذا کبر فکبروا“ (جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو) سے مقتدیوں پر جہر تکبیر کا اثبات کرنا چاہئے، اسی طرح حدیث میں ہے کہ جب مؤذن اذان دے تو تم بھی اسی طرح کہو، لہذا تمام اذان سننے والوں کو زور سے اذان دینا چاہئے، حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں اور پھر جب یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہاں امام کا جہر بھی ثابت نہیں ہو سکتا تو پھر مقتدی کا جہر جو اس پر موقوف تھا، وہ کہاں سے ثابت ہوگا؟

الغرض جہراً آمین پر اس حدیث سے کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، اور اسی طرح امام ابن شہاب زہری کے اس قول سے کہ رسول اللہ ﷺ آمین کہتے تھے، جہر پر استدلال درست نہیں؛ کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جن میں اخفاء کے سبھی قائل ہیں اور اس میں بھی ایسی روایات وارد ہیں کہ آپ نے یہ پڑھا، وہ پڑھا، اگر اس کا طریق اطلاع صرف جہر ہی تھا تو پھر ان سب امور میں بھی جہر ہی کرنا چاہئے۔ علامہ کشمیری نے ”کشف الستر عن مسئلۃ الوتر“ میں اس کا یہی جواب دیا ہے۔

(کشف الستر: ۶۹)

یہ تو اس صورت کی بات ہے جبکہ ”اذا“ کو اس جگہ ظرف کے لئے مانیں، اور ہمارے نزدیک یہاں یہی صحیح ہے، اور اگر اس کو شرط کے لئے مانیں جیسا کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے کیا ہے تب بھی اس سے وہ بات ثابت ہونا مشکل ہے جس کے ثابت کرنے کے درپے ہیں، یعنی یہ کہ امام زور سے آمین کہتا ہے اس لئے مقتدی کو

بھی زور سے کہنا چاہئے؛ کیونکہ جس طرح ”اذا کبر فکبروا“ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امام زور سے تکبیر کہتا ہے اس لئے تم بھی زور سے تکبیر کہو، اسی طرح اگر بالفرض امام کا آمین زور سے کہنا اس سے ثابت ہوتا ہے تو اس سے مقتدی کے لئے بھی زور سے کہنے کا ثبوت نہیں ہو جاتا، پھر خود امام کا زور سے آمین کہنا بھی اس سے بھی ثابت نہیں ہوتا؛ کیونکہ متعدد احادیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مثلاً ظہر میں یا عصر میں فلان فلاں سورتیں پڑھتے تھے، تو کیا اس سے یہ اخذ کیا جائے گا کہ ظہر و عصر میں بھی زور سے قرأت کرنا چاہئے؟ کیونکہ بغیر جہر کے دوسروں کو کس طرح معلوم ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ استدلال نہایت ضعیف ہے، اسی طرح امام کی آمین سے جہر پر استدلال بھی نہایت کمزور ہے۔ اور اس استدلال کو ضعیف قرار دینے والوں میں مسلک شافعی کے جلیل القدر امام علامہ ابن دقیق العید بھی ہیں، وہ اپنی کتاب ”شرح عمدۃ الاحکام“ میں کہتے ہیں کہ:

”وأما دلالة الحديث على الجهر بالتأمين فأضعف من دلالة على نفس التأمين قليلاً، فإنه قد يدل دليل على تأمين الإمام من غير جهر“ (رہا اس حدیث کا مقتدی کے زور سے آمین کہنے پر دلالت کرنا تو یہ نفس آمین پر دلالت سے زیادہ کمزور ہے؛ کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی دلیل امام کے بغیر آمین کہنے پر دلالت کرے) (شرح عمدہ الاحکام: ۲۰۸-۲۰۹)

اس تبصرے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مؤلف ”حدیث نماز“ کی پیش کردہ دلیل سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی کہ امام اور مقتدی کو آمین زور سے کہنا چاہئے

آمین بالجہر کی دوسری دلیل

مؤلف ”حدیث نماز“ نے بحوالہ ”ابوداؤد“ اور ”نیل الاوطار“ اور ”ابن

ملجہ، حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ:

”رسول اللہ ﷺ جب ”غیر المغضوب علیہم ولا الضالین“

پڑھتے تو (اتنی بلند آواز سے) آمین کہتے کہ صف اول میں سے جو آپ ﷺ

کے پاس ہوتا وہ سن لیتا، پھر تو پوری مسجد گونج اٹھتی۔“ (حدیث نماز: ۱۱۹)

اس کے بعد مؤلف نے ”نیل الاوطار“ سے نقل کیا کہ:

”اس حدیث کی سند کو امام دارقطنی نے حسن قرار دیا ہے۔ امام حاکم

نے بھی اس کو وارد کر کے صحیح کہا ہے اور امام بیہقی بھی اس کو حسن صحیح کہتے

ہیں۔“ (حدیث نماز: ۱۱۹)

راقم کہتا ہے کہ: یہاں کئی باتیں قابل گرفت ہیں، ایک تو یہ کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے جو الفاظ نقل کیے ہیں، یہ صرف ”ابن ملجہ“ کے الفاظ ہیں، ”ابوداؤد“ وغیرہ میں مسجد کے گونجنے کا ذکر نہیں ہے، مگر مؤلف نے سب کی طرف منسوب کر دیا، جو خلاف احتیاط ہے۔

دوسرے یہ کہ اس روایت کے بارے میں مؤلف نے جو بحوالہ ”نیل الاوطار“ علامہ شوکانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس حدیث کی سند کو امام دارقطنی نے حسن قرار دیا ہے، امام حاکم نے صحیح کہا ہے اور امام بیہقی نے حسن صحیح کہا ہے، یہ بات بھی صحیح نہیں ہے؛ یہ علامہ شوکانی کا وہم ہے؛ کیونکہ ان حضرات کے یہ اقوال اس روایت کے بارے میں نہیں ہیں، بلکہ دوسری سند سے ان حضرات نے اس حدیث کو نقل کیا ہے، اور اس حدیث میں مسجد کے گونجنے کا بھی ذکر نہیں ہے، جس میں صرف یہ الفاظ ہیں:

”كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا فَرَغَ مِنْ قِرَاءَةِ أَمِّ الْقُرْآنِ رَفَعَ صَوْتَهُ وَقَالَ

آمِينَ“۔ (نبی کریم ﷺ جب سورہ فاتحہ پڑھ کر فارغ ہوتے تو اپنی آواز کو بلند کرتے

اور آئین کہتے)۔ (دارقطنی: ۳۳۵/۱، سنن بیہقی: ۸۵/۲، مستدرک: ۳۴۵/۱)

شیخ ناصر الدین الالبانی نے بھی ”السلسلۃ الضعیفۃ“ میں علامہ شوکانی کی اس غلطی اور وہم کا ذکر کیا ہے۔ (دیکھو: السلسلۃ الضعیفۃ: ۳۶۷/۲)

الغرض مؤلف نے جو روایت نقل کی ہے وہ اور یہ دارقطنی وغیرہ کی روایت اصل میں ایک ہی ہے، مگر الفاظ اور سند کا فرق ہے۔ پھر دارقطنی وغیرہ کی سند بھی صحیح یا حسن نہیں ہے۔ یہ ان حضرات کا تسامح ہے؛ کیونکہ اس کی سند میں اسحاق بن ابراہیم بن علاء زبیدی ہے، اس سے امام بخاری و امام مسلم نے ”صحیحین“ میں روایت نہیں لی اور نہ ہی اصحاب سنن اربعہ نے ”سنن“ میں ان سے روایت کی ہے۔ پھر یہ راوی ضعیف ہے، میزان الاعتدال میں ہے کہ ابو حاتم نے اس کے بارے میں ”لاباس بہ“ کہا، اور کہا کہ: میں نے ابن معین سے سنا کہ ان کی تعریف کرتے تھے، نسائی نے کہا کہ: ثقہ نہیں ہیں، ابوداؤد نے ”لیس بشی“ کہا، اور محدث حمص محمد بن عوف نے کذاب کہا۔ اور تہذیب التہذیب میں مزید یہ ہے کہ محمد بن عون نے کہا کہ: مجھے اس میں شک نہیں کہ اسحاق جھوٹ کہتا ہے۔ (میزان الاعتدال: ۳۳۱/۱، تہذیب التہذیب: ۱۸۹/۱)

جس روایت کے راوی پر اتنا کلام کیا گیا ہو، اس کی روایت قابل تحسین و تصحیح ہو سکتی ہے؟ معلوم ہوا کہ ان حضرات کی تحسین و تصحیح صحیح نہیں ہے۔ اور خود دارقطنی نے اپنی ”کتاب العلل“ میں اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے؛ کیونکہ اسحاق بن ابراہیم زبیدی کے شاگرد اس کے متن و سند میں اختلاف کرتے ہیں۔ (التعلیق الحسن: ۹۳/۱)

تیسرے یہ کہ یہاں مؤلف نے جو روایت ”ابوداؤد“ و ”ابن ماجہ“ کے حوالہ سے ذکر کی ہے، یہ بھی ضعیف ہے؛ کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی بشر بن رافع ہے،

اس پر محدثین نے کلام کیا ہے، اور بعض نے اگرچہ ان کی توثیق کی ہے مگر جمہور نے ان کو ضعیف الحدیث و منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ امام احمد نے کہا کہ: ”لیس بشیء ضعیف الحدیث ہے، امام بخاری نے ان کو غیر متابع کہا، امام ترمذی نے کہا کہ: حدیث میں اس کی تضعیف کی جاتی ہے، امام نسائی نے کہا کہ: ضعیف ہے، امام دارقطنی نے کہا کہ: منکر الحدیث ہے، ابن معین نے کہا کہ: مناکیر بیان کرتے ہیں، اسی کے بارے میں ابن عبدالبر نے کہا کہ: محدثین نے ان کی روایت کے انکار اور ترک پر اور اس سے احتجاج نہ کرنے پر اتفاق کیا ہے، ابن حبان نے کہا کہ: یحییٰ بن ابی کثیر سے موضوع احادیث روایت کرتا ہے۔ (دیکھو: میزان الاعتدال: ۲۸۷، تہذیب التہذیب: ۳۹۳/۱)

نیز اس روایت میں بشر بن رافع کے شیخ ابو عبد اللہ ہیں، ان کے بارے میں علامہ ذہبی نے ”میزان“ میں اور علامہ ابن حجر نے تلخیص الحجیر میں لکھا ہے کہ: مجہول ہیں، اور ان سے سوائے بشر بن رافع کے کوئی روایت نہیں کرتا۔ (میزان الاعتدال: ۳۹۱/۷، تلخیص الحجیر: ۲۳۸/۱)

اور لیجئے علامہ احمد بن ابی بکر الکنانی نے ابن ماجہ کی شرح میں اسی حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ: ”هذا إسناد ضعيف، أبو عبد الله لا يعرف حاله، و بشر ضعفه أحمد، وقال ابن حبان: يروي الموضوعات“ (یہ سند ضعیف ہے، ابو عبد اللہ کا حال معلوم نہیں اور بشر کو امام احمد نے ضعیف کہا ہے اور ابن حبان نے کہا کہ: یہ موضوع احادیث بیان کرتا ہے) (مصباح الزجاجة: ۱۰۶/۱)

اور اب اپنے گھر کی شہادت بھی سن لیجئے، شیخ ناصر الدین الالبانی نے ”سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة“ میں اس حدیث کے بارے میں لکھا

ہے کہ: اس کی سند ضعیف ہے، ابن حجر نے کہا کہ: بشر بن رافع ضعیف ہے اور ابو ہریرہؓ کا چچا زاد غیر معروف ہے جس کا حال نہیں معلوم، بوسیری نے کہا کہ: یہ سند ضعیف ہے ابو عبد اللہ غیر معروف ہے الخ۔ (السلسلۃ الضعیفۃ: ۲/۳۶۷)

یہ ہے مؤلف کی پیش کردہ روایت کی سند، جس کے راوی میں محدثین کا اتنا کلام اور جس کی روایت کے ترک کر دینے پر علماء کا اتفاق ہے۔

اس کے علاوہ علامہ نیوٹی نے ثابت کیا ہے کہ: اس حدیث میں ”ابن ماجہ“ نے جو ”فیرتج بہا المسجد“ کی زیادتی بیان کی، اس کی متابعت نہیں کی گئی۔ (التعلیق الحسن: ۹۴/۱)

الغرض مؤلف کا اس سے احتجاج درست نہیں اور پھر کمال یہ کہ بلا تحقیق اس کی تحقیق و تحسین بھی نقل کر دی اور خوش ہیں کہ روایت صحیح ہے۔ تعجب تو اس پر ہے کہ ان اہل حدیث کہلانے والے لوگوں نے بلا تحقیق دارقطنی و بیہقی و شوکانی کی تقلید کو کیوں گوارا کر لیا جب کہ مشروع تقلید کے بھی یہ منکر ہیں۔ (إن هذا النسب عجب)

اور چوتھے یہ کہ اس حدیث سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ نے زور سے آمین کہی تھی؛ کیونکہ غور کیجئے کہ اس میں حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ: ”آپ کی آمین وہ لوگ سن لیتے جو صف اول میں سے آپ کے قریب ہوتے“ سوال یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جو قرأت پڑھتے تھے وہ بھی کیا صف اول میں سے قریب لوگ ہی سنتے تھے یا مسجد کے تمام لوگ سنتے تھے؟ ظاہر یہی ہے کہ آپ کی قرأت تو تمام لوگ سنتے تھے، اگر قرأت تمام لوگ سنتے تھے تو آمین صرف قریب کے لوگ کیوں سنتے تھے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی قرأت کی آواز تو ایسی ہوتی تھی کہ تمام مصلیٰ سن سکیں، لیکن جب آپ آمین کہتے تھے تو آواز کو پست کر لیتے تھے جس کی

وجہ سے صرف قریب کے لوگ ہی آپ کی آئین کو سن پاتے تھے۔ اس سے تو احناف کی تائید ہو رہی ہے کہ آئین میں آواز پست ہونا چاہئے، اس میں جہر کا کوئی دور دور تک شائبہ بھی نہیں معلوم ہوتا۔

پھر سوال یہ ہے کہ کیا اہل حدیث حضرات کی مسجد میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ امام کی قرأت تو تمام مصلیٰ سنیں اور آئین صرف امام کے قریب کے لوگ سنیں؟ نہیں ہوتا، بلکہ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ قرأت سے بھی زیادہ آواز آئین کی ہوتی ہے، کیوں؟ کیا یہ بات صریح طور پر اس حدیث کے خلاف نہیں ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ دراصل ان حضرات کا مستدل بن ہی نہیں سکتا۔

آئین بالجہر کی تیسری دلیل

آئین زور سے کہنے کی تیسری دلیل میں مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”بخاری“ سے امام بخاری کا قائم کردہ باب اور اس میں روایت کردہ تعلیقات کو نقل کیا ہے کہ:

”حضرت عطاء نے فرمایا کہ: آئین دعا ہے، حضرت ابن الزبیر نے آئین کہی اور ان کے پیچھے جو لوگ تھے انہوں نے بھی آئین کہی، حتیٰ کہ مسجد گونج گئی۔ اور حضرت ابو ہریرہ امام سے کہہ دیا کرتے تھے کہ: میری آئین فوت نہ ہونے دینا۔ اور حضرت نافع نے بیان کیا کہ: حضرت ابن عمر آئین نہیں چھوڑتے تھے اور لوگوں کو اس کی ترغیب دیتے تھے اور میں نے ان سے اس بارے میں ایک حدیث بھی سنی ہے۔“ (حدیث نماز: ۱۱۹-۱۲۰)

میں کہتا ہوں کہ: یہ دلائل بھی ہمارے مؤلف ”حدیث نماز“ کو کچھ مفید نہیں؛

کیونکہ یہاں امام بخاریؒ نے جو تعلیقات پیش کی ہیں، ان میں سے کسی سے بھی آمین میں جہر کا ثبوت نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ ابن زبیر اور ان کے معتقدیوں نے آمین کہی اور مسجد گونج گئی۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آمین زور سے کہی گئی تھی، مگر مؤلف کو یہ کچھ بھی مفید نہیں۔

اولاً: اس لئے کہ مؤلف کے مسلک میں اقوال صحابہ بھی حجت نہیں، چہ جائیکہ افعال حجت ہوں اور یہاں انہوں نے کوئی مرفوع حدیث نہیں پیش کی ہے بلکہ صرف اقوال و افعال صحابہ یا تابعین پیش کئے ہیں، جس سے خود مؤلف کے نزدیک دلیل نہیں لی جاسکتی۔

ثانیاً: ان میں سے سوائے حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کی تعلیق کے کسی سے بھی آمین کو زور سے کہنے کا ثبوت نہیں ہوتا، صرف آمین کا ثبوت ہوتا ہے جس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔

ثالثاً: حضرت ابن الزبیر کے علاوہ دیگر اکثر صحابہ آمین میں اخفاء کے قائل تھے، جن میں حضرت علیؓ و حضرت عمرؓ ہیں اور حضرت ابن مسعودؓ بھی اسی کے قائل تھے۔ (الجوہر النقی علی سنن البیہقی: ۲/۷۰۲ و ۸۵/۲)

امام طحاوی نے حضرت عمرؓ سے عدم جہر نقل کیا ہے۔ چنانچہ ابووائل سے روایت کیا کہ: ”کان عمر و علی لا یجهران بسم اللہ الرحمن الرحیم ولا بالتعوذ ولا بالتأمین“ (حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ بسم اللہ الرحمن الرحیم کو جہر سے نہیں پڑھتے تھے اور نہ تعوذ کو اور نہ آمین کو) (شرح معانی الآثار: ۱۵۰/۱)

اس میں ایک راوی ابوسعید ضعیف ہے، جس کی اگرچہ جمہور علماء نے تضعیف

کی ہے، مگر تمام محدثین اس کو ضعیف نہیں کہتے بلکہ امام طحاوی نے اس حدیث کو موقع احتجاج میں پیش کیا ہے، جس سے ان کے نزدیک اس روایت کا صحیح ہونا معلوم ہوتا ہے۔

اور علامہ بنوری نے ”معارف السنن“ میں اس پر کافی بحث کرنے کے بعد لکھا کہ: حاصل یہ کہ ابوسعید کی امام بخاری، ترمذی، ابن جریر نے، بیہمی نے ”مجمع الزوائد“ میں، اور حافظ ابن حجر نے ”فتح الباری“ میں توثیق کی ہے، بلکہ ابوزرعہ کا کلام بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ (معارف السنن: ۲/۴۱۳)

غرض اکابر صحابہ سے عدم جہر ہی ثابت ہے، پھر ابراہیم نخعی نے بھی دو صحابہ میں یہ فتویٰ دیا تھا کہ: ”خمس - وفي رواية: أربع - يخفیهن: سبحانك اللهم وبحمدك، والتعوذ، وبسم الله الرحمن الرحيم، وآمين، واللهم ربنا لك الحمد“ (پانچ چیزیں کو آہستہ کہے اور ایک روایت میں چار چیزوں کا ذکر: ”سبحانك اللهم وبحمدك، اعوذ بالله، بسم الله الرحمن الرحيم، آمين، اور ”اللهم ربنا لك الحمد“ (کتاب الآثار: ۱۶، مصنف عبد الرزاق: ۸۷۲/۲)

امام عبد الرزاق کی سند کو علامہ شوق نیوی نے آثار السنن میں ذکر کر کے فرمایا کہ: ”وإسناده صحيح“ (اس کی سند صحیح ہے)۔ (آثار السنن: ۹۷)

اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ صحابہ میں جہر کا رواج نہیں تھا، ورنہ حضرت ابراہیم نخعی جیسے فقیہ اگر صحابہ میں آمین زور سے کہنے کا رواج ہوتا تو یہ کیسے کہہ سکتے کہ یہ انخفاء سے ہوتی ہے؟

اور رہا حضرت عبد اللہ بن الزبیر کے مقتدیوں کا عمل، تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ اولاً تو مقتدیوں کو آمین زور سے کہنے کے سلسلہ میں صرف یہی ایک اثر ملتا ہے، مگر اس میں ان لوگوں کے لئے کوئی حجت نہیں؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے جو

روایات مروی ہیں ان میں مقتدیوں کے بالجہر آمین کہنے کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔
دوسرے اس سے بھی مقتدیوں کے لئے آمین میں جہر متعارف ثابت نہیں
ہوتا؛ کیونکہ بہت سارے لوگوں کی ہلکی سی آواز سے مسجد کا گونج جانا ممکن ہے، جیسا کہ
مشاہد ہے، لہذا اس سے متعارف جہر کا ثبوت نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ اور جو کچھ اس باب میں ہے وہ جہر پر دلالت نہیں کرتا ہے،
اور مؤلف نے ”و سمعت منہ فی ذلک خبراً“ کا ترجمہ جو کیا کہ میں نے آمین کے
جہر کے بارے میں مرفوع حدیث سنی ہے، یہ مؤلف کے اضافات میں سے ہے، ورنہ
یہاں بھی جہر کا کوئی لفظ نہیں، صرف آمین کی بات ہے۔ (ہاتوا برہانکم ان
کنتم صادقین)

آمین بالجہر کی چوتھی دلیل

”مؤلف“ حدیث نماز“ نے علامہ قسطلانی کے حوالے سے نقل کیا کہ:
”سنن بیہقی“ میں ہے کہ حضرت عطاء نے فرمایا کہ ”میں نے
دو صحابہ کرام کو اس مسجد (یعنی مسجد نبوی) میں پایا، جب امام ”وَلَا
الصَّالِّينَ“ کہتا تو ان صحابہ کی آمین کی آوازوں سے ایک غلغلہ سنتا“۔
(حدیث نماز: ۱۲۰)

اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً یہ روایت صحیح نہیں ہے، ایک تو اس لئے کہ اس کی
سند میں ابو بکر محمد بن الحسین القطان راوی کے بارے میں محدثین نے جرح کی ہے،
لسان المیزان میں ہے کہ: عبداللہ بن ناجیہ نے اس کو جھوٹا قرار دیا ہے، اور ابن عدی
نے ان کی متعدد احادیث نقل کی ہیں جن کی سند میں اس نے مخالفت کی ہے۔

(لسان اللمیز ان: ۱۳۷/۵)

اور دوسرے اس لئے کہ اس سند میں خالد بن ابی انوف راوی مجہول ہے، شیخ ناصر الدین البانی کہتے ہیں کہ: اس خالد کا شمار مجہول راویوں میں ہوتا ہے اور اس کی سوائے ابن حبان کے کسی نے توثیق نہیں کی اور ابن حبان کی توثیق کی قیمت معلوم ہے۔ (تمام المنۃ علی فقہ السنۃ: ۱۷۹)

ثانیاً: علامہ بنوری نے لکھا ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری نے فرمایا کہ: حضرت عطاء کا دوسو صحابہ سے ملاقات کرنا ثابت نہیں ہے، علامہ بنوری نے فرمایا کہ: ابن کثیر اس روایت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ: کہا جاتا ہے کہ عطاء نے دوسو صحابہ سے ملاقات کی، گویا ابن کثیر کو اس پر جزم نہیں، اس طرح ابن خلکان بھی بغیر یقین کے بیان کرتے ہیں کہ: صحابہ کے عدد کثیر کو دیکھا۔ علامہ کشمیری نے فرمایا کہ: ممکن ہے صحابہ میں سے دوسو کو نہ پایا ہو، صرف مصلین مسجد میں سے دوسو کو پایا ہو اور دوسو صحابہ کو پانا ہو بھی کیسے سکتا ہے، جب کہ حضرت حسن بصری عطاء سے بڑے تھے اور حضرت حسن بصری نے جیسا کہ ”تہذیب“ میں ہے، صرف ایک سو بیس صحابہ کو دیکھا اور اسی طرح حضرت مجاہد نے بھی۔ (معارف السنن: ۲/۴۱۸)

پھر بصورتِ تسلیم یہ کیا ضروری ہے کہ سب نے آمین کہی ہو، جس سے مسجد گونجی، بلکہ اگر چار، پانچ آدمی بھی آمین زور سے کہیں، تو مسجد میں ایک گونج پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس گونج سے احناف کی مسجدیں بھی خالی نہیں اور پھر آہستہ آواز سے بھی آمین کہی جائے تو سب کی آوازیں مل کر ایک گونج کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، لہذا اس کو جہر متعارف پر محمول کرنا کس دلیل سے ہے۔

افادہ راقم

احقر کا خیال یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے جو حضرت عطاء سے نقل فرمایا کہ: ابن الزبیرؓ اور آپ کے مقتدی آمین کہتے تھے حتیٰ کہ مسجد میں گونج پیدا ہو جاتی، یہ روایت اور ”بیہتی“ کی یہ روایت کہ حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ: میں نے دو صحابہ کو دیکھا الخ، یہ دونوں روایتیں ایک ہی ہیں، الگ الگ نہیں۔ اور حاصل ان دونوں روایات کا یہ ہے کہ حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ: میں نے دو صحابہ کو دیکھا، پھر اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: ابن الزبیر اور آپ کے مقتدی آمین کہتے تھے حتیٰ کہ مسجد گونج جاتی، تو اس میں دو صحابہ کا جوڑ صرف روایت کی تقویت کے لیے ہے، اور طالب حدیث پر اس قسم کی عبارات مخفی نہیں، جو محض خارجی غرض سے مستعمل ہوتی ہیں اور ابن الزبیر اور آپ کے مقتدیوں کا آمین کہنا اور بلند آواز سے کہنے کے بارے میں، ہم پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ دوسرے صحابہ ان سے مختلف ہیں۔ اس تحقیق کی طرف علامہ کشمیریؒ کے بھی اشارات ملتے ہیں۔ (دیکھو معارف السنن: ۲/۴۱۹)

اس کے بعد مؤلف نے حضرت وائل کی روایت بیان کی ہے ہم اس پر گفتگو چند صفحات بعد کریں گے۔

جہر کی پانچویں دلیل

مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”ابوداؤد“ سے حضرت بلالؓ کی یہ حدیث نقل کی

ہے کہ:

”انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! مجھ

سے پہلے آمین نہ کہا کیجئے۔ اس کے بعد مؤلف نے لکھا کہ اس حدیث

کا مطلب یہ ہے کہ حضرت بلالؓ آپ کے پیچھے سورہ فاتحہ جلدی نہیں پڑھ سکتے تھے، اس لیے انہوں نے عرض کیا کہ میں اپنی فاتحہ کی قرأت پوری کر لیا کروں۔ (سورہ فاتحہ امام کے پیچھے اور بلند آواز سے آمین بولنا دونوں مسئلے اس حدیث سے بھی ثابت ہوئے)۔“ (حدیث نماز: ۱۲۱)

اس کا جواب یہ ہے کہ:

اولاً: تو یہ حدیث منقطع ہے؛ کیونکہ حاکم نے ”احکام“ میں کہا کہ: ابو عثمان نے بلالؓ کو نہیں پایا، ابو حاتم نے کہا کہ: اس کا وصل خطا ہے، ائمہ ثقافت نے اس کو مرسل ہی روایت کیا ہے، بیہقی نے کہا کہ: ابو عثمان عن سلمان بھی روایت کیا گیا ہے اور یہ سلمان ضعیف ہیں۔ (عمدة القاری: ۴/۳۹۸، بذل المجہود: ۲/۱۰۵)

اور مشہور اہل حدیث عالم شیخ شمس الحق عظیم آبادی نے بھی حافظ کے حوالے نقل کیا ہے کہ: اس کے راوی ثقہ ہیں مگر ابو عثمان کی حضرت بلال سے ملاقات نہیں ہے، اور دارقطنی سے نقل کیا کہ: انہوں نے اس کو منقطع قرار دیا اور اسی کو راجح ٹھہرانا نقل کیا ہے۔ (عون المعبود: ۳/۱۴۹)

لہذا اس سے استدلال کیسے درست ہوگا؟ خصوصاً مؤلف کے یہاں تو مرسل حدیث حجت بھی نہیں، منقطع تو درکنار۔

ثانیاً: اس سے بھی جہر ثابت نہیں ہوتا؛ کیونکہ حدیث کی شرح یہ ہے کہ حضرت بلالؓ چونکہ مؤذن تھے اور آپ صفوں کی درستی سے فارغ ہو کر آنے تک نبی کریم ﷺ قرأت شروع فرمادیتے تھے، بسا اوقات حضرت بلالؓ کو اتنی تاخیر ہو جاتی کہ سورہ فاتحہ بھی ختم ہو جاتی اور آپ جانتے ہی تھے کہ نبی کریم ﷺ آمین کہتے ہیں اور

آمین میں امام کی موافقت کا ہونا بھی استجاب کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے حضرت بلال نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے حاضر ہونے سے پہلے آمین نہ ہو جائے؛ کیونکہ اس سے آپ ﷺ کی موافقت فوت ہو جاتی ہے۔ اب غور کیجئے کہ اس میں جہر کا کیا سوال ہے؟

اور مؤلف نے جو توجیہ کی ہے کہ آپ سورہ فاتحہ پڑھتے تھے، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے، مگر اس پر جمود کی کیا وجہ؟ اور اس توجیہ سے بھی جہر آمین ثابت نہیں ہوتا؛ کیونکہ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کا آمین کہنا تو حضرت بلال کو معلوم ہی تھا تو آپ نے عرض کیا کہ میرے پڑھنے سے پہلے آمین نہ ہو جائے اور ممکن ہے کہ حضرت بلال قرأت خلف الامام کے قائل ہوں جیسے اور بھی بعض صحابہ اس کے قائل تھے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

الحاصل اس روایت سے بھی آمین میں جہر ثابت ہو ہی نہیں ہو سکتا۔ خوب غور کر لیں اور انصاف کی آنکھ سے حدیثوں پر نظر ڈالیں۔

جہر آمین کی چھٹی دلیل

مؤلف ”حدیث نماز“ نے ”ابن ماجہ“ کے حوالہ سے حضرت علیؑ کی حدیث بیان کی ہے کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کو جب آپ ”ولا الضالین“ کہتے تو آمین کہتے ہوئے سنا ہے۔ (حدیث نماز: ۱۲۲)

اس کا جواب یہ ہے کہ: اولاً تو یہ روایت ابن ابی لیلی سے ہے اور ابن ابی لیلی حافظہ کے لحاظ سے کمزور تھے، اور ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ: ابو حاتم نے کہا کہ: میرے نزدیک یہ حدیث خطا ہے، اصل میں یہ حجر بن العنبر کی وائل سے روایت ہے اور یہ خطا ابن ابی لیلی سے ہے اور یہ سی الحفظ تھے۔ (تلخیص الجبیر: ۲۳۸/۱)

نیز اس کے ایک اور راوی حنیہ بن عدی کے بارے میں بھی بعض نے کلام کیا ہے، اگرچہ کہ ان کو عجلی و ابن حبان نے ثقہ کہا ہے مگر ابو حاتم نے کہا کہ: ”شیخ لا یحتج بحدیثہ، شبیبہ بالمجہول“ (شیخ ہے جس کی حدیث سے احتجاج نہیں کیا جاسکتا، اور یہ مجہول کے برابر ہے) (تہذیب التہذیب: ۱۹۰/۲)

دوسرے اس سے بھی آمین کا زور سے کہنا ثابت نہیں ہوتا؛ کیونکہ مؤلف ”حدیث نماز“ اور قائلین جہر اس سے جہر آمین پر اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے رسول اللہ ﷺ کی آمین سنی اور سننا بغیر جہر کے ممکن نہیں تو معلوم ہوا کہ آپ نے بلند آواز سے آمین کہی تھی۔ مگر یہ استدلال بھی تام نہیں؛ کیوں کہ بہت سی اشیاء ایسی ہیں جن میں سوائے جہر کے طریق اطلاع کوئی نہیں، مگر ان کے اسرار و اخفاء پر سب کا اتفاق ہے، مثلاً:

(۱) نبی کریم ﷺ سے ظہر و عصر میں قرآن پڑھنا ثابت ہے۔ اور حضرت ابو قتادہؓ نے کہا کہ: کبھی آپ ﷺ ہمیں ظہر و عصر میں کوئی آیت بھی سنا دیتے تھے۔ نیز حضرت جابر بن سمرہؓ نے فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ ظہر و عصر میں ”والسما والطارق“ اور ”والسما ذات البروج“ پڑھتے تھے اور اس کی مانند دوسری اور سورتیں۔ (طحاوی: ۱۰۱/۱)

(۱) نماز کے شروع میں ”سبحانک اللہم الخ“ پڑھنا ثابت ہے، اور حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابہ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ تکبیر کے بعد اس کو پڑھتے تھے، حالانکہ بغیر سماع یہ ممکن نہیں کہ معلوم ہو جائے، حالانکہ ان کے جہر کا کوئی بھی قائل نہیں۔

حاصل جواب یہ ہے کہ وہ اشیاء جو آہستہ پڑھی جاتی ہیں، ان میں بھی صحابہ

کار رسول اللہ ﷺ سے سننا ثابت ہے۔ مگر اس سے جہر کی سنیت پر دلالت نہیں ہوتی، بلکہ یہ تو محض آئین کی سنیت یا موقع آئین بتلانے کے لیے ہے، جیسا کہ آپ ﷺ کبھی سری نمازوں میں قرآن پڑھ کر سنا دیتے تھے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ ایک دو اشخاص کا سن لینا، اخفاء و اسرار کے منافی نہیں، علامہ عبدالحی صاحب نے فتاویٰ خانہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ: جامع الصغیر میں ہے کہ امام اگر سری نماز میں قرأت اس طرح کیا کہ ایک دو آدمیوں نے سن لیا تو یہ جہر نہ ہوگا۔ اس پر بعض نے امام ہندوانی کے قول کی بناء پر اشکال کیا تو علامہ عبدالحی صاحب لکھنوی نے جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ: اس میں کوئی اشکال نہیں؛ کیونکہ امام ہندوانی کے نزدیک سر و اخفاء یہ ہے کہ خود کو سنائے اور اس کے لئے یہ بات لازم ہے کہ ایک دو قریبی لوگ سن لیں۔ (السعایہ شرح شرح وقایہ: ۲/۲۷۰)

غرض یہ کہ اس حدیث سے بھی مؤلف ”حدیث نماز“ کا مدعا کہ آئین زور سے کہنا چاہئے، ثابت نہیں ہو سکتا۔

جہر کی ساتویں دلیل

مؤلف ”حدیث نماز“ نے ابن ماجہ کے حوالے سے ایک حدیث حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت سے نقل کی کہ:

”رسول اللہ ﷺ فرمایا کہ: تم سے یہودی لوگ اتنا حسد کسی چیز میں نہیں رکھتے ہیں، جتنا حسد تمہارے سلام کرنے اور آئین بولنے میں رکھتے ہیں، اور دوسری حدیث حضرت عبد اللہ بن عباس کی روایت سے ذکر کی جس بھی یہی مضمون ہے مگر اس میں سلام کا ذکر نہیں ہے، اور اس کے آخر میں یہ زیادتی ہے کہ ”پس آئین زیادہ کہا کرو“۔ (حدیث نماز: ۱۲۲)

اس کا جواب یہ ہے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ اور قائلین جہر اس حدیث سے جہر آمین پر استدلال کرتے ہیں کہ یہودی حسد اس وقت کریں گے، جب کہ ان کو معلوم ہو اور اطلاع بلا جہر نہیں ہو سکتی۔ لہذا معلوم ہوا کہ آمین میں جہر ہونا چاہئے۔ مگر یہ استدلال بھی تام نہیں؛ کیونکہ اگر یہی بات ہے کہ یہود کا حسد کرنا جہر آمین کو مستلزم ہے، تو پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ یہودی ”اللہم ربنا لك الحمد“ پر حسد کرتے ہیں۔

چنانچہ ”سنن کبریٰ“ میں بیہقی نے حضرت عائشہؓ ہی کی روایت نقل کی ہے کہ: ”قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَمْ يَحْسُدُوا نَا الْيَهُودُ بِشَيْءٍ مَا حَسَدُوا نَا بِثَلَاثٍ: التَّسْلِيمِ، وَالتَّامِينِ، وَاللَّهِمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ“ (ہم سے یہودی کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کرتے جتنا کہ تین چیزوں پر کرتے ہیں: ایک سلام، دوسرے آمین، تیسرے ”اللہم ربنا لك الحمد“۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۸۲۲)

علامہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ: کوئی بھی ”اللہم ربنا لك الحمد“ کے جہر کا قائل نہیں تو جب یہود کے ”اللہم ربنا لك الحمد“ پر حسد کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو زور سے کہا جائے تو آمین میں جہر کیوں لازم آجاتا ہے؟ یہ قول کیسے صحیح ہو جاتا ہے؟ (معارف السنن: ۲۰۳/۲)

نیز اس حدیث میں سلام کا بھی ذکر ہے، اگر اس سے مراد نماز کا سلام ہے جیسا کہ امور نماز میں اس کو پیش کرنے سے ظاہر ہوتا ہے تو یہ سلام صرف امام زور سے کہتا ہے، مقتدی آہستہ کہتے ہیں، تو اس تفریق کی کیا وجہ ہے؟ اس میں بھی سب کو بلند آواز سے سلام کرنا چاہئے، نیز سری و جہری تمام نمازوں میں اور انفرادی و اجتماعی سب نمازوں میں اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے سلام اور ”ربنا لك الحمد“، اور آمین سب کو جہراً کہنا چاہئے، حالانکہ خود یہ اہل حدیث بھی اس کے قائل نہیں۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث میں ایک راوی طلحہ بن عمرو ہے، جس پر بہت سے محدثین نے کلام کیا ہے، اور علامہ کنانی نے کہا کہ: یہ سند طلحہ بن عمرو کے ضعف پر علماء کے اتفاق کی وجہ سے ضعیف ہے۔ (نیل الاوطار: ۲۲۹/۲، مصباح الزجاجة: ۱۰۷/۱)

معلوم ہوا کہ اس حدیث سے دراصل جہر ثابت ہی نہیں ہوتا۔ لہذا اگر احناف نے بھی آمین میں اس سے جہر نہ سمجھا تو کیا خلاف کیا؟ اور ابن ماجہ کا اس حدیث کو باب جہر آمین میں لانا ہم پر کوئی حجت قائم نہیں کرتا۔

ایک نظر میں جائزہ

مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا ہے: یہ چند حدیثیں ہم نے یہاں بیان کر دی ہیں، ورنہ علامہ شوکانی نے آمین کے متعلق سترہ حدیثیں اور تین آثار صحابہ گنوائے ہیں۔ ان احادیث سے ہمیں یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہم اہل حدیث بلند آواز سے نماز میں آمین کہتے ہیں، تو اس کے دلائل کوئی گروے پڑے نہیں ہیں، بلکہ نہایت ہی مضبوط، ٹھوس، صحیح اور کثیر التعداد احادیث پر ہم نے یہ عمل اختیار کیا ہے۔ (حدیث نماز: ۱۲۳)

راقم کہتا ہے کہ: ناظرین نے ان مضبوط، ٹھوس اور صحیح روایات کا حال دیکھ لیا کہ کسی کاراوی متروک و مطروح ہے، کسی کا غایت درجہ ضعیف ہے اور کسی روایت سے جہر ثابت ہی نہیں ہوتا ہے اور پھر ان ضعیف روایات میں ان اہل حدیث لوگوں میں معروف جہر کا ذکر نہیں، بلکہ صرف یہ ہے کہ صف اول والوں نے سنا، یا صف اول کے ایک فرد نے سنا، یہ ہے ان کے ٹھوس اور صحیح دلائل کا حال ہے۔

ہم یہاں بطور خلاصہ ان گزشتہ روایات کا حال بیان کرتے ہیں:

(۱) ”بخاری“ کی حدیث ابو ہریرہؓ میں ہے کہ امام آمین کہے تو تم بھی آمین

کہو۔ یہ روایت صحیح ہے، مگر جہر اس سے ثابت نہیں ہوتا۔ جنہوں نے کہا کہ: مطلق قول سے مراد جہر ہوتا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، ورنہ تو پھر ”مسلم“ کی روایت میں ہے کہ جب امام ”سمع اللہ لمن حمدہ“ کہے تو تم ”ربنا لك الحمد“ کہو، اس میں بھی قول کو مطلق بیان کیا ہے، حالانکہ اس کے جہر کا کوئی قائل نہیں۔

(۲) ”ابوداؤد“ اور ”ابن ماجہ“ کی حدیث ابو ہریرہؓ ہے کہ: نبی کریم ﷺ جب ”ولا الضالین“ کہتے تو اتنی آواز سے آمین کہتے کہ صفِ اول والے سن لیتے اور مسجد گونج جاتی۔ اس کا ایک راوی بشر بن رافع ضعیف ہے اور دوسرا راوی ابو عبد اللہ مجہول ہے۔ اور اس کے دوسرے طریق میں راوی اسحاق بن ابراہیم بن علاء زبیدی ضعیف ہے۔ اور اس سے بھی آپ ﷺ کے پاس والے کا آپ کی آمین کو سن لینا ثابت ہوتا ہے، جہر ثابت نہیں ہوتا۔

(۳) حضرت عبد اللہ بن الزبیرؓ کا عمل کہ آپ نے جہر سے آمین کہی، تو آپ کے مقتدیوں نے بھی جہر سے آمین کہی، مگر دیگر صحابہ کا عمل ان کے خلاف ہے اور جمہور صحابہ انہما کے قائل ہیں۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث جس کو امام بخاریؒ نے تعلقاً روایت کیا، اس سے بھی صرف موافقت آمین پر زور دینا معلوم ہوتا ہے، جہر کا سوال ہی نہیں۔

(۴) حضرت عطاء کا اثر کہ یہ بھی مدعی پر دلالت نہیں کرتا ہے جب کہ ان کا دوسرا صحابہ کا دیکھنا اور پھر اسی مسجد نبویؐ میں دیکھنا بعید بلکہ ابعد ہے، اور پھر دو چار کے جہر سے بھی مسجد گونج جاتی ہے اور سب کی معمولی آواز سے بھی گونج پیدا ہو جاتی ہے، اور اس قدر جہر کے ساتھ آمین کہنا تو مساجدِ احناف میں بھی ہے۔

(۵) حدیث بلالؓ کہ اس سے بھی اولاً آمین میں جہر ثابت نہیں ہوتا ہے، نیز

یہ حدیث درمیان سے ایک راوی کے چھوٹ جانے کی وجہ سے منقطع ہے۔

(۶) حدیث علیؑ کہ نبی کریم ﷺ ”ولا الضالین“ کہتے تو میں نے سنا کہ آپ ﷺ آئین کہتے۔ یہ روایت ضعیف ہے، اس میں حمید بن عبدالرحمن اور حبیہ بن عدی ضعیف ہیں۔ اور اس سے بھی اس رواجی جہر کا ثبوت نہیں ملتا، نیز کبھی کبھی تعلیم کے لیے کرنے سے ہمیں بھی انکار نہیں جس سے آئین کے زور سے کہنے کا صرف جواز ثابت ہوتا ہے، نہ کہ اس کا سنت ہونا۔

(۷) حدیث عائشہؓ کہ یہودی آئین پر حسد کرتے ہیں، یہ حدیث اگرچہ صحیح ہے، مگر اس سے بھی جہر پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم ان باتوں کو سامنے رکھ کر مؤلف کی عبارت اور ان کا علم حدیث اور شانِ تفقہ کو ملاحظہ فرمائیے اور افسوس کیجئے کہ احناف کے صحیح دلائل کو ضعیف کہا جاتا ہے اور یہاں اپنے لیے ضعیف کو بھی صحیح کہا جاتا ہے۔ (فیہا لایف !!)

انتباہ

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ بعض روایات سے جہر ثابت ہے، اگرچہ وہ روایات ضعیف ہیں مگر ان تمام کے جمع ہونے سے حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہیں، مگر نفس جہر کے جواز و ثبوت میں ہمیں کلام نہیں، کلام اس کی سنیت و افضلیت میں ہے، اور یہ ان احادیث سے ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ نے یا صحابہ کرام نے جہر آئین پر مدامت کی ہو۔ لہذا اس سے نفس جہر پر استدلال تو کر سکتے ہیں، مگر سنیت پر نہیں۔

اخفاء آئین کے دلائل

اب ہم یہاں سے احناف کے دلائل بیان کرتے ہیں، اس کے بعد مؤلف

کے دیگر بیانات کا جائزہ لیں گے، علماء حنفیہ نے آمین آہستہ کہنے پر چند دلائل سے استدلال کیا ہے:

پہلی دلیل

سب سے پہلے قرآن کو لیجئے؛ کیونکہ قرآن کریم دلائل شرعیہ میں سب سے پہلے نمبر پر ہے، اسی لئے علماء حنفیہ سب سے پہلے اسی کو لیتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: ﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾ [اعراف: ۵۸]

(اپنے رب سے آہ و زاری سے اور پوشیدہ طور پر دعا مانگو؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا)

اس آیت میں آہستہ دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور خود مؤلف ”حدیث نماز“ کو بھی یہ تسلیم ہے کہ آمین ایک دعا ہے، جیسا کہ آمین کے مسئلہ میں شروع میں بیان کیا ہے، اور امام بخاری نے اپنی ”صحیح“ میں حضرت عطاء کا قول نقل کیا کہ آمین دعا ہے۔ (بخاری: ۱۰۷۱)

علامہ شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی نے لکھا ہے کہ: ”وأجمع أهل اللغة أن آمين هو الدعاء فالأصل فيه الإخفاء“ (اہل لغت کا اس پر اجماع ہے کہ آمین دعا ہے اور اس میں افضل اخفاء ہے) (اوجز المسالك: ۱۹۹)

اور ”تفسیر کبیر“ میں علامہ رازی نے آمین کو دعا مانا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: امام ابوحنیفہ نے کہا کہ آمین کا اخفاء افضل ہے اور اس پر اس سے احتجاج کیا ہے کہ آمین میں دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ یہ دعا ہے، دوسری یہ کہ یہ اللہ کا نام ہے، پس اگر یہ دعا ہے تو اس کا اخفاء واجب ہے؛ کیونکہ اللہ کا قول ہے: ”ادْعُوا رَبَّكُمْ“

تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً“ (اپنے پروردگار کو آہ وزاری اور آہستہ سے پکارو) اور اگر یہ اللہ کا نام ہے تو بھی اس کا انخفاء واجب ہے؛ کیونکہ اللہ کا قول ہے کہ: **وَإِذْ كُنَّا رَبُّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً“** (اپنے پروردگار کو آہ وزاری اور آہستہ سے یاد کرو)۔
(تفسیر کبیر: ۱۰۷/۱۴)

جب آمین دعاء ہے اور دعاء میں انخفاء کرنا بروئے قرآن واجب نہ بھی ہو، تو مستحب ضرور ہے۔ لہذا آمین میں بھی انخفاء کرنا مستحب ہوگا۔ علامہ رازیؒ ”تفسیر کبیر“ میں لکھتے ہیں:

”جاننا چاہئے کہ دعاء میں انخفاء کا اعتبار کیا گیا ہے اور اس پر چند وجوہ دلالت کرتی ہیں۔ اول یہی آیت کہ یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کا حکم انخفاء کے ساتھ دیا ہے اور امر ظاہر اور واجب کے لیے ہوتا ہے۔ پس اگر وجوب حاصل نہ بھی ہو تو انخفاء کے مندوب ہونے سے تو کم نہیں۔ پھر اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ: وہ (اللہ تعالیٰ) حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ظاہری مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انخفاء اور تضرع کو ترک کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور اللہ کی محبت یہ ہے کہ اللہ ثواب دے۔ پس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جو دعاء میں تضرع اور انخفاء کو ترک کر دے اللہ اس کو ثواب نہیں دے گا اور نہ ہی اس سے احسان کرے گا۔ اور جو ایسا ہو وہ لامحالہ اہل عقاب میں سے ہوگا۔ پس ظاہر ہوا کہ اللہ کا قول ”إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ“ دعاء میں ترک تضرع اور ترک انخفاء پر مثل دھمکی اور ڈانٹ کے ہے۔“ (تفسیر کبیر: ۱۰۶/۱۴)

انخفاء آمین کی دوسری دلیل

قرآن کے بعد حدیث کی جانب آئیے، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جب امام ”غیر المغضوب علیہم ولا الضالین“ کہے تو تم آمین کہو؛ کیونکہ ملائکہ بھی آمین کہتے ہیں اور امام بھی آمین کہتا ہے، پس جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہو جائے گی، اس کے پچھلے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ (نسائی: ۱۰۷۱، علامہ نیوی نے کہا کہ: اس کی اسناد صحیح ہے)

اس حدیث میں جملہ ”وإن الإمام یقولہا“ (امام بھی اس کو کہتا ہے) بتا رہا ہے کہ: امام کی آمین آہستہ ہوتی ہے، ورنہ اس کے بیان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں؛ کیونکہ جب وہ زور سے کہے گا تو سب اس کو سن لیتے ہیں اور سب کو معلوم ہو ہی جاتا ہے، مگر یہاں حدیث میں بتایا جا رہا ہے کہ تم آمین کہو؛ کیونکہ امام بھی آمین کہتا ہے۔ معلوم ہوا کہ آمین کہنے میں اخفاء ہوتا ہے۔ (اعلاء السنن: ۲/۲۱۲)

اخفاء آمین کی تیسری دلیل

حضرت سمرہ بن جندبؓ نے بیان کیا کہ: انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دو سکتے یاد رکھے ہیں: ایک اس وقت جب تکبیر کہتے اور دوسرا سکتہ اس وقت جب کہ ”غیر المغضوب علیہم ولا الضالین“ سے فارغ ہوتے۔ پس حضرت سمرہؓ نے اس کو یاد رکھا اور عمران بن حصینؓ نے اس کا انکار کیا۔ تو پھر دونوں نے اس بات کو حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس لکھا جواب میں آپ نے لکھا کہ: سمرہ نے ٹھیک یاد رکھا۔ (ابوداؤد: ۱۱۳۱، ترمذی: ۵۹۱)

علامہ نیوی نے فرمایا کہ: اس حدیث کی سند صالح ہے اور ترمذی نے اس کی تحسین کی اور ابن حجر نے بھی تحسین کی بلکہ تصحیح کی ہے، اور حضرت سمرہ سے حضرت حسن بصری کا سماع ثابت ہے۔ (آثار السنن والتعلیق الحسن: ۱/۹۵)

اس حدیث میں قابل غور بات یہ ہے کہ اس میں دو سنتوں کا ذکر ہے، ان میں سے پہلا سنتہ ثناء پڑھنے کے لیے تھا اور دوسرا سنتہ آہستہ آہستہ آئین کہنے کے لیے تھا۔ علامہ شوق نیوی کہتے ہیں کہ: اگر اس سنتہ کو اس پر حمل نہ کریں اور یوں کہیں کہ دوسرا سنتہ اس لیے تھا کہ سانس لوٹ آئے، جیسا کہ بعض نے یہی کہا ہے، تو اس سے مقتدیوں کی آئین کا امام کی آئین سے پہلے ہونا لازم آتا ہے؛ کیونکہ حدیث میں ہے ”إِذَا قَالَ ‘غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ‘ فَقُولُوا آمِينَ“ اس سے معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ کے بعد مقتدی آئین کہے تو اس وقت مقتدیوں کی آئین دوسرے سنتہ کے وقت ہوگی اور امام (نبی کریم ﷺ) کی آئین دوسرے سنتہ کے بعد ہوگی تو مقتدیوں کی آئین امام کی آئین سے مقدم ہوگی اور اس سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے کہ مقتدی امام سے سبقت کرے۔ (التعلیق الحسن: ۹۵/۱)

غرض ان روایات میں آئین کے سری ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے اور دیگر احادیث میں اس کی تعلیم دی گئی ہے، اور ہمارے مدعی پر اتنا لکھنا ہی کافی ہے؛ کیونکہ جو چیز عدلی ہوتی ہے یا مخفی ہوتی ہے اس پر دلیل میں یہ اشارات اور اخفاء کی تعلیم ہی کافی ہے؛ کیونکہ جب آئین مخفی ہوتی تھی تو اس پر یہ سوال کرنا کہ دلیل لاؤ، لغو سوال ہے۔ ہاں جہر کا دعویٰ کرنے والوں کو اس پر دلیل قائم کرنا چاہئے، اور اس پر وہ کوئی محکم دلیل بیان نہیں کر سکتے، اور جو ثابت ہے اس کا جواب ہم نے دے دیا کہ ایسا کبھی کبھی ہوا ہے تاکہ تعلیم دی جائے، بطور سنت ایسا ہونا ان احادیث سے معلوم نہیں ہوتا ہے، جیسے ”بخاری“ وغیرہ میں روایت صحیحہ موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا، مگر کوئی بھی اس کو سنت نہیں کہتا، بلکہ اس سے روکتے ہیں اور خلاف سنت بتاتے ہیں۔ نیز آپ ﷺ کا جوتے پہن کر نماز پڑھنا ثابت ہے،

مگر اس کو سنت نہیں کہا جاتا، تو محض ثبوت سنت ہونے پر دلالت نہیں کرتا، ایسے ہی یہاں بھی محض ثبوت کی وجہ سے سنیت ثابت نہیں ہوتی اور جواز سے کسی کو انکار نہیں۔

علامہ عبدالحی صاحبؒ کے بیان کی حقیقت

مؤلف ”حدیث نماز“ نے عبدالحی صاحبؒ کی ایک عبارت نقل کی ہے، جس میں انہوں نے جہر کو راجح اور سر و اخفاء کو مرجوح قرار دیا ہے۔ (حدیث نماز: ۱۲۴-۱۲۵)

ان کی عبارت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت وائلؓ نے نبی کریم ﷺ سے ”خَفَضَ بِهَا صَوْتَهُ“ (آپ ﷺ نے آئین پست آواز سے کہی) بیان کیا ہے اور اس کے راوی شعبہ ہیں اور یہی روایت بطریق سفیان آئی ہے، جس میں حضرت وائلؓ نے ”مَدَّ بِهَا صَوْتَهُ“ یا ”جَهَرَ بِهَا“ (بلند آواز سے آئین کہا) روایت کیا ہے اور محدثین نے سفیان کی روایت کو ترجیح دی ہے؛ کیوں کہ شعبہ کی روایت کی سند میں خدشہ اور خطاء ہے اور مختلف کتب حدیث میں نبی کریم ﷺ سے جہر آئین کی روایت ثابت ہے، جو سب مل کر قوی ہو جاتی ہیں اور ابن الہمامؒ اور ان کے شاگرد ابن امیر الحاج نے بھی جہر ہی کو راجح قرار دیا ہے۔ (عمدة الرعایہ: ۱۶۷-۱۶۸)

راقم کہتا ہے کہ: علامہ عبدالحی صاحب لکھنوی نے اس مسئلہ آئین میں اپنی کتاب ”السعیة“ اور ”التعلیق المجد“ اور ”عمدة الرعایہ حاشیہ شرح الوقایہ“ میں اپنا رجحان جہر کی طرف ظاہر فرمایا ہے اور اسی کے ساتھ علامہ ابن الہمامؒ و ابن امیر الحاج کو بھی اسی کا قائل قرار دیا ہے، مگر میرے خیال میں ابن الہمامؒ کو اس کا قائل قرار دینا صحیح نہیں؛ کیونکہ انہوں نے حدیث جہر و حدیث سر میں محض تطبیق کی ایک صورت بیان کی ہے، جیسا کہ آگے اس کی وضاحت پیش کروں گا، رہا علامہ عبدالحی صاحب کا

جہر کو ترجیح دینا تو یہ ان کی ذاتی رائے ہے اور ان سے بھی بڑے بڑے دیگر علماء اس کے خلاف آئین بالسر کی احادیث کو راجح قرار دیتے ہیں، مگر یہاں سوال یہ ہے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے علامہ عبدالحی صاحب کی کب سے تقلید شروع کر دی ہے؟ کہ ان کے قول کو بلاچون و چرمانے تیار ہو گئے؟ چاہئے تو یہ تھا کہ دلائل کی روشنی میں کلام کیا جاتا، اور اس بارے میں صحیح احادیث کو پیش کیا جاتا، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کر دیا ہے کہ ان کے پیش کردہ دلائل کی کیا حیثیت ہے؟ کہ اگر حدیث صحیح ہے تو وہ جہر پر دلالت ہی نہیں کرتی اور اگر دلالت کرتی ہے تو صحت کے معیار کی نہیں ہوتی۔ لہذا علامہ عبدالحی صاحب کی اس عبارت سے نہ مؤلف ”حدیث نماز“ کو کوئی فائدہ ہے اور نہ وہ ہم پر حجت ہے۔

اس اجمالی گفتگو کے بعد ہم مولانا عبدالحی صاحب کے بیان پر ذرا تفصیلی نظر ڈالنا چاہتے ہیں، حضرت مولانا موصوف نے اپنے اس بیان میں ایک بات تو یہ بیان کی ہے کہ شعبہ کی روایت جس میں آئین آہستہ کہنے کا ذکر ہے وہ بقول امام بخاریؒ محدوش و خطاء ہے اور دوسری بات یہ فرمائی کہ جب حدیث کی سند میں اختلاف ہو تو اس صورت میں محدثین ہی مرجع ہوتے ہیں، لہذا ان ہی کی بات کا اعتبار ہوگا۔

محدثین کے اقوال کا درجہ

ہم اولاً ان کی دوسری بات کا جواب دیتے ہیں کہ اس میں تو اختلاف کی گنجائش نہیں کہ محدثین عظام کے اقوال و آراء خصوصاً فن حدیث میں بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں، ان حضرات کی جرح و تعدیل میں اور روایات کی جانچ میں یارجال میں ترجیح کے بارے میں، ہم جیسوں کو بلا تقلید چارہ نہیں۔ ہم اہل تقلید تو کیا، منکرین تقلید

بھی اس مقام پر ان حضرات کی تقلید پر مجبور و مضطر ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان حضرات کی ہر بات یہ مقام اور درجہ نہیں رکھتی کہ بلاچون و چرا قبول کر لیا جائے۔ امام بخاریؒ کا احسان اس امت مرحومہ پر اتنا عظیم اور بھاری ہے کہ ساری امت مل کر بھی اس کا بدلہ نہیں دے سکتی، مگر اس کے ساتھ ہی آپ کی یہ بات امت پر بڑی گراں اور دلسوز ہے کہ آپ نے حضرت امام الحدیث راس الفقہاء امام اعظم ابوحنیفہؒ پر ارجاء اور خنزیر بری کی حلت کا داغ لگایا، اور ”سکتوا عنہ“ کہہ کر جرح کر ڈالی اور رسالہ ”جزء القراءة“ اور ”رفع الیدین“ میں آپ پر مخالفت احادیث کا الزام لگایا اور جہل کے طعنہ دیے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ امت آپ کی ان باتوں کو قبول نہیں کر سکتی۔ اسی طرح آپ نے امام ابو یوسف کو متروک الحدیث اور امام محمدؒ کو جہمی قرار دیا، اس طرح بہت سے رجال حنفیہ کو مجروح کیا۔ کیا ان تمام باتوں میں آپ مرجع قرار دیے جائیں گے؟

اور دارقطنی نے ”من کان له إمام، الخ“ کو اپنے مسلک کے خلاف دیکھ کر امام اعظم ہی کو ضعیف قرار دے دیا، تو کیا یہاں دارقطنی کی بات مستند سمجھی جائے گی۔

امام ابن معین نے امام شافعی کو ضعیف کہا تو کیا ان کی بات مانی جائے گی اور اس کی بنا پر امام شافعی کو ضعیف ٹھہرایا جائے گا؟ امام عقیلی نے امام ابن المدینی کو ضعیف کہا تو کیا وہ ضعیف سمجھے جائیں گے؟

الغرض ان حضرات محدثین کے کلام کو بلا تحقیق معتمد علیہ اور مرجع قرار نہیں دیا جائے گا، بلکہ محدثین کے اقوال بھی جانچنے کے بعد ہی قابل اعتناء سمجھے جائیں گے، ہاں جہاں پر جانچ ہی ممکن نہ ہو، تو لامحالہ ان کے اقوال پر اعتماد کرنا ہی ہوگا۔

پھر یہ بھی ملاحظہ کیجئے کہ اس حدیثِ وائل بن حجر کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہے، بعض نے سفیان کی روایت کو ترجیح دی ہے تو بعض نے اس کے خلاف شعبہ کی روایت کو راجح قرار دیا ہے، لہذا علامہ موصوف کا یہ کہنا کہ: اس سلسلہ میں محدثین ہی مرجح ہیں، ایک مبہم بات ہے۔

حدیثِ وائل میں اختلاف و ترجیح

اس کے بعد علامہ کی پہلی بات کا جائزہ لیتے ہیں، جس میں انھوں نے حدیثِ شعبہ کو امام بخاری کے حوالے سے مخدوش و خطا قرار دیا ہے، ہماری اس گفتگو سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ امام بخاری کے نقد کی کیا حیثیت ہے۔

بات یہ ہے کہ حضرت وائل بن حجر سے ایک حدیث آئی ہے جس میں بعض راوی جیسے سفیان یہ بیان کرتے ہیں کہ: حضرت وائل نے بیان کیا کہ: ”سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ قَرَأَ ”غَيْرَ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ“ وَقَالَ: آمِينَ وَمَدَّ بِهَا صَوْتَهُ“ (میں نے نبی کریم ﷺ کو سنا کہ آپ ﷺ نے ”غَيْرَ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ“ پڑھا اور آمین کہا اور آواز دراز فرمائی) (ترمذی: ۵۷۱/۱، ابو داؤد: ۱۳۴۱/۱، مسند احمد: ۳۱۵/۴، سنن دارقطنی: ۳۳۴/۱، سنن بیہقی: ۸۳/۲)

اور بعض راوی جیسے حضرت شعبہ یہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت وائل بن حجر نے کہا کہ: ”سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ قَرَأَ ”غَيْرَ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ“ فَقَالَ: آمِينَ وَخَفَصَ بِهَا صَوْتَهُ“ (میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپ نے ”غَيْرَ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ“ پڑھا اور آمین کہی اور آواز کو پست کیا) (ترمذی: ۵۸۱/۱، مسند احمد: ۳۱۵/۴، مستدرک حاکم: ۲۵۳/۲، ابوداؤد طیالسی: ۱۳۸/۱،

معجم کبیر طبرانی: ۹/۲۲، سنن بیہقی: ۸۳/۲، سنن دارقطنی: ۳۳۴/۱)

جب ایک ہی حدیث کے بارے میں راویوں نے دو الگ الگ باتیں بیان کیں تو محدثین میں اس پر بحث ہوگئی کہ ان میں سے کون صحیح ہے اور کون غلط؟ امام ترمذی نے امام بخاری اور امام ابوزرعہ سے اس سلسلہ میں نقل کیا کہ: شعبہ کی روایت سے زیادہ سفیان کی روایت صحیح ہے، اس کے بعد امام بخاری کا طویل کلام نقل کیا ہے، جس کو ہمارے مؤلف ”حدیث نماز“ نے بھی پورا نقل کر دیا ہے، اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث میں امام شعبہ نے تین جگہ خطا کی ہے:

(۱) ایک تو یہ کہ روایت کی سند میں، روای ”حجر بن عنبس“ کو ”حجر ابو العنبس“ کہہ دیا، جن کی کنیت ابو السکن ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ سند میں حجر بن عنبس اور وائل بن حجر کے درمیان ایک راوی کا اضافہ کر دیا کہ اصل یوں تھا: عن حجر بن عنبس عن وائل بن حجر، اور شعبہ نے اس کی سند اس طرح بیان کی ہے کہ: ”عن حجر ابی العنبس عن علقمہ بن وائل عن وائل بن حجر“ تو بیچ میں ”علقمہ بن وائل“ کا واسطہ شعبہ کا وہم ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ روایت کے الفاظ ”مَدَّ بِهَا صَوْتَهُ“ (یعنی آپ نے آئین میں آواز بلند کی) تھے، مگر شعبہ نے اس کو ”حَفَضَ بِهَا صَوْتَهُ“ (یعنی آواز پست کی) نقل کیا۔

(۴) امام ترمذی نے اس پر ایک اعتراض اپنی کتاب العلیل الکبیر میں ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر بیچ میں علقمہ کا واسطہ ہے تو علقمہ کو اپنے باپ سے سماع حاصل نہیں۔ (نصب الراية: ۳۶۹/۱)

شعبہ کی خطا کا جواب

امام بخاری نے جو فرمایا کہ شعبہ نے خطا کی ہے، یہ صرف امام بخاری کا ظن

ہے، جو اعتراضات یہاں کیے گئے ہیں، سب بے جا ہیں؛ لہذا ہم یہاں علماء کے کلام کی روشنی میں ان کے جوابات بیان کرتے ہیں:

(۱) شعبہ کی روایت پر امام بخاری نے پہلا اعتراض یہ کیا ہے کہ: انھوں نے سند میں ”حجر بن عنبس“ کی جگہ ”حجر ابو العنبس“ کہہ دیا، مگر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ حجر بن العنبس اور حجر ابو العنبس، یہ سب ایک ہی شخصیت کے نام ہیں۔ چنانچہ محدث ابن حبان نے ”کتاب الثقات“ میں ابن العنبس و ابو العنبس کے ایک ہونے کی تصریح کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ: ”حجر بن عنبس أبو العنبس الكوفي ، وهو الذي يقال له : حجر أبو العنبس ، يروي عن علي و وائل بن حجر روى عنه سلمة بن كهيل“۔ (نصب الراية: ۳۶۹/۱)

اور خود امام سفیان نے بھی شعبہ ہی کی طرح ایک روایت میں کہا ہے، چنانچہ ابوداؤد کی روایت سفیان میں حضرت سفیان نے ”حجر ابی العنبس“ ہی کہا ہے۔ (ابوداؤد: ۱۳۴/۱)

اور مزید کمال کی بات یہ ہے کہ دارقطنی کی روایت میں دونوں کے ایک ہونے کی تصریح خود امام سفیان نے کی ہے، چنانچہ سفیان نے سلمہ بن کہیل سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ: ”عن حجر أبي العنبس وهو ابن العنبس عن وائل قال سمعت النبي ﷺ الخ“ اور دارقطنی نے اس روایت کی تصحیح کی ہے۔ (سنن دارقطنی: ۳۳۳/۱)

پس سفیان اور شعبہ کی روایت متفق ہوگئی۔ سوال یہ ہے کہ یہ بات اگر شعبہ بیان کریں تو ان کی خطا ہے اور وہی بات سفیان بیان کریں تو صحیح اور ان کی حدیث بھی صحیح ہے، یہ کس اصول پر ہے؟

رہا امام بخاری کا یہ کہنا کہ حجر کی کنیت تو ”ابو السکن“ ہے نہ کہ ”ابو العنبس“، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہی شخص کی دو کنیت بھی ہوتی ہیں، اور اس میں کوئی خرابی و اعتراض کی بات نہیں۔ چنانچہ حافظ نے ”تہذیب“ میں لکھا کہ: حجر بن العنبس حضرمی ابو العنبس ہیں اور ان کو ابو السکن بھی کہا جاتا ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۲/۱۸۸، معارف السنن: ۴۰۱)

اور علامہ نیوی نے فرمایا کہ: ابن حبان نے ”کتاب الثقات“ میں اس کو ہزیم کے ساتھ کہا ہے کہ: حجر بن عنبس ابو السکن کوفی ہیں اور یہ وہی ہیں جن کو حجر ابو العنبس کہا جاتا ہے، یہ علیٰ وائل سے روایت کرتے ہیں اور ان سے سلمہ بن کہیل روایت کرتے ہیں۔ (آثار السنن مع التعلیق الحسن: ۱/۹۶)

اس سے معلوم ہوا کہ امام بخاری کا پہلا نقد و اعتراض محض ظن و تخمین پر مبنی ہے جو ان تصریحات کے خلاف ہے، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امام شعبہ ”حجر ابو العنبس“ کہنے میں متفرق نہیں بلکہ خود امام سفیان ثوری بھی اس میں ان کے ساتھ ساتھ ہیں۔

(۲) امام بخاری کا دوسرا نقد یہ ہے کہ: امام شعبہ نے سند میں ایک راوی ”علقمہ بن وائل“ کا حجر بن عنبس اور وائل بن حجر کے درمیان اضافہ کر دیا حالانکہ یہ واسطہ نہیں تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شعبہ کی خطا نہیں ہے، بلکہ واقعہ ہی یہ ہے کہ ”حجر بن عنبس“ نے کبھی تو وائل سے براہ راست سنا ہے، اور کبھی علقمہ بن وائل کے واسطے سے سنا ہے۔ اور اس میں کوئی بعد نہیں کہ ایک راوی کسی سے کبھی براہ راست سنے اور کبھی کسی کے واسطے سے سنے۔

چنانچہ امام بیہقی نے ”سنن کبریٰ“ میں بطریق ابو داؤد طیالسی شعبہ سے روایت کیا ہے کہ: ”أخبرني سلمة بن كهيل قال سمعتُ حَجراً أبا العنيس قال سمعت علقمة بن وائل يحدث عن وائل وقد سمعته من وائل“، امام بیہقی نے اس کو روایت کرنے کے بعد امام بخاری کے اعتراض کا جواب یہی دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: ”وأما قوله ”عن علقمة“ فقد بين في روايته أن حجراً سمعه من علقمة وقد سمعه أيضاً من وائل نفسه“ (رہا شعبہ کا ”عن علقمة“ کہنا تو انھوں نے خود اپنی روایت میں تصریح کر دی ہے کہ حجر نے اس کو علقمہ سے سنا اور خود وائل سے بھی سنا ہے) (سنن کبریٰ بیہقی: ۸۴/۲)

علامہ نیوی لکھتے ہیں کہ: بعض روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ حجر نے اس حدیث کو علقمہ بن وائل سے سنا ہے اور خود وائل سے بھی سنا ہے۔ امام احمد نے ”مسند احمد“ میں تخریج کی ہے، اس میں ہے کہ حجر بن عنیس بیان کرتے ہیں، ”سمعتُ علقمةَ بن وائل يُحدِّثُ عن وائل و سمعتُ من وائل“ (میں نے علقمہ بن وائل سے سنا، وہ وائل کی طرف سے حدیث بیان کرتے تھے اور میں نے وائل سے بھی سنا)۔ اور مسند ابی داؤد طیالسی اور سنن ابی سلم الجلی میں بھی اس کی تصریح ہے۔ (التعليق الحسن: ۹۶/۱-۹۷)

پس یہ دوسری علت بھی مندرج ہوئی اور جس طریق میں علقمہ کا واسطہ ہے۔ اس کا صحیح ہونا معلوم ہوا۔

(۳) تیسرا نقد یہ ہے کہ شعبہ نے ”مَدَّ بِهَا صَوْتَهُ“ کو ”خَفَضَ بِهَا صَوْتَهُ“ کہا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب مذکورہ علل ہی مدفوع ہو گئے، تو پھر اس بات کی کیا سند ہے کہ شعبہ نے ہی خطا کی، ممکن ہے سفیان نے خطا کی ہو۔

غرض یہ دعویٰ بے دلیل ہے کہ شعبہ نے غلطی کی ہے، بس زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ روایت ہی مضطرب ہے، جس سے فریقین میں سے کسی کا بھی استدلال نہیں ہو سکتا، یا دونوں لفظوں میں جمع کی صورت اختیار کی جائے، جیسا کہ ہم بیان کریں گے۔

(۴) اس پر آخری اعتراض یہ ہے کہ اگر اس روایت کی سند میں بقول شعبہ علقمہ نے اپنے باپ وائل بن حجر سے روایت کیا ہے تو یہ حدیث منقطع ہے؛ کیونکہ علقمہ نے اپنے باپ سے نہیں سنا۔ مگر یہ بات درست نہیں؛ کیونکہ علقمہ کا سماع وائل سے ثابت ہے، جس کی تحقیق ہم نے دعائے استفتاح کے بیان میں بوضاحت کر دی ہے۔ وہاں مراجعت کر لی جائے۔ اور اگر ان بعض محدثین کا قول لیا جائے تو بھی یہ قادح اس لیے نہیں کہ اس واسطے کے بغیر بھی ان کی روایت ہے، جیسا کہ ابھی گزرا۔ الغرض یہ روایت اس قدر نقد سے بھی سالم ہے۔

روایت شعبہ کی تصحیح

اسی لئے متعدد محدثین نے شعبہ کی حدیث کو بھی صحیح مانا ہے، چنانچہ امام حاکم نے مستدرک میں اس کو روایت کیا اور کہا کہ: یہ حدیث صحیح علی شرط الشیخین ہے، اسی طرح ابن جریر طبری اور قاضی عیاض نے بھی شعبہ و سفیان دونوں کی حدیثوں کو صحیح کہا ہے۔ (دیکھو: الجوهري، ۸۵/۲، معارف السنن: ۲/۴۰۷)

دونوں روایات میں تطبیق

جب دونوں حدیثیں صحیح ہیں تو دو کے لفظوں میں جمع کی کئی صورتیں ہو سکتی ہے: (۱) علامہ ابن الہمام نے اس طرح جمع کیا کہ ”حفض“ یعنی آواز پست

کرنے سے مراد یہ ہے کہ بہت زور کی آواز نہ تھی اور ”مد“ سے مراد آواز کا کم نہ ہونا ہے۔

(۲) بعض علماء نے دونوں میں اس طرح جمع کیا ہے کہ یہ مختلف حالات پر محمول ہے کہ کبھی آپ ﷺ نے آمین زور سے کہی، اور کبھی آہستہ کہی اور حضرت وائل نے بھی کبھی اس کو، کبھی اُس کو بیان کیا ہے۔

(۳) بعض نے کہا کہ: ”مَدَّ بِهَا صَوْتَهُ“ کے معنی یہاں آواز بلند کرنے کے نہیں ہیں، بلکہ سانس کو لمبا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ آمین میں ذرا لمبا سانس لے کر اس کو کھینچ کر پڑھتے ہیں، اب دونوں لفظ جمع ہو گئے کہ آواز پست تھی اور آپ ﷺ نے آمین میں لمبا سانس لے کر ادا کیا۔

رہا یہ کہ بعض روایات میں رفع کی تصریح ہے، تو جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ روایت بالمعنی ہو اور راویوں نے تغیر کیا ہو، اس لیے محدثین نے ”مَدَّ بِهَا“ کے الفاظ کو صحیح قرار دیا ہے۔ اسی طرح جہر کو محدثین نے روایت بالمعنی قرار دیا ہے۔ (معارف السنن: ۲۰۹/۲-۲۱۰)

اور اس کی مؤیدات ہم عرض کریں گے:

(۱) ابن ماجہ نے حضرت وائل ہی کی یہ حدیث بطریق عبد الجبار بن وائل روایت کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:

” فَلَمَّا قَالَ: ” وَلَا الضَّالِّينَ “ قَالَ آمِينَ ، فَسَمِعْنَاهَا مِنْهُ “ (جب نبی کریم ﷺ نے ” وَلَا الضَّالِّينَ “ پڑھا تو آمین کہا اور ہم نے بھی اس کو سنا) (ابن ماجہ: ۶۱/۱)

اس میں بنظر انصاف غور و تأمل سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ روزانہ

بالکل اخفاء کے ساتھ آمین ہوتی تھی اور کسی دن ذرا آپ ﷺ نے زور سے آمین فرمائی، تو یہ اس کو یہاں بیان کرتے ہیں کہ: آپ ﷺ نے آمین کہی اور ہم نے بھی اس کو سنا۔ کیا جو چیز روزانہ ہوتی ہو اور یہ بات مقرر و مشہور ہو کہ آمین میں جہر ہوتا ہے تو اس عنوان سے اس کو تعبیر کیا جاسکتا ہے؟

(۲) سنن کبریٰ نسائی، میں بطریق ابی اسحاق وائل کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں: ”فَسَمِعْتُهُ وَأَنَا خَلْفَهُ“ (میں نے اس کو سنا اور میں آپ ﷺ کے پیچھے تھا) (سنن کبریٰ نسائی: ۳۲۳۱)

یہاں بھی یہ تعبیر بتاتی ہے کہ اول تو روزانہ جہر و رفع نہ تھا اور اس دن بھی کچھ رفع ہوا تو اس کو بڑے اہتمام سے بیان کر رہے ہیں کہ: میں نے بھی اس کو سنا ہے جب کہ میں آپ ﷺ کے پیچھے تھا۔
الغرض روایت شعبہ کومسک کے خلاف دیکھ کر محض گمان سے اسے خطا اور خدشہ قرار دینا بعید از انصاف ہے۔

ترجیح روایت

بعض لوگ کہتے ہیں کہ: شعبہ اور سفیان کے اختلاف کی صورت میں سفیان کو ترجیح دی جاتی ہے؛ کیونکہ سفیان شعبہ سے احفظ ہیں۔ لہذا یہاں بھی سفیان کی روایت راجح ہے۔

راقم کہتا ہے کہ: اول تو اختلاف ہی نہیں کہ ترجیح کی نوبت آئے۔ ثانیاً یہ فیصلہ متفق علیہ و مجمع علیہ نہیں، بلکہ اس میں خود ہی اختلاف ہے، بعض محدثین نے جیسے یحییٰ بن سعید القطان وغیرہ نے اختلاف کے موقع پر شعبہ کو ترجیح دی ہے۔ (التعلیق الحسن: ۹۷)

بعض لوگ سفیان کی روایت کو اس طرح ترجیح دیتے ہیں کہ سفیان کی متابعت علاء بن الصالح اور محمد بن سلمہ بن کہیل سے ہے، مگر یہ روایت شعبہ میں قادح نہیں: کیونکہ یہ دونوں راوی ضعیف ہیں، لہذا یوں نہیں کہا جاسکتا کہ شعبہ نے ثقات کی مخالفت کی ہے۔ (آثار السنن مع التعلیق الحسن: ۹۷/۱)

بعض حضرات نے سفیان کی روایت کو اس طرح ترجیح دی ہے کہ خود شعبہ نے سفیان کی طرح رفع ومد کی حدیث روایت کی ہے جو ”بیہقی“ میں بطریق ابوالولید طیالسی عن شعبہ ہے۔ (سنن بیہقی: ۸۴/۲)

مگر علامہ شوق نیوی نے کہا کہ یہ شعبہ سے رفع آمین کی روایت شاذ ہے: کیونکہ شعبہ کے سب شاگردان سے حفص ہی نقل کرتے ہیں۔ اور صرف ابوالولید نے رفع نقل کیا ہے اور ابوالولید سے بھی صرف ابراہیم بن مرزوق نے اس کو نقل کیا ہے اور ابراہیم بن مرزوق بصری بھی آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے اور خطا کرتے تھے۔ لہذا یہ وجہ ترجیح بننے کے قابل نہیں۔ (آثار السنن مع التعلیق الحسن: ۹۸/۱)

اور پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ: خود سفیان سے ”مصنف ابن ابی شیبہ“ میں ”حفص و اخفی“ کی روایت مثل شعبہ کے بطریق وکیع بن سفیان واقع ہوئی ہے۔ اس کو مترجم ”شرح وقایہ“ وحید الزماں صاحب نے ”نور الہدایہ“ میں نقل کیا ہے۔ (نور الہدایہ: ۸۹)

مگر یہاں کے نسخوں میں یہ روایت نہیں ہے، ممکن ہے اصل اور صحیح نسخوں میں ہو؛ کیونکہ ان کتابوں میں نسخوں کا کافی فرق ہے، جو اہل علم اور اصحاب مطالعہ پر مخفی نہیں۔ لہذا یہ امر قابل تحقیق ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

روایت شعبہ کی وجہ ترجیح

اس سے معلوم ہوا کہ سفیان کی روایت کو ترجیح دینے کے لئے جو وجوہات پیش کی گئی ہیں وہ اس لائق نہیں کہ ان کو وجہ ترجیح قرار دیا جائے، اور اس کے مقابلہ میں ایک واقعی وجہ ترجیح روایت شعبہ کے بارے میں پیش کی جاسکتی ہے۔

علامہ نیوی نے کہا کہ: میرے پاس شعبہ کی روایت کی ترجیح کے لیے ایک وجہ حسن ہے کہ شعبہ کبھی بھی تالیس نہیں کرتے تھے، نہ ضعفاء سے نہ ثقات سے، اس کے برخلاف حضرت سفیان کبھی تالیس بھی کرتے تھے۔ (آثار السنن: ۱/۹۷)

حافظ ذہبی نے ”تذکر الحفاظ“ میں ابو زید اللہری سے نقل کیا کہ: میں نے شعبہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں آسمان سے گر پڑوں اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤں یہ مجھے تالیس سے زیادہ محبوب ہے۔ (تذکر الحفاظ: ۱/۱۲۵)

اور مقدمہ ابن الصلاح میں ہے کہ حضرت شعبہ نے کہا کہ: تالیس جھوٹ کا بھائی ہے اور کہا کہ: میں زنا کروں یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں تالیس کروں۔ (مقدمہ ابن الصلاح: ۲/۴۲، تدریب الراوی: ۱/۱۲۱)

مطلب یہ ہے کہ وہ تالیس کو زنا سے بھی زیادہ ناپسند کرتے تھے، تو ظاہر ہے کہ وہ تالیس کیسے کرتے۔ اور پھر اس کے باوجود انہوں نے سلمہ بن کہیل سے روایت کرنے میں ”خبرنی“ کہا ہے، جیسا کہ ”مسند ابی داؤد طیالسی“ میں ہے۔

اور اس کے برخلاف حضرت سفیان کبھی کبھی ضعفاء سے تالیس بھی کرتے تھے۔ میزان الاعتدال میں ہے کہ وہ ثقہ ثابت تھے، لیکن کبھی کبھی ضعفاء سے تالیس کرتے تھے، اور حافظ نے تقریب میں یہی لکھا ہے۔ (میزان الاعتدال: ۲/۱۶۹، تقریب التہذیب: ۲/۲۴۴)

اور پھر یہاں انھوں نے عنعنہ سے روایت کیا ہے۔ لہذا تدریس کا شبہ ہے۔ اس لیے شعبہ کی روایت راجح ہوگئی۔ (التعلیق الحسن: ۱/۹۷)

اور علامہ بنوری نے ”معارف السنن“ میں لکھا ہے کہ: شعبہ کی روایت ”مسند ابی داؤد طیالسی“ اور ”مسند احمد“ و ”مسند ابوسلم کجی“ اور ”دارقطنی“ میں مسلسل بالتحذیر ہے اور سفیان کی روایت عن سلمہ عنعنہ سے ہے اور بلاشبہ وہ روایت قابل ترجیح ہے جس میں سماع کی صراحت ہو۔ (معارف السنن: ۲/۴۲۰)

اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ شعبہ کی اور سفیان کی روایت میں اول تو ترجیح کی ضرورت نہیں، اور شعبہ کی خطا بیان کرنا خلاف تحقیق ہے اور بے دلیل ہے اور جو بھی اعتراضات اس پر کئے گئے ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے، اور ترجیح کی صورت میں سفیان کی روایت راجح نہیں ہو سکتی اور جوہ مذکورہ باعث ترجیح نہیں ہیں اور شعبہ کی روایت میں ایک وجہ ترجیح موجود ہے کہ شعبہ باوجود مدلس نہ ہونے کے سماع کی تصریح کرتے ہیں اور سفیان مدلس ہونے کے باوجود عنعنہ سے روایت کرتے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ مدلس کا عنعنہ ناقابل اعتبار ہوتا ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

اخفاء کے معنی کی تحقیق

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس کے بعد لکھا ہے کہ ”تاہم اس (شعبہ کے) غلطی کرنے اور اس روایت کے ضعیف ہونے پر بھی اس حدیث میں بالکل ہی آمین بولنے کی ممانعت ہرگز نہیں ہے۔ راوی کا بیان موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ”ولا الضالین“ پڑھ کر آمین کہی۔ آمین میں آواز کو پست یعنی ہلکا رکھا۔ اب ظاہر بات ہے کہ اتنا پست رکھا کہ راوی حدیث نے آپ ﷺ کی آواز سنی، ورنہ راوی حدیث کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے (آمین) بولا یا نہیں۔ اس کے بعد علامہ ابن

الہمام کا قول ”عین الہدایہ“ سے نقل کیا کہ: خفض سے مراد زیادہ بلند آواز نہ ہونا ہے الخ۔ (حدیث نماز: ۱۲۹)

میں کہتا ہوں کہ: پہلے بھی میں نے نقل کیا ہے کہ احناف کے نزدیک بھی اخفاء اور خفض کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آواز بالکل نہ آئے، بلکہ اخفاء میں یہ بھی داخل ہے کہ ایک دو آدمی سن لیں، یہ خلاف اخفاء نہیں۔

چنانچہ کتب فقہ میں مصرح ہے کہ:

”إن أدنى المخافة إسماع نفسه ومن يقربه من رجل أو رجلين“
نیز لکھا ہے کہ: فلو سمع رجل أو رجلان لا يكون جهرًا“ (کم سے کم اخفاء یہ ہے کہ اپنے نفس کو آواز سنائے اور ان کو جو اپنے قریب ہوں، پس اگر ایک دو آدمی سن لیں تو یہ جہر نہیں ہوگا) (دیکھو شامی: ۵۳۴/۱-۵۳۵)

اور روایات میں بھی اتنا ہی مذکور ہے کہ ایک دو نے سن لیا، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ کی روایت بطریق بشر بن رافع میں ”حتى يسمع من يليه من الصف الاول“ (آپ ﷺ سے صف اول میں سے جو قریب تھا اس نے سن لیا) آیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قریب ایک دو ہی ہوتے ہیں۔

اور نسائی نے بطریق ابی اسحاق انہی وائل کی روایت میں نقل کیا ہے کہ:
”فسمعتہ و أنا خلفہ“ (میں نے آمین سنی اور میں آپ ﷺ کے پیچھے تھا)

اور بعض روایات میں جو ”سمعنا“ (ہم نے سنا) آیا ہے، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سب نے سنا؛ کیونکہ ایک، دو، یا بعض سننے پر بھی ”سمعنا“ کا اطلاق ہو سکتا ہے، جو کسی پر بھی مخفی نہیں۔ الغرض ان روایات سے بس اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے اخفاء کے ساتھ اس طرح آمین کہی کہ ایک دو افراد نے سن لیا،

اور یہ بات اخفاء کے خلاف نہیں ہے۔

اور جو مؤلف ”حدیث نماز“ نے کہا کہ: اگر آواز نہ ہوتی تو راوی حدیث کو کیسے معلوم ہوتا کہ آمین کہی۔ یہ بات قلت تامل سے پیدا ہوئی ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا ہے؛ کیونکہ متعدد احادیث میں ان امور کو بھی صحابہ نے بیان کیا ہے جو بالاتفاق اخفاء کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ اور پھر مؤلف نے یہاں تو یہ کہا ہے کہ اتنی ہلکی آواز سے آمین کہے کہ پہلی صف والے سن لیں، مگر ان کی مساجد میں اس کا التزام نہیں ہے، بلکہ اس اخفاء و خفض کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی۔

مؤلف ”حدیث نماز“ کی بد فہمی

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس کے بعد یہ بیان کیا کہ: حدیث کی کتابوں پر حاشیے چڑھائے گئے ہیں اور ان حاشیوں میں اسی ضعیف اور مخدوش حدیث سے صحیح حدیثوں کو کاٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز لکھا کہ: ابن ماجہ کے حاشیہ میں پہلے تو اس ضعیف روایت کو صحیح لکھ مارا، پھر شاید حفاظ حدیث اور گھر کی شہادتوں کا خیال آیا تو اس کو علت والی قرار دے دیا، پھر سفیان کی صحیح روایت برداشت نہ ہو سکی، تو حاشیہ نگار نے اسے علت والی بتا دیا، پھر اس نے فیصلہ کیا کہ شعبہ و سفیان والی دونوں روایتیں معلول ہیں۔ لہذا عمل عبداللہ بن مسعود کے قول پر ہوگا کہ حضرت ابن مسعود آہستہ آمین بولنے کو کہتے تھے۔ پھر مؤلف نے آگے چل کر کہا کہ حاشیہ نگار کی تینوں باتیں غلط ہیں۔ (حدیث نماز: ۱۳۰)

میں کہتا ہوں کہ: یہاں مؤلف نے محشی ”ابن ماجہ“ پر جو نقد کیا ہے، یہ بھی مذہبی تعصب کی بنا پر ہے۔ اول تو یہ بیان خود محشی کا نہیں، بلکہ ابن الہمام کا بیان بحوالہ

”مرقاۃ“ و ”لمعات“ نقل کیا گیا ہے اور پھر حدیث شعبہ کی تصحیح خود محشی نے نہیں کر دی ہے، بلکہ یہ نقل کیا ہے کہ بعض علماء نے اس کی تصحیح کی ہے، اور میں کہتا ہوں کہ: مؤلف ”حدیث نماز“ کو معلوم ہو کہ حاکم نے اس کو صحیح علی شرط الشيخین کہا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر نقل کر دیا ہے اور نہ صرف حاکم نے بلکہ جیسا کہ نقل کیا گیا قاضی عیاض وابن جریر نے بھی اس کو صحیح کہا ہے، اور سفیان کی حدیث کو معلوم محشی نے قرار نہیں دیا، ابن الہمام کی جانب اس کو منسوب کیا ہے، اور میں کہتا ہوں کہ یہی بات ابن القطان نے بھی کہی ہے کہ سفیان کی حدیث حسن ہونے کی بنسبت ضعف کے زیادہ قریب ہے۔ (دیکھو نصاب الراية: ۳۶۹/۱)

اور ابن الہمام نے اضطراب کی وجہ سے دونوں کو ضعیف کہا ہے، اور علامہ نیموی نے بھی کہا کہ اس کی اسناد صحیح ہے، مگر متن میں اضطراب ہے۔ مگر افسوس کہ مؤلف کو ان باتوں کا علم ہی نہیں، یا تجاہل عارفانہ برتنے ہوئے ان سے اعراض کرنا چاہتے ہیں، اور آنکھ بند کر کے جہر کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

بہر حال اگر شعبہ کی روایت صحیح نہیں تو سفیان کی حدیث صرف امام بخاری و ابو زرہ کے کہنے سے صحیح کیسے ہو جائیگی، جب کہ شعبہ کی روایت میں سند کا خدشہ تو بالکل نہیں رہا ہے۔ غایت مافی الباب یہ ہے کہ دونوں حدیثیں صحیح ہوں، یا دونوں اضطراب کی وجہ سے معلول ہوں۔ اور اصل حکم اذکار و ادعیہ میں چونکہ اخفاء ہے، اس لیے ہم اخفاء کو اختیار کرتے ہیں، جس کی تائید ابن مسعود کے عمل سے اور حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ کے عمل سے ہوتی، مگر مؤلف کو یہ سب باتیں اوپری معلوم ہوتی ہیں، یہ مؤلف کی کم فہمی و بد فہمی ہے۔

منقطع و معلق کی تعریفات

مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا کہ:

” حضرت ابن مسعودؓ کی روایت (کہ آمین وغیرہ کو اخفاء سے

کہنا چاہئے) کی سند آپ ﷺ تک نہیں پہنچتی، صرف ابراہیم نخعی تک پہنچتی

ہے اور یہاں سلسلہ متروک ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد لکھا کہ یعنی یہ قول

بھی منقطع السند اور معلق ہے۔“ (حدیث نماز: ۱۳۱)

راقم کہتا ہے کہ: مؤلف کو پہلے منقطع اور معلق کی تعریفات اصول حدیث کی

ابتدائی کتابوں سے یاد کر لینا چاہئے، تاکہ ایسی بے تکی اور مضحکہ خیز باتیں ان سے

صادر نہ ہوں۔

منقطع کے معنی یہ ہیں کہ درمیانی سند سے کوئی ایک یا چند راوی ساقط

ہو جائیں۔ اور اگر سلسلہ سند جا کر کسی پر ختم ہو جائے اور درمیان میں سب راوی

برابر ہوں، اور کوئی راوی ساقط نہ ہوا ہو تو اس کو منقطع نہیں کہتے، وہ بھی محدثین کی

اصطلاح میں متصل ہی کہلاتی ہے، پھر یہ سلسلہ سند اگر رسول اللہ ﷺ پر جا کر رکے،

تو حدیث متصل مرفوع، اگر صحابہ پر رکے تو متصل موقوف، اور اگر تابعی پر رکے تو اس

کو مقطوع کہتے ہیں۔ لہذا یہاں یہ سند حضرت ابراہیم نخعیؒ پر رکتی ہے تو منقطع نہیں،

بلکہ اس کو مقطوع کہا جائے گا۔

اور معلق کا مطلب یہ ہے کہ سقوط راوی اول سند سے ہوا ہو، اگر آخر سند سے

سقوط راوی ہو تو اس کو مرسل وغیرہ کہا جاتا ہے۔ الغرض یہ سند حضرت ابراہیم نخعیؒ

پر رکتی ہے تو منقطع اور معلق نہیں کہلاتی۔ (فاصلہ)

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کی تحقیق

اب رہا یہ کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے اس قول کی کیا حیثیت ہے؟ تو راقم کہتا ہے کہ: حضرت ابن مسعودؓ کی روایت جو صاحب ”ہدایہ“ نے نقل کی ہے، یہ قول کی حیثیت سے حضرت عبداللہ بن مسعود سے ثابت نہیں ہے، بلکہ یہ مشہور تابعی حضرت ابراہیم نخعی کا قول ہے، اور یہ فعل کی حیثیت سے حضرت عبداللہ بن مسعود سے ثابت ہے۔

پہلے یہ سنئے کہ ابراہیم نخعی کا یہ قول امام محمد نے کتاب الآثار میں روایت کیا ہے کہ ابراہیم نخعی نے کہا کہ: ”أَرْبَعٌ يُخْفِيهِنَّ الْإِمَامُ: التَّعَوُّدُ، وَ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، وَ سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ، وَ آمِينَ“۔ (چار چیزیں ہیں جنہیں امام آہستہ کہے: التَّعَوُّدُ، بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ، بِحَمْدِكَ، اور آمِينَ) (الآثار: ۱۶)

اور محدث عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں روایت کیا کہ ابراہیم نخعی نے کہا کہ ”أَرْبَعٌ يُخْفِيهِنَّ الْإِمَامُ: بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، وَالْإِسْتِعَاذَةُ، وَ آمِينَ، وَإِذَا قَالَ: سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ قَالَ: رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ۔ (چار چیزیں ہیں جنہیں امام آہستہ کہے: بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، الْإِسْتِعَاذَةُ، آمِينَ، اور جب: سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ کہے تو: رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہے) (مصنف عبدالرزاق: ۸۷۲)

اور عبدالرزاق ہی نے دوسری سند سے انہی سے روایت کیا کہ: ”خَمْسٌ يُخْفِيهِنَّ: وَ سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ، التَّعَوُّدُ، وَ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ وَ آمِينَ، وَاللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ“ (پانچ چیزیں ہیں جنہیں آہستہ کہے:

سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ ، أَلْتَعُوذُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ، آمِينَ ، اور
اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ (مصنف عبدالرزاق: ۸۷/۲)

اور ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں انہی سے روایت کیا کہ انہوں نے
فرمایا کہ: ”يُخْفِي الْإِمَامُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ، وَالْإِسْتِعَاذَةَ وَآمِينَ وَ
رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ“ (امام بسم اللہ کو، اعوذ باللہ کو، آمین کو اور ربنا لک الحمد کو آہستہ
پڑھے) (مصنف ابن ابی شیبہ: ۴۴۸/۱)

ان مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم نخعی کا قول و مسلک
یہی تھا کہ آمین آہستہ ہی جائے۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے یہ بات عملاً ثابت ہوئی ہے، امام طبرانی
نے معجم کبیر میں حضرت ابو وائل سے روایت کیا کہ: كَانَ عَلِيٌّ وَ عَبْدُ اللَّهِ لَا
يَجْهَرَانِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ، وَلَا بِالْتَعُوذِ ، وَلَا بِالتَّامِينَ“ (حضرت
علی و عبداللہ بن مسعود نہ بسم اللہ میں آواز بلند کرتے تھے اور نہ تعوذ میں اور نہ آمین
میں) (مجمع الزوائد: ۱۰۸/۲)

علامہ پیشی نے کہا کہ: اس کو امام طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے اور
اس کی سند میں ابوسعید البقال راوی ثقہ مدلس ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ: ابوسعید البقال کی اگرچہ جمہور علماء نے تضعیف کی ہے، مگر
تمام محدثین اس کو ضعیف نہیں کہتے، علامہ بنوری نے ”معارف السنن“ میں اس پر کافی
بحث کرنے کے بعد لکھا کہ: ابوسعید کی امام بخاری، ترمذی، ابن جریر نے، پیشی نے
مجمع الزوائد“ میں، اور حافظ ابن حجر نے ”فتح الباری“ میں توثیق کی ہے، بلکہ ابوزرعہ
کا کلام بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ (معارف السنن: ۴۱۳/۲)

دیگر صحابہ کا مسلک

مؤلف ”حدیث نماز“ نے بحث کے آخری حصہ میں لکھا ہے کہ:
 ”حضرت علی و حضرت عمر وغیرہ کا اثر بھی حاشیہ نگار لاتے ہیں کہ یہ صحابہ آمین نہیں بولتے تھے، میں کہتا ہوں کہ: یہ نام لینا بھی غلط ہے؛ کیونکہ حضرت علی سے خود امام ابن ماجہ نے آمین اونچی آواز سے کہنے کی حدیث روایت کی ہے، معلوم ہوا کہ ان صحابہ کا نام بھی غلط استعمال کیا گیا ہے۔“ (حدیث نماز: ۱۳۱)

راقم کہتا ہے کہ: یہ مؤلف ”حدیث نماز“ کی جرأت بے جا ہے کہ بلا تحقیق اس کو غلط کہد یا، ورنہ صرف یہ حاشیہ نگار نہیں بلکہ بڑے بڑے ائمہ نے اس کو بیان کیا ہے۔

ابن جریر طبری جو کہ مسلکاً شافعی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ: ”روي ذلك عن ابن مسعود و روي عن النخعي والشعبي و ابراهيم التيمي كانوا يخفون بآمين . والصواب أن الخبرين بالجهر بها والمخافتة صحیحان ، وعمل بكل من فعلیه جماعة من العلماء ، وإن كنتُ مُختاراً خفض الصوت بها إذ كان أكثر الصحابة والتابعين علي ذلك۔ (یہ بات حضرت ابن مسعود سے مروی ہے اور امام نخعی و امام شععی و ابراہیم التیمی سے بھی مروی ہے کہ وہ آمین میں انخفاء کرتے تھے، اور صحیح بات یہ ہے کہ آمین زور سے کہنے اور آہستہ کہنے کی دونوں حدیثیں صحیح ہیں، اور آپ ﷺ کے ہر فعل پر علماء کی ایک ایک جماعت نے عمل کیا ہے، اگرچہ میں آہستہ آواز سے کہنے کو پسند کرتا ہوں؛ کیونکہ اکثر صحابہ و تابعین اسی پر تھے) (الجوہر النقی علی سنن البیہقی: ۸۵/۲)

نیز امام طحاوی نے حضرت عمرو علیؓ سے آمین زور سے نہ کہنا روایت کیا ہے۔ وہ اپنی سند سے حضرت ابو وائل سے روایت کرتے ہیں کہ: کان عمر و علی لا یجهران بسم اللہ الرحمن الرحیم ولا بالتعوذ ولا بالتأمین“ (حضرت عمر و حضرت علیؓ نہ بسم اللہ میں آواز بلند کرتے تھے اور نہ تعوذ میں اور نہ آمین میں) (طحاوی: ۱۵۰/۱)

اور اس سند میں بھی وہی ابوسعید البقال ہیں جن کا ذکر ابھی اوپر کیا گیا۔ لہذا یہ سند بھی حسن ہوگی۔ نیز ”کنز العمال“ میں حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ چار چیزوں کو امام آہستہ کہے گا، تعوذ، بسم اللہ، آمین اور ”ربنا لک الحمد“۔ (معارف السنن: ۴۱۳/۲)

اس سے معلوم ہوا کہ مؤلف کا بے تحقیق یہ کہنا کہ ”حضرت عمرؓ وغیرہ کے اثر بھی یہ حاشیہ نگار بیان کرتے ہیں یہ صحابہ کے نام لینا بھی غلط ہے“ خود ہی غلط، لاعلمی اور تعصب اور ہوا پرستی کے سوا کچھ نہیں۔

رہا حضرت علیؓ کی روایت کا ”ابن ماجہ“ میں ہونا تو اس کا ضعف بھی ہم نے اوپر واضح کر دیا ہے۔ پھر اس سے جہر ثابت ہی نہیں ہوتا، جیسا کہ اوپر ہم نے بیان کیا ہے۔

آیات کا جواب دینا

قرآن کی تلاوت کے موقع پر آیات ترغیب و ترہیب بھی نظر سے گزرتی ہیں اور اس موقع پر رسول اللہ ﷺ آیات کا جواب دیا کرتے تھے، جس کا احادیث میں ذکر ہے، مگر یہ جواب کس موقع پر دیتے تھے، ہر موقع پر یا کسی خاص موقع پر؟ یہ مسئلہ علماء کے مابین اختلافی ہے، مؤلف ”حدیث نماز“ نے یہاں یہ مسئلہ بھی

چھیڑا ہے اور لکھا ہے کہ:

”امام کی قرأت میں جہاں جہاں آیت عذاب آئے تو وہ عذاب سے پناہ مانگے اور جہاں جہاں رحمت و جنت کا بیان آئے تو اللہ کی رحمت کا سوال کرے، یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ اور آگے چلکر لکھا ہے کہ حنفی مذہب میں بھی اس کی اجازت ہے۔ اور ملا علی قاری نے امام کو بھی قرأت کرتے ہوئے ان آیات کا جواب دینے کے لئے مرقات شرح مشکاۃ میں لکھا ہے“ (حدیث نماز: ۱۳۳-۱۳۵)

راقم کہتا ہے کہ: یہ بات صحیح ہے کہ قرأت کرتے ہوئے آیات رحمت و آیات عذاب کا جواب دینا چاہئے، اور اس سلسلہ میں احادیث وارد ہوئی ہیں، مسئلہ کی وضاحت سے پہلے وہ احادیث ملاحظہ کیجئے:

(۱) حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ: میں نے ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، آپ نے سورہ بقرہ شروع کی، میں نے (دل میں) کہا کہ: شاید سو آیات پر رکوع کریں گے، لیکن آپ آگے بڑھ گئے، میں نے کہا کہ: شاید سورہ بقرہ پوری نماز (دو رکعت) میں پڑھیں گے، پس آپ آگے بڑھ گئے، میں نے کہا کہ: شاید اس پر آپ رکوع کریں گے، مگر آپ نے سورہ نساء شروع کر دی، پھر آل عمران شروع کر دی، آپ اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ رہے تھے، جب کسی ایسی آیت پر گزرتے جس میں اللہ کی تسبیح کا ذکر ہے تو آپ اللہ کی تسبیح کرتے اور جب کسی ایسی آیت پر گزرتے جس میں اللہ سے سوال ہے تو آپ اللہ سے سوال کرتے، اور جب کسی ایسی آیت سے گزرتے جس میں اللہ سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے تو آپ اللہ سے پناہ مانگتے، الخ۔ (مسلم: ۲۶۴۱)

(۲) حضرت جابر سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب میں نکلے، اور سورہ رحمان شروع سے اخیر تک پڑھی، پس صحابہ خاموش رہے تو فرمایا کہ: میں نے اس کو لیلۃ الجن میں جنات پر پڑھا تو انھوں نے تم سے زیادہ اچھے طور پر اس کا جواب دیا، میں جب بھی: ”فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ“ پڑھتا تو وہ کہتے: ”لَا بِشَيْءٍ مِّنْ نُّعْمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ، فَلَكَ الْحَمْدُ“۔ (مشکوٰۃ: ۸۱)

(۳) حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو تم میں سے: ”وَالْتَيْنِ وَالزَّيْتُونِ“ پڑھے اور: ”أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَاكِمِينَ“ تک پہنچے تو وہ کہے: ”بَلَىٰ وَ أَنَا عَلَىٰ ذَٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِينَ“ اور جو: ”لَا أُفْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ“ پڑھے اور: ”أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ“ تک پہنچے تو وہ ”بَلَىٰ“ کہے اور جو: ”وَالْمُرْسَلَاتِ“ پڑھے اور: ”فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ“ تک پہنچے تو وہ: ”آمَنَّا بِاللَّهِ“ کہے۔ (مشکوٰۃ: ۸۱)

یہ ہیں وہ احادیث جن میں آیات قرآنیہ کا جواب دینا وارد ہوا ہے، مگر اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی میں فرض نماز کے اندر جواب دینے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، اور نہ ان کے علاوہ نماز رسول پر مشتمل سینکڑوں احادیث میں اس کا ذکر ہے، حالانکہ نماز کا قصہ تو روزانہ پانچ وقت پیش آتا ہے، معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ فرض نمازوں میں آیات قرآنیہ کا جواب نہیں دیتے تھے، ورنہ صحابہ ضرور اس کا ذکر کرتے، دوسرے ان احادیث میں ایک روایت میں نماز لیل میں جو کہ نفل نماز ہے جواب دینے کا ذکر آیا ہے اور دوسری احادیث میں نماز کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ خارج نماز جواب کا ذکر ہے، لہذا نفل میں اس کا جواز یا استحباب ہے۔ اور تیسرے کسی روایت میں مقتدی حضرات کے جواب دینے کا نہ ذکر ہے اور نہ حکم ہے،

لہذا اس کا تعلق مقتدی سے بھی نہ ہوگا۔

لہذا علماء احناف نے اس مسئلہ میں تفصیل کی ہے، علامہ ابن الہمام نے فتح القدر میں، علامہ عینی نے البناہ میں، علامہ نے النہر الفائق میں اور علامہ شامی نے منہج الخالق میں اس کی تفصیل لکھی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: یہاں تین مسئلے ہیں:

(۱) ایک یہ کہ امام فرض نماز میں آیات کا جواب دے، علماء حنفیہ کے نزدیک ایک تو اس کا ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے امام کو فرض میں جواب نہ دینا چاہئے۔

شیخ ناصر الدین الالبانی نے اپنی کتاب ”تمام المنة علی فقہ السنة“ میں یہی بات لکھی ہے، وہ کہتے ہیں کہ: ”قلت: هذا إنما ورد في صلاة الليل كما في حديث حذيفة، فمقتضى الاتباع الوقوف عند الوارد وعدم التوسع فيه بالقياس والرأى، فإنه لو كان ذلك مشروعاً في الفرائض أيضاً لفعله النبي ﷺ ولو فعله لنقل، بل لكان نقله أولى من نقل ذلك في النوافل كما لا يخفى“ (میں کہتا ہوں کہ یہ بات تو بس رات کی (نفل) نماز میں وارد ہوئی ہے جیسا کہ حضرت حذیفہ کی حدیث میں ہے، لہذا اتباع نبی کا تقاضا یہ ہے کہ جو وارد ہوا ہے اسی پر رک جائیں، اور قیاس و رائے سے اس میں توسع نہ کی جائے؛ کیونکہ اگر یہ بات فرائض میں بھی مشروع ہوتی تو نبی کریم ﷺ اس کو کرتے اگرچہ کہ ایک ہی مرتبہ کیوں نہ ہو، اور اگر کرتے تو اس کو ضرور نقل کیا جاتا بلکہ نوافل کے بجائے فرائض میں اس کا نقل کیا جانا اولی ہوتا جیسا کہ مخفی نہیں ہے) (تمام المنة: ۱۸)

دوسرے اس وجہ سے بھی نہ دینا چاہئے کہ امام کو فرض نماز میں حکم ہے کہ وہ نماز میں تخفیف کرے، لمبی لمبی نماز نہ پڑھائے۔ مثلاً:

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”إِذَا أُمَّ“

أَحَدُكُمْ النَّاسَ فَلْيُخَفِّفْ فَإِنَّ فِيهِمُ الصَّغِيرَ وَالضَّعِيفَ وَالْمَرِيضَ وَإِذَا صَلَّى وَحْدَهُ فَلْيُصَلِّ كَيْفَ شَاءَ“ (جب تم میں سے کوئی لوگوں کی امامت کرے تو نماز ہلکی پھلکی پڑھائے؛ کیونکہ لوگوں میں بچے اور کمزور اور بیمار بھی ہوتے ہیں اور جب تنہا پڑھے تو جس طرح چاہے نماز پڑھے) (مسلم: ۳۴۰۱)

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ”مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ إِمَامٍ قَطُّ أَخَفَّ صَلَاةٍ وَلَا أَتَمَّ صَلَاةٍ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ“ (میں نے کسی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ ہلکی پھلکی نماز پڑھانے والا ہو اور نہ کسی ایسے کے پیچھے جو مکمل نماز پڑھانے والا ہو) (مسلم: ۳۴۰۱)

اس سے معلوم ہوا کہ امام کو فرض نماز میں چونکہ تخفیف کا حکم ہے اس لئے آیات کا جواب فرض نماز میں نہ دے، ہاں اگر نفل کی جماعت میں جواب دے تو یہ بات مستحب ہے۔

دوسرا مسئلہ ہے مقتدی کے جواب دینے کا، ان حضرات کے نزدیک یہ بھی نہ چاہئے؛ کیونکہ مقتدی کے جواب دینے کا کوئی ذکر احادیث میں نہیں ہے اور نہ اس کو اس کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ اس کو خاموش رہنے کا حکم ہے۔

اور تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ منفرد فرض نماز میں جواب دے، یہ بھی علماء حنفیہ کے نزدیک ثابت نہیں، ہاں منفرد اگر نفل میں جواب دے تو یہ مستحب ہے۔ (فتح القدر: ۳۵۰۱، البنایہ: ۳۷۲/۲، النہر الفائق: ۲۳۶/۱)

راقم کہتا ہے کہ: حضرت حدیفہ کی روایت میں نفل نماز میں جواب دینے کا بیان ہے۔ اور جو روایت مؤلف نے پیش کی ہے، ان میں اکثر میں نماز کا کوئی

ذکر ہی نہیں، اس لیے احناف نے نماز کی اصل حالت کا اعتبار کرتے ہوئے ان روایات کو خارج صلوٰۃ پر محمول کیا ہے۔ اور ظاہر ہے یہ سب کچھ احادیث ہی کی روشنی میں کہا گیا ہے۔

رفع یدین کا مسئلہ

رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے (رفع یدین) یعنی ہاتھ اٹھانے کے بارے میں علماء و ائمہ میں شدید اختلاف ہوا ہے، اور حق یہ ہے کہ دونوں کا ثبوت نبی کریم ﷺ سے اور صحابہ و تابعین سے علی سبیل التواتر موجود ہے، کسی ایک پر جمود کرتے ہوئے دوسرے کا انکار تعصب جاہلانہ و حمیت جاہلیہ ہے۔ اسی طرح یہ بات کہ رفع یدین ثابت ہے ایک مسلم بات ہے جس طرح ترک رفع بھی ثابت ہے، مگر یہ دعویٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ رفع یدین کیا ہے محتاج دلیل ہے اور اس کی کوئی دلیل نہیں، ہمارے مؤلف ”حدیث نماز“ نے رفع یدین کی بحث کے شروع میں یہی دعویٰ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

”رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھا کر رفع یدین کرنا

رسول اللہ ﷺ کی سنتِ مستمرہ ہے آپ نے ہمیشہ یہ سنت ادا کی ہے۔“

(حدیث نماز: ۱۳۵)

مگر اس کی کوئی دلیل نہیں دی اور نہ اس کی کوئی دلیل ہے، بلکہ احادیث سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رفع یدین کیا ہے، اور جس طرح یہ ثابت ہے اسی طرح اس کے خلاف ترک رفع یدین کا بھی ثبوت ہے۔ لہذا اس کا انکار احادیث کے انکار کے مترادف ہے۔

ائمہ کے مسالک

آگے بڑھنے سے پہلے اس سلسلہ میں ائمہ کرام کے مسالک پر ایک نظر ڈالتے چلئے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اس میں ائمہ دونوں جانب موجود ہیں، بعض کے نزدیک رفع یدین نہیں ہے اور بعض کے نزدیک رفع یدین کا ثبوت نہیں۔

(۱) ایک قول یہ ہے کہ نماز میں صرف تکبیر اولیٰ کے وقت رفع یدین ہے، اس کے بعد رکوع وغیرہ کے موقعہ پر رفع یدین نہیں ہے، علامہ عینی نے ذکر کیا ہے کہ: رفع یدین نہ کرنا امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مسلک ہے، اسی طرح امام سفیان ثوری، امام نخعی، امام ابن ابی لیلیٰ، علقمہ بن قیس، اسود بن یزید، امام شععی، ابواسحاق سبئی، خیشمہ، مغیرہ، کعب، عاصم بن کلیب، زفر کا بھی یہی قول ہے، امام مالک کی ایک روایت اور ان کا مشہور مذہب بھی یہی ہے، امام ترمذی نے کہا کہ بے شمار صحابہ رسول اور تابعین نے بھی یہی بات کہی ہے۔ (عمدة القاری: ۴/۳۸۰)

اور علامہ عبداللہ صاحب لکھنوی نے لکھا ہے کہ یہی حضرت ثوری، حضرت حسن بن جی، اور تمام فقہاء کوفہ کا قول ہے، اور یہی حضرت ابن مسعود اور ان کے شاگردوں کا قول ہے۔ (التعلیق امجد: ۹۱)

امام مالک کا قول ان کے مذہب کی مستند و معروف کتاب ”المدونۃ الکبریٰ“ میں نقل کیا ہے کہ: ”لا أعرف رفع الیدین فی شیء من تکبیر الصلاة لا فی خفض ولا فی رفع إلا فی افتتاح الصلاة“ (میں سوائے افتتاح کے نماز کی تکبیر میں کہیں بھی رفع یدین کو نہیں جانتا، نہ جھکتے وقت اور نہ اٹھتے وقت) (المدونۃ الکبریٰ: ۱۶۵/۱)

(۲) دوسرا مسلک یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے بھی رفع یدین ہے، علامہ عینی کہتے ہیں کہ: یہی قول امام

شافعی، امام احمد، امام اسحاق، ابو ثور، ابن جریر، طبری کا ہے، اور امام مالک کی ایک روایت بھی یہی ہے، اور اسی طرف حسن بصری، ابن سیرین، اور عطاء ابن ابی رباح، طاوس، مجاہد، قاسم بن محمد، سالم، قتادہ، مکحول، سعید بن جبیر، عبد اللہ بن المبارک، سفیان بن عیینہ گئے ہیں۔ (عمدة القاری: ۳۷۹/۴، المغنی: ۳۵۰/۱)

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ میں سے بھی اور تابعین میں سے بھی متعدد حضرات نے ان میں سے کسی نہ کسی قول کو اختیار کیا، بعض نے پہلے قول کو اور بعض نے دوسرے قول کو اختیار کیا ہے۔

ربارح و مرجوح کا معاملہ یہ اذواق ائمہ کا نتیجہ ہے، کسی نے رفع یدین کو راجح قرار دیا ہے، تو کسی نے ترک رفع یدین کو ترجیح دی ہے اور امام ابوحنیفہ اور علماء احناف بھی ترک رفع کی ترجیح کے قائل ہیں۔

مؤلف ”حدیث نماز“ کے بعض بیانات پر تبصرہ

ان مسلکوں کے دلائل کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مؤلف ”حدیث نماز“ کے بعض غیر ذمہ دارانہ بیانات کا جائزہ لیں اور ان پر تبصرہ پیش کریں۔ مؤلف ”حدیث نماز“ نے ایک عنوان قائم کیا ہے: ”حنفی مذہب کی کتابوں اور فقہاء سے رفع یدین کا ثبوت“ اور اس میں بعض کتب حنفیہ اور علماء حنفیہ کے حوالے درج کئے ہیں جن سے ان کے گمان کے مطابق رفع یدین کا ثبوت ہوتا ہے، لہذا اولاً ہم ان ہی کا جائزہ لیتے ہیں۔

(۱) نور الہدایہ وعین الہدایہ کی عبارت کا حوالہ

مؤلف ”حدیث نماز“ نے حسب عادت نور الہدایہ وعین الہدایہ کے حوالے

سے لکھا ہے کہ:

”رفع یدین نہ کرنے کی حدیث ضعیف ہے، اور یہ کہ رفع یدین کرنے کی حدیثیں بنسبت ترک رفع کے قوی ہیں۔ پھر لکھا کہ جب آپ کی کتابوں میں علی الاعلان یہ تحقیق ہے تو ہم کونسا گناہ کر رہے ہیں اور آپ کیا کمال کر رہے ہیں؟“ (حدیث نماز: ۱۳۷)

راقم کہتا ہے کہ: یہاں بھی وہی کام صاحب ”حدیث نماز“ نے انجام دیا ہے جو گزشتہ اوراق میں انجام دیا تھا کہ کسی کی بات کسی کی جانب منسوب کر دی، یہاں بھی ان حضرات نے دوسرے لوگوں کی اس حدیث کے بارے میں رائے ذکر کی ہے اور اس پر ان کے اعتراضات نقل کئے ہیں اور مؤلف ”حدیث نماز“ اس کو منسوب کر رہے ہیں خود انہی حضرات کی جانب، جو کہ دھوکہ ہے۔ دوسرے ان کتابوں میں ایک یا بعض احادیث کے بارے میں بعض کا قول ضعف کا نقل کیا گیا، مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس کو مطلقاً احادیث ترک رفع یدین کے بارے میں نقل کر دیا جو کہ بددیانتی ہے، حالانکہ خود عین الہدایہ میں اسی جگہ ترک رفع یدین کے سلسلہ میں حدیث ابن مسعود کا حسن ہونا امام ترمذی سے اور اس کا صحیح ہونا امام ابن حزم سے نقل کیا گیا ہے۔ تیسرے ان کتابوں میں ان اعتراضات کے جوابات بھی دئے گئے ہیں اور ان اعتراضات کو واہی قرار دیا ہے، مگر مؤلف نے بکمال مصلحت ان سب باتوں کو حذف کر دیا، اور لوگوں کو دھوکہ میں مبتلا کیا۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ -

(۲) قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے حوالے کی حقیقت

اس کے بعد مؤلف نے حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی کتاب ”مالا بد

منہ“ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

”رفع یدین کو اکثر فقہاء و محدثین سنت ثابت کرتے ہیں، اس کو نقل کر کے لکھا ہے کہ: قاضی صاحب نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو رفع یدین سے مستثنیٰ بتایا ہے، لیکن ان کی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔“ (حدیث نماز: ۱۳۷)

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے اوپر بتایا تھا کہ صحابہ و تابعین و تبع تابعین و ائمہ میں سے بہت سے رفع یدین کے قائل ہیں تو بہت سے ترک رفع کے قائل ہیں، اس میں دورائے نہیں ہے، اگر قاضی صاحب نے بھی اس کو لکھا ہو تو آخر کیا تعجب کی بات ہے، رہا قاضی صاحب کا امام ابوحنیفہ کے مسلک کی دلیل نہ پیش کرنا تو انہوں نے تو کسی کی بھی دلیل نہیں پیش کی ہے، اور نہ یہ کتاب ”مالا بدمنہ“ دلائل کی کتاب ہے بلکہ یہ تو مسائل کی کتاب ہے، دلائل اپنی جگہ مذکور ہیں، اور رہا ابوحنیفہ کا مسلک تو وہ ترک رفع ہونا ایک معروف و مشہور بات ہے، اس پر خوانخواہ کا تبصرہ کرنا اور آپ کو بھی رفع یدین کرنے والوں میں شامل کرنا سوائے ضد کے کچھ نہیں معلوم ہوتا۔

(۳) حضرت شاہ ولی اللہ کا حوالہ

اس سلسلہ میں مولف ”حدیث نماز“ نے ایک حوالہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا پیش کیا ہے کہ:

”انہوں نے اپنی کتاب ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں لکھا ہے کہ: ”والذي يرفع أحب إلي ممن لا يرفع، فإن أحاديث الرفع أكثر وأثبت“ (جو شخص رفع یدین کرتا ہے وہ مجھے رفع یدین نہ کرنے والے سے زیادہ

محبوب ہے، رفع یدین کی حدیثیں بہت زیادہ اور صحیح ہیں)“ (حدیث نماز: ۱۳۸)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اولاً پوری عبارت ملاحظہ کیجئے، پھر حضرت کا مقصد سمجھئے، حضرت کی پوری عبارت یہ ہے:

”وهو من الهيئات فعله النبي ﷺ مرةً و تركه مرةً ، والكل سنةً ، و أخذ بكل واحد جماعةً من الصحابة والتابعين ومن بعدهم ، وهذا أحد المواضع التي اختلف فيها الفريقان : أهل المدينة و أهل الكوفة ، ولكل واحد أصل أصيل - والحق عندي في مثل ذلك أنّ الكل سنةً ، و نظيره الوتر بركعةٍ واحدةٍ أو بثلاثٍ ، والذي يرفع أحب إليّ ممّن لا يرفع ، فإن أحاديث الرفع أكثر وأثبت“ (اور وہ یعنی رفع یدین ان ہیئتوں میں سے ہے جن کو اللہ کے نبی ﷺ نے کبھی کیا اور کبھی چھوڑا ہے، اور یہ سب کا سب سنت ہے، اور صحابہ و تابعین اور بعد کے لوگوں میں سے ایک ایک جماعت نے ان میں سے ایک ایک ہیئت کو اختیار کیا ہے، اور یہ ان مواقع میں سے ہے جن میں دو فریق کا اختلاف ہوا ہے: اہل مدینہ اور اہل کوفہ کا، اور ہر ایک کی اصل و دلیل موجود ہے، اور میرے نزدیک اس جیسے امر میں حق یہ ہے کہ سب باتیں سنت ہیں اور اس کی نظیر ایک رکعت یا تین رکعات سے وتر پڑھنے کا مسئلہ ہے، اور جو شخص رفع یدین کرتا ہے وہ مجھے رفع یدین نہ کرنے والے سے زیادہ محبوب ہے؛ کیونکہ رفع یدین کی حدیثیں بہت اور زیادہ صحیح ہیں)“ (حجۃ اللہ البالغۃ: ۲/۴۵۲)

اس پوری عبارت کو پڑھنے سے چند امور مفہوم ہوئے: ایک تو یہ کہ حضرت

شاہ صاحب کے نزدیک رفع یدین بھی سنت ہے اور ترک رفع بھی سنت ہے اور یہی بات ان کے نزدیک حق ہے، دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک رفع یدین بھی دلائل کی بنیاد پر ثابت ہے اور اسی طرح ترک رفع کی بھی اصل اصیل و دلیل موجود ہے، لہذا یہ بھی بے دلیل نہیں، تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس مسئلہ میں صحابہ و تابعین و بعد کے ائمہ میں بھی اختلاف رہا ہے اور ان میں جس طرح رفع یدین کرنے والے تھے اسی طرح ترک رفع کے قائلین بھی تھے، لہذا دونوں کا پلہ یکساں ہے، ہاں اسی کے ساتھ حضرت شاہ صاحب رفع یدین کو ترک پر ترجیح دیتے ہیں، اور ہم نے اوپر عرض کیا تھا کہ اس ترجیح والے مسئلہ میں ائمہ کے مدارک اجتہاد و اذواق مختلف ہیں، لہذا اگر شاہ صاحب کے نزدیک ترجیح اس کو ہے کہ رفع یدین کیا جائے تو دوسرے ائمہ کا ذوق اس کے خلاف ہے۔

لہذا اس حوالے سے اگر مولف ”حدیث نماز“ کی منشأً صرف یہ بتانا ہے کہ رفع یدین بھی صحیح ہے تو بے شک یہ بات اس سے ثابت ہوتی ہے اور ہمارے نزدیک بھی یہ بات صحیح ہے، لیکن اگر یہ منشأً ہے کہ صرف رفع یدین ہی صحیح و ثابت ہے اور ترک رفع غلط و غیر صحیح اور ضعیف ہے تو اس سے یہ بات ثابت ہی نہیں ہوتی، بلکہ اس کے خلاف کا ثبوت ہوتا ہے۔

(۴) علامہ عبدالحی لکھنوی کا حوالہ

یہاں مؤلف ”حدیث نماز“ نے حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کے دو حوالے پیش کئے ہیں، ایک ان کی کتاب ”السعاہیہ“ کا اور دوسرا ”التعلیق الممجد“ کا، اور یہاں بھی مؤلف ”حدیث نماز“ نے دھوکہ سے کام لیا ہے، لیجئے اولاً ہمارے مؤلف کا بیان ملاحظہ کیجئے، وہ ایک عنوان قائم کرتے ہیں کہ ”مولانا عبد

الحی حنفی کار فغ یدین کے متعلق حرف آخر، اور اس کے تحت لکھتے ہیں کہ:

”اپنی کتاب سعایہ جلد اول ص: ۲۱۳ پر فرماتے ہیں: والحق فی ثبوت رفع الیدین عند الرکوع والرفع منه عن رسول اللہ ﷺ و کثیر من أصحابه بالطرق القویة والأخبار الصحیحة“
(رسول اللہ ﷺ سے اور آپ کے بہت سے اصحاب کرام سے رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین برحق ثابت ہے قوی طریقے اور صحیح حدیثوں کے ساتھ) (حدیث نماز: ۱۳۸)

میں کہتا ہوں کہ: اس میں مؤلف ”حدیث نماز“ پر کئی موخذات ہیں: ایک یہ کہ یہ عبارت جلد اول میں نہیں، بلکہ جلد دوم میں ہے، دوسرے یہ کہ عبارت کے نقل کرنے میں بے احتیاطی کی ہے؛ کیونکہ اس عبارت کے شروع میں ”والحق أنه لا شک“ بھی ہے، جس کو چھوڑ دینے سے عبارت مہمل سی معلوم ہو رہی ہے، جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں، تیسرے یہ کہ اس جگہ بھی انھوں نے حسب عادت عبارت میں قطع و برید سے کام لیا ہے، علامہ عبدالحی صاحب نے اسی عبارت میں ایک جملہ اور بھی لکھا ہے، جس کو جناب مؤلف ”حدیث نماز“ نے اپنے مسلک کے خلاف ہونے کی وجہ سے نقل کرنے سے گریز کیا ہے، لیجئے علامہ کی پوری عبارت یہ ہے: ”والحق أنه لا شک فی ثبوت رفع الیدین عند الرکوع والرفع منه عن رسول اللہ ﷺ و کثیر من أصحابه بالطرق القویة والأخبار الصحیحة، و ثبوت ترکه أیضاً منهم والأمر سهل“ (حق یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اور آپ کے بہت سے صحابہ کرام سے رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کے قوی طرق اور صحیح حدیثوں سے ثبوت میں اور نیز ان حضرات سے ترک رفع یدین میں کوئی شک نہیں اور معاملہ آسان ہے) (السعایة: ۲۱۳/۲)

اس عبارت میں علامہ نے دونوں باتوں کو ثابت کہا ہے: رفع یدین کو بھی اور ترک رفع کو بھی، مگر چونکہ یہ بات مؤلف ”حدیث نماز“ کو کبھی ہضم نہیں ہوتی، اس لئے اس کو چھوڑ کر صرف اپنے مطلب کی بات نقل کر دی، دوسرے اگر یہ بات بھی مان لیں کہ علامہ عبدالحی صاحب نے رفع یدین کا ثبوت ذکر کیا ہے تو اس میں بھی ہمارے مؤلف کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے؛ کیونکہ سوال یہ نہیں ہے کہ رفع یدین صحیح حدیثوں میں وارد ہے یا نہیں؟ بلکہ یہ تو متفقہ و مسلمہ بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بھی اور آپ کے بعض اصحاب سے بھی رفع یدین ثابت ہے، اور اس مذکورہ عبارت سے صرف یہی اور اتنی ہی بات ثابت ہوتی ہے کہ رفع یدین ثابت ہے، اور اس میں کوئی اشکال نہیں، مگر کیا رفع یدین ہمیشہ کرتے تھے؟ اور کیا ترک رفع ثابت نہیں ہے؟ سوال تو یہ ہے۔

مؤلف ”حدیث نماز“ نے علامہ عبدالحی لکھنوی کا دوسرا حوالہ ان کی کتاب ”التعلیق المحمد“ سے دیا کہ:

”آپ نے لکھا ہے: ”إن ثبوته عن النبي ﷺ أكثر وأرجح، وأما دعوى نسخه فليست بمبرهن عليها بما يشفي الغليل و يروي الغليل (رفع یدین کرنے کا ثبوت رسول اللہ ﷺ سے بہت زیادہ حدیثوں اور نہایت راجح روایتوں سے موجود ہے اور جو لوگ اس کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ دعویٰ ایسا بے دلیل ہے جس سے مریض کی نہ تشفی ہوتی ہے اور نہ پیا سے کی پیاس بجھتی ہے) (حدیث نماز: ۱۳۸)

راقم کہتا ہے کہ: اس جگہ مؤلف نے علامہ عبدالحی صاحب کی عبارت پر

اعراب لگانے میں اور اس کے ترجمے میں جو غلطیاں کی ہیں ان سے صرف نظر کرتے ہوئے عرض ہے کہ یہاں بھی علامہ عبدالحی صاحب نے اولاً یہ کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے رفع یدین اور اس کا ترک دونوں کا ثبوت ہے، اسی طرح ابن مسعود اور ان کے اصحاب سے بھی ترک ثابت ہے، لہذا ہم رفع یدین کے سنت مؤکدہ ہونے کو مختار نہیں مانتے، پھر فرمایا کہ: ہاں رفع یدین کا ثبوت اکثر وارنج ہے، اور دعوائے نسخ پر کوئی دلیل نہیں جس سے تشفی و تسلی ہو۔ (خلاصہ از التعلیق المجد: ۹۱)

میں کہتا ہوں کہ: اس میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے رفع یدین کا بھی ثبوت ہے اور ترک رفع کا بھی، ہاں علامہ عبدالحی لکھنوی کے نزدیک رانج رفع یدین ہے، مگر رانج ہونا یا مرجوح ہونا ایک اجتہادی امر ہے، اس میں آراء میں اختلاف ہو سکتا ہے، لہذا اس سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوا کہ علامہ عبدالحی صاحب کے نزدیک رانج یہ ہے کہ رفع یدین کیا جائے، مگر اس سے مؤلف ”حدیث نماز“ کو کیا فائدہ؟ جو کسی کی تقلید ہی کے سرے سے قائل نہیں، اور ہم پر کیسے حجت جو علامہ عبدالحی کی تقلید کا نہیں بلکہ ابوحنیفہ کی تقلید کا التزام کئے ہوئے ہیں؟ رہا رفع یدین کے منسوخ ہونے کا سوال تو اس پر بحث آگے آرہی ہے۔ اور مؤلف نے یہاں علامہ سندھی کے حوالے سے بھی یہ نقل کیا ہے کہ رفع یدین کے منسوخ ہونے کا دعویٰ بے دلیل ہے، اس پر بھی کلام ہم آگے کریں گے۔

کیا رفع یدین کی احادیث زیادہ ہیں؟

مؤلف ”حدیث نماز“ نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور علامہ عبدالحی لکھنوی کے حوالے سے یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ:

”رفع یدین کی احادیث زیادہ ہیں، مگر اس دعوے میں کلام ہے،

اسی طرح بعض حضرات نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ: رفع یدین کو نقل کرنے والے پچاس صحابہ ہیں اور بعض نے کہا کہ: تینتیس ہیں اور بعض نے کہا کہ: تیس ہیں اور بعض نے کہا کہ: سترہ ہیں یہ سب بھی غیر تحقیقی باتیں ہیں، چنانچہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری نے فرمایا کہ: پچاس کا عدد بیان کرنا تو خلط ملط کی بات ہے اور یہ عدد تکبیر تحریمہ کے وقت کے رفع یدین کے بارے میں صحیح ہو سکتا ہے، نہ کہ رکوع کے رفع یدین کے بارے میں، اور امام بیہقی نے خود کہہ دیا ہے کہ: ان احادیث میں سے صرف پندرہ احادیث صحیح سند کے ساتھ آئی ہیں، اور امام بیہقی کے اس دعوے کو بھی دوسرے حضرات تسلیم نہیں کرتے اور تحقیق و بحث کے بعد کل چھ احادیث اس سلسلہ میں باقی رہ جاتی ہیں، ہاں ان چھ احادیث کے طرق و سندیں زیادہ ہیں، اور ترک رفع یدین کے راوی سات ہیں اور ان کے طرق و سندیں کم ہیں، تو معاملہ تو برابر برابر ہی رہا، پھر ترک رفع تو ایک عدمی چیز ہے اور رفع یدین ایک وجودی چیز، اور وجودی چیز کی نقل و حکایت زیادہ ہوتی ہے جبکہ عدمی چیز کی نقل و روایت کم ہوتی ہے؛ کیونکہ وہ تو صرف کسی خاص داعیہ کے وقت نقل کی جاتی ہے۔ (معارف السنن: ۴۶۵/۲-۴۶۷)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رفع یدین کی احادیث اور ترک رفع یدین کی احادیث دونوں تقریباً برابر ہی ہیں، فرق صرف اس قدر ہے کہ رفع یدین کی حدیث کی سندیں زیادہ ہیں اور ترک رفع والی حدیث کی سندیں کم ہیں، مگر اس سے اصل مسئلہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ معلوم ہوا کہ رفع یدین کی احادیث کے زیادہ ہونے کا دعویٰ صحیح نہیں۔

چند اور حوالے

اس کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نے چند اور حوالے بھی درج کئے ہیں، ایک عین الہدایہ کا جس میں ہے کہ رفع یدین صحیح ثابت ہے، اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے کہ رفع یدین کے ثابت ہونے میں کسی کو کلام نہیں، کلام تو اس کے سنت ہونے میں ہے، خود صاحب عین الہدایہ کہتے ہیں کہ: یہاں کلام اس میں ہے کہ آیا مسنون طریقہ یہ ہے کہ سوائے تکبیر تحریمہ کے باقی میں بغیر ہاتھ اٹھائے دائمہ نماز آنحضرت ﷺ ہے یا رکوع و اس سے سر اٹھانے میں رفع الیدین کرنا دائمہ نماز آنحضرت ﷺ ہے؟ اور ائمہ حنفیہ کو اس میں کلام نہیں کہ حضرت ﷺ سے رفع یدین کرنا ثابت ہے مگر یہ نہیں تحقیق ہوتا کہ وہ ابتداء میں تھا یا آخر تک بھی رہا ہے۔ (عین الہدایہ: ۴۹۲/۱)

الغرض محض رفع یدین کا ثبوت سنیت کے لئے کافی نہیں، اس لئے مؤلف کا یہ حوالہ دینا کہ ثبوت ہے مسنون ہونے کی کوئی دلیل نہیں اور نہ ان علماء نے اس مقصد سے اس کو لکھا ہے، لہذا بار بار اس طرح کی عبارات سے عوام الناس کو مرعوب کرنے کا کام بے وجہ کی راگنی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟

ایک حوالہ مقدمہ عالمگیری اردو سے دیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد حضرت عصام بن یوسف رفع یدین کرتے تھے۔ اس کا جواب بھی ظاہر ہے کہ کسی کو یہ دعویٰ نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی رفع یدین نہیں کرتا تھا، اگر وہ اور دیگر حضرات بھی رفع یدین کرتے تھے تو بہت سے نہیں کرتے تھے، اس سے کوئی حجت قائم نہیں ہوتی، خصوصاً مؤلف ”حدیث نماز“ جن کے پاس سوائے قرآن و حدیث کے کوئی بات معتبر ہی نہیں، لہذا یہ حوالہ مؤلف کے کسی کام کا نہیں ہے۔

ایک حوالہ امام بخاری کی جزء رفع الیدین سے دیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام ابن المبارک رفع یدین کرتے تھے، اور ایک حوالہ امام بیہقی کی کتاب السنن سے امام ابوحنیفہ کے استاذ حضرت امام عطاء کا دیا ہے کہ وہ بھی رفع یدین کرتے تھے، اس کا جواب بھی وہی ہے جو ابھی دیا گیا کہ اس سے کسی کو انکار نہیں مگر یہ سب امور ہمارے مؤلف ”حدیث نماز“ کو کچھ بھی مفید نہیں۔

اور اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ جس طرح ابوحنیفہ کے بعض شاگرد اور بعض اساتذہ سے رفع یدین ثابت ہے، اسی طرح بعض اساتذہ اور شاگردوں سے اس کے خلاف وہی ثابت ہے، جو امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ: رفع یدین صرف تکبیر اولی کے وقت ہے۔ جیسا کہ اوپر مسالک کے بیان کے تحت گزرا ہے۔ بلکہ تمام فقہاء کوفہ کا یہی مسلک ہے۔

الغرض اگر یہ لوگ رفع یدین کے قائل تھے تو امام اعظم ابوحنیفہؒ اس کے قائل نہیں، جیسا کہ امام محمد نے کتاب مؤطا میں آپ کا مسلک بیان کیا ہے، اور ابو یوسف اس کے قائل نہیں تھے، جیسا کہ طحاوی میں ہے اور امام محمد بھی قائل نہیں تھے، جیسا کہ کتاب الآثار اور مؤطا میں خود بیان فرمایا ہے، اور حضرت ابراہیم نخعیؒ اس کے قائل نہیں تھے، جیسا کہ کتاب الآثار میں ہے، اسی طرح حضرت اسود اور حضرت علقمہ اس کے قائل نہیں تھے، یہ بھی امام اعظم کے اساتذہ ہی ہیں، یہ مصنف بن ابی شیبہ میں صحیح جید سے ثابت ہے۔ نیز مصنف ابن ابی شیبہ میں بسند جید ابراہیم، خیمہ، قیس بن ابی جازم، شععی، ابواسحاق وغیرہ تابعین سے ترک رفع یدین نقل کیا گیا ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۱۴/۱، قلائد الازہار: ۲۰۲/۱)

بہر حال مؤلف نے جو عبارات نقل کی ہیں، اس کا مجمل جواب یہ ہے کہ ان

علماء کے علاوہ دوسرے علماء احناف ترک رفع یدین کے قائل ہیں، حتیٰ کہ امام اعظم بھی، ان کے شاگرد امام محمدؒ بھی اپنی کتابوں میں تصریح کرتے ہیں کہ رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھتے وقت رفع یدین نہ کریں۔ اگر بعض علماء کے نزدیک رفع یدین رائج ہے، تو احناف پر یہ کہاں لازم ہے کہ ان کی تقلید کر لیں، جب کہ ان کی تقلید کا انہوں نے التزام ہی نہیں کیا ہے۔ رہا معاملہ دلائل کا تو ہم انشاء اللہ اس کو آگے بیان کریں گے۔

امام اعظمؒ کے مسلک کی تحقیق

یہاں پر مؤلف نے ”حدیث نماز“ میں ایک عنوان قائم کیا ”سیدنا امام اعظم ابوحنیفہؒ کے متعلق تحقیق“، پھر لکھا کہ:

”امام اعظم کا فرمان پہلے گزر چکا ہے، ”إذا صح الحدیث فہو مذہبی“ جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے، اس فرمان کے مطابق آپ کا مذہب بھی رفع یدین کا ہوگا جو بخاری وغیرہ میں ثابت ہے۔ اگر کوئی قول آپ کا رفع یدین نہ کرنے کا ہے تو وہ آپ ہی کے اس فرمان سے منسوخ ہوگا، پھر ویسے بھی صحیح سلسلہ سند کے ساتھ رفع یدین کے ساتھ حضرت امام عالی مقام کا کوئی قول ملنا مشکل ہے، اور مکہ میں امام اوزاعی سے رفع یدین کے بارے میں جو مناظرہ حاشیہ نگار نقل کرتے ہیں، اس کی بھی سند نہیں ملتی اور مضمون کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا اور امام عالی مقام کی جلالتِ شان سے بعید ہے۔ (حدیث نماز: ۱۴۰-۱۴۱)

اس بات کو پڑھ کر دل روتا ہے کہ اگر اسی کا نام تحقیق ہو تو پھر دنیا کی کسی

کتاب پر کسی کو بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اسی طرح اوٹ پٹانگ جو سمجھ میں آجائے لکھ مارے اور اس کا نام تحقیق رکھ دے، لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

ہم کئی بار اس سے پہلے بھی ”إذا صح الحدیث فهو مذہبی“ کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ: اس کا مطلب وہ نہیں جو مخالفین عوام کو دھوکہ دینے کے لیے لیتے ہیں؛ کیونکہ اگر امام صاحب کو حدیث صحیح پہنچی ہو، اور انھوں نے اس کو دوسری روایت صحیح کی وجہ سے نہیں لیا یا اس کو مؤول قرار دیا، تو پھر یہاں اس مقولہ کو پیش کرنا سراسر دھوکہ ہے؛ کیونکہ اس مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر حدیث نہ ملنے کی وجہ سے میں نے کوئی بات ایسی کہی ہو جو اس کے مطابق نہ ہو تو میرا مذہب وہی ہے جو حدیث میں ہے، یہ مطلب نہیں کہ اگر میں نے کسی حدیث کی بنیاد پر کوئی بات کہی ہو اور وہ بات کسی کو سمجھ میں نہ آئے تو بھی تم اس بے سمجھ کی وجہ سے میری اس حدیث پر مبنی بات کو چھوڑ دو، کیا کوئی اس کا یہ مطلب لے سکتا ہے؟ نہیں، ہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حدیث صحیح آپ کو نہیں پہنچی تو پھر یہ بات درست ہو سکتی ہے، اور امام صاحب کو حدیث رفع یدین و ترک رفع یدین دونوں کا پہنچنا اور آپ کا ان میں سے رفع یدین والی حدیث کا قبول نہ کرنا اور اس کے مقابل حدیث ترک رفع کا قبول کرنا ثابت ہے، جس کی دلیل وہ واقعہ ہے جو آپ اور امام اوزاعی کے درمیان پیش آیا تھا، اور اس پر کلام آگے آ رہا ہے۔

رہا مؤلف کا یہ کہنا کہ امام صاحب کا رفع یدین نہ کرنے کے بارے میں صحیح سند سے کوئی قول ملنا مشکل ہے، یہ مؤلف کی خوش فہمی اور انمول تحقیق ہے، جس پر مؤلف جتنا چاہیں خوش ہوں کم ہی ہے، مگر اہل دانش و اہل انصاف اس پر لا حول ہی پڑھیں گے؛ کیونکہ میں پوچھتا ہوں کہ کیا امام محمد کی کتاب مؤطا اس بات کی کافی و شافی سند نہیں کہ امام اعظم کا مسلک رفع یدین نہ کرنے کا تھا اور کیا یہ صحیح سند نہیں، اس طرح

امام طحاوی کی کتب سلسلہ سند کی صحت کے لیے کافی نہیں؟
 مؤلف کو ایسی مضحکہ خیز باتوں سے اپنی زبان اور قلم کی حفاظت کرنی چاہئے،
 اور بے سمجھے بوجھے لکھتے چلے جانے سے احتراز کرنا چاہئے جس پر ایک معمولی طالب
 علم بھی گرفت کر سکتا ہے۔

امام اعظم اور امام اوزاعی کا مناظرہ

رہا امام ابوحنیفہ و امام اوزاعی کا رفع یدین کے بارے میں مناظرہ تو اس کے
 متعلق عرض ہے کہ: اولاً: ہم اس کو نقل کرتے ہیں، پھر اس پر کلام کریں گے، وہ یہ کہ
 امام ابن عیینہ کہتے ہیں کہ: ایک دفعہ مکہ میں دارالحنطین پر امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی
 کا اجتماع ہوا تو امام اوزاعی نے امام ابوحنیفہ سے پوچھا کہ آپ لوگ رکوع میں جاتے
 ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کیوں نہیں کرتے؟ امام ابوحنیفہ نے کہا
 کہ: کیونکہ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی بات صحیح طور پر ثابت نہیں (جو غیر
 معارض ہو) اس پر امام اوزاعی نے کہا کہ: کیوں ثابت نہیں جبکہ مجھ سے زہری نے
 سالم سے اور انھوں نے اپنے والد ابن عمر سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ رکوع میں
 جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے؟ امام ابوحنیفہ نے فرمایا
 کہ: مجھ سے حماد نے اور حماد سے ابراہیم نے اور ان سے علقمہ اور اسود نے اور ان
 سے عبد اللہ بن مسعود نے بیان کیا کہ: رسول اللہ ﷺ صرف نماز کے شروع میں رفع
 یدین کرتے تھے، اس کے بعد پھر کہیں رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ اس پر امام اوزاعی
 نے کہا کہ: میں تو آپ کو زہری کے حوالہ سے سالم کی روایت ان کے باپ ابن عمر
 سے بیان کر رہا ہوں اور آپ حماد کے حوالہ سے ابراہیم کی روایت بیان کر رہے ہیں؟
 امام ابوحنیفہ نے کہا کہ: حماد زہری سے زیادہ فقیہ ہیں، اور ابراہیم سالم سے بڑھ کر فقیہ

ہیں اور علقمہ فقہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کچھ کم نہیں ہیں، اور عبد اللہ بن مسعود تو عبد اللہ بن مسعود ہیں ہی۔ اس پر امام اوزاعی خاموش ہو گئے۔ (المبسوط ۲۹۱: ۳۱۱، فتح القدیر: ۳۱۱/۱، جامع المسانید: ۳۵۲/۱)

یہ ہے وہ پورا مناظرہ جس میں امام ابوحنیفہ نے امام اوزاعی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ بتا دیا کہ اگرچہ ہمارے پیش نظر حضرت عبد اللہ بن عمر کی وہ حدیث بھی ہے جس میں ”رفع یدین“ کا ذکر ہے مگر اس کے مقابلہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود کی حدیث جس میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ رفع یدین نہیں کرتے تھے، ہمارے نزدیک راجح ہے اور راجح ہونے کی دلیل میں امام ابوحنیفہ نے علو اسناد کے بجائے فقہت راوی کو پیش کیا ہے۔

اس کی سند محدث حارثی سبذمونی نے مسند میں بیان کی ہے کہ: ان سے محمد بن ابراہیم بن زیاد الرازی نے بیان کیا اور ان سے سلیمان بن الشاذکونی نے بیان کیا کہ: میں نے سفیان بن عیینہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی مکہ میں دارالحنطین میں جمع ہوئے اور پھر یہی قصہ بیان کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ واقعہ کس حیثیت کا ہے؟ صحیح ہے یا غلط؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ سند کے لحاظ سے اگرچہ کچھ زیادہ مضبوط نہیں ہے؛ کیونکہ اس سند میں سلیمان الشاذکونی ہیں جن کے بارے میں محدثین کی رائے مختلف ہے، بعض نے ان کو وہابی اور بعض نے خائب بتایا ہے اور امام احمد سے مروی ہے کہ: انھوں نے ان کے حافظہ کی تعریف کی اور فرمایا کہ: ہم میں ابواب کے یاد کرنے میں شاذکونی سب سے بڑھ کر ہیں، اور صالح بن محمد جزرہ سے جب ان کے بارے میں سوال کیا گیا تو کہا کہ: میں نے ان سے زیادہ احفظ نہیں دیکھا، مگر حدیث میں جھوٹ

بولتے ہیں، اور اسی طرح ابن معین نے بھی ان کو جھوٹا کہا ہے، مگر ابن عدی نے اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ: ان کی بہت سی احادیث مستقیم ہیں، اور عبدان سے جب سلیمان کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ معاذ اللہ کہ وہ کذب سے متہم ہوں، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کی کتابیں ضائع ہو گئی تھیں اور حفظ سے بیان کرتے تھے اور غلطی کرتے تھے۔

(تذکرۃ الحفاظ: ۲/۴۸۹، الکامل لابن عدی: ۳/۲۹۵، لسان المیزان: ۳/۸۵)

اس سے معلوم ہوا کہ محدث شاذ کو فی ضعیف تو ہیں مگر ان پر کذب کا اتہام صحیح نہیں ہے، بلکہ معارف السنن میں ہے کہ تذکرۃ الحفاظ میں شاذ کو فی کو ایسے طریقہ سے ذکر کیا ہے کہ اس سے ایسے امور میں قابل احتجاج ہونا معلوم ہوتا ہے۔ (معارف السنن: ۲/۵۰۰)

اور اس سند میں دوسرے راوی محمد بن ابراہیم ہیں، یہ بھی متکلم فیہ راوی ہیں، ان کے بارے میں امام دارقطنی نے کہا کہ: متروک ہے اور ایک موقع پر دجال کہا ہے اور برقانی نے کہا کہ: برا آدمی ہے، مگر خطیب نے لکھا ہے کہ: میں نے ان کے بارے میں ابو حازم سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ: میں نے ابو حامد الحافظ سے سنا کہ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ: وہ اگر اپنے سماع پر اکتفاء کرتے تو ان کے لئے کافی تھا، مگر انھوں نے ان شیوخ سے بھی روایت کیا جن سے ان کو ملاقات نہیں ہے۔ (تاریخ بغداد: ۱/۴۰۶، تاریخ ابن عساکر: ۵۱/۲۰۲)

پھر یہ حدیث اگرچہ اس طریق سے ضعیف ہے مگر اس کا ایک دوسرا طریق بھی ہے جس کو ابو محمد البخاری نے جامع المسانید میں ذکر کیا ہے، اس میں امام ابو حنیفہ تک تمام رجال ثقہ ہیں، اور امام صاحب سے روایت کرنے والے شقیق بن ابراہیم کبار زہاد میں سے ہیں اور ان کی احادیث پر نکارت کا حکم ان کی وجہ سے نہیں بلکہ ان

سے روایت کرنے والوں کی وجہ سے ہے اور دوسرا راوی رجا بن عبد اللہ ہے جن پر ہم واقف نہیں ہوئے کہ کون ہیں۔ (امانی الاحبار: ۳/۲۰۰)

حاصل یہ کہ سلیمان شاذ کوفی کو کذاب کہنا تو درست نہیں، البتہ ضعیف ضرور ہیں، اسی طرح محمد بن ابراہیم بھی متکلم فیہ ہیں، لہذا یہ واقعہ سند ضعیف سے ثابت ہے، مگر اس کو بے سند بھی نہیں کہا جاسکتا، پھر چونکہ یہ حدیث کا معاملہ نہیں، بلکہ صرف ایک تاریخی واقعہ ہے، اس لئے اس کی اتنی سند بھی کافی ہوتی ہے، بلکہ محض شہرت واقعہ بھی اعتماد کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔

رہا مؤلف ”حدیث نماز“ کا یہ کہنا کہ اس کا مضمون صحیح نہیں ہے، تو عرض ہے کہ اس میں کیا صحیح نہیں ہے؟ اگر یہ بات کہ غیر صحابی کو صحابی پر فضیلت دینا صحیح نہیں تو میں کہتا ہوں کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے صحابی پر غیر صحابی کو کلی فضیلت نہیں دی ہے، بلکہ ایک جزئی فضیلت دی ہے، اور اس میں کوئی قابل اشکال بات نہیں؛ کیونکہ یہ بات مانے بغیر چارہ نہیں کہ بہت سے صحابہ بدوی اور اعرابی تھے اور علم و فقہ میں اونچا مرتبہ نہیں رکھتے تھے، اگرچہ کہ صحابہ تھے اور ان کے برخلاف دوسرے غیر صحابہ ائمہ فقہ و حدیث دانی میں ان سے بڑھے ہوئے ہیں، اگرچہ کہ مرتبہ میں صحابہ سے کم ہیں لہذا یہ بات قابل اشکال نہیں ہے۔

تحقیق یا ہانک

پھر اس کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نے اسی عنوان کے تحت لکھا کہ:
 ”اگر قرآن سے دیکھا جائے اور تحقیق کی جائے تو امام اعظم ابو حنیفہؒ بھی رفع یدین کے قائل معلوم ہوتے ہیں، جب امام اعظم کے استاذ عطا اور شاگرد عبد اللہ بن المبارک اور شاگرد کے شاگرد عصام بن یوسف رکوع

کارِ یدین کرتے تھے آپ بھی کرتے ہوں گے۔ (حدیث نماز: ۱۳۶)

میں کہتا ہوں کہ: یہ استدلال ایسا بے تکا اور بھونڈا ہے کہ اس کو استدلال کا نام دینا بھی علمیت کی توہین معلوم ہوتی ہے، دیکھئے امام شافعی رفع یدین کے قائل تھے اور ان کے اساتذہ میں سے امام مالک و امام محمد بن الحسن رفع یدین کے قائل نہیں ہیں، کیا کوئی اس پر یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ امام شافعی کے اساتذہ رفع یدین کے قائل نہیں تھے اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ امام شافعی بھی اس کے قائل نہیں ہوں گے؟ قرآن کی ضرورت وہاں پڑتی ہے جہاں علم و تحقیق نہ ہو، جہاں تصریحات و تحقیقات اس کے خلاف ہوں وہاں ان کو چھوڑ کر قرآن سے استدلال کرنا کسی عقل مند کا کام نہیں ہو سکتا پھر اگر امام اعظم کے کچھ اساتذہ کا عمل آپ کے خلاف ہے تو آپ کے استاذوں میں سے امام شععی، استاذوں کے استاذ ابراہیم نخعی، ان کے استاذ علقمہ و اسود اور ان کے استاذ حضرت عبداللہ بن مسعود کا عمل آپ کے موافق ہے اور شاگردوں میں بھی آپ کے مذہب کے علم بردار امام محمد و امام ابو یوسف و امام زفر و امام و کعب اور دیگر بہت سے حضرات آپ کے موافق ہیں۔

یہ سب اس کا پتہ دیتے ہیں کہ آپ ترک رفع یدین کے قائل ہیں اور تصریح بھی موجود ہے، جیسا کہ مناظرہ سے اور امام محمد و امام طحاوی کی تصریحات سے معلوم ہو گیا۔ کیا وجہ ہے کہ یہ باتیں اور تصریحات تو مقبول نہ ہوں اور مؤلف ”حدیث نماز“ کے محض قرآن مقبول ہوں اور امام صاحب پر بے وجہ کوئی قول تھوپ دیا جائے کیا اس کو تحقیق کا نام دیا جائے یا ہانک کہا جائے؟

ایک اور استدلال پر نظر

مؤلف ”حدیث نماز“ نے یہاں امام ابو حنیفہ کے رفع یدین کے قائل

ہونے پر ایک اور استدلال کیا ہے جو عجیب بلکہ اعجاب العجائب کہلانے کا مستحق ہے۔ وہ یہ کہ حنفی مذہب میں تکبیر تحریمہ میں کانوں تک ہاتھ اٹھاتے ہیں جس کی دلیل ہدایہ میں حضرت وائلؓ، حضرت براءؓ اور حضرت انسؓ کی حدیث کو قرار دیا ہے۔ اور حاشیہ میں حضرت وائلؓ کی حدیث مذکور ہے، جس میں رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کا بھی ذکر ہے۔ اس سے مؤلف ”حدیث نماز“ نے یہ اخذ کیا ہے کہ اس حدیث سے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دلیل لی ہے کہ تکبیر تحریمہ میں کانوں کے برابر اور محاذ میں ہاتھ اٹھانا چاہئے تو پھر اس کے بعد رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت جو ہاتھ اٹھانے کا ذکر اسی حدیث میں موجود ہے یقیناً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو بھی تسلیم کیا ہے۔ (حدیث نماز: ۱۴۱-۱۴۲)

راقم کہتا ہے کہ: مؤلف کی یہ بات نہایت مخدوش ہے؛ کیونکہ اولاً تو امام صاحبؒ کا اس حدیث سے استدلال کرنا ثابت نہیں، یہ تو محشی نے مذہب حنفی کی دلیل اس سے لی ہے، نہ کہ امام صاحب کا استدلال بتایا ہے، دوسرے اس لئے کہ نماز میں کان تک ہاتھ اٹھانے کا مسئلہ کچھ اسی دلیل پر موقوف نہیں، بلکہ دوسری روایات بھی ہیں، جیسا کہ مسئلہ تفصیل سے گزر چکا، اور تیسرے اس لئے کہ ایک حدیث سے ایک بات لی اور دوسری چھوڑ دی، تو اس میں کوئی خرابی نہیں، جبکہ اس ترک کی کوئی دلیل ہو، اور یہاں دلیل ہے کہ کانوں کے محاذات میں ہاتھ اٹھانا بلا تعارض ثابت ہے، اس لیے اس کو یہاں سے لے لیا اور رفع یدین کرنا بغیر معارض ثابت نہیں بلکہ دوسری احادیث اس کے معارض موجود ہیں، اس لیے اس کو ترک کر دیا اور پھر یہ ترک بھی بحیثیت سنت ہونے کے ترک کیا گیا ہے، ورنہ بحیثیت جائز و مشروع ہونے کے اس کو ترک نہیں کیا ہے۔ (فافہم)

علامہ عینی کے حوالہ کی حقیقت

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اسی سلسلہ میں علامہ عینی کے حوالہ سے لکھا کہ:
 ”انہوں نے عمدۃ القاری میں فرمایا کہ: ”و حکي عن أبي حنيفة
 ما يقتضي الإثم بتركه“ (امام ابوحنیفہ کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ رفع
 یدین کے چھوڑنے پر گناہ ہوتا ہے)۔“ (حدیث نماز: ۱۴۲)

راقم کہتا ہے کہ: یہاں بھی مؤلف حدیث نماز نے اپنی عادت کے موافق
 دھوکہ سے کام لیا ہے؛ کیونکہ علامہ عینی نے یہ بات امام ابوحنیفہ کی تکبیر اولیٰ کے وقت
 رفع یدین کے بارے میں نقل کی ہے، نہ کہ رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین
 کے بارے میں۔ مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ مؤلف نے پوری ڈھٹائی کے
 ساتھ اس کو رکوع والے رفع یدین کے بارے میں نقل کر دیا اور دھوکہ دیا ہے۔ اس کو
 سمجھنے کے لئے علامہ عینی کی پوری عبارت پڑھئے، وہ لکھتے ہیں کہ:

” وفي التوضيح : ثم المشهور أنه لا يجب شيء من الرفع ،
 وحكي الإجماع عليه ، وحكي عن داود إيجابه في تكبيرة الإحرام ، وبه
 قال ابن سيار من أصحابنا ، وحكي عن بعض المالكية ، وحكي عن أبي
 حنيفة ما يقتضي الإثم بتركه “ (توضیح کتاب میں ہے کہ پھر مشہور یہ ہے کہ کسی
 بھی موقع پر رفع یدین کرنا واجب نہیں، اور اس پر اجماع نقل کیا ہے، اور داؤد ظاہری
 سے تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کا واجب ہونا نقل کیا گیا ہے اور ہمارے اصحاب
 میں سے ابن سيار کا بھی یہی قول ہے اور بعض مالکیہ سے بھی یہی نقل کیا گیا ہے، اور ابو
 حنيفة سے نقل کیا گیا ہے کہ اس رفع یدین کے ترک سے گناہ لازم آتا ہے) (عمدۃ
 القاری:)

اس عبارت کو پڑھئے تو واضح طور پر یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ یہاں علامہ عینی تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کا مسئلہ پیش کر رہے ہیں اور اس میں متعدد علماء کے مسالک بیان کر رہے ہیں، اولاً جمہور کا مسلک نقل کیا کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین واجب نہیں، یعنی سنت ہے، اور اس پر اجماع ہونے کا بھی ذکر کیا، پھر دوسرا قول داؤد ظاہری اور ابن سیار شافعی اور بعض مالکیہ کا نقل کیا کہ: تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین واجب ہے اور پھر امام ابوحنیفہ سے نقل کیا کہ: اس رفع یدین کے ترک سے گناہ لازم آتا ہے: کیونکہ وہ اس کو سنت مؤکدہ قرار دیتے ہیں، جیسا کہ درمختار اور شامی میں تصریح موجود ہے۔ (درمختار مع الشامی: ۵۱۱/۱)

غور کیجئے کہ اس میں رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کا کہاں ذکر ہے؟ اور اس عبارت کو رکوع کے رفع یدین کے بارے میں نقل کرنا کیا دھوکہ نہیں؟

رفع یدین سے نماز فاسد نہیں ہوتی

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس جگہ یہ بھی نقل کیا ہے کہ علماء حنفیہ کے نزدیک رفع یدین سے نماز فاسد نہیں ہوتی، اور اس پر علامہ شامی اور غایۃ الاوطار کا حوالہ دیا ہے۔ (حدیث نماز: ۱۴۳)

میں کہتا ہوں کہ: یہ تو سب جانتے ہیں کہ رفع یدین نواقض نماز میں سے نہیں ہے، اور اسی لئے حنفیہ نے اس کی تصریح بھی کر دی ہے جو ان کی حقانیت و اعتدال پسندی کی دلیل ہے، اور اسی لئے ہم اس سے منع کرنا بھی جائز نہیں رکھتے، جبکہ دوسرے فریق کے نزدیک رفع یدین کی سنیت ثابت ہے، ہاں اپنا مذہب راجح ترک بتاتے ہیں۔ مگر اس سے مؤلف ”حدیث نماز“ کو کیا فائدہ؟

ایک اور جھوٹ

یہاں بحث کے اخیر میں مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا ہے کہ:
 ”حنفی مذہب کے محقق علماء شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، علامہ سندھی،
 اور مولانا عبدالحی وغیرہ کی عبارتوں سے ثابت ہو گیا کہ رفع یدین کی
 احادیث زیادہ اور بہت صحیح ہیں، نیز یہ کہ رفع یدین نہ کرنے کی احادیث
 ضعیف ہیں۔“ (حدیث نماز: ۱۴۳)

اس کا جواب اوپر کی تحقیق و تفصیل سے ہو گیا اور مؤلف ”حدیث نماز“ کی غلط
 بیانی اور ان بزرگوں کی جانب غلط انتساب کا پردہ فاش ہو گیا، اور یہ معلوم ہو گیا کہ ان
 حضرات نے یا تو کسی اور کا قول نقل کیا ہے، یا یہ کہ مؤلف نے ان کی عبارت میں کتر
 بیونت کر کے اپنے مطلب کی بات نکالی ہے، ہاں ان میں سے بعض حضرات نے یہ کہا
 ہے کہ: احادیث دونوں جانب ہیں اور دونوں قسم کی احادیث صحیح ہیں، اور ان میں سے
 ہمارے نزدیک رفع یدین افضل ہے۔ اور یہ میں کہہ چکا ہوں کہ: افضل ہونے نہ
 ہونے میں رائے کا اختلاف ہو سکتا ہے، اگر یہ ان کی رائے ہے تو دوسرے حضرات کی
 رائے اس کے خلاف ہے، مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک رفع یدین
 نہ کرنے کی حدیث ضعیف ہے؟ کیا یہ ان حضرات پر بہتان نہیں ہے؟

امام مالک کا مسلک

امام ابوحنیفہ کے مسلک کے بعد میں مناسب سمجھتا ہوں کہ امام مالک کا
 مسلک بھی اس سلسلہ میں پیش کر دیا جائے، جیسا کہ اوپر بھی عرض کیا گیا، امام مالک کا
 مسلک بھی یہی ہے کہ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین ہے، اس کے سوا کسی اور

جگہ نماز میں رفع یدین نہیں ہے، ہم نے امام مالک کا قول ان کے مسلک کی سب سے مستند کتاب سے پیش کیا تھا کہ آپ نے فرمایا کہ: ”میں سوائے افتتاح کے نماز کی تکبیر میں کہیں بھی رفع یدین کو نہیں جانتا، نہ جھکتے وقت اور نہ اٹھتے وقت“۔ (المدونۃ الکبریٰ: ۱۶۵/۱)

اسی مدونہ میں امام مالک کے شاگرد امام ابن القاسم کہتے ہیں کہ: ”وکان رفع الیدین عند مالک ضعیفاً إلا فی تکبیرة الاحرام“ (امام مالک کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے علاوہ دوسرے موقع پر رفع یدین ضعیف ہے) (المدونۃ الکبریٰ: ۱۶۵/۱) اور اگرچہ ایک روایت امام مالک کی یہ ہے کہ رفع یدین سنت ہے مگر ان کا مسلک یہی ہے کہ رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین نہیں ہے، جیسا کہ ابن رشد مالکی نے تصریح کی ہے۔ اور یہی ان کا مشہور قول ہے جیسا کہ زرقانی نے کہا ہے۔ (بدایۃ المجتہد: ۲۰۹/۱، شرح الزرقانی علی الموطأ: ۲۲۹/۱)

کیا رفع یدین منسوخ ہے؟

اس کے بعد ہم یہاں یہ بحث سامنے لانا چاہتے ہیں کہ بعض علماء حنفیہ وغیرہ نے جو رفع یدین کو منسوخ کہا ہے اس کی کیا اصلیت و حقیقت ہے؟ کیونکہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے حضرت علامہ عبدالحی لکھنوی اور علامہ سندھی وغیرہ سے یہ نقل کیا ہے کہ رفع یدین کا منسوخ ہونا بے دلیل ہے۔ (حدیث نماز: ۱۳۸-۱۳۹)

راقم کہتا ہے کہ: علامہ عبدالحی صاحب کی عبارت اوپر گزر چکی کہ انھوں نے فرمایا کہ: ”جو لوگ رفع یدین کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ دعویٰ ایسا بے دلیل ہے جس سے مریض کی نہ تشفی ہوتی ہے اور نہ پیاس کی پیاس بجھتی ہے“ (تعلیق المجتہد: ۹۱)

اور علامہ سندھی نے ابن ماجہ اور نسائی کی شرح میں لکھا ہے کہ رفع یدین کے منسوخ ہونے کا دعویٰ باطل ہے، شرح ابن ماجہ میں ان کی عبارت یہ ہے: ”وأما قول من قال إن ذلك الحديث ناسخ لرفع غير تكبيرة الافتتاح فهو قول بلا دليل“ (جس نے یہ کہا کہ یہ حدیث تکبیر تحریمہ کے علاوہ دوسرے موقعہ کے رفع یدین کی ناسخ ہے تو وہ بے دلیل قول ہے) (شرح ابن ماجہ: ۲۴۹/۲، شرح نسائی: ۱۲۲/۲)

ہمارے مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس موقعہ پر ان عبارتوں کو پیش کر کے یہ پوچھا ہے کہ عین الہدایہ میں لکھا ہے کہ رفع یدین ثابت ہے اور دوسرے مقلدین منسوخ بتا رہے ہیں، یہ تضاد کیوں؟

اس کا جواب عرض ہے کہ عین الہدایہ میں تو اتنا ہی ہے کہ رفع یدین ثابت ہے اور ثبوت نسخ دوسرے علماء نے بیان کیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر ثبوت نہ ہوتا تو نسخ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، نسخ ہوتا ہے اس کا جس کا پہلے ثبوت ہو، مگر مؤلف کو یہ بدیہی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تو ہم کیا کریں؟

رہا یہ کہ ان علماء کا یہ کہنا کہ نسخ کا دعویٰ بے دلیل ہے، اس سلسلہ میں ذرا تفصیل درکار ہے، اس لیے کسی قدر تفصیل سے اس کو ہم بیان کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ فقہاء کی زبان میں نسخ کے دو معنی ہیں، ایک معنی متاخرین کی اصطلاح میں ہیں، اور وہ ”ابطال حکم“ ہیں، اور دوسرے متقدمین کی اصطلاح میں ہیں، اور وہ اس سے عام ہیں، حتیٰ کہ تخصیص، تغیر وصف اور استثناء کو بھی ان کے نزدیک نسخ کہا جاتا ہے، جیسا کہ علماء نے تصریح کی ہے۔ علامہ ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ: نسخ کئی طرح ہوتا ہے، ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ کوئی بات مستحب تھی، اس کو واجب قرار دیا گیا

یا اس کو حرام قرار دیا گیا، یا اس کو جائز و مباح قرار دیا گیا۔ (نوح القرآن: ۲۱)

اس میں دیکھئے مستحب کو جائز قرار دینے کو بھی منسوخ ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے، جب یہ بات مہمہ ہوگئی تو اب ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے علماء نے جو رفع یدین کو منسوخ کہا ہے وہ اسی معنی میں ہے کہ پہلے یہ مستحب تھا اور بعد میں یہ منسوخ ہو گیا یعنی اس کا استحباب منسوخ ہو گیا اور اب یہ صرف جائز و مباح ہے۔ حضرت امام طحاویؒ نے جو رفع یدین کو منسوخ کہا ہے، ان کی مراد نسخ یعنی ازالہ و ابطال شئی و حکم نہیں ہے، بلکہ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں، یعنی تغیر وصف اور یہ بات طحاوی شریف کے مطالعہ کرنے والوں پر مخفی نہیں کہ امام طحاوی اکثر مواقع میں نسخ کا لفظ استعمال فرماتے ہیں، مگر مراد یہی دوسرے معانی ہوتے ہیں اور یہ بات شائع و ذائع ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ نماز تہجد پہلے فرض تھی بعد میں منسوخ ہوگئی اور ظاہر ہے کہ یہ بمعنی ازالہ و ابطال نہیں، بلکہ بمعنی تغیر وصف ہے، اس لیے آج بھی تہجد پڑھنا بالاتفاق مشروع ہے۔ اسی طرح یومِ عاشورہ کا روزہ کہ اس کی فرضیت بھی منسوخ ہوگئی، مگر روزہ اب بھی مشروع ہے۔

جب یہ بات محقق ہوگئی تو اب میں کہتا ہوں کہ: رفع یدین میں بھی نسخ کے معنی صرف یہ ہیں کہ پہلے یہ سنت تھا، مگر بعد میں اس کی سنیت منسوخ ہوگئی اور جواز باقی ہے۔ اس تحقیق سے وہ تمام شبہات ختم ہو جاتے ہیں جو مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ اور علامہ سندھیؒ وغیرہ کو پیش آئے ہیں۔

علامہ سندھیؒ کے شبہ کا جواب

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا علامہ سندھی نے شرح ابن ماجہ اور حاشیہ نسائی میں

نسخ کے قول کو بے دلیل دعویٰ قرار دیا ہے اور ان کو اصل شبہ یہ لاحق ہوا کہ حضرت وائل بن حجر کی روایت میں اور مالک بن الحویرث کی حدیث میں رفع یدین کا ثبوت ہے اور یہ دونوں حضرات آپ کی آخری زندگی میں حاضر ہوئے تھے، تو معلوم ہوا کہ یہ منسوخ نہیں، بلکہ آخری عمر کا فعل ہے۔ لہذا اس کو منسوخ کہنا بے دلیل ہے۔ مگر علامہ سندھی کا یہ شبہ اس لئے صحیح نہیں کہ آپ کو یہ شبہ اس لئے پیش آیا کہ علماء کی عبارات میں نسخ کو بمعنی ازالہ سمجھا، حالانکہ یہاں مراد نسخ کے دوسرے معنی ہیں، یعنی سنیت منسوخ ہوگئی، یہ معنی نہیں کہ اصل جواز ہی منسوخ ہو گیا۔ جب جواز باقی ہے تو پھر اس پر آخری عمر میں عمل کرنے سے نسخ کے خلاف کہاں لازم آیا؟ اور احناف کا دعویٰ اس بنا پر بے بنیاد و بے دلیل کیسے ہو گیا؟ بہر حال منسوخ ہونے کے یہ معنی ذہن میں رکھنے سے کوئی اشکال نہیں ہوگا۔

رفع یدین کے دلائل کا جائزہ

اس بحث کے بعد اب یہاں سے رفع یدین کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے دلائل پر بحث شروع کرتے ہیں، مگر ہم یہاں مؤلف ”حدیث نماز“ نے جن دلائل سے تعرض کیا ہے انہی کے جواب پر اکتفاء کرتے ہیں، ہاں ضمناً دوسری تحقیق آجائے تو یہ الگ بات ہے۔

حدیث ابن عمر پر بحث

مؤلف ”حدیث نماز“ نے رفع یدین کے ثبوت میں سب سے پہلے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ:

”رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا قَامَ فِي الصَّلَاةِ رَفَعَ يَدَيْهِ

حَتَّى تَكُونََا حَذُو مَنْكِبِيهِ، وَكَانَ يَفْعَلُ ذَلِكَ حِينَ يُكَبِّرُ لِلرُّكُوعِ، وَيَفْعَلُ ذَلِكَ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، وَيَقُولُ: سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، وَلَا يَفْعَلُ ذَلِكَ فِي السُّجُودِ“ (میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو رفع یدین کرتے حتیٰ کہ آپ ﷺ کے دونوں ہاتھ کاندھوں کے برابر ہو جاتے، اور آپ ﷺ اسی طرح کرتے جب کہ رکوع کی تکبیر کہتے اور ایسا ہی اس وقت بھی کرتے جب کہ رکوع سے سر اٹھاتے اور ”سمع الله لمن حمده“ کہتے اور ایسا سجدہ میں نہیں کرتے تھے)“

یہ حدیث بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ اصحاب صحاح نے روایت کی ہے اور صحت کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی ہے، اور اس حدیث سے رفع یدین کے قائل حضرات نے استدلال کیا ہے اور وہ اس کو سب سے زیادہ قوی حجت و دلیل کہتے ہیں، مگر یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی ہونے کے باوجود ترک رفع کے قائلین کے پاس اس حدیث پر عمل نہ کرنے کی کئی وجوہات ہیں

حدیث ابن عمر میں اضطراب

ایک تو یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ حدیث رفع یدین کے مواقع کے بارے میں مضطرب ہے۔ چنانچہ محدث شہیر علامہ محمد یوسف بنوری نے ”معارف السنن“ میں لکھا ہے کہ: اس میں چھ طرح اضطراب ہے:

(۱) مدونہ کبریٰ میں ابن عمر کی روایت میں صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کا ذکر ہے۔

(۲) مؤطامالک میں دو جگہ ایک افتتاح نماز کے وقت اور دوسرے رکوع

کے بعد اٹھتے ہوئے رفع یدین کا ذکر ہے اور رکوع میں جانے کے وقت کا رفع یدین کا نہیں ہے۔

(۳) بخاری و مسلم وغیرہ کی روایت میں اسی روایت میں تین مواقع پر رفع یدین کا ذکر ہے: تبکیر تحریمہ کے وقت، رکوع کو جاتے ہوئے، اور رکوع سے اٹھتے ہوئے۔

(۴) صحیح بخاری میں نافع کے طریق سے ان تین مواقع کے علاوہ دو رکعتوں کے بعد اٹھتے ہوئے رفع یدین کا ذکر بھی ہے اور اس طرح رفع یدین چار مواقع پر ہوگا۔

(۵) بخاری کے جزء رفع الیدین میں سجدہ کو جاتے وقت بھی رفع یدین کا ذکر بطریق نافع آیا ہے۔

(۶) امام طحاوی کی مشکل الآثار میں ہر خفض و رفع اور رکوع، سجدہ و، قیام و قعود اور دو سجدوں کے درمیان میں رفع یدین کا ذکر کیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو معارف السنن: ۴۷۳-۴۷۴)

الحاصل یہ اختلافات واضطرابات اس روایت میں بے شک موجود ہیں، پھر اس کے باوجود اس سے استدلال دوسرے پر حجت کیسے ہو سکتا ہے؟

ایک حدیثی فائدہ

یہاں ایک علمی و حدیثی فائدہ پیش کر دینا مناسب ہے کہ مؤطا امام مالک میں اس حدیث ابن عمر میں صرف دو مواقع پر رفع یدین مذکور ہے: ایک افتتاح نماز کے وقت اور دوسرے رکوع سے اٹھتے وقت، رکوع میں جاتے وقت کا رفع یدین مذکور نہیں ہے۔ حافظ ابن عبد البر نے اس کو امام مالک کا وہم قرار دیا ہے؛ کیونکہ ابن

شہاب کے دیگر تمام شاگرد اس روایت میں رکوع کے وقت کا رفع یدین بھی ذکر کرتے ہیں، مگر حافظ ابن عبدالبر نے جو امام مالک پر وہم کا الزام لگایا ہے اور تمام اصحاب ابن شہاب کے بارے میں جو یہ کہا ہے کہ سب نے اس رفع یدین کا بھی ذکر کیا ہے، یہ آپ سے سہو اور خطا ہے؛ کیونکہ ابو داؤد میں زبیدی نے بھی ابن شہاب زہری سے امام مالک کی طرح رکوع کے رفع یدین کے بغیر روایت کی ہے۔ (ابو داؤد: ۱۰۴/۱)

اور جزء رفع الیدین میں خود امام بخاری نے ابن شہاب کے دو شاگردوں: یونس اور سفیان بن عیینہ سے مالک کی طرح روایت نقل کی ہے، بلکہ امام بخاری نے بطریق حماد بن سلمہ ایوب عن نافع بھی اسی طرح روایت کی ہے۔ (جزء رفع الیدین: ۲۰۱۹ و ۲۰۱۷)

اب غور کیجئے کہ کیا اس کو امام مالک کا وہم قرار دینا صحیح ہے؟ اور صنیع محدثین کے موافق ہے؟ جبکہ متعدد حضرات نے امام مالک کی طرح رکوع کے رفع یدین کا ذکر نہیں کیا ہے؟

الغرض حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت جیسا کہ ابھی مذکور ہوا مضطرب ہے، اس سے احتجاج کیسے صحیح ہو گیا؟ اگر کوئی حنفی ایسی روایت سے استدلال کر لیتا تو یہ لوگ چیخ اٹھتے اور بے علمی اور عدم واقفیت حدیث کے طعنہ دیتے، مگر یہی لوگ ایسی روایت سے استدلال کر کے فخر کرتے ہیں۔

دوسرا جواب

اور اگر اس حدیث ابن عمر کے اضطراب کو اس طرح دفع کیا جائے کہ ان مختلف روایات میں سے راجح و قوی ہونے کی وجہ سے یا جماعت کی روایت ہونے کی

وجہ سے بخاری و مسلم وغیرہ کی روایت کو دیگر روایات پر ترجیح دی جائے اور اضطراب کو رفع کیا جائے تو پھر بھی اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے رفع یدین کیا ہے، اور اس میں کسی کو کلام نہیں، کلام تو اس میں ہے کہ کیا آپ ہمیشہ کرتے تھے؟ اس کا کوئی ثبوت اس سے نہیں ہوتا، ایک تو اس لئے کہ بعض صحابہ اس کے خلاف یہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رفع یدین صرف تکبیر تحریمہ کے وقت کرتے تھے، دوبارہ نہیں کرتے تھے، جیسا کہ ہم اس کا ذکر کریں گے، اور دوسرے خود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ان کا عمل بھی ترک رفع یدین نقل کیا گیا ہے۔

تحقیق مذہب ابن عمرؓ

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں، اور ابن ابی شیبہ نے مصنف میں حضرت مجاہدؒ سے روایت کیا ہے کہ حضرت مجاہدؒ نے کہا کہ: ”صلیٰ خلف ابن عمر، فلم یکن یرفع یدیہ إلا فی التکبیرة الأولى من الصلاة“ (میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی، آپ تکبیر اولیٰ کے سوا نماز میں رفع یدین نہیں کرتے تھے) (معانی الآثار: ۱۶۳/۱، واللفظ لہ، ابن ابی شیبہ: ۲۱۴/۱)

امام عینی نے معانی الآثار کی شرح ”نخب الافکار“ میں اس حدیث کو صحیح علی شرط الشیخین قرار دیا ہے، علامہ ابن الترمذی نے ”الجوہر النقی“ میں ابن ابی شیبہ کی سند کو صحیح کہا ہے اور علامہ نیموی نے اس کو آثار السنن میں صحیح قرار دیا ہے، اور علامہ ظفر احمد عثمانی نے کہا کہ: اس کے راویوں میں سے ابراہیم بن داؤد تو امام طحاوی کے شیخ ہیں جو کہ ثقہ ہیں اور باقی راوی سب جماعت (اصحاب صحاح ستہ) کے راوی ہیں۔ (نخب الافکار: ۶۱۲/۲، الجوہر النقی علی سنن البیہقی: ۱۰۹/۲، آثار السنن: ۱۰۸/۱، اعلاء السنن: ۵۱/۳)

علماء حنفیہ کہتے ہیں کہ: جب حضرت ابن عمر نے خود ہی رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ رفع یدین کرتے تھے تو بلا کسی وجہ کے وہ خود کیوں اس کو ترک کریں گے؟ ظاہر ہے کہ ان کے اس کو ترک کرنے کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ترک کرتے دیکھا ہوگا۔ تو آپ کے اس عمل سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بھی رفع یدین نہیں کرتے تھے، جیسا کہ ابن مسعود وغیرہ صحابہ سے مروی ہے۔

مذکورہ روایت پر چار اعتراضات کے جوابات

مؤلف ”حدیث نماز“ اس روایت سے بڑے غضبناک معلوم ہوتے ہیں، انہوں نے روایت کو نقل کر کے اس پر ضعف کا حکم لگایا ہے، اور اس پر چار اعتراضات کئے ہیں۔ یہاں ان اعتراضات کا جواب ہم سے ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس پر پہلا اعتراض یہ کیا کہ بخاری و مسلم کی حدیث سب سے زیادہ صحیح ہے اور عین الہدایہ سے نقل کیا ہے کہ: جمہور محدثین کے نزدیک یہ سب سے مقدم ہے۔ (حدیث نماز: ۱۴۵)

راقم کہتا ہے کہ: اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ مسئلہ کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکے، بات یہ ہے کہ مقدم و مؤخر کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں ایک کو لیکر دوسرے کو رد کیا جاتا ہے، اور یہاں علماء حنفیہ نے بخاری و مسلم کی حدیث کو رد نہیں کیا ہے بلکہ اس کی تاویل اور اس کا مناسب موقعہ بیان کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ابن عمر نے رسول اللہ ﷺ سے جو نقل کیا کہ: آپ رفع یدین کرتے تھے، یہ فی الجملہ آپ سے ثابت ہے مگر اس پر دوام و ہمیشگی ثابت نہیں، اور اس کی دلیل حضرت ابن عمر کا رفع یدین نہ کرنے کا عمل ہے جو صحیح سند سے ثابت ہے۔ اب بتاؤ کہ حنفیہ نے جب بخاری و مسلم کی حدیث کو رد ہی نہیں کیا بلکہ اس کا محمل بیان کیا تو اس

کے جواب میں یہ کہنا کہ بخاری و مسلم کی حدیث مقدم ہے کیا بے جوڑ بات نہیں ہے؟
 (۲) مولانا عبدالمتمین صاحب، مؤلف ”حدیث نماز“ نے دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ طحاوی کو فقہ حنفی کی تیسرے درجہ کی کتاب قرار دیا گیا ہے اور اس کی روایتیں بے تحقیق نہیں لی جائیں گی۔ اور مولانا عبدالحی صاحب نے التعلیق المجد میں اس اثر کو مردود قرار دیا ہے؛ کیونکہ اس کی سند میں ابو بکر بن عیاش راوی ہیں، جن کے بارے میں تنقید و جرح کی گئی ہے، اور عبد اللہ بن عمر تو خود بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ رکوع کے وقت ہمیشہ رفع یدین کیا کرتے تھے، وہ اس کا خلاف کیسے کر سکتے ہیں، اور عبد اللہ بن عمر کا رفع یدین صحیح سند سے ثابت ہو چکا ہے۔ ایسی مردود روایت سے صحیح بخاری کی مقبول روایت رد نہیں کی جاسکتی۔ (حدیث نماز: ۱۴۵-۱۴۶)

اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو ہم نے بخاری کی روایت کو رد ہی نہیں کیا، جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں، لہذا نہ اعتراض ہماری طرف متوجہ ہوگا نہ ہمیں جواب دہی کی ضرورت۔ دوسرے اس حدیث کو مردود کہنا بھی بے تحقیق بات اور کورانہ تقلید کا نتیجہ ہے، ہمیں افسوس ہے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے غیر مقلد ہونے کے باوجود علامہ عبدالحی صاحب لکھنوی کی کورانہ تقلید کی ہے اور تحقیق کے میدان میں قدم رکھنا نہیں چاہا، ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ علامہ عبدالحی صاحب لکھنوی نے یہاں دراصل بعض محدثین بیہتی وغیرہ کی تقلید بے تحقیق کر لی ہے، ورنہ حقیقت کچھ اور ہے؛ کیونکہ یہ ابو بکر بن عیاش ثقہ ہیں۔

اور تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب وغیرہ کتب رجال میں ہے کہ ابو بکر بن عیاش سے بخاری نے اور امام مسلم نے مقدمہ میں اور اصحاب سنن اربعہ سے روایت کیا ہے، ابن المبارک نے ابو بکر کا ذکر کیا اور ان کی تعریف کی، صالح بن

احمد نے اپنے باپ امام احمد سے نقل کیا کہ: یہ صدوق صاحب قرآن و حدیث تھے، اور انھوں نے ہی فرمایا کہ: ثقہ ہیں کبھی کبھی خطا کر جاتے تھے، اسی طرح ابن ابی حاتم نے نقل کیا کہ: ان کے باپ ابو حاتم سے انھوں نے دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک ابو بکر اور ابوالاحوص میں سے کون بہتر ہیں؟ تو کہا کہ: کوئی مضائقہ نہیں کہ ان میں سے کسی سے بھی ابتداء کروں۔ نیز عثمان الدارمی نے ابن معین سے ان کی توثیق نقل کی ہے، اور ابن عدی نے کہا کہ: یہ مشہور کوئی ہیں اور بڑے لوگوں سے روایت کرتے ہیں، اور کہا کہ: وہ اپنی تمام روایات میں جن کو ان سے روایت کرنے والے روایت کرتے ہیں قابل اعتماد ہیں؛ کیونکہ میں نے ان کی کوئی حدیث منکر نہیں پائی، جب ان سے ثقہ بیان کرتا ہے، الا یہ کہ وہ کسی ضعیف سے روایت کریں، ہاں علی ابن المدینی اور یحییٰ بن القطان ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے؛ کیونکہ ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا اور وہ خطا کرتے تھے مگر دیگر علماء نے کہا کہ: ایسا تو سب کو ہوتا ہے، کون ہے جس کو کبھی کبھی غلطی نہیں لگتی اور وہ ہم سے کوئی بشر جدا نہیں ہوتا۔ (تہذیب الکمال: ۱۳۲/۳۳-۱۳۵/۳۹)

بہر حال ابو بکر کو متکلم فیہ قرار دینا صحیح نہیں، ہاں اتنی بات ہے کہ آخری عمر میں ان کی یادداشت میں فرق آ گیا تھا مگر یہ معلوم ہے کہ جب ثقہ راوی کا حافظہ خراب ہو جائے اور وہ متغیر ہو جائے، تو اصول یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس سے زمانہ قدیم میں حدیث سنی ہے، ان کی روایت صحیح قرار دی جاتی ہے۔ اور یہاں ان ابو بکر بن عیاش سے روایت کرنے والے احمد بن یونس ہیں۔ (معانی الآثار: ۱۶۳/۱)

اور یہ احمد بن یونس، ابو بکر بن عیاش کے قدیم اصحاب میں سے ہیں، اسی لیے امام بخاری نے صحیح میں ابو بکر بن عیاش کی روایت بطریق احمد بن یونس نقل فرمائی

ہے۔ (دیکھو بخاری: ۷۲۵/۲)

اگر یہ اصحابِ قدام میں سے نہ ہوتے تو صحیح بخاری میں امام بخاری اس کو نہ لاتے، جیسا کہ ان کا اصول ہے، پس یہ روایت ابو بکر بن عیاش صحیح ہے۔ اس کو معطل و ضعیف قرار دینا بے تحقیق بات ہے۔

جب یہ روایت بھی صحیح ہے اور اس سے عبد اللہ بن عمر کا عمل اپنی ہی روایت کے خلاف معلوم ہوا، تو اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ابن عمر نے اس روایت کے بارے میں یہ جان لیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا وہ عمل منسوخ ہے، یعنی مرجوح ہے۔

(۳) مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس پر ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ:

”حنفیہ کے یہاں بھی یہ اصول مسلم ہے کہ جس صحابی کی روایت کے خلاف ان کا عمل بیان کیا جائے، تو وہ عمل منسوخ اور ناقابل قبول ہے۔“

(حدیث نماز: ۱۴۶)

راقم کہتا ہے کہ: یہاں مؤلف نے صریح دھوکہ دیا ہے اور عوام کے ساتھ خیانت کا معاملہ کیا ہے؛ کیونکہ خود مؤلف نے حدیث نماز میں حنفی مذہب کا اصول یہ بتایا ہے کہ جس راوی صحابی کا عمل اس کی روایت کے خلاف ہو، تو وہ روایت ہی منسوخ ہے۔ (دیکھو حدیث نماز: ۹۶)

اور یہاں مؤلف نے اس حنفی اصول سے اپنی بات بنتی نہ دیکھی، تو اس اصول ہی میں ترمیم بلکہ خیانت کر دی اور بجائے روایت کو منسوخ بتانے کے صحابی کے عمل ہی کو منسوخ کر دیا۔ (لا حول ولا قوۃ الا باللہ)

معلوم نہیں مؤلف نے یہ دھوکہ دہی کہاں سے سیکھی، اور حیرت تو یہ ہے کہ خوف خدا سے اس قدر کیوں عاری ہو گئے؟ بہر حال احناف کا صحیح اصول یہ ہے کہ

جب روایت کے خلاف صحابی کا عمل ہو تو وہ روایت منسوخ ہے۔ لہذا اس قاعدے کی بنا پر احناف نے کہا کہ: جب عبد اللہ بن عمر نے رفع یدین کو رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا اور حضرت مجاہد کی حدیث سے ابن عمر کا عمل اس کے خلاف پایا گیا، تو روایت کا منسوخ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ (وهو المطلوب)

(۴) مؤلف نے حضرت عبد اللہ بن عمر کے عمل والی اس روایت پر چوتھا اعتراض یہ کیا ہے کہ صحیح سند سے ابن عمر کا عمل رفع یدین ثابت ہو گیا ہے جیسا کہ بخاری میں درج ہے۔ لہذا اس کے خلاف تیسرے درجے کی کتاب طحاوی کی روایت مجروحہ سے دھوکہ کھانے کی ضرورت نہیں۔ الخ (حدیث نماز: ۱۴۶)

اس کا جواب یہ ہے کہ بخاری کی اس روایت کو محدثین عبد اللہ بن عمر کا فعل نہیں بلکہ اس کو مرفوع حدیث یعنی نبی کریم ﷺ کا عمل شمار کرتے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کو مرفوعاً ہی راجح قرار دیا ہے۔ اور خود امام بخاری نے بھی اس حدیث کے آخر میں یہی فرمایا ہے، اور خود مؤلف ”حدیث نماز“ نے بھی اس کو نقل کیا ہے مگر شاید امام بخاری کا منشاء و مطلب سمجھ میں نہیں آیا، بہر حال امام بخاری نے فرمایا ”وَرَفَعَ ذَلِكَ ابْنُ عُمَرَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ“ (اس بات کو ابن عمر نے رسول اللہ ﷺ تک پہنچایا ہے) (بخاری: ۱۰۲۱)

لہذا یہ ابن عمر کا عمل نہ ہو بلکہ ان کی رسول اللہ ﷺ سے روایت ہوئی، لہذا ان کا عمل ان کی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے معلوم ہوا کہ وہ روایت ان کے نزدیک بھی منسوخ ہے۔

ایک اور روایت سے تائید

حضرت ابن عمر سے جو رفع یدین نہ کرنے کا ذکر طحاوی و ابن ابی شیبہ کی

روایت میں حضرت مجاہد سے گزرا اسی کی طرح حضرت ابن عمر کے ایک اور شاگرد حضرت عبدالعزیز بن حکیم سے بھی روایت کیا گیا ہے، امام محمد بن الحسن شیبانی نے اپنی ”موطا“ اور ”الحجة على أهل المدينة“ میں ان سے روایت کیا ہے کہ: انھوں نے کہا کہ میں نے ابن عمر کو دیکھا کہ تکبیر تحریمہ کے وقت کانوں تک ہاتھ اٹھاتے تھے اور اس کے سوا ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ (موطا امام محمد: ۹۳، الحجۃ علی اہل المدینۃ: ۹۷/۱)

جب ایک سے دو ثقہ و قابل اعتماد آدمی اس کی خبر دیں تو ظاہر ہے کہ روایت کو تقویت پہنچتی ہے اور وہ بات لائق احتجاج بن جاتی ہے، اس روایت کے راوی محمد بن ابان بن صالح القرشی کے بارے میں محدثین کو کلام ہے، اور جمہور نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، امام احمد، امام بخاری و امام نسائی وغیرہ نے ان کو ضعیف کہا ہے اور ان کے حافظہ کی وجہ سے ان کو حجت نہیں سمجھا، تاہم امام احمد نے کہا کہ ان سے حدیث لکھی جاسکتی ہے مگر حجت نہیں پکڑی جاسکتی۔ (لسان المیزان: ۳۱/۵)

مگر جیسا کہ ہم نے قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں بھی ذکر کیا ہے یہ راوی مختلف فیہ ہیں؛ کیونکہ امام محمد جیسے مجتہد نے اس روایت سے احتجاج کیا ہے، اور مجتہد کا کسی روایت سے احتجاج کرنا اس روایت کے اس کے نزدیک صحیح ہونے کی علامت ہے۔ لہذا امام محمد کے نزدیک محمد بن ابان ثقہ ہیں۔ (اعلاء السنن: ۸۰/۴)

لہذا یہ محدثین کے اصول کے مطابق حسن الحدیث ہیں، اور حسن الحدیث راوی کی حدیث سے احتجاج اسی طرح درست ہے جس طرح صحیح حدیث کے راوی سے احتجاج صحیح ہے۔ اور اگر ان کو ضعیف ہی قرار دیا جائے تب بھی یہ روایت حضرت مجاہد کی روایت کی تقویت کے لئے کافی ہے اور تائید و تقویت کے لئے کمزور روایت

بھی چل جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس بات کو ابن عمر سے نقل کرنے میں امام مجاہد متفرد و تنہا نہیں ہیں، بلکہ ان کے ساتھ دوسرے حضرات بھی شامل ہیں۔

ابن عمر کی دو روایات میں تطبیق

ہاں یہاں ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے وہ یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمر سے ان کا عمل دو طرح روایات میں وارد ہوا ہے: ایک تو وہ جو ابھی نقل کیا گیا کہ وہ رفع یدین نہیں کرتے تھے، اور دوسرے یہ کہ وہ رفع یدین کرتے تھے، مثلاً:

(۱) امام بخاری نے اپنے رسالہ ”رفع الیدین“ میں بطریق ابن جریج حسن بن مسلم سے روایت کیا کہ انھوں نے طاوس کو سنا کہ ان سے نماز میں رفع یدین کے بارے میں سوال کیا گیا تو کہا کہ: میں نے عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر کو رفع یدین کرتے دیکھا ہے۔ (امانی الاحبار: ۲۱۴)

(۲) حکم کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت طاوس کو دیکھا کہ انھوں نے تکبیر کہی، پھر تکبیر کے وقت اور رکوع کے وقت اور رکوع سے اپنا سر اٹھاتے وقت اپنے کندھوں تک رفع یدین کیا، میں نے طاوس کے اصحاب میں سے ایک سے پوچھا تو کہا کہ: وہ اس کو حضرت ابن عمر سے اور وہ حضرت عمر سے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۱۰۸/۲)

(۳) امام بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت نافع سے روایت کیا کہ حضرت ابن عمر نماز کے شروع میں اور رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھ کر رفع یدین کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ: رسول اللہ ﷺ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۱۰۳/۲)

اور امام بخاری نے جزء رفع الیدین میں لکھا کہ: حضرت ابن عمر کے متعدد

اصحاب جیسے طاوس، سالم، نافع، ابو الزبیر اور محارب بن دثار یہ سب کہتے ہیں کہ: ہم نے ابن عمر کو تکبیر کے وقت اور رکوع کے وقت رفع یدین کرتے دیکھا ہے۔ (آثار السنن: ۱۰۸/۱)

یہ دو قسم کی روایات ہیں، اب ظاہر ہے کہ یا تو ان میں تطبیق کی صورت تلاش کرنا چاہئے یا ترجیح کی شکل بیان کرنا چاہئے، لہذا تطبیق کی صورت جیسا کہ امام طحاوی نے فرمایا یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ابن عمر نسخ کا علم ہونے سے پہلے رفع یدین کرتے ہوں اور اس کو حضرت طاوس نے دیکھا اور بیان کیا ہو، اور بعد میں جب آپ کو نسخ کا علم ہو گیا اور آپ نے اس کو ترک کر دیا اس وقت حضرت مجاہد نے آپ کو دیکھا ہو اور انھوں نے اس کو بیان کیا ہو۔ (شرح معانی الآثار: ۱۶۳/۱)

اگر کوئی کہے کہ ممکن ہے ترک رفع یدین منسوخ ہو، اور وہ آپ کا پہلا عمل ہو، جس کو مجاہد نے دیکھا اور بیان کیا ہو، اور دوسرے لوگوں نے جو رفع یدین کا ان کا عمل ذکر کیا ہے وہ بعد کا عمل ہو، اور ان لوگوں نے حضرت مجاہد کے بعد ابن عمر کو رفع یدین کرتے دیکھا ہو، تو میں کہوں گا کہ: یہ قول مردود ہے؛ کیونکہ نسخ افعال کا ہوتا ہے نہ کہ عدم فعل کا۔ پھر یہ بات بعید از عقل بھی ہے؛ کیوں کہ ابن عمر تو خود رفع یدین کے راوی ہیں، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ پہلے آپ کو رفع یدین معلوم نہ ہو اور آپ ترک رفع کرتے ہوں، پھر بعد علم کے آپ رفع یدین کرنے لگے ہوں؟ اس لیے یہ کہنا کہ ترک رفع کا نسخ ہوا ہو گا صحیح نہیں۔

اور بعض نے جو یہ کہا کہ ممکن ہے کہ ابن عمر ایک مرتبہ رفع یدین کو بھول گئے ہوں، یہ بھی صحیح نہیں؛ کیونکہ جو امر دن رات میں کئی کئی دفعہ پیش آتا ہو، ایسا امر بھولا نہیں جاتا، پھر کسی ایک جگہ کے رفع یدین میں تو بھول لگ سکتی ہے مگر پوری نماز میں

متعدد مواقع پر رفع یدین ہوتا ہے، وہ سب جگہوں پر کیسے بھول کا شکار ہو گئے؟ اگر واقعی اس میں ان سے بھول ہوئی ہے تو یہ اکبر دلیل و اعظم برہان اس بات کی ہے کہ رفع یدین سنت نہیں ہے اور روزانہ ہوا نہیں کرتا تھا، ورنہ اس کو بھولنا بعید بلکہ ابعَد ہے، جیسا کہ اہل انصاف پر مخفی نہیں۔

بعض حضرات نے کہا کہ: حضرت ابن عمرؓ نے بیانِ جواز کے لیے ترک کیا ہوگا، تا کہ کوئی اس کو واجب نہ جان لے؛ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سننِ نبویہ اور آثارِ محمدیہ کے شدید قبیح تھے، حتیٰ کہ عاداتِ نبویہ کے بھی پابند تھے۔ اور آپ اس صفت کے ساتھ مشہور بھی ہوئے جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں، تو حضرت ابن عمرؓ کے نزدیک اگر رفع یدین کی سنیت ثابت ہوتی، تو کیا آپ اس کو ترک کرنا گوارا کرتے؟ خصوصاً جب کہ نبی کریم ﷺ کی مواظبت اور مداومت بھی ثابت ہوتی تو کیا حضرت ابن عمرؓ جیسے شدید الاتباع شخص سے یہ ممکن تھا کہ وہ اس کو ترک کر دیتے؟

رہا یہ کہ بیانِ جواز کے لیے ترک کیا ہے، تو یہ ان کا منصب نہیں تھا، بیانِ جواز تو صاحبِ شرع اور رسول کا منصب ہے اور پھر اگر بیانِ جواز کے لیے ہوتا، تو ایک دو مرتبہ ترک اس کے لیے کافی تھا، مگر آپ نے تو ترکِ رفع کو عادت بنا لیا تھا جیسا کہ حضرت مجاہد کے الفاظ ”فلم یکن یرفع یدہ“ (آپ رفع یدین نہیں کرتے تھے) ترکِ معتاد پر دلالت کر رہے ہیں، اور خود مؤلف ”حدیث نماز“ کے نزدیک بھی مضارع پر ”کان“ کا دخول مقتضی و موجب استمرار ہے جیسا کہ مؤلف نے صفحہ ۱۴۵ پر حدیث ابن عمرؓ کے تحت بیان کیا ہے۔ لہذا اس سے ترکِ معتاد ثابت ہوا۔

الغرض حضرت ابن عمرؓ پہلے رفع یدین کرتے تھے اور اس کو طواس وغیرہ نے

بیان کیا ہے اور بعد میں اس کو ترک کر دیا تھا اور اس کو حضرت مجاہد و عبدالعزیز نے نقل کیا ہے۔ یہ تو ان میں تطبیق کی صورت ہے۔

اور ان میں ترجیح کی شکل یہ ہے کہ یہ دوسری قسم کی روایات کوئی مضبوط و صحیح نہیں ہیں، اور ان میں اشکالات ہیں، اور ان کے مقابلہ میں ابن عمر سے ترک رفع یدین کی روایت قوی ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔

(۱) چنانچہ پہلی روایت حضرت طاؤس کی جو جزء بخاری میں ہے، اس کے کئی جواب ہیں: ایک یہ کہ اس کی سند میں عبدالملک ابن جریج راوی ہیں، یہ اگرچہ ثقہ و عادل ہیں، مگر مدلس ہیں، بلکہ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ امام احمد نے کہا کہ: ابن جریج جب یوں کہیں کہ ”قال فلان وقال فلان“ تو یہ منکر احادیث روایت کرتے ہیں، اور جب یوں کہیں کہ ”أخبرني“ یا ”سمعتُ“ تو اس کو لے لو، اور دارقطنی نے کہا کہ: ابن جریج کی تدلیس سے بچو؛ کیونکہ وہ فتیح التدلیس ہیں اور اسی سند میں تدلیس کرتے ہیں جس کو انھوں نے کسی مجروح راوی سے سنا ہے۔ (تہذیب الکمال: ۳۴۸/۱۸، تہذیب التہذیب: ۳۵۹/۶)

اور اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ مدلس اگر عنعنہ کرے تو مقبول نہیں، بلکہ وہ جب تک سماع اور تحدیث کی تصریح نہ کرے اس کی روایت مقبول نہیں ہوتی جیسا کہ حافظ ابن حجر نے شرح الخبہ میں کہا ہے اور یہاں بھی ابن جریج نے حسن بن مسلم سے بصیغہ عن روایت کی ہے، لہذا یہ مقبول نہ ہوگی۔

دوسرے اس روایت میں حضرت طاؤس نے صرف یہ کہا ہے کہ: میں نے عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن الزبیر کو نماز میں ہاتھ اٹھاتے دیکھا ہے اس میں رکوع کے وقت رفع یدین کا ذکر نہیں ہے، اور مطلق رفع میں سب متفق

ہیں۔ لہذا اس سے یہ ثابت نہ ہوا کہ وہ رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے۔

(۲) دوسری روایت جو بیہقی نے سنن میں بطریق شعبہ عن الحكم طاؤس سے نقل کی ہے، اس کے بارے میں امام ابن دقیق العید نے ”الامام“ میں نقل کیا ہے کہ اس روایت میں حضرت عمر کے ذکر کو امام احمد نے ”لیس بشی“ (اس کی کوئی حیثیت نہیں) کہا، اور کہا کہ یہ تو ابن عمر کی رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے، اور دارقطنی نے بھی کہا کہ: آدم بن ابی ایاس اور عمار بن عبد الجبار کو شعبہ کی روایت میں وہم ہوا ہے اور انہوں نے اس میں حضرت عمر کا ذکر کر دیا ہے، اور پھر اس میں حکم نے اصحاب طاؤس میں سے ایک شخص کے حوالے سے اس کو بیان کیا ہے اور وہ شخص مجہول ہے، لہذا اس سے حجت قائم نہ ہوگی۔ (دیکھو الجوہر النقی: ۱۰۸/۲، نصب الراية: ۴۱۵/۱)

حاصل یہ ہے کہ اولاً تو یہ ابن عمر کی رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے نہ کہ ان کا عمل، اور اس روایت میں راویوں نے حضرت عمر کا حوالہ جو ذکر کیا ہے یہ وہم پر مبنی ہے، دوسرے اس روایت کی سند میں ایک مجہول شخص ہے اور مجہول کی روایت قابل احتجاج نہیں ہے۔

(۳) اور تیسری روایت جو حضرت نافع سے ہے اور نیز سالم و محارب اور ابوالزبیر سے جو روایت ہے اس میں اشکال یہ ہے کہ یہ روایت رفع یدین کے موقعہ و مقام کے بارے میں مختلف و مضطرب ہیں، حضرت سالم کی روایت میں ہے کہ ابن عمر جب سجدہ سے سر اٹھاتے اور جب کھڑے ہونے کا ارادہ کرتے تو رفع یدین کرتے تھے، اور نافع کی روایت میں ہے کہ ابن عمر جب نماز میں داخل ہوتے

اور جب رکوع کرتے اور جب ”سمع اللہ لمن حمدہ“ کہتے اور جب دو رکعتوں کے بعد کھڑے ہوتے تو رفع یدین کرتے تھے، اور ایک روایت میں انہی نافع سے یہ ہے کہ ابن عمر جب سجدہ سے اٹھتے تو رفع یدین کرتے تھے، اور ابو الزبیر کی روایت میں ہے کہ ابن عمر نماز کے شروع میں اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرتے تھے، اور محارب کی روایت میں صرف رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کا ذکر ہے، یہ سب روایات امام بخاری نے جزء رفع الیدین میں ذکر کی ہیں۔ لہذا یہ روایات مضطرب و مختلف ہیں۔ (امانی: ۲۱۴/۳-۲۱۵)

لہذا یہ روایات مجاہد کی روایت کا رد کیسے کر سکتی ہیں، جبکہ خود مختلف و مضطرب ہیں اور مجاہد کی روایت صحیح علی شرط ائمہین ہے۔ الحاصل حضرت عبداللہ بن عمر کا عمل اس روایت کے موافق نہیں ہے جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ وہ نبی کریم ﷺ کے عمل کو جانتے ہوئے اور اس کی سنیت کا علم رکھتے ہوئے اس کے خلاف عمل کریں، اس لیے یوں کہا جائے گا کہ دراصل حضرت ابن عمر کے نزدیک بھی آپ کا یہ عمل درجہ سنیت کا نہیں تھا، بلکہ صرف جائز تھا، لہذا کبھی کبھی تو رفع یدین کیا، لیکن معمول وہ تھا جو حضرت مجاہد و حضرت عبدالعزیز نے بیان کیا کہ: وہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

تیسرا جواب

پھر ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عمر نے بھی نبی کریم ﷺ کا عمل یہ بیان کیا ہے کہ: آپ ﷺ صرف تکبیر اولیٰ کے وقت رفع یدین کرتے تھے، پھر دوبارہ نہیں کرتے تھے۔ اس کو نبیہتی نے خلائیات میں بطریق مالک عن الزہری عن سالم عن

بن عمر روایت کیا ہے۔ اس روایت کی مکمل تحقیق ہم آئندہ صفحات میں ہمارے دلائل کے تحت پیش کریں گے۔

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت مرفوع خود ان کے نزدیک بھی معمول بہ نہیں اور پھر اس میں اضطراب و اختلاف بھی ہے اور دوسرے صحابہ کی روایات بھی اس کے معارض ہیں، لہذا اس میں حجت نہیں ہے۔ ہاں اس سے انکار نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے رفع یدین بھی کیا ہے، مگر کلام تو دوام و سنیت میں ہے اور یہ ثابت نہیں۔

ایک حدیث کی تحقیق

یہاں مناسب ہے کہ ہم اس حدیث کی تحقیق کر دیں جو امام بیہقی کی جانب منسوب کر کے متعدد حضرات نے نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا کہ: ”أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ رَفَعَ يَدَيْهِ وَإِذَا رَكَعَ وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، وَكَانَ لَا يَفْعَلُ ذَلِكَ فِي السُّجُودِ، فَمَا زَالَتْ تِلْكَ صَلَاتُهُ حَتَّى لَقِيَ اللَّهَ تَعَالَى“ (رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو رفع یدین کرتے، اور جب رکوع کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے تب بھی کرتے، اور سجدہ میں ایسا نہیں کرتے تھے، آپ کی نماز ہمیشہ اسی طرح رہی یہاں تک کہ آپ اللہ سے جا ملے)۔ (نصب الراية: ۴۰۹/۱)

اس حدیث کا مؤلف ”حدیث نماز“ نے بھی بیہقی کے حوالے سے ذکر کیا ہے، مگر اولاً تو یہ حدیث بیہقی کی سنن کبریٰ میں نہیں ہے، اور نہ ان کی کتاب ”معرفة السنن والآثار“ میں ہے بلکہ یہ ان کی کتاب ”الخلافيات“ میں ہے، معلوم نہیں کس شبہ کی بنیاد پر اس کو سب سے پہلے علامہ ابن دقیق العید نے ”الامام“ میں سنن بیہقی کے

حوالے سے ذکر کیا اور پھر علامہ زیلعی نے ابن دقیق العید کے حوالے سے اس کو بیہتی کی طرف منسوب کر کے نصب الراہیہ میں نقل کیا، اور اسی طرح دوسرے لوگوں نے بھی اس حدیث کو بیہتی کی جانب منسوب کر دیا حالانکہ یہ سنن کبریٰ میں نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ حدیث صرف ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع ہے، افسوس کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے ایک موضوع حدیث کو معرض استدلال میں پیش کر کے ایک سخت غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور یہ سب ان کی کورانہ تقلید کا نتیجہ ہے، کاش وہ تحقیق کی زحمت گوارا کرتے اور اس کے رجال سے بحث کرتے تو حقیقت ان کے سامنے کھل جاتی۔

لیجئے ملاحظہ کیجئے کہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمن بن قریش بن خزیمہ ہروی ہے، علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں کہا کہ: سلیمان نے عبدالرحمن کو وضع حدیث سے متہم کہا ہے، اور ابن حجر نے اس پر مزید یہ نقل کیا ہے کہ: خطیب نے تاریخ میں کہا ہے کہ: ان کے بارے میں سوائے خیر کے کچھ سنا نہیں گیا۔ (لسان المیزان: ۳/۴۲۵)

مطلب یہ کہ فی نفسہ آدمی تو اچھے تھے مگر حدیث کے بارے میں سلیمان نے ان کو متہم سمجھا ہے، لہذا کم از کم ایسے شخص کی روایت انتہائی ضعیف و مخدوش ہوگی۔

اور دوسرا راوی اس سند میں عصمہ بن محمد الانصاری ہے۔ ابن حجر نے کہا کہ ابو حاتم نے اس کو ”لیس بالقوی“ کہا اور یحییٰ بن معین نے کذاب اور وضاع کہا اور عقیلی نے کہا کہ ثقافت سے باطل روایات بیان کرتا ہے اور دارقطنی وغیرہ نے متروک کہا ہے۔ (لسان المیزان: ۴/۱۷۰)

اب غور کیجئے کہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے ایسی باطل اور موضوع حدیث کو بلا تحقیق نقل کر کے اپنے مدعی کو ثابت کرنے کی ناکام

کوشش کی ہے؟ (لا حول ولا قوة الا بالله العلیٰ العظیم) اس سے معلوم ہوا کہ اگر ان کا جی چاہے تو موضوع حدیث سے بھی استدلال کرنے تیار ہو جاتے ہیں اور جی نہ چاہے تو صحیح و حسن احادیث سے بھی جی چراتے ہیں، کیا یہ اہل حق کا شیوہ ہے؟ بہر حال دوام رفع یدین پر کوئی دلیل نہیں ہے اور ثبوت سے انکار نہیں ہے۔

حدیث مالک بن الحویرث پر کلام

مؤلف ”حدیث نماز“ نے رفع یدین کی دوسری دلیل میں حضرت مالک بن الحویرثؓ کی روایت پیش کی ہے۔ اس کو بخاری، مسلم وغیرہ اصحاب صحاح نے روایت کیا ہے، اس میں حضرت مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: ”أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ رَفَعَ يَدَيْهِ وَإِذَا رَكَعَ وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرَّكُوعِ“ (میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے جب تکبیر کہی تو رفع یدین کیا اور جب رکوع کیا اور جب رکوع سے سر اٹھایا)۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد مؤلف ”حدیث نماز“ نے لکھا کہ:

”اس حدیث میں ماضی کے صیغہ پر ”إِذَا“ داخل ہے، جس کے معنی مضارع اور مستقبل کے ہیں، یعنی یہ آپ ﷺ کا عمل ہمیشہ رہا ہے، پھر رفع یدین کب منسوخ ہوا؟ ویسے بھی مالک بن حویرثؓ نبی کریم ﷺ کی آخری زندگی میں ایمان لائے تھے۔ (سنہ ۹ ہجری) پھر رفع یدین کس سال منسوخ ہوا؟“ الخ (حدیث نماز: ۱۴۸)

ایک من گھڑت اصول

میں کہتا ہوں کہ: یہاں مؤلف ”حدیث نماز“ نے جو یہ بیان کیا ہے کہ ”اس

حدیث میں ماضی کے صیغہ پر ”اذا“ داخل ہے، جس کے معنی مضارع اور مستقبل کے ہیں، یہ تو صحیح ہے کہ اذا ماضی پر بھی داخل ہو تو مستقبل کے معنی دیتا ہے مگر اس کا کیا یہ مطلب ہے کہ:

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب تکبیر کہیں گے تو رفع یدین کریں گے“ کیا کوئی زبان داں اس عبارت کو صحیح کہہ سکتا ہے اور اس تعبیر کی لغویت کا انکار کر سکتا ہے؟ لہذا اس حدیث اور اس قسم کے جملوں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ”آپ نے جب تکبیر کہی اور رکوع کیا اور رکوع سے سر اٹھایا تو رفع یدین کیا“ چونکہ یہ سب افعال تکبیر اور رکوع اور رکوع سے سر اٹھانا نماز کے لئے کھڑے ہونے کے بعد مستقبل میں پیش آئے لہذا راوی نے ان کو بیان کرتے ہوئے مستقبل کے صیغہ سے بیان کیا ہے۔ یہ مطلب کوئی معمولی پڑھا لکھا بھی اس کا نہیں لیتا کہ راوی کا منشا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ آئندہ زمانے میں تکبیر و رکوع وغیرہ کریں گے اور اس وقت رفع یدین کریں گے۔ یہ بات بہت موٹی اور کھلی ہوئی ہے۔

پھر مؤلف کا اس پر یہ حکم مرتب فرمانا کہ: ”یہ آپ ﷺ کا عمل ہمیشہ رہا ہے“ یہ تو اور بھی مضحکہ خیز ہے، اور بالکل بے جوڑ بات ہے، کیونکہ ”اذا“ ماضی پر داخل ہو کر ماضی کو مضارع و مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے تو اس سے صرف یہ معلوم ہوا کہ نماز کے شروع کے لحاظ سے یہ سب کام مستقبل میں ہوئے جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، مگر اس سے دوام و استمرار کا ثبوت کہاں سے ہو گیا؟ کیا مؤلف ”حدیث نماز“، ”مستقبل“، کو ”مستقل“ کے معنی میں سمجھتے ہیں؟ اگر کسی فعل ماضی پر ”اذا“ کے داخل ہونے سے اس فعل کا دوام ثابت ہوتا ہے تو میں مؤلف ”حدیث نماز“ سے پوچھتا ہوں کہ اس حدیث کا کیا مطلب ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ:

”أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ مِنَ الرُّكُوعَةِ
الْآخِرَةِ مِنَ الْفَجْرِ يَقُولُ: ”اللَّهُمَّ الْعَنْ فَلَانًا وَ فَلَانًا وَ فَلَانًا“ بَعْدَ مَا
يَقُولُ: ”سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“، فَأَنْزَلَ اللَّهُ: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ
شَيْءٌ إِلَى قَوْلِهِ: فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ﴾ (بخاری: ۵۸۲۲، نسائی: ۱۲۲۱، مسند احمد:
۱۲۸/۲)

(انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپ جب فجر کی آخری رکعت میں رکوع
سے سر اٹھاتے تو ”سمع اللہ لمن حمدہ“ کہنے کے بعد یہ کہتے کہ اے اللہ!
فلاں وفلاں وفلاں پر لعنت کیجئے، پس اللہ نے اس پر یہ آیت نازل کی جس کا ترجمہ یہ
ہے کہ آپ کو اس کا کوئی حق و اختیار نہیں)

غور طلب یہ بات ہے کہ اس حدیث میں بھی ابن عمر نے وہی صیغہ استعمال
کیا ہے اور ”رفع“ پر ”إذا“ داخل ہے تو مؤلف کے اصول کے مطابق اس کا مطلب یہ
ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ جب بھی فجر کی آخری رکعت میں رکوع سے اٹھاتے تو کفار
پر بددعا کرتے، لہذا روزانہ سب کو یہ بھی کرنا چاہئے، حالانکہ یہ صرف ایک دفعہ کا
واقعہ ہے اور خود ابن عمر کہتے ہیں کہ مذکورہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس
کام سے روک دیا۔

اگر مؤلف کو اس سے تسلی نہیں ہوئی تو ایک دلیل اور پیش کرتا ہوں، وہ یہ کہ
حضرت مالک بن الحویرث کی اسی زیر بحث حدیث میں امام نسائی اور امام احمد وغیرہ
کی روایت میں، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ”وَإِذَا سَجَدَ، وَ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ
السُّجُودِ (یعنی نبی کریم ﷺ رفع یدین کرتے تھے جب کہ سجدہ میں جاتے اور سجدہ
سے سر اٹھاتے) (سنن نسائی: ۱۲۳۱ و ۱۲۸، سنن نسائی کبری: ۲۲۸، مسند احمد: ۴۳۶/۳)

کیا اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کرنا بھی رسول اللہ ﷺ کا دائمی معمول تھا؟ اگر یہ نکلتا ہے تو پھر ہمارے مولف کیوں اس سے بیزار ہیں اور رکوع کے رفع یدین پر اتنا زور دینے کے باوجود سجدے کا رفع یدین کیوں نہیں کرتے؟

کیا یہ اس بات کو سمجھنے کے لئے کافی نہیں کہ مولف ”حدیث نماز“ نے جو اصول بیان کیا ہے وہ بے اصول بات ہے، الغرض یہ من گھڑت اصول مولف کا خود ساختہ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔

حدیث مالک کا جواب

اس کے بعد ہم اصل بحث کی جانب رجوع کرتے ہیں، حضرت مالک بن الحویرث کی حدیث کے متعلق مولف ”حدیث نماز“ نے جو یہ کہا کہ ”مالک بن حویرثؓ نبی کریم ﷺ کی آخری زندگی (سنہ ۹ ہجری) میں ایمان لائے تھے، پھر رفع یدین کس سال منسوخ ہوا“ ہم نے اس کا جواب اوپر دے دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ آخر عمر کا فعل ہونا قول بالسنخ کے منافی نہیں؛ کیونکہ احناف یہ نہیں کہتے کہ اس کا جواز منسوخ ہو گیا، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کی سنیت منسوخ ہو گئی، اور سنیت کے نسخ سے جواز کا نسخ لازم نہیں۔ (کما مر مفصلاً)

اور اس حدیث کے منسوخ ہونے کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ حضرت مالک بن حویرثؓ سے ہی نسائی میں یہ زیادتی بھی ہے جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا: ”وَإِذَا سَجَدَ، وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السُّجُودِ (یعنی نبی کریم ﷺ رفع یدین کرتے تھے جب کہ سجدہ میں جاتے اور سجدہ سے سر اٹھاتے) (نسائی: ۱۲۳۱ و ۱۲۸)“

جمہور نے اس حدیث میں سجدہ کے رفع یدین کو قبول نہیں کیا، اور اس کے

بارے میں وہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ منسوخ مانا ہے، جب اس حدیث کے اس جزء کو اس بنا پر تسلیم نہیں کیا گیا کہ منسوخ ہے، حالانکہ وہ بھی انہی مالک بن الحویرث سے مروی ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ کی آخری زندگی میں ایمان لائے ہیں تو اس کے پہلے اجزاء کو منسوخ ماننے سے کیوں اشکال پیش آتا ہے؟۔

سجدہ کے وقت رفع یدین

جب یہاں سجدے کے رفع یدین کا ذکر آ گیا ہے تو اس کے بارے میں مزید کچھ وضاحتیں پیش کر دینا مناسب ہے، ایک تو یہ کہ یہ حدیث جس میں سجدے کے وقت رفع یدین کا ذکر آیا ہے صحیح ہے، اور یہ جس طرح حضرت مالک بن الحویرث کی حدیث میں ہے اسی طرح اور بھی متعدد صحابہ سے روایت کیا گیا ہے، سلفی عالم شیخ ناصر الدین الالبانی نے ”تخریج المشکاة“ میں لکھا ہے کہ: ”قد صح عنه ﷺ الرفع في السجود و مع كل تكبيرة عن جماعة من الصحابة“ (رسول اللہ ﷺ کا سجدے میں اور ہر تکبیر کے وقت رفع یدین کرنا صحابہ کی ایک جماعت سے صحیح طور پر ثابت ہے) (مشکاة: ۱/۲۴۸)

اور شیخ الالبانی ہی ”صفة صلاة النبي“ میں لکھتے ہیں کہ: ”وروي هذا الرفع عن عشرة من الصحابة“ (یہ سجدوں کا رفع یدین دس صحابہ سے روایت کیا گیا ہے) (صفة صلاة النبي: ۱۴۶)

اور اس کے علاوہ ہر خفض و رفع (جھکنے اور اٹھنے) کے وقت بھی رفع یدین کا ذکر آیا ہے، اور علامہ عراقی نے لکھا ہے کہ امام یحییٰ بن القطان اور دارقطنی نے ان حدیثوں کو صحیح قرار دیا ہے، اور ابن حزم ظاہری نے کہا کہ: یہ احادیث متواتر ہیں جن سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے اور انھوں نے ابن عمر، ابن عباس، حسن بصری، طاؤس، ان

کے بیٹے عبداللہ، نافع، ابوب سختیانی، عطاء بن ابی رباح، وغیرہ کا یہی مذہب نقل کیا ہے۔ (طرح التقریب فی شرح التقریب: ۲/۲۲۸)

بعض لوگ حضرت مالک بن الحویرث کی حدیث میں سجدے کے وقت کے رفع یدین کی اس زیادتی کو اس کے راوی سعید کا تفرّد کہہ کر اس کو شاذ قرار دیتے ہیں مگر یہ بات صحیح نہیں؛ کیونکہ حافظ ابن حجرؒ نے کہا کہ: ابو عوانہ کی صحیح میں سعید کی ہمام نے قتادہ سے روایت کرتے ہوئے متابعت کی ہے۔ (فتح الباری: ۲/۲۲۳)

اور علامی نیوی نے التعلیق الحسن میں فرمایا کہ: میں کہتا ہوں کہ اصحاب قتادہ میں متعدد حضرات نے سعید کی متابعت کی ہے، ہمام نے مسند احمد صحیح ابی عوانہ میں اور شعبہ و ہشام نے نسائی میں ان کی متابعت کی ہے۔ پس رفع یدین للسجود کی زیادتی بلا شک صحیح اور محفوظ ہے، شاذ نہیں ہے۔ (التعلیق الحسن: ۱۰۲/۱)

جب سجدے میں بھی رفع یدین ثابت ہے تو اس کو قبول نہ کرنے کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اس کو منسوخ کہا جائے، اسی لئے علامہ ظہیر احسن نیوی نے کہا کہ: ”لم یصب من جزم بأنه لا یثبت شیء فی رفع الیدین للسجود، و من ذهب إلى نسخه فلیس له دلیل علی ذلك إلا مثل دلیل من قال لا یرفع یدیه فی غیر تکبیرة الافتتاح“ (جس نے اس بات پر جزم کیا کہ سجدے کے رفع یدین کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے وہ صحیح نہیں ہے، اور جو اس کے نسخ کی جانب گیا اس کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں مگر اسی طرح کی جو تکبیر تحریمہ کے علاوہ کسی جگہ رفع یدین کا قائل نہیں) (آثار السنن: ۱۰۳/۱)

الغرض جب رفع یدین للسجود کی زیادتی کو باوجود یہ کہ صحیح طریقہ سے ثابت ہے، جمہور نے تسلیم نہیں کیا اور اس کو ساقط کر دیا، تو یہ اس کی دلیل اکبر اور شاہد اعظم

ہے کہ یہ حدیث مالک بن الحویرث سب کے نزدیک غیر معمول بہ ہے، اگر احناف نے دیگر دلائل کی بنا پر رفع عند الركوع وعند الرفع کو غیر معمول بہ قرار دیا ہے، تو کیا حرج اور کونسا گناہ کر دیا؟ اور ہمارے لفظ نضح کے یہی معنی ہیں کہ یہ غیر معمول بہ ہے، یہ نہیں کہ اس پر عمل ناجائز ہے جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

انتباہ

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے کہ اگر مؤلف ”حدیث نماز“ صرف اپنے مسلک کو بیان کرتے اور ثابت کرتے اور علماء احناف کی کتابوں سے غلط مطالب اخذ نہ کرتے اور عبارات میں توڑ مروڑ نہ کرتے اور غلط باتیں ان کی طرف منسوب نہ کرتے، تو پھر ہمیں اس جوابدہی کی ضرورت نہ تھی، مگر مؤلف موصوف نے اپنی ساری کتاب میں یہ شیوہ اپنایا ہے کہ علماء احناف کی عبارات کو غلط مطلب کے لئے استعمال کیا اور کسی کی جانب انتساب غلط کیا اور بعض جگہ ایک ہی قلم سے سارے مذہب احناف اور ان کی دلیلوں کو ضعیف اور حتیٰ کہ موضوع بھی بعض جگہ کہہ دیا، اسی لئے ہمیں اس پر قلم اٹھانا پڑا، ورنہ ہمارا شیوہ اور ہمارا مذہب و مسلک یہ ہے کہ جو باتیں مختلف فیہ ہیں ان میں حتیٰ الامکان تشدد نہ ہو، بلکہ سب کو حق مانا جائے اور ہمارے اساتذہ و اکابر کا یہی طریقہ رہا ہے اور اب بھی ہے، ہاں جب دوسرے لوگ حملہ کرتے ہیں تو جواب دہی کرتے ہیں، اس لئے نہیں کہ دوسرے ائمہ کی تغلیط کی جائے، بلکہ اس لئے کہ اپنے مسلک کو ثابت کیا جائے اور اس کے دلائل کو سامنے لایا جائے۔ (فافرہم)

مؤلف نے رفع یدین کی دلیل میں چونکہ صرف یہی دو روایتیں پیش کی ہیں،

اس لئے ہم نے بھی انہی دو روایات پر اکتفاء کیا ہے۔

ترکِ رفع کے دلائل

اب ہم ان حضرات کے دلائل بیان کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ: نماز میں صرف افتتاح کے وقت تکبیر کہتے ہوئے رفع یدین ہے، اس کے بعد دوبارہ رفع یدین نہیں ہے۔

(۱) حدیث عبد اللہ بن مسعود

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ: ”أَلَا أُصَلِّي بِكُمْ صَلَاةَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ؟ فَصَلَّى فَلَمْ يَرْفَعْ يَدَيْهِ إِلَّا فِي أَوَّلِ مَرَّةٍ“ (کیا میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی نماز نہ پڑھاؤں؟ پھر آپ نے نماز پڑھی اور اول مرتبہ کے سوا کسی اور جگہ رفع یدین نہیں کیا) (ترمذی: ۵۹/۱، سنن نسائی: ۱۲۰/۱، سنن کبریٰ نسائی: ۲۲۱/۱، ابوداؤد: ۱۰۹/۱، احمد: ۲۵۱/۵، مسند ابویعلیٰ: ۸/۲۵۳، مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۱۳/۱، سنن کبریٰ بیہقی: ۷۸/۲)

بعض روایات میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کے بارے میں کہا کہ: ”أَنَّهُ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي أَوَّلِ تَكْبِيرَةٍ، ثُمَّ لَا يَعُودُ“ (نبی کریم ﷺ تکبیرِ اولیٰ میں رفع یدین کرتے تھے، پھر نہ لوٹاتے تھے) (طحاوی: ۱۱۰/۱)

حدیث کی صحت

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور غیر مقلدوں کے امام ابن حزم طاہری نے ”المحلی“ میں اس کی تصحیح کی ہے، اور ابن القطان المغربی نے کتاب

”الوہم والایہام“ میں اس کی تصحیح کی ہے، جیسا کہ حافظ زیلیعی نے نصب الراہیہ میں ابن دقیق العید سے نقل کیا ہے، اور علامہ عینی نے نخب الافکار میں اس کو صحیح کہا ہے، اور مشہور محقق علامہ احمد محمد شاہ نے مسند احمد کی تعلیق میں اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، اور ان کے علاوہ جمہور مالکیہ نے بھی اس کی تصحیح کی ہے، جیسا کہ نیل الفرقدین میں ہے اور علامہ نیوی نے آثار السنن میں اس کو صحیح کہا ہے۔ (دیکھو: سنن ترمذی: ۵۹۱، محلی: ۴۳، نصب الراہیہ: ۳۹۵/۱، نخب الافکار: ۶۰۱/۲، مسند احمد بتعلقات الشیخ احمد محمد شاہ کر: ۲۵۱/۵، آثار السنن: ۱۰۳/۱)

اور شیخ الالبانی نے ”تخریج مشکاة“ میں لکھا ہے کہ: ”والحق انہ حدیث صحیح، وإسناده صحیح علی شرط مسلم، ولم نجد لمن أعلہ حجة یصلح التعلق بها، وردّ الحدیث من أجلها“ (حق یہ ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کی سند مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے اور جن لوگوں نے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے ہمیں ان کی کوئی ایسی دلیل نہیں ملی جس سے استدلال صحیح ہو اور اس کی وجہ سے حدیث کو رد کیا جاسکے) (تخریج المشکاة: ۲۵۴/۱)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث محدثین کے ایک جم غفیر کے نزدیک صحیح ہے، اور اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک تو یہ کہ نبی کریم ﷺ رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع یدین نہیں کرتے تھے، بلکہ صرف نماز کی افتتاح کے وقت رفع یدین کرتے تھے، دوسرے یہ کہ خود عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی رکوع کے وقت رفع یدین کے قائل نہیں تھے اور آپ کا عمل بھی اسی پر تھا۔ علماء احناف کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی رسول اللہ ﷺ کے بعد اپنے اصحاب کو بڑے اہتمام سے رسول اللہ ﷺ کی نماز کا طریقہ بتانا چاہتے

ہیں اور صرف زبانی تعلیم کے بجائے عملی طور پر ان کو سکھاتے ہیں اور اس میں صرف ایک بار افتتاح نماز کے وقت رفع یدین کرتے ہیں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول یہی تھا، اور یہی بات سنت ہے، ورنہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے رسول اللہ ﷺ کو ہمیشہ اور معمولاً رفع یدین کرتے دیکھا ہوتا تو وہ کبھی اس کے خلاف نہ کرتے اور نہ رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے اس کے خلاف تعلیم دیتے۔ اس لئے امام ابوحنیفہ اور بہت سے ائمہ و علماء و فقہاء رکوع کے رفع یدین کے قائل نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ رفع یدین صرف نماز کے افتتاح کے وقت ہی سنت ہے

رہا حضرت عبداللہ بن عمر کا یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب رکوع کیا تو رفع یدین کیا، یہ انھوں نے کسی وقت کا واقعہ بیان کیا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے آپ رفع یدین کرتے تھے، مگر ہمیشہ کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اور اسی لئے خود حضرت ابن عمر بھی رفع یدین نہیں کرتے تھے جیسا کہ اوپر ہم نے صحیح طریق سے اس کا ثبوت دیدیا ہے۔ اب جبکہ حدیث ابن مسعود و حدیث ابن عمر دونوں کا صحیح ہونا ثابت ہو گیا تو ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بظاہر تعارض لازم آیا، اس لئے ان میں تطبیق ہوگی یا ترجیح ہوگی، تطبیق وہی ہے جو ہم نے پیش کی کہ ابن عمر نے کسی وقت کا عمل بتایا ہے اور ابن مسعود نے آپ کا معمول ذکر کیا ہے، لہذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں، اور ترجیح کی صورت یہ ہے کہ یہ مسلم ہے کہ ابن مسعود کا عمل ان کی روایت کے موافق ہے، اس کے برخلاف ابن عمر کا عمل ان کی روایت کے خلاف ہے لہذا یہ روایت ابن عمر ان کے نزدیک بھی غیر معمول بہ ٹھہری، اس لئے علماء حنفیہ کہتے ہیں کہ اس راوی کی روایت ترجیح کے لائق ہے جس کا عمل بھی اس کی روایت کے موافق ہو، لہذا احناف نے اسی کے موافق کیا ہے۔

حدیث مذکور پر پہلا اعتراض اور جواب

اس واضح حدیث صحیح کے ہوتے ہوئے مسئلہ کا حل بہت آسان تھا، مگر مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس حدیث کو قبول کرنے کے بجائے اس کو نقل کرنے کے بعد اس روایت کو رد کر دیا ہے اور اس پر کئی طرح سے کلام کیا ہے، لہذا ہم بھی ان کے اعتراضات کا تفصیلی جواب دینا چاہتے ہیں۔

صاحب ”حدیث نماز“ نے پہلا اعتراض یہ کیا ہے کہ:

”امام ترمذی نے اس حدیث کو زیادہ سے زیادہ حسن کہا ہے اور حسن حدیث صحیح کو رد نہیں کر سکتی، بلکہ اگر حسن حدیث کے خلاف صحیح حدیث موجود ہے تو حسن خود ہی رد ہو جاتی ہے۔“ (حدیث نماز: ۱۴۹)

جواب ملاحظہ کیجئے کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ امام ترمذی نے تو اس حدیث کو صرف حسن کہا ہے لیکن غیر مقلدوں کے امام ابن حزم ظاہری نے ”المحلی“ میں اس کی تصحیح کی ہے، دوسرے غیر مقلد عالم شیخ الالبانی نے بھی اس کو صحیح علی شرط مسلم کہا ہے، نیز ہم نقل کر چکے کہ ابن القطان المغربی نے اس کی تصحیح کی ہے، علامہ عینی نے اس کو صحیح کہا ہے، مشہور محقق علامہ احمد محمد شاہ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، اور ان کے علاوہ جمہور مالکیہ نے بھی اس کی تصحیح کی ہے۔

جب حدیث کی صحت ثابت ہوگئی، تو یہ کہنا کہ یہ حدیث صرف حسن ہے لہذا صحیح کی وجہ سے رد ہو جائے گی، ناقابل قبول و ناقابل التفات ہے۔

حدیث پر دوسرا اعتراض اور جواب

صاحب ”حدیث نماز“ نے مذکورہ حدیث ابن مسعود پر دوسرا اعتراض یہ کیا

ہے کہ:

”یہ روایت حسن بھی نہیں ہے، امام ترمذی نے عادتاً یا تسابیل سے حسن کہہ دیا ہے، ورنہ خود امام ترمذی امام اعظمؒ کے شاگرد عبد اللہ ابن المبارکؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ رفع یدین کی حدیث ثابت ہے..... اور حدیث ابن مسعود ثابت نہیں۔“ (حدیث نماز: ۱۴۹)

مؤلف ”حدیث نماز“ کی اس بات میں کئی طرح سے مواخذات ہیں:

ایک تو یہ کہ انھوں نے اس میں امام ترمذی پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ ضعیف حدیث کو عادتاً حسن کہہ دیا کرتے ہیں، یہ بات انہائی غلط ہے؛ کیونکہ علماء نے یہ تو لکھا ہے کہ امام ترمذی میں کچھ تسابیل تھا، مگر یہ کسی نے نہیں لکھا کہ وہ عادتاً ایسا کرتے تھے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ عادتاً ایسا کرتے تھے تو ان کے حدیث پر حکم لگانے سے اعتماد ہی ختم کر لینا پڑے گا، حالانکہ کسی نے آج تک ایسی بات نہیں کہی بلکہ اس کے خلاف ان کے لگائے ہوئے احکام کو امت نے قبول کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ امام ترمذی نے امام ابن المبارکؒ کا قول نقل تو کیا ہے مگر خود اس کا رد اس طرح کر دیا کہ آپ نے ان کے خلاف اس حدیث پر حسن ہونے کا حکم لگایا ہے، لہذا جس پر خود امام ترمذی اعتماد نہیں کر رہے ہیں اس کو پیش کرنا اور اس کو صحیح قرار دینا اور اس کو امام ترمذی کی جانب منسوب کرنا غلط بات ہے۔

تیسرے امام ابن المبارکؒ نے اس حدیث کے غیر ثابت و غیر صحیح ہونے کی کوئی علت اور وجہ بیان نہیں کی ہے، اور جرح مبہم مقبول نہیں ہوتی، لہذا جن لوگوں نے اس کو دیکھ پرکھ کر صحیح کہا ہے ان کی بات کا اعتبار ہوتا ہے۔

چوتھے یہ کہ امام ابن المبارکؒ کے نزدیک اس حدیث کے ثابت نہ ہونے

سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب کے نزدیک غیر ثابت ہو، اس حدیث کو حضرت وکیع سے سنن ابی داؤد میں عثمان بن ابی شیبہ نے اور سنن ترمذی میں ہناد نے، سنن نسائی میں محمود بن غیلان مروزی نے اور بیہقی نے بطریق محمد بن اسمعیل وکیع سے روایت کی ہے، اور ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اس کو وکیع سے روایت کیا ہے، پھر ابن المبارک کے قول پر کیسے اعتماد کر لیا جائے اور ثابت حدیث صحیح کی کیسے تردید کر دی جائے؟ خصوصاً جبکہ یہ روایت ابن المبارک کے استاذ وکیع کے نزدیک بھی صحیح ثابت ہے اور ان کے استاذ سفیان ثوری کے نزدیک بھی صحیح ہے، اسی لئے ان دونوں حضرات نے اپنا عمل بھی اسی کے مطابق کیا ہے جیسا کہ خود امام بخاری نے جزء رفع یدین میں بیان کیا ہے کہ سفیان اور وکیع اور بعض اہل کوفہ رفع یدین نہیں کرتے اھ۔ (جزء رفع یدین: ۱۹)

اگر کسی ایک دو کے بلا دلیل کہہ دینے سے حدیث قابل رد ہو جاتی ہے تو پھر حدیث رفع یدین بھی ضعیف ہوگی؛ کیونکہ اس کو امام مالک نے ضعیف قرار دیا ہے۔ چنانچہ المدونۃ الکبریٰ میں ہے کہ امام مالک نے سوائے تکبیر اولی کے اور جگہ رفع یدین کو ضعیف قرار دیا، اور شرح مؤطا میں زرقانی نے امام اصیلی سے نقل کیا ہے کہ: امام مالک نے حدیث ابن عمر کو اس لئے قبول نہیں کیا کہ اس میں حضرت سالم اور حضرت نافع نے وقف و رفع میں اختلاف کیا ہے۔ (دیکھو المدونہ: ۱۶۵/۱، شرح الزرقانی: ۲۲۹/۱)

پانچویں یہ کہ حضرت عبداللہ بن المبارک نے جو حدیث ابن مسعود کو غیر ثابت کہا ہے، وہ مطلقاً حدیث ابن مسعود کو نہیں بلکہ اس کے بعض طرق کے بارے میں فرمایا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود کی یہ حدیث دو طرح وارد ہوئی ہے: ایک میں وہ فرماتے ہیں کہ: ”أَنَّه يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي أَوَّلِ تَكْبِيرَةٍ، ثُمَّ

لَا يَعُودُ“ (نبی کریم ﷺ تکبیر اولیٰ میں رفع یدین کرتے تھے، پھر نہ لوٹاتے تھے) دوسرے میں ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ: ”أَلَا أُصَلِّي بِكُمْ صَلَاةَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ؟ فَصَلَّى فَلَمْ يَرْفَعْ يَدَيْهِ إِلَّا فِي أَوَّلِ مَرَّةٍ“ (کیا میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی نماز نہ پڑھاؤں؟ پھر آپ نے نماز پڑھی اور اول مرتبہ کے سوا کسی اور جگہ رفع یدین نہیں کیا) اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے سیاق میں صراحۃً رسول اللہ ﷺ کا عمل ترکِ رفع یدین بیان کیا گیا ہے جبکہ دوسرے سیاق میں اصلاً حضرت ابن مسعود کا عمل بیان کیا گیا ہے اور اس میں حوالہ رسول اللہ ﷺ کا ہونے کی وجہ سے یہ حکماً مرفوع ہے حضرت ابن المبارک کا منشاء پہلے سیاق کا انکار ہے اسی لئے امام ترمذی نے بھی ابن المبارک کے قول کو اسی سیاق کے تحت نقل کیا ہے، رہا دوسرا سیاق تو نہ ہی ابن المبارک نے اس کا رد کیا ہے اور نہ امام ترمذی نے اس کو اس کی تردید کے لئے نقل کیا ہے، بلکہ امام ترمذی نے دوسرے سیاق سے روایت کو نقل کر کے اس کو حسن کہا ہے۔ (دیکھو امامانی الاحبار: ۱۹۷/۳)

غرض یہ کہ اس حدیث کی صحت ثابت ہو جانے کے بعد کسی کا اس سے انکار ناقابل التفات ہے، لہذا یہ حدیث صحیح و ثابت ہے۔

تیسرا اعتراض

صاحب ”حدیث نماز“ نے اس حدیث کے خلاف تیسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ:

”امام ابو داؤد نے اس حدیث کو بیان کر کے لکھا ہے کہ: ”ولیس

هو بصحيح على هذا اللفظ“ (یہ روایت ابن مسعود کی ان الفاظ میں صحیح نہیں)۔ اب کیا آپ غیر صحیح سے صحیح روایت کو رد کر دیں گے؟

(حدیث نماز: ۱۵۰)

راقم کہتا ہے کہ: امام ابو داؤد کے نزدیک کسی حدیث کے صحیح نہ ہونے سے یہ لازم نہیں کہ جن کے نزدیک صحیح ثابت ہے وہ بھی ان کی تقلید کر لیں، اور صحیح روایت کو ترک کر دیں۔ تعجب تو مؤلف ”حدیث نماز“ پر ہے کہ اہل حدیث ہو کر بھی تقلید میں حد ہی کر دیا حتیٰ کہ ایک صحیح حدیث کو ان کی تقلید میں قبول کرنے سے اعراض و گریزی کی راہ پر چل رہے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ شیخ البانی نے ان تمام شکوک و شبہات کو جن کی بنیاد پر اس حدیث کو بعض لوگوں نے صحیح ماننے سے انکار کیا ہے ناقابل التفات قرار دیا ہے اور انہوں نے اپنی کتاب ”صحیح الترمذی“ میں ان سب کا جواب بھی دیدیا ہے، لہذا اندھی تقلید کو چھوڑیے اور تحقیق کے میدان میں قدم رکھئے، ورنہ صرف تقلید کی حرمت کے فتوے دیکر تقلید بلکہ اندھی تقلید کو گلے سے لگائے رکھنا کوئی عقلمندی کا کام نہیں۔

برسبیل تذکرہ

یہاں برسبیل تذکرہ یہ بھی عرض کر دینا مناسب ہے کہ امام منذری نے مختصر السنن میں کہا ہے کہ: ابن المبارک کے علاوہ (کسی اور نے) کہا کہ اس حدیث کے راوی عبدالرحمان بن الاسود نے علقمہ سے نہیں سنا، لہذا یہ روایت منقطع ہوگئی۔ مگر یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے، اولاً تو اس قول کا قائل معلوم نہیں کہ کون ہے؟ تاکہ یہ معلوم ہوتا کہ ناقد اہل فن سے ہے یا نہیں۔ ابن دقیق العید نے کہا کہ: یہ بات قاذح نہیں ہے؛ کیونکہ یہ ایک مجہول آدمی سے نقل ہے اور میں نے اس قائل کو تلاش و تتبع کیا مگر مجھے نہیں ملا۔ ثانیاً: اس لئے کہ عبدالرحمان کی وفات ۹۹ھ میں ہوئی اور یہ حضرت ابراہیم نخعی سے بڑے تھے، جب حضرت ابراہیم کے علقمہ سے سماع پر سب کا اتفاق ہے، تو یہ کیوں ممکن نہیں کہ عبدالرحمان نے بھی سنا ہو؟ اور پھر ابو بکر خطیب بغدادی نے اپنی کتاب ”المتفق والمتفرق“ میں عبدالرحمان کے ترجمہ میں تصریح

کردی ہے کہ انہوں نے علقمہ سے سنا۔ (نصب الراية: ۱/۳۹۵)

تفرد و کعبہ پر ایک نظر

اس حدیث ابن مسعود میں جو لفظ ”ثم لا یعود“ واقع ہوا ہے، اس کے بارے میں بعض حضرات نے تفرد و کعبہ کا دعویٰ کیا ہے، مگر یہ دعویٰ غلط ہے؛ کیونکہ سنن نسائی میں ابن المبارک نے کعبہ کی متابعت کی ہے اور ابوداؤد میں معاویہ، خالد بن عمرو اور ابو حذیفہ نے کعبہ کی متابعت سفیان سے کی ہے۔ (نسائی: ۱/۱۱۷، ابوداؤد: ۱۰۹/۱)

اور دارقطنی نے جو یہ کہا کہ اصحاب کعبہ میں سے ایک جماعت نے اس کو روایت کیا ہے مگر ”ثم لا یعود“ کا لفظ وہ نہیں کہتے، تو یہ گمان صحیح نہیں، اصحاب کعبہ میں سے کئی حضرات نے (جن کا ذکر اوپر ہوا ہے) اس کو مختلف عنوان سے بیان کیا ہے، بعض نے ”لا یعود“، بعض نے ”ثم لا یرفع یدیه إلا مرة“ وغیرہ الفاظ بیان کئے ہیں، جس کے معنی ایک ہیں۔ (دیکھو: التعلیق الحسن علی آثار السنن: ۱۰۴-۱۰۵)

عاصم بن کلیب پر جرح کا جواب

اسی ضمن میں یہ بھی سنتے چلئے کہ اس حدیث کے ایک راوی عاصم بن کلیب ہیں، اور انہی پر اس حدیث کا مدار ہے، لہذا بعض نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کو مجروح ثابت کیا جائے، مگر حقیقت یہ ہے کہ عاصم بن کلیب ثقہ راوی ہیں، اور امام مسلم نے ان سے تخریج کی ہے اور امام بخاری نے ان سے تعلیقاً روایت کیا ہے۔ پھر امام شعبہ نے بھی ان سے روایت کی ہے، ابن معین اور نسائی نے کہا کہ: یہ ثقہ ہیں، ابو حاتم نے

کہا کہ: صالح ہیں، ابوداؤد نے کہا کہ: عاصم بن کلیب عبادت گزار لوگوں میں سے تھے اور کہا کہ: کوفہ کے لوگوں میں سب سے افضل تھے، امام ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور ابن شاہین نے کہا کہ: احمد بن صالح نے کہا کہ: یہ کوفہ کے ذی وجاہت ثقہ لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، ابن سعد نے کہا کہ: ثقہ ہیں جن سے حجت پکڑی جاتی ہے۔ (تہذیب الکمال: ۵۳۸/۱۳، تہذیب التہذیب: ۴۹/۵)

اس سے معلوم ہوا کہ عاصم بن کلیب کو مجروح قرار دینا صحیح نہیں، بلکہ یہ ثقہ راوی ہیں اور ان سے حجت پکڑی جاتی ہے۔

حدیث پر چوتھا اعتراض و جواب

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس حدیث ابن مسعود پر چوتھا اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”امام بخاری، ابوحاتم، امام احمد بن حنبل جیسے فن رجال کے اماموں نے ابن مسعود کی روایت کو ضعیف کہا ہے (ضعیف سے صحیح کو رد کرنا تو مذہب حنفی میں بھی منع ہے)“ (حدیث نماز: ۱۵۰)

میں کہتا ہوں کہ: کسی حدیث کے ان حضرات کے نزدیک ثابت نہ ہونے سے یہ لازم نہیں کہ دوسروں کے پاس بھی ثابت نہ ہو، اور امام احمد بن حنبل سے تو اس حدیث کے سلسلہ میں کوئی کلام منقول بھی نہیں، سوائے اس کے جو امام بخاری نے جزء رفع الیدین میں نقل کیا ہے کہ امام احمد نے یحییٰ بن آدم سے نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ: ابن ادریس کی کتاب میں ”ثم لا یعود“ کا لفظ نہیں ہے۔ اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ عاصم سے روایت کرنے والے دو ہیں، سفیان بھی ہیں اور ابن ادریس بھی، مگر ابن ادریس نہ تو ”ثم لا یعود“ کا اضافہ روایت کرتے ہیں، اور نہ

ان کی کتاب میں یہ لکھا ہے، لہذا کتاب میں جو ہے وہی صحیح ہے، اور عاصم کے شاگردوں میں سے سفیان اس اضافہ کو روایت کرتے ہیں، یہ ان کا وہم ہے۔

میں کہتا ہوں کہ: یہ بات کئی وجوہات سے صحیح نہیں، ایک تو اس لئے کہ ابن ادریس کی روایت اور سفیان کی روایت دونوں ایک نہیں ہیں، بلکہ ابن ادریس کی حدیث کا تعلق تطبیق (رکوع میں دونوں ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں کے بیچ رکھنا) والے مسئلہ سے ہے اور سفیان کی روایت رفع یدین کے بارے میں ہے۔ چنانچہ ابن ادریس کی روایت میں ہے کہ ابن مسعود نے فرمایا کہ: ”عَلَّمَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الصَّلَاةَ، فَكَبَّرَ، وَرَفَعَ يَدَيْهِ، فَلَمَّا رَكَعَ طَبَّقَ يَدَيْهِ بَيْنَ رُكْبَتَيْهِ“ (نبی کریم ﷺ نے ہمیں نماز سکھائی، پس ہاتھ اٹھائے، پھر جب رکوع کیا تو تطبیق کیا یعنی اپنے ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں کے درمیان رکھا) (ابوداؤد: ۱۰۹/۱، حدیث: ۷۷۷، نسائی: ۱۱۷۱/۱، حدیث: ۱۰۳۱، مسند احمد: ۴۱۸/۱، سنن بیہقی: ۱۱۲/۲، صحیح ابن خزمیہ: ۳۰۱، مستدرک: ۳۲۶/۱، سنن دارقطنی: ۳۳۹/۱)

ظاہر ہے کہ اس حدیث کا مضمون الگ ہے اور حضرت سفیان کی حدیث کا مضمون الگ ہے۔ لہذا ایک میں اگر ”ثم لا يعود“ کا ذکر نہیں ہے تو کیا ضروری ہے کہ دوسری میں بھی نہ ہو؟

ثانیاً: اگر ان دونوں حدیثوں کو ایک مان لیا جائے تب بھی یہ اعتراض اس وقت صحیح ہو سکتا تھا جبکہ وہ کتاب یا تو خود سفیان ثوری کی ہوتی یا ان کے شیخ امام عاصم کی ہوتی، مگر حیرت ہے کہ جس کتاب میں یہ لفظ نہ ہونے کی بات کہی جا رہی ہے وہ نہ تو خود سفیان کی ہے اور نہ ان کے شیخ کی، بلکہ سفیان کے ساتھی ابن ادریس کی کتاب ہے جو حفظ و مرتبہ میں سفیان سے کم درجے کے ہیں۔ اگر ابن ادریس کی کتاب میں یہ لفظ نہ ملا تو اس سے یہ کس طرح ثابت ہو گیا کہ غلطی سفیان کی ہے، کیا یہاں غلطی

ابن ادریس کی نہیں ہو سکتی کہ انھوں نے حدیث سے یہ لفظ ساقط کر دیا یا ان سے بھول ہو گئی، اور سفیان کو یاد رہی؟

ثالثاً: کتاب میں نہ ہونا کوئی حجت نہیں؛ کیونکہ محدثین کے یہاں حفظ سے بیان کی ہوئی بات ہی زیادہ مضبوط اور پختی سمجھی جاتی ہے، نہ کہ کتاب کی، جبکہ حدیث شیخ سے سن کر یاد کی ہوئی ہو۔

دیکھئے امام ابن الصلاح ”مقدمہ“ میں لکھتے ہیں کہ: إذا وجد الحافظ في كتابه خلاف ما يحفظه نظر: فإن كان إنما حفظ ذلك من كتابه فليرجع إلى ما في كتابه وإن كان حفظه من فم المحدث فليعتمد حفظه دون ما في كتابه إذا لم يتشكك“ (اگر حافظ حدیث اپنی کتاب میں ایسی بات پائے جو اس کی یاد کی ہوئی بات کے خلاف ہو تو دیکھے کہ اگر اس نے کتاب ہی سے یاد کیا ہو تو کتاب میں جو ہے اسی کی طرف رجوع کرے اور اگر اس نے محدث کی زبانی سن کر یاد کیا ہو تو اپنے حفظ پر اعتماد کرے نہ کہ اس بات پر جو کتاب میں ہے بشرطیکہ اس (یادداشت) میں کوئی شک نہ ہو) (مقدمہ ابن الصلاح: ۱۲۰، الشذ الفیاح: ۳۶۱/۱)

لہذا ابن ادریس کی کتاب سے اگر یہ لفظ ساقط ہو گیا ہو اور سفیان کو یاد ہو تو کیا مانع ہے؟ اور کیوں نہ اس پر اعتماد کیا جائے؟

رابعاً: ابن ادریس کے بارے میں محدثین نے لکھا ہے کہ وہ سفیان سے کم درجہ کے راوی ہیں، سفیان کا حافظہ ابن ادریس کے مقابلے میں بڑھا ہوا ہے، حتیٰ کہ ابن معین نے کہا کہ کسی نے بھی سفیان کے مخالف کوئی بات کہی تو آخر الامر بات تو سفیان ہی کی صحیح ہوتی ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۱۰۱/۴)

اب بتائیے کہ ابن ادریس کی روایت سے سفیان کی روایت کو کیسے گرایا

جاسکتا ہے؟ پس معلوم ہوا کہ یہ اعتراض درست نہیں اور سفیان کی زیادتی محفوظ ہے، کیونکہ ثقہ کا تفرّد مضر نہیں۔ (کما مر مراراً)

راقم کہتا ہے کہ: کسی کے پاس بھی کوئی دلیل نہیں کہ اس کی تضعیف ثابت کر سکے، جو کچھ کہتے ہیں محض تخمین اور رجم بالغیب ہے۔ لہذا یہ اقوال دوسرے پر حجت نہیں ہو سکتے، اور دلائل احناف پر ایسے حملے یہ کوئی آج کی نئی بات نہیں، اس طرح ان حضرات محدثین سے بہت ہوا ہے، اگرچہ کہ ہم اس کو اجتہادی غلطی پر محمول کرتے ہیں اور یہ کوئی مخفی بات نہیں ہے، بلکہ جو کتب حدیث کے اوراق کا تفحص کرے گا، اس پر یہ بات خوب واضح اور منکشف ہو جائے گی، مثلاً امام مالکؒ جو کہ سب کے نزدیک بالاتفاق ثقہ حافظ ثبت سب ہی کچھ ہیں، جب رفع یدین عند الركوع کی روایت نہیں کرتے تو وہ واہم قرار دئے جاتے ہیں اور ان کے خلاف امام محمدؒ جو کہ امام بخاری کے نزدیک متروک اور چھپی ہیں، جب رفع یدین میں ان کے موافق روایت کرتے ہیں تو قابل احتجاج ہو جاتے ہیں اور ثقات اثبات میں شمار ہو جاتے ہیں، اور یہی سفیان ثوریؒ جب ”لم یعد“ اور ”لا یعود“ ان کے مذہب کے خلاف روایت کرتے ہیں تو یہ ان کا واہم ہے اور ابن ادریس جو کہ سفیان سے کئی درجہ کم ہیں جب ان کے مذہب کے موافق روایت کرتے ہیں تو حجت اور سفیان سے بڑھ جاتے ہیں، جبکہ یہی سفیان ثوری آمین کے مسئلہ میں جب ”مدّ بہا“ روایت کرتے ہیں تو شعبہ سے بھی بڑھ جاتے ہیں اور وہاں شعبہ واہم قرار دئے جاتے ہیں، اور سنئے اس روایت ابن مسعودؓ میں عاصم ابن کلیب ہیں، یہاں ان کی تضعیف کی جاتی ہے اور یہی راوی ابن خزیمہ کی روایت وائل بن حجر میں ”علی صدرہ“ روایت کرتے ہیں تو وہاں وہ حدیث غیر معلل غیر شاذ صحیح سب ہی کچھ ہو جاتی ہے اور امام زہریؒ ان کے نزدیک جبل حدیث ہیں مگر جب حدیث ذوالیدین میں ان کے خلاف روایت کرتے ہیں تو

اس کو نسیان اور وہم قرار دیتے ہیں، پس یہ سب کا سب رجم بالغیب نہیں تو اور کیا ہے؟

حدیث پر پانچواں اعتراض و جواب

صاحب ”حدیث نماز“ نے حدیث ابن مسعود کے جواب میں پانچواں اعتراض یہ کیا ہے کہ:

”جب دو صحیح حدیثیں آپس میں ٹکراتی ہوں تو اصحاب حدیث دونوں میں کوئی مطابقت دیتے ہیں اور اگر ضعیف صحیح سے ٹکرا جائے تو ضعیف کو رد کر دیتے ہیں، اس لئے فن رجال کے اماموں نے ابن مسعود کی روایت کو رد کر دیا ہے، لیکن امام محی الدین ابن عربی نے ضعیف ہونے کے باوجود اس روایت کو صحیح سے مطابق کیا ہے، وہ لکھتے ہیں صرف ایک بار کیا اور عیدین کی طرح بار بار نہیں کیا۔“ (حدیث نماز: ۱۵۰)

جواب عرض ہے کہ اوپر معلوم ہو چکا کہ ابن مسعود کی حدیث صحیح ہے، اور بہت سے محدثین نے اس کی تصحیح کی ہے اور اس کے ضعیف قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں اور جو وجوہات اس کے ضعف کی بیان کی جاتی ہیں وہ سب ناقابل قبول ہیں۔ رہا امام محی الدین کا ”فتوحات مکیہ“ میں اس کا یہ مطلب بیان کرنا کہ بار بار عیدین کی طرح نہیں کیا، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تاویل خلاف ظاہر ہے، کیونکہ امام ترمذی کے الفاظ اس حدیث میں یہ ہیں: ”فلم یرفع یدیه إلا أول مرة“ جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی مرتبہ میں رفع یدین کیا، اور ظاہر ہے کہ یہ الفاظ اس مفہوم و تاویل پر منطبق نہیں ہوتے۔ (کما لا یخفی)

دوسرے جمہور نے اس کے یہ معنی نہیں لئے اور پھر حضرت ابن مسعود کا عمل

اور ان کے اصحاب کا عمل جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں باسانیدِ جیدہ مروی ہے، وہ بتاتا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ وہی مطلب ہے جو جمہور نے سمجھا ہے۔

حدیث پر چھٹا اعتراض و جواب

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اس حدیث پر چھٹا اعتراض کرتے ہوئے علامہ عبدالعزیز صاحب محدث رحیم آبادی کی کتاب ”حسن البیان“ کے حوالے سے حافظ زیلیعی کی طرف منسوب کرتے ہوئے نقل کیا ہے کہ:

”انہوں نے ”نصب الرایۃ“ میں عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کا جو اب یہ لکھا ہے کہ فقیہ ابو بکر بن اسحاق نے کہا کہ عبداللہ بن مسعود کا رفع یدین نہ کرنا حدیث رفع یدین کے برابر نہیں ہو سکتا کیونکہ رفع یدین کرنا رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین اور صحابہ و تابعین سے صحیح طور پر ثابت ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اس کو بھول گئے ہوں۔
(دیکھو حدیث نماز: ۱۵۰)

راقم کہتا ہے: کہ یہاں متعدد امور قابل بحث ہیں:

(۱) مؤلف ”حدیث نماز“ نے اور علامہ عبدالعزیز محدث نے یہاں جو کہا ہے کہ حافظ زیلیعی نے اس حدیث کا یہ جواب دیا ہے، یہ بات غلط ہے؛ کیونکہ جیسا کہ خود عبارت منقولہ میں مذکور ہے، یہ حافظ زیلیعی کا بیان نہیں بلکہ فقیہ ابو بکر بن اسحاق کا بیان ہے اور حافظ زیلیعی نے نصب الرایۃ میں صرف نقل کر دیا ہے اور حافظ زیلیعی کی عادت ہے کہ وہ ”نصب الرایۃ“ میں موافق و مخالف کے اقوال کو صرف جمع کر دیتے ہیں اور بعض جگہ وہ صرف مخالف کے اقوال ہی جمع کر دیتے ہیں، جیسا کہ ”نصب الرایۃ“ کا مطالعہ کرنے والوں پر مخفی نہیں، لہذا یہاں بھی وہ صرف اس کے ناقل ہیں،

قابل نہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ فقیہ ابو بکر نے جو یہ بیان کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ہو سکتا ہے کہ رفع یدین کو بھول گئے ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود کے نسیان میں واقعہ کوئی تعجب نہیں؛ کیونکہ یہ لوازم انسان سے ہے اور خواص بشریہ میں سے ہے لیکن اولاً: تو محض امکان و احتمال سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ خاص اس بات میں ان سے نسیان ہوا ہے۔ ثانیاً: ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا نسیان و بھول صرف ابن مسعود کے ساتھ خاص ہے یا دوسرے لوگوں میں بھی جاری ہو سکتا ہے؟ اگر دوسرے لوگ بھی بھول سکتے ہیں کہ ممکن و محتمل یہ بھی ہے کہ حضرت ابن عمر سے اس کے منسوخ ہونے کی بات میں بھول ہو گئی ہو؛ کیونکہ محض احتمال سے تو اس طرح کی کوئی بھی بات گھڑ سکتا ہے۔ لہذا جب تک اس کا کوئی یقینی ثبوت نہیں پیش کیا جاتا اس وقت تک یہ بات ناقابل قبول بلکہ قابل رد ہوگی۔ ثالثاً: اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت ابن مسعود کی کسی حدیث پر بھی اعتماد نہ کیا جائے؛ کیونکہ ہر حدیث میں احتمال موجود ہے کہ ان کو اس میں کوئی بھول لگی ہو، تو کیا ان کی ساری احادیث کو کتابوں سے نکال دینا چاہئے؟ اگر نہیں تو رفع یدین کی حدیث اور دیگر احادیث میں کیا فرق ہے؟ جس طرح یہاں احتمال ہے دوسری جگہوں پر بھی بھول کا احتمال ہے، اگر یہ کہو کہ رفع یدین کی حدیث میں وہ متفرد ہیں تو عرض ہے کہ یہ غلط و بے بنیاد ہے؛ کیونکہ اس میں ان کے ساتھ اور صحابہ بھی شریک ہیں۔

(۳) تیسرے یہ کہ فقیہ ابو بکر نے یہ جو کہا کہ عبداللہ بن مسعود کا رفع یدین نہ کرنا حدیث رفع یدین کے مساوی نہیں سکتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود کا یہ محض عمل نہیں ہے، بلکہ وہ اس کو نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں جیسا کہ

طحاوی کی روایت میں صاف و صریح اس پر دلالت ہے اور خود ابن مسعودؓ کا عمل بھی اس کے موافق ہے، لہذا یہ اس کے مساوی کیوں نہ ہوگا؟ کیا رسول اللہ ﷺ کا عمل کوئی حیثیت نہیں رکھتا؟

(۴) چوتھے یہ کہ انھوں نے جو حضور ﷺ اور خلفاء راشدین اور صحابہ و تابعین سے رفع یدین کا ذکر کیا ہے، یہ علی الاطلاق صحیح نہیں؛ کیونکہ اگر ایک جانب حضرت ابن عمر وغیرہ کی روایات سے آپ ﷺ کا رفع یدین کرنا ثابت ہوتا ہے تو دوسری جانب دیگر حضرات صحابہ کی روایات سے اس کے برخلاف رفع یدین نہ کرنا بھی ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت براءؓ اور خود حضرت ابن عمرؓ اور دوسرے صحابہ سے بھی مروی ہے جیسا کہ آگے آئے گا، اور اس کی صراحت متعدد حضرات نے کی ہے، جن میں سے کچھ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، جیسے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی عبارت ہم نے نقل کی جس میں صاف ہے کہ:

”وہو من الهيئات فعله النبي ﷺ مرة و تركه مرة ، والكل سنة ، و أخذ بكل واحد جماعة من الصحابة و التابعين و من بعدهم “ (اور وہ یعنی رفع یدین ان ہیئتوں میں سے ہے جن کو اللہ کے نبی ﷺ نے کبھی کیا اور کبھی چھوڑا ہے، اور یہ سب سنت ہے، اور صحابہ و تابعین اور بعد کے لوگوں میں سے ایک ایک جماعت نے ان میں سے ایک ایک ہیئت کو اختیار کیا ہے) (حجۃ اللہ البالغہ: ۲۵۷/۲)

اور ان میں سے ایک حضرت عبدالحی لکھنوی بھی ہیں، ان کی عبارت بھی ہم نے نقل کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ: ”والحق أنه لا شك في ثبوت رفع اليدين عند الركوع والرفع منه عن رسول الله ﷺ و كثير من أصحابه

بالطرق القویة والأخبار الصحیحة ، وثبوت تركه أيضاً منهم والأمر سهل“ (حق یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اور آپ کے بہت سے صحابہ کرام سے رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کے قوی طرق اور صحیح حدیثوں سے ثبوت میں اور نیز ان حضرات سے ترک رفع یدین میں کوئی شک نہیں اور معاملہ آسان ہے) (السعیة: ۲۱۳/۲)

جب دونوں امر کا ثبوت ہے تو صرف ایک کو ثابت کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ رہا فقیہ ابو بکر کا یہ کہنا کہ خلفاء راشدین سے بھی رفع یدین ثابت ہے، تو اس کا جواب علامہ ابن الترمذی نے ”الجوہر النقی“ میں دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ فقیہ ابو بکر کی یہ بات بھی صحیح نہیں؛ کیونکہ خلفاء راشدین میں سے کسی سے بھی رفع یدین ثابت نہیں بلکہ حضرت عمر و حضرت علی سے ترک رفع ثابت ہے اور حضرت عثمانؓ کو کسی نے رفع یدین کرنے والوں میں شمار نہیں کیا ہے، اور دوسرے صحابہ سے بھی ترک رفع ثابت ہے، اسی طرح تابعین میں بے شمار حضرات رفع یدین نہیں کرتے تھے، جن میں سے اسود، علقمہ، ابراہیم، خیشمہ، قیس بن ابی حازم، شععی، ابواسحاق وغیرہ ہیں، اور ان اسانیدِ جیدہ سے مصنف ابن ابی شیبہ میں روایت کیا گیا ہے، اور اسی طرح انھوں نے صحیح سند کے ساتھ اصحاب ابن مسعود و اصحاب علیؓ سے بھی رفع یدین نہ کرنا روایت کیا ہے اور یہ لوگ تیرے لئے کافی ہیں۔ (الجوہر النقی علی سنن البیہقی: ۱۱۶/۲)

ابن مسعودؓ پر بھول کا الزام اور جواب

فقیہ ابو بکر نے حضرت ابن مسعودؓ پر جو الزام لگایا ہے اس کی دلیل میں حضرت ابن مسعود کے چند نسیان و بھول کا ذکر کیا ہے، کہ وہ جب ان مواقع پر بھول سکتے ہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رفع یدین کو بھی بھول گئے ہوں۔

اس کا جواب اوپر عرض کیا گیا ہے کہ محض احتمال سے یہ بات ثابت نہیں ہو جاتی، اور اس طرح کا سہو و نسیان تو امام بخاری نے خود ابن عمرؓ کے بارے میں بھی بیان کیا ہے، اور ہم اس کا جواب بھی اوپر دے آئے ہیں، چنانچہ حضرت مجاہد سے جو مروی ہے کہ انھوں نے ابن عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو انھوں نے صرف افتتاح کے وقت رفع یدین کیا، اس کے بارے میں امام بخاری کہتے ہیں کہ: ہو سکتا ہے کہ ابن عمر رفع یدین کو بھول گئے ہوں۔ تو کیا اس کی وجہ سے ہمیں بھی یہ اجازت ہے کہ ہم کہیں کہ حضرت ابن عمر سے نسیان ہو گیا اور انہوں نے رفع یدین کا منسوخ ہونا یاد نہ رکھا، اور پرانا فعل ہی بیان کر دیا؛ کیونکہ جب وہ بھی بھول کے شکار ہوئے تو اس کی کوئی دلیل نہیں کہ یہاں بھول نہیں ہوئی ہے۔ اگر یہ بات نہیں اور ہرگز نہیں تو حضرت ابن مسعودؓ کے بارے میں کیا دلیل ہے کہ وہ چند موقعوں پر بھول گئے تو یہاں بھی بھول گئے؟

پہلے نسیان کا جواب

اب ہم فقیہ ابو بکر کے عائد کردہ الزامات میں سے ایک ایک ذکر کر کے ان کا جواب دینا چاہتے ہیں جس سے ان شاء اللہ حقیقت حال کھل جائے گی۔
مؤلف ”حدیث نماز“ نے نقل کیا ہے کہ: فقیہ موصوف نے بیان کیا کہ:
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ معوذتین (سورہ فلق اور سورہ ناس) کا قرآن میں سے ہونا بھول گئے۔ (حدیث نماز: ۱۵۰)

راقم کہتا ہے کہ: اس میں فقیہ موصوف نے اس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کو قرآن میں سے ہونے کا انکار کرتے تھے۔ (ابن کثیر: ۵۷۲، فتح القدر للشوکانی: ۵/۵۱۸، فتح الباری: ۸/۷۴۳)

مگر یہاں ابن مسعود نہیں بھولے، بلکہ دراصل خود ابو بکر ابن اسحاق سے بھول اور خطاً فاحش ہوئی ہے؛ کیونکہ علماء میں سے کسی نے اس کو نسیان پر حمل نہیں کیا، لہذا اس سے ان کے نسیان پر استدلال حیرت انگیز بات ہے؛ کیونکہ علماء نے یا تو ان روایات کو غیر صحیح کہا یا اس میں کوئی تاویل کی ہے، چنانچہ اس روایت کو بعض محدثین نے موضوع قرار دیا ہے، علامہ ابن حزم ظاہری نے ”المحلی“ میں فرمایا کہ: ”وکل ما روي عن ابن مسعود من أن المعوذتين و أم القرآن لم يكن في مصحفه فكذب موضوع لا يصح“ (ابن مسعود سے جو روایت کیا گیا ہے کہ ان کے مصحف میں معوذتین اور سورہ فاتحہ نہیں تھے وہ من گھڑت جھوٹ ہے جو صحیح نہیں ہے) (المحلی: ۱۳۱)

اسی طرح علامہ نووی نے ”المجموع“ میں فرمایا کہ: ”وما نقل عن ابن مسعود في الفاتحة والمعوذتين باطل ليس بصحيح“ (حضرت ابن مسعود سے جو فاتحہ اور معوذتین کے بارے میں نقل کیا گیا ہے وہ باطل ہے صحیح نہیں ہے) (المجموع: ۳/۳۵۰)

اور جن حضرات نے اس روایت کو صحیح مانا ہے انھوں نے اس میں تاویل کی ہے، چنانچہ بعض نے یہ کہا ہے: حضرت ابن مسعود کے نزدیک یہ سورتیں درجہ تواتر کو نہیں پہنچی تھیں، اس لئے آپ نے ان کو قرآن میں نہیں شمار کیا، جیسا کہ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں فرمایا ہے۔ (تفسیر روح المعانی: ۳۲۲۱۵)

اور بعض نے یہ تاویل کی ہے کہ حضرت ابن مسعود کی مراد ان سورتوں کی قرآنیت کی نفی کرنا نہیں تھا، بلکہ ان سورتوں کو مصحف میں داخل کرنے پر تکبیر کرنا مقصود تھا کہ اس کو مصحف میں نہ لکھا جائے، جیسا کہ حافظ ابن حجر نے قاضی ابو بکر باقلانی سے

یہ تاویل نقل کی ہے اور اس کو تاویل حسن قرار دیا ہے۔ (فتح الباری: ۷۴۳/۸)
 اور علامہ آلوسیؒ نے اس تاویل کو بعید بلکہ غیر صحیح جو کہا یہ اس لئے کہ لفظ ”
 لیستنا من کتاب اللہ“ کے ظاہر کے خلاف ہے، یہی اشکال حافظ ابن حجر کو پیش آیا،
 مگر انہوں نے اس روایت میں ”کتاب اللہ“ کے الفاظ کو بمعنی مصحف لے کر تاویل
 مذکورہ کو صحیح اور حسن قرار دیا ہے۔

الغرض تمام علماء اس روایت میں تاویل کرنے پر مجبور ہیں، مگر فقیہ ابو بکر نے
 اس کو نسیان پر محمول کر دیا جس کی کسی نے جرأت نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابو بکر
 بن اسحاق کا اس کو نسیان پر محمول کرنا ایک دعوے بے دلیل ہے۔

دوسرا نسیان اور جواب

فقیہ موصوف نے حضرت ابن مسعود کا دوسرا نسیان یہ بیان کیا کہ: وہ نماز
 میں تطبیق کا منسوخ ہونا بھول گئے جس پر سارے مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ (تطبیق
 کے معنی رکوع میں گھٹنوں کے درمیان ہاتھوں کو رکھنے کے ہیں، یہ پہلے رکوع کا طریقہ
 تھا، بعد میں منسوخ ہو گیا)

مگر اس کو بھی نسیان پر محمول کرنا درست نہیں؛ کیونکہ فعل تطبیق شروع دور
 اسلام میں مشروع تھا پھر منسوخ ہوا، تو ممکن ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کو اس کے
 منسوخ ہونے کی بات نہ پہنچی ہو؛ کیونکہ نبی کریم ﷺ سب کے سامنے ہر بات نہیں
 بیان کیا کرتے تھے، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت ابن مسعود تطبیق و ترک تطبیق میں
 اختیار کے قائل ہوں کہ جو چاہے کر لے جیسا کہ حضرت علیؓ سے مصنف ابن ابی شیبہ
 میں مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ: جب تم میں کوئی رکوع کرے تو اگر چاہے اپنے
 ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ لے یا اگر چاہے تطبیق کر لے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۲۱/۱، حافظ

ابن حجر نے کہا کہ اس کی اسناد حسن ہے، کذا فی امانی الاحبار: ۳/۲۰۴) تو یہ کیوں ممکن نہیں ہے کہ آپ بھی ایسا ہی خیال فرماتے ہوں اور اختیار کے قائل ہوں؟

اور یہ دونوں باتوں کا جائز رکھنا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے کسی فعل کو ترک کرنے سے اور دوسرے فعل کو اختیار کرنے سے حضرت ابن مسعودؓ نسخ کے قائل نہ ہو جاتے تھے، جب تک کہ ان کے نزدیک رسول اللہ کی جانب سے کوئی امر زائد جو دال علی النسخ یا دال علی المرجوحیت نہ آجاتا اور نہ ظاہر ہو جاتا تو اس سے ہماری تائید ہوتی ہے کہ جب ابن مسعود نے رفع یدین میں صاف و صریح طریقہ پر اور عزم و جزم کے ساتھ رفع یدین کا انکار کر دیا اور بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ صرف تکبیر اولیٰ میں رفع یدین کرتے تھے، پھر اس کو دوبارہ نہیں کرتے تھے تو ضرور آپ کے پاس کوئی دلیل ہوگی اور آپ نے نبی کریم ﷺ کی نمازوں کا خوب مشاہدہ و معائنہ کیا ہوگا اور جانچ کر یہ حکم لگایا ہوگا، اس سے خود نسیان کی نفی ہوتی ہے، مگر افسوس کہ مذہبی تعصب سے اس کو نسیان پر حمل کر کے صحابہ کی ذوات قدسیہ پر حملہ کیا جاتا ہے۔

تیسرا نسیان اور جواب

فقہ موصوف نے حضرت ابن مسعود کا تیسرا نسیان بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ: عبد اللہ بن مسعود اس بات کو بھول گئے کہ دو شخص امام کے ساتھ نماز پڑھیں تو کیا کیفیت ہونی چاہئے، آیا امام کے بازو کھڑے ہوں یا پیچھے کھڑے ہوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بھی حضرت ابن مسعود کے بھول جانے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ محض احتمال ہے، اور احتمال سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی، اور حقیقت

یہ ہے کہ یہ ان کی بھول نہیں بلکہ امام طحاوی و امام بیہقی نے ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ: میں سمجھتا ہوں کہ ابن مسعود نے ایسا اس لئے کیا ہوگا کہ مسجد میں کوئی تنگی تھی یا کوئی اور عذر تھا، یہ نہیں کہ اس کو وہ سنت سمجھتے تھے۔ (معانی الآثار: ۲۱۵/۱، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۳/۱۴۰)

چوتھا نسیان اور جواب

فقہ ابو بکر نے حضرت ابن مسعود کا چوتھا نسیان یہ بیان کیا ہے کہ وہ اس کو بھول گئے جو بلا اختلاف علماء ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوم النحر میں فجر کی نماز وقت پر پڑھی۔ (حدیث نماز: ۱۵۱)

اس کا جواب یہ کہ حدیث میں ابن مسعود نے جو فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے یوم النحر میں صبح کی نماز وقت میں نہیں پڑھی، اس کا مطلب وہ نہیں جو فقہ موصوف نے سمجھا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ روزانہ جو وقت پڑھنے کا تھا اس میں نہیں پڑھا، روزانہ اسفار (ذرا اجالا) میں پڑھتے تھے، اور اُس دن غلَس (اندھیری) میں نماز پڑھی جس سے بعض نے یہ سمجھا کہ ابھی طلوع فجر نہیں ہوا۔ اس کی دلیل طحاوی کی روایت ہے جس میں ہے کہ حضرت ابن مسعود نے حج کیا، جب مزدلفہ کی رات ہوئی اور فجر طلوع ہوئی تو حضرت ابن مسعود نے عبدالرحمن بن یزید سے فرمایا کہ: اقامت کہو، حضرت عبدالرحمن بن یزید نے عرض کیا کہ: میں نے تو کبھی آپ کو اس وقت نماز پڑھتے نہیں دیکھا؟ فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ اس نماز (فجر) کو اس جگہ اس دن میں اسی وقت پڑھتے تھے۔ (طحاوی: ۱/۱۸۸)

اس میں صاف ہے کہ طلوع فجر کے بعد یہ بات چیت ہوئی تھی اور اس روایت میں آگے خود آپ نے اس کی تصریح کی ہے کہ دو نمازیں اپنے وقت سے ہٹ

کر ہوتی تھیں، ایک مغرب کہ لوگوں کے مزدلفہ سے آنے کے بعد ہوتی تھی دوسرے فجر کی نماز کہ فجر طلوع ہونے کے بعد پڑھی جاتی تھی۔

اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: ”وأما إطلاقه على صلاة الصبح أنها تحول عن وقتها فليس معناه أنه أوقع الفجر قبل طلوعها وإنما أراد أنها وقعت قبل الوقت المعتاد فعلها في الحضر“ (ربان ابن مسعود) کا نماز صبح پر یہ اطلاق کرنا کہ وہ اپنے وقت سے ہٹ گئی تو اس کا معنی یہ نہیں کہ آپ نے فجر کی نماز طلوع فجر سے پہلے پڑھ لی ان کی مراد تو یہ ہے کہ نماز صبح اپنے اس معتاد وقت سے پہلے ہوئی جس میں حضر میں نماز ہوتی تھی)۔ (فتح الباری: ۵۲۵/۳)

اور امام قرطبی نے ”المفہم شرح مسلم“ میں لکھا ہے کہ: ”قول ابن مسعود“ أنه ﷺ صلى الفجر يومئذ قبل ميقاتها“ لا يفهم من ذلك أنه يعني بذلك أنه أوقع صلاة الصبح قبل طلوع الفجر، فإن ذلك باطل بالأدلة القاطعة، وإنما يعني بذلك أنه ﷺ أوقع الصبح يومئذ قبل الوقت الذي يوقعها فيه في غير ذلك اليوم“ (حضرت ابن مسعود کے اس قول سے کہ رسول اللہ ﷺ نے وقت سے پہلے نماز پڑھی یہ مفہوم نہیں لیا جائے گا کہ آپ نے طلوع فجر سے پہلے نماز پڑھی؛ کیونکہ یہ بات دلائل قاطعہ کی وجہ سے باطل ہے، بلکہ اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے صبح کی نماز اس دن اس وقت سے پہلے پڑھی جس میں کہ دوسرے دنوں میں نماز پڑھتے تھے) (المفہم: ۸۵/۳)

اسی طرح علامہ نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ: ”فقوله: “قبل ميقاتها“: المراد قبل وقتها المعتاد، لا قبل طلوع الفجر؛ لأن ذلك ليس

بجائز باجماع المسلمین فتعین تأویلہ علی ما ذکرته“ (آپ کا قول کہ وقت سے پہلے نماز پڑھی اس سے مراد معتاد وقت ہے، یہ نہیں کہ طلوع فجر سے پہلے پڑھی؛ کیونکہ یہ بات باجماع مسلمین جائز نہیں ہے، لہذا یہ تاویل جو میں نے ذکر کی متعین ہے) (شرح مسلم: ۴۱۷/۱)

ان کے علاوہ علامہ ابن الہمام نے فتح القدر میں، عمر بن علی الاندلسی شافعی نے ”تحفۃ المحتاج“ میں حضرت ابن مسعود کے قول کی یہی تاویل بیان کی ہے۔ (فتح القدر: ۲۲۶/۱، تحفۃ المحتاج: ۱۷۹/۲)

اس سے معلوم ہوا کہ فقیہ ابو بکر کا یہ الزام بھی محض بے ثبوت اور بے دلیل دعویٰ ہے کہ حضرت ابن مسعود کو یہاں بھول ہو گئی۔

پانچواں نسیان اور جواب

فقیہ موصوف نے حضرت ابن مسعود کا پانچواں نسیان یہ لکھا ہے کہ: ابن مسعود اس کو بھول گئے کہ نبی کریم ﷺ نے عرفات میں کس طرح جمع فرمایا۔ (حدیث نماز: ۱۵۱)

راقم کہتا ہے کہ: اس اعتراض کا منشا یہ ہے کہ بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت ابن مسعود کی روایت ہے کہ: ”ما رأیت رسول اللہ ﷺ صلی صلاة إلا لمیقانہا إلا صلاتین: صلاة المغرب والعشاء بجمع و صلی الفجر یومئذ قبل میقاتہا“ (میں نے نبی کریم ﷺ کو سوائے دو نمازوں کے بے وقت نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا، ایک مغرب اور عشاء کی نماز مزدلفہ میں (ایک ہی وقت میں دونوں نمازیں پڑھیں) اور اس دن فجر کی نماز اپنے وقت سے پہلے پڑھی۔ (بخاری: ۲۲۸/۱، مسلم: ۴۱۷/۱)

فجر کے بارے میں گذشتہ صفحات میں معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت ابن مسعود کی مراد اس سے یہ ہے کہ روزانہ جس وقت پر پڑھتے تھے اس سے ذرا جلدی یوم النحر میں نماز پڑھی تھی، جس کی دلیل اوپر گزر چکی ہے۔ اب یہاں معترض کو یہ شبہ ہوا ہے کہ ابن مسعودؓ نے مغرب اور عشاء کی نماز کا جمع کرنا تو بیان کیا ہے مگر اس کے ساتھ ظہر اور عصر کا جمع کرنا بیان نہیں کیا، لہذا یہ بھول گئے۔

مگر یہ اعتراض اور یہ الزام بھی صحیح نہیں؛ کیونکہ ممکن ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے بیان کیا ہو اور راوی نے اختصار کرتے ہوئے اس کو حذف کر دیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود حضرت ابن مسعودؓ نے کسی وجہ سے یاد ہوتے ہوئے بھی اس کا ذکر نہ کیا ہو؛ کیونکہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ تمام باتیں بیک وقت بیان کر دی جائیں، پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں ”صلوتین“ سے حضرت ابن مسعودؓ کی مراد عرفہ کی صلوٰۃ عصر اور مزدلفہ کی صلوٰۃ مغرب ہو؛ کیونکہ یہی دو نمازیں اپنے وقت پر نہیں ادا کی گئی تھیں، اور جو آگے فجر کا ذکر ہے یہ الگ مستقل بات بیان کی ہے، جو صلوٰۃ تین سے متعلق نہیں، اس صورت میں تو اس سے ابن مسعودؓ کا بھولنا نہیں بلکہ اس کو بیان کرنا ثابت ہوا، اور مذکورہ بیان کا صحیح ہونا نسائی کی ایک اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے جو ”کتاب المناسک“ میں ”باب الجمع بین الظهر والعصر بعرفة“ میں ہے، اس میں حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ: ”کان رسول اللہ ﷺ یصلی الصلاة لوقتها إلا بجمع و عرفات“ (رسول اللہ ﷺ نماز کو اپنے وقت میں ادا کرتے تھے سوائے مزدلفہ اور عرفات کے) (نسائی: ۳۶/۲)

کیا اس کے بعد بھی کسی کو گنجائش ہے کہ ابن مسعودؓ کے اس میں نسیان کا دعویٰ کرے؟ معلوم ہوا کہ بھول تو خود فقیر موصوف کو ہوئی ہے۔

چھٹا نسیان اور جواب

فقہ موصوف نے حضرت ابن مسعود کے چھٹے نسیان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ: عبد اللہ بن مسعود سجدے میں زمین پر ہاتھ رکھنا بھول گئے، جو بلا اختلاف علماء ہے۔ (حدیث نماز: ۱۵۱)

میں کہتا ہوں کہ: فقہ موصوف کی مراد اس سے وہ روایت ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے اپنے ”مصنف“ میں اور امام شافعی نے ”کتاب الام“ میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ: ”ھیئت عظام ابن آدم للسجود فاسجدوا حتی بالمرافق“ (نبی آدم کی ہڈیاں سجدہ کے لئے بنائی گئی ہیں، پس تم سجدہ کرو حتیٰ کہ اپنی کہنیوں سے بھی۔) (مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۳۲/۱، کتاب الام للشافعی: ۱۸۶/۱، الجوهرائی: ۱۱۷/۲)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سجدے میں کہنیاں بھی رکھنا چاہئے حالانکہ صحابہ و تابعین و ائمہ میں سے کسی کے نزدیک سجدہ میں کہنیاں رکھی نہیں جاتیں، اس سے فقہ موصوف نے یہ سمجھا کہ حضرت ابن مسعود کو اس میں بھی بھول لگ گئی، مگر ابو بکر بن اسحاق کا اس سے نسیان پر استدلال درست نہیں؛ کیونکہ اولاً حضرت ابن مسعود سے اس کے خلاف بھی مروی ہے، چنانچہ امام طبرانی نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود کو ایک شخص نے دیکھا کہ انہوں نے سجدہ کیا تو دونوں کہنیاں الگ الگ تھیں، حتیٰ کہ ان کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ (مجمع الزوائد: ۱۲۵/۲، پیشی نے کہا کہ: اس میں ایک شخص مجھول ہے)

نیز طبرانی نے ہی روایت کیا کہ: ابن مسعود نے فرمایا کہ: جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو ٹیک لگا کر سجدہ نہ کرے، الخ۔ علامہ پیشی نے کہا کہ: اس کے

رجال صحیح کے رجال ہیں۔ (مجمع الزوائد: ۲/۱۲۷)

نیز آپ سے مروی ہے کہ ہمیں سات اعضاء پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے الخ۔ اس روایت کی سند میں اسمعیل بن عمرو الجبلی ہیں، جن کی ابو حاتم اور دارقطنی نے تضعیف کی ہے، اور ابن حبان نے کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے، اور ایک روایت میں وہ کہتے ہیں کہ میں سات اعضاء پر سجدہ کیا کرتا ہوں، اس میں ایک راوی نوح بن مریم متروک ہے۔ (مجمع الزوائد: ۲/۱۲۴)

ان تمام روایات کا مجموعہ بتا رہا ہے کہ حضرت ابن مسعود کا عمل بھی وہی تھا جو سب لوگوں کا ہے کہ کہنیاں سجدہ میں نہیں رکھتے، لہذا اگر وہ روایت جس سے ابو بکر نے استدلال کیا ہے صحیح ہو تو ان کی ان مختلف روایات کے بارے میں کہا جائے گا کہ یہ روایت رخصت پر محمول ہے کہ اگر کوئی کہنیاں سجدہ میں زمین پر رکھ لے تو جائز ہے، اور دوسری روایات سنیت پر محمول ہیں اور وہی آپ کا عمل ہے۔

اور ہم نے جو کہا کہ: یہ رخصت پر محمول ہے تو یہ رخصت بھی بعض احادیث سے ثابت ہے، چنانچہ روایت آئی ہیں کہ صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے سجدہ کی مشقت کا شکوہ کیا جب وہ کشادہ ہو کر سجدہ کرتے تھے، تو آپ نے فرمایا کہ ”استعینوا بالرکب“ (گھٹنوں سے مدد لے لو) یعنی گھٹنوں پر ہاتھ ٹیک لو۔ (ابوداؤد: ۱۳۰/۱، ترمذی: ۶۴۱/۱، طحاوی: ۱۶۶/۱، مسند احمد: ۲/۳۳۹، صحیح ابن حبان: ۲۴۶/۵، مستدرک: ۳۵۲/۱)

اور امام احمد اور حاکم نے اس کی تخریج کے بعد ابن عجلان کا قول اس حدیث کی شرح میں ذکر کیا ہے کہ ”استعینوا بالرکب“ کا مطلب یہ ہے کہ جب سجدہ لمبا ہو تو گھٹنوں پر کہنیاں رکھ لی جائیں۔ تو اگر اس رخصت پر عمل کرنے کے لئے زمین

پر ہاتھ ٹیکنے کو فرمایا ہو تو کیا ممکن نہیں؟ الغرض اس کو نسیان پر محمول کرنا بے دلیل بات ہے۔

ساتواں نسیان اور جواب

فقہ موصوف نے حضرت ابن مسعود کا ساتواں نسیان یہ بیان کیا ہے کہ: حضرت عبداللہ بن مسعود آیت کریمہ: ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى﴾ [اللیل: ۳] کے بارے میں بھول گئے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو کس طرح پڑھا تھا۔ (حدیث نماز: ۱۵۱)

راقم کہتا ہے کہ: فقہ موصوف کی مراد یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود مذکورہ آیت کریمہ کو اس طرح پڑھتے تھے: ﴿وَالذَّكَرَ وَالْأُنثَى﴾ اور جمہور اس کو: ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى﴾ پڑھتے ہیں، اس سے فقہ موصوف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ابن مسعود اس کو پڑھنے کا طریقہ بھول گئے، مگر فقہ موصوف کا یہ قول بھی بالکل غلط ہے؛ کیونکہ اس آیت میں ایک قرأت یہ بھی ہے جو ابن مسعود نے اختیار فرمائی ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ امام بخاری نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے اس کی تصدیق نقل کی ہے، چنانچہ انھوں نے حضرت ابراہیم سے روایت کیا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے تو آپ نے ان کو بلایا اور پوچھا کہ تم میں سے کون عبداللہ بن مسعود کی قرأت پر قرآن پڑھتا ہے؟ ان حضرات نے عرض کیا کہ ہم سب کے سب پڑھتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ تم میں کون سب سے زیادہ حافظ والا ہے؟ تو لوگوں نے حضرت علقمہ کی جانب اشارہ کیا، تو حضرت ابو درداء نے فرمایا کہ تم نے ابن مسعود کو ”واللیل إذا يغشى“ کس طرح پڑھتے سنا ہے؟ حضرت علقمہ کہتے ہیں کہ میں نے اس طرح پڑھا: ﴿وَالذَّكَرَ وَالْأُنثَى﴾ تو اس پر حضرت ابو درداء نے فرمایا کہ: ”أشهد أني سمعتُ النبيَّ

صَلَّىٰ يَقْرَأُ هَكَذَا ، وَهُوَ لَأَيُّ يَرِيدُونِي عَلِيٌّ أَنْ أقرأ: ﴿ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ﴾ وَاللَّهُ لَا أَتَابِعُهُمْ (میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے نبی ﷺ کو اسی طرح پڑھتے ہوئے سنا ہے، اور یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں اس کو ﴿ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ﴾ پڑھوں، لیکن میں اللہ کی قسم ان کی اتباع نہیں کروں گا) (بخاری: ۵۳۱/۱، رقم: ۴۶۶۰، مسلم: ۲۷۴/۱، رقم: ۸۲۴)

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں ایک قرأت اس طرح بھی ہے اور اس میں حضرت ابن مسعودؓ منفرد نہیں ہیں، ان کے ساتھ حضرت ابودرداءؓ بھی ہیں، اور حضرت ابن مسعودؓ کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قرآن چار آدمیوں سے سیکھو: عبداللہ بن مسعودؓ، سالم مولیٰ ابوحذیفہؓ، ابی بن کعبؓ اور معاذ بن جبلؓ۔ (بخاری: ۵۳۱/۱)

اور مسند احمد بن حنبل میں متعدد طرق سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: جس کو یہ بات خوش کرتی ہو کہ وہ قرآن کو ایسا ہی پڑھے جیسا کہ نازل ہوا ہے تو وہ ابن ام عبد (یہ ابن مسعودؓ کی کنیت ہے) کی قرأت پر قرأت کرے۔ (ابن ماجہ: ۱۳۸/۱، صحیح ابن خزیمہ: ۱۸۶/۲، صحیح ابن حبان: ۵۴۲/۱۵، مستدرک: ۲۴۷/۲)

بہر حال یہ بھی ایک قرأت ہے۔ اور اس کو سہو و نسیان کہنا خود ایک بڑا سہو اور صحابہ کی شان میں سوء ادب کے مترادف ہے۔

انتباہ

یہاں میں مؤلف ”حدیث نماز“ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ نے فقیہ ابوبکر کی اندھی تقلید نہیں کر لی ہے؟ اور پھر اس اندھی تقلید کی وجہ سے کیا آپ نے ایک صحابی پر الزام تراشی کا ارتکاب نہیں کیا ہے اور کیا آپ نے حضرت ابن مسعود پر

اس الزام کی وجہ سے بخاری کی اس حدیث کو جھٹلایا نہیں ہے جس میں ابو درداء کہتے ہیں کہ: میں نے نبی ﷺ سے اسی طرح پڑھتے سنا ہے؟ اب فرمائیے کہ آپ تو فقیہ ابو بکر کی تقلید میں کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود کا یہ نسیان اور بھول ہے، تو کیا اللہ کے نبی ﷺ بھی بھول گئے تھے؟ اور کیا حضرت ابو درداء نے غلط بیانی کی تھی؟ میں مؤلف ”حدیث نماز“ سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں۔

یہاں تک الحمد للہ حضرت عبداللہ بن مسعود پر لگائے گئے سہو و نسیان کے بے بنیاد الزامات کے مفصل جوابات ہم نے دے دئے اور یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت ابن مسعود سے اس سلسلہ میں کوئی سہو نہیں ہوا ہے۔ اور جب فقیہ ابو بکر کے پیش کردہ ان مسائل و امور میں آپ سے سہو و نسیان نہیں ہوا تو پھر اس سے یہ بھی آشکارا ہو گیا کہ فقیہ موصوف کا یہ کہنا بھی باطل و بے بنیاد ہے کہ آپ سے رفع یدین میں بھول ہو گئی۔ پس رفع یدین نہ کرنے کے بارے میں حضرت ابن مسعود کی روایت صحیح ہے اور ہر طرح محفوظ ہے۔

مؤلف کا امام محمد پر الزام

مؤلف ”حدیث نماز“ نے اپنی عادت کے مطابق یہاں ایک گل یہ کھلایا ہے کہ امام محمد کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا کہ: اسی طرح امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد امام محمد نے بھی ایسے ہی تین مسائل میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی بھول ثابت کی اور کہا ہے کہ ہم ان کی یہ تین باتیں نہیں لیتے۔ (حدیث نماز: ۱۵۱)

میں کہتا ہوں کہ: یہ امام محمد پر مؤلف ”حدیث نماز“ کا الزام محض اور جھوٹ ہے، امام محمد نے کہیں بھی ابن مسعود کا سہو و نسیان ثابت نہیں کیا ہے، اگر مؤلف کو کچھ بھی اللہ کا ڈر اور خوف ہے تو وہ ان کی کتاب الآثار سے اس کو دکھادیں۔ میں کہتا ہوں

کہ ان شاء اللہ العزیز قیامت تک وہ نہیں دکھا سکتے۔

بات یہ ہے کہ کتاب الآثار میں امام محمد نے اولاً حضرت ابن مسعود کے بیان کردہ تین مسائل اپنی سند کے ساتھ بیان کئے ہیں، ایک یہ کہ دو مقتدی ہوں تو ایک کا امام کے داہنے جانب اور دوسرے کا بائیں جانب کھڑا ہونا، دوسرا یہ کہ رکوع میں تطبیق کرنا اور تیسرا یہ کہ گھر میں نماز پڑھنے کی صورت میں اذان و اقامت کے بغیر نماز پڑھنا۔ امام محمد ان کو ذکر کر کے یہ فرماتے ہیں کہ: ”قال محمد: ولسنا نأخذ بقول ابن مسعود رضي الله عنه في الثالثة“ (محمد کہتا ہے کہ ہم ابن مسعود کا قول ان تین مسئلوں میں نہیں لیتے) (کتاب الآثار: ۱۹)

ہر کوئی اس عبارت پر نظر ڈالنے کے بعد فیصلہ کر سکتا ہے کہ امام محمد نے حضرت ابن مسعود پر بھول کا الزام لگایا ہے یا ان کے بیان کردہ مسئلوں سے اختلاف کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک علمی اختلاف ہے اور امام محمد کے پاس اس اختلاف کے دلائل ہیں، چنانچہ اس کے بعد یہیں پر امام محمد نے حضرت عمر کی حدیث سے اس کے خلاف دلیل دی ہے۔ اب بتائیے کہ مؤلف ”حدیث نماز“ نے جو حوالہ امام محمد کا دیا ہے یہ کیا امام محمد پر الزام اور لوگوں کے حق میں صریح دھوکہ نہیں؟

ترک رفع یدین کی دوسری دلیل

اس کے بعد ہم ترک رفع یدین کے دلائل کی طرف آتے ہیں، رفع یدین نہ کرنے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ: ”خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: مَا لِي أَرَاكُمْ رَافِعِي أَيْدِيكُمْ كَأَنَّهَا أذْنَابُ خَيْلٍ شَمْسٍ ، أَسْكُنُوا فِي الصَّلَاةِ“

(رسول اللہ ﷺ ہم پر نکل آئے اور فرمایا کہ: مجھے کیا ہوا کہ میں تم کو رفع یدین

کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، گویا کہ وہ حرکت کرنے والے گھوڑوں کی دہلیز میں، نماز میں سکون اختیار کرو) (مسلم: ۱۸۱/۱، ابوداؤد: ۱۴۳۱/۱، احمد: ۱۰۱/۵، صحیح ابن حبان: ۱۹۷/۵، مسند ابوداؤد طیالسی: ۱۰۶/۱، معجم کبیر طبرانی: ۲۰۲/۲، مسند ابویعلیٰ: ۳۸۷/۱۳، مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۳۱/۲، سنن بیہقی: ۳۹۸/۲، معانی الآثار: ۲۹۸/۱)

اس حدیث کی بعض روایات میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا کہ صحابہ نماز پڑھ رہے تھے اور انہوں نے اس میں رفع یدین کیا تھا، اس پر اللہ کے نبی ﷺ نے ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ: یہ بدکنے والے گھوڑوں کی دہلیز کی طرح کیا ہاتھ اٹھاتے ہو؟ اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے رفع یدین کو پسند نہیں کیا، یہی علماء احناف کا مسلک ہے۔

اس پر امام بخاری نے اعتراض کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ تکبیر رکوع کے وقت کے رفع یدین کے بارے میں نہیں ہے بلکہ سلام کے وقت ہاتھ اٹھانے پر تکبیر ہے؛ کیونکہ امام مسلم وغیرہ نے انہی حضرت جابر بن سمرہ سے روایت کیا ہے کہ ہم جب اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو ہم سلام کے وقت ہاتھوں سے دونوں طرف اشارہ کرتے تھے، اس پر آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ: ”تَوَمُّونَ أَيَدِيكُمْ كَأَنَّهَا أَذْنَابُ حَيْلٍ شَمْسٍ“ (تم اپنے ہاتھوں سے اس طرح اشارہ کر رہے ہو کہ وہ گویا بدکنے والے گھوڑوں کی دہلیز میں ہیں) (مسلم: ۱۸۱/۱، رقم: ۴۳۱، ابوداؤد: ۱۴۳۱/۱، حدیث: ۹۹۸، نسائی: ۱۳۳۱/۱، حدیث: ۱۳۲۶ وغیرہ)

امام بخاری نے فرمایا کہ: اس حدیث سے سلام کے وقت اشارہ کو منع کیا گیا ہے، نہ کہ رفع یدین کو، مگر حضرت الامام کی یہ بات صحیح نہیں؛ کیونکہ حضرت جابر بن سمرہ سے دونوں طرح کی حدیث آئی ہے، ایک میں سلام کے وقت ہاتھ اٹھانے پر

نکیر ہے تو دوسری میں اس رفع یدین پر نکیر وارد ہوئی ہے، لہذا ایک کو دوسری پر محمول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور مذکورہ جملوں سے معروف ”رفع یدین“ مراد ہونے کا قرینہ یہ ہے کہ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ”اسکنوا فی الصلاة“ (نماز میں سکون اختیار کرو) فرمایا ہے، اور ”نماز میں سکون“ والی بات اسی وقت ہوگی جبکہ نماز کے اندر ہونے والے کام سے متعلق یہ بات کہی جائے، اور ظاہر ہے کہ نماز کے اندر تو رکوع یا سجدے کا رفع یدین ہوتا ہے، اور سلام کے وقت ہاتھ اٹھانا تو نماز کے آخر میں ہوتا ہے، اس کو ”نماز میں“ نہیں کہہ سکتے۔ (دیکھو نصب الراية: ۳۹۳/۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے رفع یدین پر نکیر کی ہے اور یہ مسلم وغیرہ کی صحیح حدیث میں آیا ہے، لہذا ہم بھی اسی کے قائل ہیں۔

ترک رفع یدین کی تیسری دلیل

ترک رفع یدین کی تیسری دلیل یہ ہے کہ حضرت براء بن عازب سے مروی ہے کہ:

”كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا كَبَّرَ لِفَتْحِ الصَّلَاةِ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتَّى يَكُونَ إِبْهَامَاهُ قَرِيبًا مِنْ شَحْمَتِي أُذُنِيهِ ثُمَّ لَا يَعُودُ، (نبی کریم ﷺ جب نماز شروع کرنے کے لئے تکبیر کہتے تو رفع یدین کرتے یہاں تک کہ آپ کے انگوٹھے کانوں کی لو کے قریب ہو جاتے، پھر دوبارہ (رفع یدین) نہیں کرتے تھے)

(ابوداؤد: ۱۰۹/۱، مسند ابویعلیٰ: ۳/۲۲۸، طحاوی: ۲۲۴/۱، مسند حمیدی: ۲/۳۱۶)

یہ روایت بھی احناف کی حجت اور دلیل ہے کہ رفع یدین صرف ایک بار تکبیر اولیٰ کے وقت ہے، اس کے بعد نہیں ہے۔ اس روایت پر امام ابوداؤد وغیرہ نے نقد کیا ہے، جس کا حاصل تین باتیں ہیں:

ایک یہ ہے کہ حضرت سفیان بن عیینہ نے فرمایا کہ: اس حدیث میں یزید بن ابی زیاد مکہ میں ”ثم لایعود“ کا اضافہ نہیں بیان کرتے تھے، پھر جب میں کوفہ گیا تو انہوں نے ”ثم لایعود“ کا اضافہ کر دیا، مجھے معلوم نہیں کہ کوفہ والوں نے ان کو اس لفظ کی تلقین کی ہے یا کچھ اور ہوا۔ (سنن ابی داؤد: ۱۰۹/۱، مسند الشافعی: ۱/۱۷۶، سنن بیہقی: ۱۱۱/۲)

اور دوسرا اعتراض امام ابو داؤد نے یہ کیا ہے کہ اس روایت براء میں ”ثم لایعود“ کا اضافہ یزید بن ابی زیاد کے شاگردوں میں سے کوئی روایت نہیں کرتا لہذا شریک اس میں منفرد ہیں۔ تیسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ اس کے راوی ابن ابی لیلیٰ ضعیف ہیں۔

راقم کہتا ہے کہ: یہ سارے نقد محل نظر ہیں، اس لئے علماء نے ان کے جوابات دئے ہیں۔ پہلے نقد کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ ”ثم لایعود“ کی زیادتی صرف یزید نے نہیں کی، بلکہ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ سے اس زیادتی کو روایت کرنے میں حکم بن عتیبہ اور عیسیٰ بن عبدالرحمن نے یزید کی متابعت کی ہے، جیسا کہ ابو داؤد و طحاوی نے روایت کیا ہے۔ (ابو داؤد: ۱۰۹/۱، طحاوی: ۱۶۲)

جب عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ سے اس زیادتی کو یزید، حکم اور عیسیٰ تین شخص روایت کرتے ہیں، تو پھر اس کو تفرد قرار دینا اور تلقین ٹھیرانا کیا صحیح ہو سکتا ہے؟ پھر یزید بن ابی زیاد مسلم اور سنن اربعہ کے راویوں میں سے ہیں، اور بخاری نے ان سے تعلقاً روایت کیا ہے، اور ان کے بارے میں اگرچہ آخری عمر میں حافظہ کے خراب ہو جانے کی وجہ سے کلام کیا گیا ہے مگر یعقوب بن سفیان نے کہا کہ: اس کے باوجود

وہ عدالت و ثقاہت پر ہیں، اگرچہ حکم اور منصور جیسے اعلیٰ درجہ کے ثقہ نہ ہوں، اور ابن شاپہین نے کہا کہ: احمد بن صالح نے کہا کہ: یزید ابن ابی زیاد ثقہ ہیں، اور مجھے ان لوگوں کی بات پسند نہیں جو ان کے بارے میں کلام کرتے ہیں۔ (تہذیب: ۲۸۸/۱۱)

الغرض جب ثقہ راوی زیادتی بیان کرے تو وہ مقبول ہوتی ہے اور اگر ان کے آخری عمر میں تغیر کی وجہ سے اس کو قبول نہ کیا جائے تو بھی اصول یہ ہے کہ اگر ایسے راوی کی متابعت پائی جائے تو وہ زیادتی مقبول ہوتی ہے، لہذا اس اصول پر ان کی یہ زیادتی مقبول ہونا چاہئے۔

نوٹ: ابوداؤد میں یہاں ”عن عیسیٰ عن الحکم“ واقع ہوا ہے، یہ ناسخین کی غلطی ہے، اور صحیح ”عن عیسیٰ وعن الحکم“ ہے یعنی ”عن الحکم“ سے پہلے واؤ ہونا چاہئے، جیسا کہ بیہقی اور ابن ابی شیبہ کے مصنف وغیرہ میں واقع ہے، نیز طحاوی میں بھی واؤ کے ساتھ ہے۔

دوسرے نقد کا جواب یہ ہے کہ شریک اس زیادتی کے بیان کرنے میں منفرد نہیں ہیں؛ کیونکہ یزید بن ابی زیاد سے روایت کرنے والوں میں سے دارقطنی کے پاس اسمعیل بن زکریا اور محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ اور ابن عدی کے پاس کتاب کامل میں ہشیم اور ایک جماعت اور بیہقی کے پاس خلائیات میں اسرائیل بن یونس اور طبرانی کے پاس معجم اوسط میں حمزہ الزیات اس زیادتی کو روایت کرتے ہیں، تو شریک کے ساتھ پانچ سے زائد افراد شریک ہیں، پھر تفرّد کا دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ (فلاذالازہار: ۳۲۷/۱)

اور تیسرے نقد کا جواب یہ ہے کہ امام ابوداؤد نے محمد بن عبدالرحمن کی

حدیث کو جو غیر صحیح قرار دیا ہے، اس کی اولاً تو کوئی وجہ بیان نہیں فرمائی، دوسرے اس کو غیر صحیح کہنا غالباً اس لئے ہے کہ اس کی سند میں محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ راوی متکلم فیہ ہے، مگر یہاں اولاً تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ راوی محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ اس حدیث کے تمام طرق میں نہیں ہے اور خود ابوداؤد میں بھی صرف ایک طریق میں ہے، لہذا اگر اس راوی کے ضعف کی طرف نظر کی جائے تو صرف اس ایک طریق کو ضعیف کہا جاسکتا ہے، لیکن ایک طریق کے ضعف کی وجہ سے تمام طرق ضعیف نہیں ہو جاتے، دوسرے یہ کہ محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کے بارے میں حافظ نے تہذیب میں لکھا کہ: ابو حاتم نے احمد بن یونس سے نقل کیا کہ زائدہ نے محمد بن عبدالرحمن کا تذکرہ کیا اور کہا کہ: ”أفقه أهل الدنيا“، اور عجلی نے کہا: فقیہ، صاحب سنت، اور جائز الحدیث ہیں اور عالم بالقرآن ہیں اور ابو حاتم نے کہا کہ: ان کا محل صدق ہے، سنی الحفظ تھے، قضاء میں مشغول ہوئے تو حفظ خراب ہو گیا، مگر کذب سے متہم نہیں ہوئے، ان پر کثرت خطا کی وجہ سے نکیر کی جاتی ہے، ان کی حدیث لی جاتی ہے، مگر احتجاج نہیں کیا جاتا..... اور آگے فرمایا کہ: یعقوب بن سفیان نے کہا کہ: ثقہ، عدل ہیں، ان کی حدیث میں کچھ کلام ہے، امین الحدیث ہیں۔ (تہذیب التہذیب:

(۲۶۹/۹)

اس سے معلوم ہوا کہ محمد بن عبدالرحمن میں اگرچہ کلام ہوا ہے تاہم بعض نے ان کی تعدیل و توثیق بھی کی ہے اور یہ متروک نہیں ہیں، لہذا ان کی حدیث اگرچہ صحیح یا حسن سے متصف نہ ہو، تاہم تائید و تقویت کے لئے ضرور کام آسکتی ہے، لہذا یہ حدیث ابن مسعودؓ کی معاضد و مؤید بننے کی ضرور صلاحیت رکھتی ہے، اور اگر مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے ان کی حدیث کو حسن کہا جائے تو کچھ بعید نہیں۔

اس تفصیلی بحث سے معلوم ہو گیا کہ اس حدیث پر جو کلام کیا گیا ہے اس میں کوئی جان نہیں ہے، اور تمام اعتراضات کا جواب موجود ہے، لہذا یہ حدیث کم از کم حسن ضرور ہے، اسی لئے علامہ ظفر احمد عثمانی نے لکھا ہے کہ: فالحق أن الحدیث حسن صالح للاحتجاج به“ (حق یہ ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اس سے احتجاج کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے) (اعلاء السنن: ۶۹/۳)

ایک حدیثی اہم فائدہ

یہاں بطور فائدہ یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث براء بن عازبؓ کے متعدد طرق ہیں، حضرت براء بن عازبؓ سے روایت کرنے والے دو حضرات ہیں: ایک عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ جیسا کہ گزرا اور دوسرے عدی بن ثابت، جیسا کہ دارقطنی نے سنن میں روایت کیا ہے۔ اور عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ سے روایت کرنے والے تین شخص ہیں: یزید بن ابی زیاد، حکم بن عتبہ اور عیسیٰ بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ، جیسا کہ ابوداؤد، طحاوی، ابن ابی شیبہ وغیرہ میں ہے، اور یزید سے روایت کرنے والے لٹحاوی کے پاس سفیان، دارقطنی کے پاس اسمعیل ابن زکریا، اور ابوداؤد کے پاس شریک ہیں اور ابن عدی کے پاس ہشیم اور شریک اور ایک جماعت ہے اور بیہقی کے پاس اسرائیل بن یونس ہے اور طبرانی کے پاس حمزہ الزیات (کما مر سابقاً) اور حکم اور عیسیٰ سے روایت کرنے والے محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ ہیں اور ان سے حضرت وکیع اور خالد بن عبداللہ الواسطی روایت کرتے ہیں جیسا کہ طحاوی، ابوداؤد اور ابن ابی شیبہ میں ہے۔ اور عدی بن ثابت سے روایت کرنے والے بھی یزید بن ابی زیاد ہیں۔ یہ تمام روایات ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں، کوئی کسی کے

ساتھ شریک ہے، کوئی کسی کے ساتھ، لہذا یہ روایت صالح اور قابل احتجاج ہے۔ اس کا انکار کرنا محض مکابره اور تعصب ہے۔

اور مؤلف نے جو حضرت اسمعیل صاحب شہیدؒ سے نقل کیا کہ اس روایت کو امام بخاریؒ، ابن المدینیؒ اور امام احمدؒ نے ضعیف اور مردود کہا ہے تو کون انکار کر رہا ہے کہ ان حضرات نے ایسا کہا ہے، سوال تو اس بات کے مطابق واقع اور غیر واقع ہونے میں ہے۔ ہم نے ابھی تفصیل سے بتا دیا ہے کہ اس حدیث کا کیا درجہ ہے؟ مگر تعجب ہے مؤلف ”حدیث نماز“ پر کہ کس طرح جگہ جگہ اندھی تقلید کرتے جا رہے ہیں!

ترک رفع یدین کی چوتھی دلیل

ترک رفع یدین کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ”رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ : إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ رَفَعَ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكَبَيْهِ ، وَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَرْكَع ، وَبَعْدَ مَا يَرْفَعُ رَأْسَهُ مِنْ الرُّكُوعِ فَلَا يَرْفَعُ ، وَلَا بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ“ (میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ نماز شروع کرتے تو رفع یدین کرتے، اور جب رکوع کا ارادہ کرتے اور رکوع کے بعد سر اٹھاتے تو رفع یدین نہ کرتے اور نہ سجدوں کے درمیان میں کرتے) (مسند حمیدی: ۲/۲۷۷، صحیح ابوعوانہ: ۱/۲۲۳)

یہ حدیث امام بخاری کے استاذ امام حمیدی نے جن سے امام بخاری نے خود استفادہ کیا ہے اور اپنی صحیح میں بھی ان سے بہت سی روایات کی تخریج کی ہے، انہوں نے اپنے مسند میں روایت کی ہے، اسی طرح امام ابوعوانہ نے بھی اس کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

اس کی سند اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے، امام حمیدی نے اس کو امام زہری سے اور انھوں نے حضرت سالم بن عبد اللہ سے اور انھوں نے اپنے والد حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت کیا ہے، اور اسی سند سے امام بخاری نے بھی رفع یدین کی حدیث انہی عبد اللہ بن عمر سے روایت کیا ہے۔ اور یہ سند ”زہری عن سالم عن عبد اللہ“ اعلیٰ درجہ کی سند مانی جاتی ہے، حتیٰ کہ بعض محدثین نے اس کو اصح الاسانید قرار دیا ہے، چنانچہ اسحاق بن ابراہیم کی یہی رائے ہے اور امام احمد نے بھی یہی کہا ہے۔ (معرفۃ علوم الحدیث: ۹۹۱، الکفایۃ فی علم الروایۃ: ۱/۳۹۷، توجیہ النظر: ۴۲۱/۱، توضیح الافکار: ۳۱/۱)

اس اعلیٰ درجہ کی سند سے وارد حضرت عبد اللہ بن عمر کی یہ حدیث بتا رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف افتتاح نماز کے موقعہ پر رفع یدین کرتے تھے، رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت اور سجدوں کے اندر رفع یدین نہیں کرتے تھے، یہ بعینہ وہی بات ہے جو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور بعض دیگر صحابہ سے روایت کی گئی ہے، اور خود حضرت عبد اللہ بن عمر کا عمل بھی اسی کے موافق ہے جیسا کہ تفصیلاً اوپر گزرا ہے۔ یہ حدیث صاف و صریح طور پر مسلک احناف کی ترجمانی کرتی ہے۔

اب رہا یہ کہ حضرت عبد اللہ بن عمر سے امام بخاری و مسلم وغیرہ نے اسی سند کے ساتھ اس کے خلاف یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت بھی رفع یدین کرتے تھے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب دونوں قسم کی روایات صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عمر سے ثابت ہیں تو ان میں تطبیق دینا لازم ہے اور علماء حنفیہ نے اس کی تطبیق میں فرمایا ہے کہ: بخاری کی روایت میں حضرت ابن عمر نے رسول اللہ ﷺ کا کسی وقت کا عمل بتایا ہے اور یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ رسول اللہ

ﷺ نے رفع یدین کیا ہے، لہذا اسی کو انھوں نے بیان کیا، مگر آپ ﷺ ہمیشہ رفع یدین کرتے تھے اس کا کوئی ثبوت نہیں، اور نہ حضرت ابن عمر اس کو بیان کرنا چاہتے ہیں اور اس دوسری حدیث میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا بعد کا عمل بیان کیا ہے کہ: آپ صرف افتتاح کے وقت رفع یدین کرتے تھے، اور رکوع و سجدے میں نہیں کرتے تھے۔ اور خود ابن عمر کا عمل بھی اسی کے موافق ہونے سے اس حدیث کو مزید تقویت مل جاتی ہے۔

ترک رفع یدین کی پانچویں دلیل

ترک رفع یدین کی پانچویں دلیل یہ ہے کہ حضرت علقمہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ: ”صَلَّيْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ وَ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ فَلَمْ يَرْفَعُوا أَيْدِيَهُمْ إِلَّا عِنْدَ افْتِتَاحِ الصَّلَاةِ“ (میں نے نبی کریم ﷺ، اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی، انھوں نے سوائے افتتاح نماز کے کسی جگہ رفع یدین نہیں کیا) (سنن دارقطنی: ۲۹۵، سنن کبریٰ بیہقی: ۱۱۳۲) علامہ ظفر احمد عثمانی نے اعلاء السنن میں ابن الترمذی کے حوالے سے اس حدیث کی سند کا جید ہونا نقل کیا ہے۔ (اعلاء السنن: ۵۳۳)

اس حدیث میں ابن مسعود نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تینوں حضرات کا عمل یہی بتایا ہے کہ صرف افتتاح نماز کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔ اس حدیث پر امام دارقطنی نے اعتراض کیا ہے جس کا حاصل دو باتیں ہیں: ایک تو یہ کہ اس کے راوی محمد بن جابر اس کو مرفوعاً بیان کرنے میں متفرد ہیں اور وہ ضعیف ہیں، لہذا ان کے تفرّد کو قبول نہیں کیا جائے گا، اور دوسرا یہ کہ اس حدیث کو حماد

بن ابی سلیمان کے علاوہ دوسروں نے ابراہیم نخعی سے موقوفاً حضرت عبداللہ بن مسعود کے عمل سے روایت کیا ہے نہ کہ مرفوع اور یہی صواب ہے۔ (سنن دارقطنی: ۲۹۵)

مگر امام دارقطنی کا یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کیونکہ محمد بن جابر کے بارے میں علماء حدیث کا اختلاف ہے، بہت سے حضرات نے ان کو اگرچہ ضعیف قرار دیا ہے مگر ان میں زیادہ سے زیادہ جو بات قابل گرفت سمجھی گئی ہے وہ ان کا آخری عمر میں سوء حافظہ کا شکار ہو جانا ہے، لہذا یہ مطلقاً ضعیف نہیں ہے، اسی لئے ان سے بڑے بڑے ائمہ حدیث نے روایت کی ہے، ابن عدی نے ذکر کیا کہ محمد بن جابر کو اسحاق بن ابی اسرائیل نے بہت سے ان شیوخ پر فضیلت دی ہے جو محمد بن جابر سے زیادہ اوثق و افضل تھے، اور کبار محدثین مثل ایوب، ابن عون، ہشام، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری اور شعبہ وغیرہ نے محمد بن جابر سے روایت کی ہے، اگر یہ اس مرتبہ کے نہ ہوتے تو یہ حضرات کبار محدثین ان سے کیوں روایت کرتے، اور فلاس نے کہا کہ یہ صدوق ہیں اور ان کو ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے اور ابوالولید طیالسی نے کہا کہ ہم محمد بن جابر سے روایت نہ کر کے ان پر بڑا ظلم کرتے ہیں، امام ذہبی نے کہا کہ ان میں کوئی خرابی نہیں۔ (تہذیب الکمال: ۲۳۷/۵۶۸-۵۶۸، تہذیب التہذیب: ۷۷۹/۷۷۹-۷۸۰، الجوہر النقی: ۱۱۴/۲)

ان اقوال کے پیش نظر غور کیجئے کہ ان سے روایت کرنے والوں میں امام شعبہ بھی ہیں، اور یہ بات پہلے بھی گزر چکی ہے کہ امام شعبہ صرف اسی سے روایت کرتے تھے جو ثقہ ہو، دوسرے متعدد حضرات نے ان کی ثقاہت و عدالت کی تصریح کی ہے اور تیسرے امام ابوالولید نے کہہ دیا کہ ان سے روایت نہ کرنا ظلم ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن جابر کو مطلقاً ضعیف قرار دینا صحیح نہیں ہے، لہذا کم از کم یہ

حسن الحدیث ہیں۔

رہا یہ اعتراض کہ اس حدیث کو صرف حماد نے مرفوعاً روایت کیا ہے اور دوسرے لوگ ابراہیم نخعی سے عبداللہ بن مسعود کا عمل بیان کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ حماد بن ابی سلیمان ثقہ ہیں اور جب وصل وارسال میں یا وقف و رفع میں تعارض ہوتا ہے تو اکثر محدثین کے نزدیک وصل اور رفع کو صحت کا حکم دیا جاتا ہے، کیونکہ یہ زیادتی ہے اور زیادتی ثقہ مقبول ہے۔ (الجوهرائی: ۱۳۸/۱)

پس یہ روایت ضعیف نہیں بلکہ قابل اعتبار روایت ہے، اور درجہ حسن سے کم نہیں ہے۔ اور یہاں ہمیں صرف تائید و تقویت ہی کے لئے اس روایت کو پیش کرنا مقصود بھی ہے اور تائید و تقویت کے لئے ضعیف بھی کھپ سکتی ہے تو حسن تو بدرجہ اولیٰ کھپ سکتی ہے۔

اس کے بعد یہ بھی سنتے چلئے کہ صاحب ”حدیث نماز“ نے اس روایت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ”تلخیص الحیبر“ کے حوالے سے لکھا کہ حضرت ابو بکرؓ اور عمر فاروقؓ کے متعلق دارقطنی کی روایت بیان کی جاتی ہے، اس کو امام دارقطنی نے مردود کہا اور ابن الجوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ (حدیث نماز: ۱۵۲)

راقم کہتا ہے کہ کیا مؤلف کو یہ خبر نہیں کہ ابن الجوزی کو متشددین میں سے شمار کیا گیا ہے اور انہوں نے بعض صحیح احادیث کو بھی موضوعات میں داخل کیا ہے، اور کتنی روایات ہیں جو ترمذی میں، ابوداؤد میں، ابن ماجہ میں موجود ہیں مگر ابن الجوزی نے ان کو موضوعات میں داخل کیا ہے، تو کیا مؤلف ان سب کتابوں کی احادیث کو ابن الجوزی کی وجہ سے موضوع کہہ دیں گے؟ رہا امام دارقطنی کا اس کو مردود کہنا تو اس کا جواب ہم تفصیل کے ساتھ محدثین کے اصول پردے چکے ہیں جس سے ہر قاری

کتاب کو یہ اندازہ بخوبی ہو جائے گا کہ محقق کون ہے اور مقلد محض کون؟

حضرت عمرؓ کا عمل

اس کے بعد ہم بعض صحابہ کا عمل بھی بطور دلیل پیش کریں گے؛ کیونکہ صحابہ کا قول و عمل بھی حجت ہے، امام طحاوی و امام ابو بکر بن ابی شیبہ نے اپنی اپنی سند سے حضرت اسود سے روایت کیا کہ انھوں نے کہا کہ: ”رأيت عمر بن الخطاب يرفع يديه في أول تكبيرة ثم لا يعود“ (میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ انھوں نے اول تکبیر میں ہاتھ اٹھائے پھر دوبارہ نہیں کیا) (طحاوی: ۱۶۴۱، ابن ابی شیبہ: ۲۱۴۱)

امام طحاوی نے فرمایا کہ یہ روایت صحیح ہے، ابن حجر نے الدرر ایہ میں کہا کہ اس کے راوی ثقہ ہیں اور ابن الترمذی نے الجوهرائی میں ابن ابی شیبہ کی سند کو صحیح علی شرط مسلم کہا ہے۔ اسی طرح علامہ نیموی نے فرمایا کہ یہ اثر صحیح ہے۔ (الدرر ایہ: ۱۵۲۱، الجوهرائی: ۱۰۹۲، آثار السنن: ۱۰۶)

ہاں یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ حاکم نے طاوس کی روایت سے اس کا معارضہ کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ رفع یدین کرتے تھے، مگر بات یہ ہے کہ اس روایت میں دراصل ابن عمرؓ ہے، عمر نہیں اور اس روایت میں عمر کا ذکر سہواً ہوا ہے۔ چنانچہ اس روایت پر ہم اوپر حضرت ابن عمرؓ کے مسلک کی تحقیق کے ضمن میں بحث کر چکے ہیں وہاں ہم نے لکھا تھا کہ امام ابن دقیق العید نے ”الامام“ میں نقل کیا ہے کہ اس روایت میں حضرت عمرؓ کے ذکر کو امام احمدؒ نے ”لیس بشی“ (اس کی کوئی حیثیت نہیں) کہا، اور فرمایا کہ یہ تو ابن عمرؓ کی رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے، اور دارقطنی نے بھی کہا کہ آدم بن ابی ایاس اور عمار بن عبد الجبار کو شعبہ کی روایت میں

وہم ہوا ہے اور انہوں نے اس میں حضرت عمر کا ذکر کر دیا ہے، اور پھر اس میں حکم نے اصحابِ طاوس میں سے ایک شخص کے حوالے سے اس کو بیان کیا ہے اور وہ شخص مجہول ہے، لہذا اس سے حجت قائم نہ ہوگی۔ (نصب الراية: ۴۱۵/۱، الجوهري النقي: ۱۰۸/۲)

حضرت عمر سے ایک اور روایت بھی آئی، جس کو بیہقی نے سعید بن المسیب سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عمر بن الخطاب کو دیکھا کہ انہوں نے نماز کے شروع میں اور رکوع کو جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کیا۔ (نصب الراية: ۴۱۸/۱)

مگر یہ حدیث بھی ضعیف ہے؛ کیونکہ اس میں رشید بن سعد راوی بہت ضعیف قسم کا ہے، اگرچہ کہ بعض نے اس کی تعریف بھی کی ہے لیکن جمہور علماء نے اس کی تضعیف کی ہے، ابن معین نے کہا کہ یہ کچھ نہیں، ابو زرعم نے کہا کہ ضعیف ہے، نسائی نے متروک کہا، ابو حاتم نے کہا کہ منکر الحدیث ہے اس میں غفلت ہے، ثقات سے منکر احادیث روایت کرتا ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۲۴۰/۳، تہذیب الکمال: ۹/۱۹۴)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر سے رفع یدین کی روایت ضعیف ہے، اور جس روایت میں اس کا ذکر ہے اس میں دراصل ابن عمر ہے اور ابن عمر اس کو رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ کا مسلک

رہا حضرت ابو بکرؓ کا عمل تو اوپر گزرا ہے کہ دارقطنی کی روایت حسن سے آپ کا بھی رفع یدین نہ کرنا معلوم ہوتا ہے، اور جو امام بیہقی نے ایک لمبی روایت حضرت عبد اللہ بن الزبیر سے نقل کی ہے جس کے آخر میں ہے کہ عبد اللہ بن الزبیر نے

فرمایا کہ میں نے ابو بکر صدیقؓ کے پیچھے نماز پڑھی، وہ رفع یدین نہیں کرتے تھے جبکہ نماز شروع کرتے اور رکوع کرتے اور رکوع سے اٹھتے۔ (سنن بیہقی: ۱۰۷/۲)

امام بیہقی نے اس کے راویوں کو ثقہ کہا ہے، اور یہ بات صحیح ہے، مگر اس کے باوجود اس روایت میں کلام ہے، علامہ ابن الترمذی نے اور علامہ نیوی نے اس پر کلام کیا ہے۔ (دیکھو الجواہر النقی: ۱۰۷/۲، التعلیق الحسن: ۱۱۰/۱)

میں کہتا ہوں کہ اس پر کلام کئی وجہ سے ہے: اولاً اس کے راوی محمد بن اسماعیل سلمیٰ کو اگرچہ بہت سے حضرات نے ثقہ کہا ہے مگر ابو حاتم کہتے ہیں کہ ”تکلموا فیہ“ کہ علماء نے ان کے بارے میں کلام کیا ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۵۳/۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں علماء کی دورائیں ہیں، لہذا ان کو مطلقاً ثقہ کہنا صحیح نہیں، اس لئے ان کی حدیث صحیح کے بجائے حسن ہوگی۔

دوسرے یہ محمد بن اسماعیل سلمیٰ اپنے شیخ ابوالعمران محمد بن الفضل عارم سے روایت کرتے ہیں اور یہ محمد بن الفضل بھی اگرچہ ثقہ ہیں، مگر آخری عمر میں ان کا حافظہ متغیر ہو گیا تھا اور ابو حاتم نے کہا کہ عارم آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے اور ان کی عقل زائل ہو گئی۔ لہذا جس نے ان سے اختلاط سے قبل سنا ہے اس کا سماع صحیح ہے اور ابن حبان نے کہا کہ آخری عمر میں اختلاط سے دوچار ہوئے اور حتیٰ کہ ان کو یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ کیا بیان کرتے ہیں، پس ان کی حدیث میں منکر روایات واقع ہو گئیں لہذا متاخرین نے جو ان سے روایت کی ہے اس سے بچنا واجب ہے، اور اگر اس کا علم نہ ہو تو ان کی سب روایات کو ترک کر دیا جائے۔ (تہذیب التہذیب: ۳۵۸/۹)

جب یہ نہیں معلوم کہ محمد بن اسماعیل نے ان سے قبل الاختلاط سنا ہے یا بعد

الاختلاط تو اس روایت کا ترک کرنا بھی لازم ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اس کو محمد بن اسماعیل المسلمی سے روایت کرنے والے محمد بن عبداللہ الصفار ہیں، اور انھوں نے اس روایت کو ان سے بیان کرتے ہوئے کہا کہ: ”قال أبو اسماعیل محمد بن اسماعیل“ (ابو اسماعیل محمد بن اسماعیل نے کہا) محمد شین کے نزدیک لفظ ”إن فلاناً قال“ کہنے سے یہ اتصال پر محمول ہوگا یا انقطاع پر اس میں اختلاف ہے، اور اگرچہ کہ جمہور اس میں اتصال ہی کے قائل ہیں، لیکن علامہ ابن الصلاح نے تصریح کی ہے اور ان کے حوالے سے علامہ سیوطی نے بھی اس کو اختیار کرتے ہوئے لکھا کہ اس صورت میں یہ اتصال کا حکم متقدمین کے بعد برقرار نہیں۔ (مقدمہ ابن الصلاح: ۳۶، تدریب الراوی: ۱۱۴/۱)

اور ان کے حوالے سے یہی بات علامہ سخاوی نے بھی اختیار کی ہے وہ کہتے ہیں کہ: ”أن ما تقدم في كون عن و ما أشبهها محمولاً على السماع، والحكم له بالاتصال بالشرطين المذكورين هو في المتقدمين خاصة، وإلا فقد قال ابن الصلاح: لا أرى الحكم يستمر بعدهم فيما وجد المصنفين في تصانيفهم مما ذكره عن مشائخهم قائلين فيه: ذكر فلان قال فلان و نحو ذلك، أي فليس له حكم الاتصال إلا إن كان له من شيخه اجازة“ (اوپر جو گزرا کہ عن اور اس کے جیسے الفاظ دو مذکورہ شرطوں سے سماع اور متصل ہونے کے حکم پر محمول ہیں یہ خاص طور پر متقدمین کے حق میں ہے، ورنہ تو ابن الصلاح تو فرمایا ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ حکم ان حضرات کے بعد بھی مصنفین کی کتابوں میں جاری ہوگا جہاں وہ اپنے مشائخ سے ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فلاں نے ذکر کیا اور فلاں نے کہا، یعنی یہ اتصال کے حکم پر نہیں ہے، الا یہ کہ اس کو

اپنے شیخ سے اجازت ہو) (فتح المغیث: ۱۷۱/۱)

اس اصول کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن عبداللہ الصفا رکا یہ کہنا کہ ابو اسماعیل السلمی نے کہا، یہ روایت کے متصل ہونے پر دلیل نہیں، لہذا یہ روایت منقطع ہونے کے حکم میں ہے، اسی لئے علامہ نیموی نے کہا کہ یہ اثر صحیح نہیں، اسی لئے امام بیہقی نے اس حدیث کے راویوں کی توثیق پر اکتفاء کیا ہے، اور اس حدیث پر صحیح ہونے کا حکم نہیں لگایا۔ (التعلیق الحسن: ۱۱۰/۱)

راقم کہتا ہے کہ ایک اور روایت بھی اسی کے مثل بیہقی نے بیان کی ہے جس میں عبدالرزاق نے کہا کہ اہل مکہ نے نماز ابن جریج سے لی اور ابن جریج نے عطاء سے اور عطاء نے ابن الزبیر سے اور ابن الزبیر نے حضرت ابوبکر سے لی، اور ابوبکر نے رسول اللہ ﷺ سے لیا ہے۔ اور ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ ”رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبریل سے لیا اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے لیا۔ (السنن الکبریٰ: ۱۰۷/۲)

مگر یہ روایت بھی کلام سے خالی نہیں، اور علامہ ظہیر نیموی نے اس پر بحث کر کے فرمایا کہ اس کی سند متصل نہیں ہے۔ (التعلیق الحسن: ۱۱۱/۱)

حق یہ ہے کہ اگر حضرت صدیق اکبرؓ کے عمل کے سلسلہ میں کوئی روایت پیش کی جاسکتی ہے تو دارقطنی کی روایت پیش کی جاسکتی ہے، جس کا حسن ہونا اوپر معلوم ہو چکا، اور اگر اس کا تعارض بیہقی کی دیگر روایات سے مانا جائے تو پھر انصاف یہی ہے کہ فریقین میں سے کوئی بھی اس سلسلہ میں صریح ثبوت نہیں پیش کر سکتے۔

حضرت علیؓ کا عمل

اور حضرت علیؓ سے بھی ترک رفع ثابت ہے، عاصم بن کلیب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ”أن علیاً کان یرفع یدیه فی اول تکبیرة من الصلاة،

ثم لا یرفع بعدُ“ (بلاشبہ حضرت علی اول تکبیر پر ہاتھ اٹھاتے تھے پھر اس کے بعد ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے) (طحاوی: ۲۲۵/۱، بیہقی: ۱۱۴/۲، ابن ابی شیبہ: ۲۱۳/۱)

علامہ ابن الترمذی نے ”الجوہر النقی“ میں کہا کہ اس کے سبب راوی ثقہ ہیں اسی طرح علامہ ابن حجر نے ”الدرایہ“ میں اس کے رجال کو ثقہ کہا ہے، اور امام زیلعی نے ”نصب الراية“ میں کہا کہ یہ اثر صحیح ہے اور علامہ عینی نے ”نخب الافکار“ میں کہا کہ یہ حدیث صحیح علی شرط مسلم ہے، اور علامہ نیوی نے آثار السنن میں فرمایا کہ اس کی سند صحیح ہے۔ (الجوہر النقی: ۱۱۴/۲، الدراریہ: ۱۵۲/۱، نصب الراية: ۴۰۶/۱، نخب الافکار: ۶۱۰/۲، آثار السنن: ۱۰۷/۱)

اس حدیث پر امام دارمی نے یہ نقد کیا ہے کہ حضرت علیؑ کا یہ اثر بطریق واہی روایت کیا جاتا ہے اور عبدالرحمن بن ہرمز الاعرج نے عبید اللہ بن ابی رافع سے، انھوں نے حضرت علیؑ سے روایت کیا کہ حضرت علیؑ نے نبی کریم ﷺ کو رکوع میں جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرتے دیکھا، تو حضرت علیؑ اپنے فعل کو حضور ﷺ کے فعل پر کیسے ترجیح دے سکتے ہیں؟ لیکن بات یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے اثر کی سند میں ابو بکر ہشلی ان لوگوں میں سے ہے، جن کی روایت سے احتجاج نہیں کیا جاسکتا اور ان سے سنیت کا ثبوت نہیں ہوتا جو دوسروں نے بیان نہ کیا ہو۔ (الجوہر النقی: ۱۱۴/۲)

اس نقد کا جواب یہ ہے کہ اوپر مذکور ہوا کہ کئی حضرات محدثین نے اس اثر کی تصحیح کی ہے، رہا امام دارمی کا نقد کہ ابو بکر ہشلی ناقابل احتجاج ہیں یہ بات صحیح نہیں، علامہ ابن الترمذی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ابو بکر ہشلی سے اس کو کئی ثقات نے روایت کیا ہے، جیسے ابن مہدی اور احمد ابن یونس وغیرہ، اور ابو بکر ہشلی سے مسلم، ترمذی، نسائی وغیرہ نے تخریج کی ہے اور امام احمد، اور ابن معین نے

ان کی توثیق کی ہے اور ابو حاتم نے ان کو ”شیخ صالح“ فرمایا، اور ذہبی نے کہا کہ رجل صالح ہیں، ابن حبان نے بلا دلیل ان میں کلام کیا ہے۔ (الجوهرائی: ۱۱۴/۲)

پس یہ طریق کیسے وہی ہو سکتا ہے اور امام دارمی نے جو کہا کہ حضرت علیؑ نے نبی کریم ﷺ کو رفع یدین کرتے دیکھا، تو اس کی مخالفت کیسے کر سکتے ہیں؟ تو اس کے جواب میں ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ حضرت علی رسول اللہ ﷺ کی کس طرح مخالفت کر سکتے ہیں جبکہ انھوں نے خود آپ کو رفع یدین کرتے دیکھا ہے؟ اس کے باوجود جب حضرت علی نے خود رفع یدین نہیں کیا اور یہ بات آپ سے بھی صحیح سند سے ثابت ہوگئی تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کے پاس بھی رفع یدین کی سنیت منسوخ ہے، لہذا آپ نے اس کو نہیں کیا۔ ورنہ اگر حضرت علی کے پاس آپ ﷺ سے ترک رفع یدین ثابت نہ ہوتا تو آپ اس کو کبھی ترک نہ کرتے اور جب صحیح طریق سے حضرت علی کا ترک رفع یدین ثابت ہوا تو اس سے نسخ رفع ثابت ہوا۔ (الجوهرائی: ۱۱۵/۲)

اور امام دارمی نے جو یہ کہا کہ ابو بکر نہشلی کے علاوہ کسی نے اس کو ذکر نہیں کیا، یہ بھی صحیح نہیں؛ کیونکہ امام محمدؒ نے محمد بن ابان سے اور انھوں نے عاصم بن کلیب سے اور انھوں نے کلیب سے اس کو اسی طرح روایت کیا ہے۔ (موطأ محمد: ۹۰/۱)

اور محمد بن ابان کا لائق احتجاج ہونا اور حسن الحدیث ہونا فاتحہ خلف الامام کے تحت ہم بیان کر چکے ہیں، لہذا حضرت علی کی یہ روایت صحیح ہے۔

پس حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت علی بن ابی طالبؓ سے ترک رفع یدین ثابت ہے، اور حضرت عثمانؓ کے بارے میں کوئی تصریح نظر سے نہیں گزری اور نہ ہی کسی نے ان کو رفع یدین میں شمار کیا ہے، اس کے علاوہ حضرت ابن عمرؓ اور ابن مسعودؓ سے ترک رفع اوپر گزر چکا۔

اصحاب علی و ابن مسعود کا عمل

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود کے اصحاب کے بارے میں بھی وارد ہے کہ وہ سب بھی رفع یدین نہیں کرتے تھے، چنانچہ ابواسحاق کہتے ہیں کہ: ”کان أصحاب عبد اللہ و أصحاب علي لا يرفعون أيديهم إلا في افتتاح الصلاة، قال وكيع: ثم لا يعودون“ (حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے اصحاب اپنے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے مگر صرف افتتاح نماز کے وقت، امام و کعب نے اس روایت میں یہ بھی کہا دوبارہ نہیں کرتے تھے) (مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۶۷/۱)

اس روایت کے بارے میں علامہ ابن الترمذی نے کہا کہ ”وہذا سند صحیح جلیل“ اور علامہ نیموی نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے۔ (الجوہر النقی: ۱۱۵/۲) اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی و حضرت عبد اللہ بن مسعود کے شاگرد جو سینکڑوں کی تعداد میں تھے وہ سب رفع یدین نہیں کرتے تھے، اور یہ سب تابعین کہلاتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بھی تابعین سے یہ ثابت ہے کہ وہ رفع یدین نہیں کرتے تھے، چنانچہ عبد الملک بن ابی بکر نے کہا کہ میں نے امام شععی، امام ابراہیم نخعی کو اور امام ابو اسحاق کو دیکھا کہ وہ سب رفع یدین نہیں کرتے تھے مگر صرف نماز کے افتتاح کے وقت۔ (طحاوی: ۱۶۴/۱، ابن ابی شیبہ: ۲۱۴/۱)

عبد الملک ابن ابی بکر نے حضرت عمر کا اثر بیان کرنے کے بعد جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یہ بات بیان کی ہے، ہم نے اسی جگہ بتایا تھا کہ امام طحاوی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے، اور علامہ ابن حجر نے الدرر ایہ میں اس کے راویوں کو ثقہ کہا ہے اور

ابن الترمذی نے الجوهرائی میں ابن ابی شیبہ کی سند کو صحیح علی شرط مسلم کہا ہے۔ اسی طرح علامہ نیوی نے فرمایا کہ یہ اثر صحیح ہے۔ (الدریۃ: ۱۵۲/۱، الجوهرائی: ۱۰۹/۲، آثار السنن: ۱۰۶)

اس اثر صحیح سے معلوم ہوا کہ یہ ائمہ دین و ہدی جو اپنے زمانے کے جلیل القدر فقہاء و محدثین تھے رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

راویان رفع یدین کی تعداد پر کلام

اس بحث کے آخر میں مؤلف ”حدیث نماز“ نے مولانا عبدالعزیز محدث رحیم آبادی کی کتاب ”حسن البیان“ کے حوالے سے علامہ زرقانی کا قول نقل کیا ہے کہ رفع یدین کی حدیث متواتر ہے، امام بخاری نے جزء رفع یدین میں ذکر کیا ہے کہ رفع یدین کی حدیث سترہ صحابہ نے روایت کی ہے، حاکم نے اور ابن مندہ نے ذکر کیا کہ رفع یدین کے روایت کرنے والے لوگوں میں عشرہ مبشرہ ہیں اور ہمارے شیخ ابوالفضل محدث نے ذکر کیا کہ انہوں نے رفع یدین کے راویوں کو ڈھونڈا تو پچاس صحابی اس کے راوی ٹھہرے۔ (حدیث نماز: ۱۵۳)

میں کہتا ہوں کہ مؤلف ”حدیث نماز“ کو معلوم ہونا چاہئے کہ امام بخاری کا یہ بیان جس کو آپ نے نقل کیا ہے، اس میں امام نے بہت مبالغہ سے کام لیا ہے، اس کے بارے میں علامہ انور شاہ کشمیری نے فرمایا کہ پچاس کا عدد بیان کرنے میں اس موقع پر خلط ملط ہوا ہے، پچاس کا عدد صرف تکبیر اولی کے وقت رفع یدین کے بارے میں صحیح ہو سکتا ہے، نہ کہ تین موقعوں پر رفع یدین کے بارے میں، اور ان میں بھی رکوع کے رفع یدین کی جو صحیح احادیث ہیں وہ بحث و تحقیق کے بعد صرف بارہ حدیثیں رہ جاتی ہیں۔ (مخلص از معارف السنن: ۲/۴۶۳)

اور جو یہ دعوے کیا ہے کہ عشرہ مبشرہ سے رفع یدین وارد ہے، اس کے بارے میں امام ابن دقیق العید نے کہا کہ میرے نزدیک یہ ٹھیک نہیں کیونکہ اس سلسلہ میں تمام حضرات عشرہ مبشرہ سے شاید ثابت نہ ہو۔ علامہ عراقی نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ اسی لئے میرے والد نے اس بات کو صیغہ تمریض (روئی) سے بیان کیا ہے (طرح التثریب: ۴۳۶/۲)

اور علامہ ہاشم سندھی نے بھی اپنے رسالہ ”کشف الرین“ میں اس کی تردید کی ہے اور فرمایا کہ اس میں سے کوئی ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے چہ جائے کہ دس حضرات کی حدیث ثابت ہو اور بیہتی کی ایک روایت میں ابن عمرؓ سے آیا ہے مگر اس کی سند صحیح نہیں ہے، جو لوگ اس کی اور اس کے علاوہ دوسرے کی صحت کے مدعی ہوں ان پر اس کا بیان کرنا لازم ہے۔ (معارف السنن: ۴۶۵/۲، قلائد الازہار: ۲۱۶/۱)

معلوم ہوا کہ مؤلف نے جو نقل کیا ہے، یہ سب محض مبالغہ آرائی ہے، حقیقت سے اس کو کوئی تعلق نہیں، مؤلف نے محض رعب جمانے کے لئے بلا تحقیق اندھی تقلید کرتے ہوئے اس کو نقل کر دیا ہے۔

رفع یدین نہ کرنے والے صحابہ و تابعین

اس کے بعد مؤلف حدیث نماز نے پچاس صحابہ کرام کے نام لکھے ہیں، جن سے رفع یدین کی روایات آئی ہیں، مگر مؤلف نے یہ زحمت نہیں کی کہ ان احادیث کا درجہ بھی بیان کرتے اور ان پر محدثانہ بحث کر کے بے لاگ تبصرہ بھی فرماتے، اور اوپر معلوم ہو گیا کہ ان میں سے چند ہی روایات ثابت ہیں اور اتنی تو ترک رفع یدین کی روایات بھی ثابت ہیں، جیسا کہ تفصیل سے عرض کر چکا ہوں، لہذا دونوں کا پلہ تقریباً

برابر ہی ہے، اور یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہئے جس کی جانب حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نے اشارہ دیا ہے کہ ترکِ رفعِ یدینِ عدوی چیز ہے اس کی نقل و روایت زیادہ نہیں ہو کر تھی، اور رہا رفعِ یدین کا متواتر ہونا جیسا کہ امام بخاری کا دعویٰ ہے تو اس سلسلہ میں گزارش یہ ہے کہ اولاً تو اس دعوے میں کلام ہے؛ کیونکہ رفعِ یدین کی حدیثوں پر تواتر کا اطلاق بہت مشکل ہے، بلکہ یہ احادیث اخباراً آحاد کی قبیل سے ہیں اور اگر یہ مراد ہے کہ عملی طور پر رفعِ یدین متواتر ہے تو جس طرح رفعِ یدین متواتر ہے اسی طرح ترکِ رفعِ یدین بھی عملاً متواتر طور پر ثابت ہے۔ (دیکھو معارف السنن: ۲/۳۶۶)

اس کے ثبوت کے لئے کہ صحابہ و تابعین میں بے شمار حضرات رفعِ یدین نہیں کرتے تھے، ہم یہاں چند ثبوت پیش کرتے ہیں، جس سے ان لوگوں کے دعویٰ کا غلط ہونا معلوم ہو جائے گا جو یہ کہتے ہیں کہ کسی صحابی سے ترکِ رفعِ یدین ثابت نہیں۔ متعدد حضرات محدثین نے حضرت میمونؓ کی سے روایت کیا ہے کہ:

”أنه رأى عبد الله بن الزبير وصلى بهم يشير بكفيه حين يقوم وحين يركع وحين يسجد وحين ينهض للقيام فيقوم و يشير بيديه ، فانطلقت إلى ابن عباس فقلت : إني رأيت ابن الزبير يصلي صلاة لم أر أحداً يصليها ، فوصفت له هذه الإشارة ، فقال : إن أحببت أن تنظر إلى صلاة رسول الله ﷺ فاقتد بصلاة عبد الله بن الزبير . (ابوداؤد: ۱۰۵/۱، تم الحدیث: ۷۳۹، مسند احمد: ۲۵۵/۱، معجم کبیر طبرانی: ۱۳۳/۱۱)

یہ روایت اگرچہ کہ ضعیف ہے؛ کیونکہ میمونؓ کی مجہول شخص ہیں، کیونکہ ان سے روایت کرنے والے صرف ابوہمیرہ ہیں، اور محدثین کی اصطلاح میں ایسے راوی کو جس سے صرف ایک ہی روایت کرنے والا ہو، مجہول کہتے ہیں، مگر یہاں ہم اس

روایت سے کسی مسئلہ شرعیہ پر نہیں بلکہ ایک تاریخی واقعہ پر استدلال کرنا چاہتے ہیں اور تاریخی بات کے لئے ایسی روایت چل جاتی ہے، اور وہ بات یہ ہے کہ میمون مکی کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو ایسی نماز یعنی رفع یدین والی نماز پڑھتے نہیں دیکھا، یہ میمون مکی تابعی ہیں، انھوں نے جب کسی کو رفع یدین کرتے نہیں دیکھا تو کیا مطلب ہوا کہ کم از کم انھوں نے جتنے صحابہ و تابعین کو دیکھا ان میں کوئی رفع یدین نہیں کرتا تھا، حتیٰ کہ ابن الزبیر کو رفع یدین کرتا ہوا دیکھا تو ان کو تعجب ہوا۔

اور امام ترمذی حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث روایت کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ: ”وہ يقول غير واحد من اهل العلم من اصحاب النبي ﷺ والتابعين“ (یہی بات اہل علم حضرات میں سے بہت سے صحابہ رسول اور تابعین کہتے ہیں) (سنن الترمذی: ۵۹/۱)

اور محمد بن نصر مروزی نے علامہ ابن عبد البر کے حوالے سے لکھا ہے کہ: ”لا نعلم مصراً من الأمصار تركوا بأجمعهم رفع اليدين عند الخفض والرفع إلا أهل الكوفة“ (ہم سوائے اہل کوفہ کے شہروں میں سے کسی شہر کو نہیں جانتے کہ وہاں کے سب کے سب لوگوں نے جھکتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کو ترک کیا ہو) (التعليق المجد: ۹۱، معارف السنن: ۲/۴۶۰)

اس عبارت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ تمام اسلامی شہروں میں رفع یدین کرنے اور نہ کرنے والے دونوں قسم کے لوگ تھے سوائے کوفہ کے کہ وہاں کے تمام رفع یدین نہیں کرتے تھے، اس عبارت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ہر شہر میں دونوں طرح نماز پڑھنے والے تھے اور کوفہ میں سب کے سب ایک بات پر قائم تھے کہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

کیا یہ ترک رفع یدین پر عملی تو اتر نہیں ہے، اور کوفہ میں اس زمانے میں بڑے بڑے صحابہ و بڑے بڑے تابعین اور ان کا ایک جم غفیر موجود تھا۔

امام عجل نے ”معرفة الثقات“ میں لکھا ہے کہ: ”نَزَلَ بِالْكَوْفَةِ أُلْفٍ وَخَمْسٍ مِائَةً مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ وَنَزَلَ قَرْقِيسِيَا (وَهُوَ ثَغْرَمَنْ ثَعُورِ الْكَوْفَةِ) سِتْمِائَةً مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ“ (کوفہ میں ایک ہزار پانچ سو صحابہ نے قیام کیا تھا اور قرقیسیا نامی کوفہ کی سرحد میں چھ سو صحابہ نے قیام کیا) (معرفة الثقات: ۴۴۸/۲)

اور کوفہ میں قیام پذیر ہونے والے صحابہ میں سے عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عباس، الحسن بن علی، سعد بن ابی وقاص، ولید بن عقبہ، خباب بن ارت، عمار بن یاسر، شداد بن الہاد، ابو الطفیل بن عمرو، حذیفہ بن الیمان، مغیرہ بن شعبہ، وغیرہ حضرات ہیں۔ (الطبقات لابن خیاط: ۱۲۶/۱ و ما بعدہ، والطبقات لابن سعد: ۵۷۶ و ما بعدہ)

امام احمد نے اپنی کتاب ”العلل و معرفة الرجال“ میں ابن سیرین سے روایت کیا کہ انھوں نے کہا کہ: أَدْرَكْتُ بِالْكَوْفَةِ أَرْبَعَةَ آلَافٍ يَطْلُبُونَ الْعِلْمَ“ (میں نے کوفہ میں چار ہزار لوگوں کو طلب علم میں مصروف دیکھا) (العلل و معرفة الرجال: ۴۴۹/۲)

اور امام رامہرمزی و امام سیوطی نے نقل کیا ہے کہ امام محمد بن سیرین نے فرمایا کہ ”قدمت الكوفة وبها أربعة آلاف يطلبون الحديث“ (میں کوفہ گیا تو وہاں چار ہزار افراد علم حدیث کی تحصیل میں مصروف تھے) (المحدث الفاصل: ۱/۴۰۸، طبقات الحفاظ: ۲۷۱، تدریب الراوی: ۲۲۷/۲)

ان حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوفہ میں اس دور میں صحابہ و تابعین کا ایک جم غفیر موجود تھا، اگر کوفہ کے سب لوگ ترک رفع یدین پر متفق تھے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہزاروں صحابہ و ہزاروں تابعین رفع یدین نہیں کرتے تھے، پھر کوفہ کے علاوہ دیگر شہروں اور علاقوں میں بھی رفع یدین نہ کرنے والے موجود تھے جیسا کہ مروزی کی روایت سے معلوم ہوا، اس طرح بے شمار صحابہ و تابعین اور بعد کے دوروں میں علماء و ائمہ ترک رفع یدین کے قائل و فاعل رہے ہیں۔ کیا یہ کافی ثبوت نہیں کہ صحابہ و تابعین و ائمہ میں سے رفع یدین نہ کرنے والے موجود تھے؟

امام بخاریؒ کے ایک دعویٰ پر نظر

یہاں مؤلف ”حدیث نماز“ نے امام بخاری کے ”جزء رفع الیدین“ سے ان کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ کسی صحابی سے بھی ترک رفع یدین ثابت نہیں۔ (حدیث نماز: ۱۵۴)

راقم کہتا ہے کہ امام بخاری کا یہ دعویٰ محض مبالغہ اور بدیہی البطلان ہے؛ کیونکہ جیسا کہ گذشتہ صفحات سے معلوم ہوا، متعدد حضرات صحابہ سے یہ ثابت ہے، اس کے بعد امام بخاری کے اس دعویٰ کی طرف کسی توجہ و دھیان کی ضرورت نہیں اور اس کو مبالغہ آرائی پر محمول کرنا چاہئے۔ اور امام بخاری نے اس دعوے پر جن دلائل سے استدلال کیا ہے وہ یا تو خود کوئی مضبوط نہیں ہیں، یا دعوے پر دلالت نہیں کرتے، مثلاً:

(۱) انھوں نے ایک روایت حضرت حسن بصری سے نقل کی ہے کہ انھوں نے کہا کہ صحابہ کرام کے ہاتھ گویا پٹکھے تھے، کہ وہ جب رکوع کرتے اور رکوع سے اپنے سر اٹھاتے رفع یدین کرتے تھے۔ (جزء رفع الیدین: ۲۱)

مگر یہ روایت ضعیف ہے؛ کیونکہ اس کی سند میں سعید بن ابی عروبہ راوی

اختلاط زدہ ہونے کی وجہ سے ضعیف ہیں، ابو حاتم نے اسی لئے کہا کہ اختلاط سے پہلے یہ ثقہ تھے، اور ازدی نے کہا کہ ان کو بدترین اختلاط ہو گیا تھا، اسی طرح ابن حبان وغیرہ نے بھی کہا ہے کہ ان کو اختلاط ہو گیا تھا اور آخری پانچ سال یا نو سال اسی حالت میں گزرے۔ (تہذیب التہذیب: ۵۷/۴)

مگر یہ علت اس طرح مندرج ہو سکتی ہے کہ ان سے یہ روایت نقل کرنے والے یزید بن زریع ہیں، اور انھوں نے سعید سے قبل الاختلاط سنا ہے، لہذا ان کا سماع صحیح ہے۔ لیکن اس میں ضعف کی ایک اور وجہ ہے، وہ یہ کہ اس کو سعید بن ابی عروبہ نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے اور قتادہ نے حضرت حسن بصری سے، اور اس روایت میں قتادہ نے ”عن“ سے روایت کیا ہے، جبکہ حضرت قتادہ میں تدلیس کی عادت تھی۔ (تہذیب التہذیب: ۳۱۸/۸)

اور تدلیس کرنے والا جب تک سماع و تحدیث کی صراحت نہ کرے اس کی روایت قابل اعتبار نہیں ہوتی، جیسا کہ محدثین کا اصول ہے۔ لہذا یہ روایت ضعیف ہے۔

(۲) امام بخاری نے ایک روایت حمید بن ہلال سے نقل کی کہ انھوں نے کہا کہ صحابہ جب نماز پڑھتے تو ان کے ہاتھ کانوں تک ہوتے گویا کہ وہ پکھے ہیں۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ حضرت حسن اور حمید بن ہلال نے کسی ایک صحابی کا بھی اس سے استثناء نہیں کیا۔ (جزء رفع الیدین: ۲۱)

اس میں صحابہ کا رفع یدین کرنا تو مذکور ہے، مگر محل رفع مذکور نہیں کہ یہ کس وقت کا رفع یدین ہے اور ظاہر یہی ہے کہ اس سے مراد وہ رفع یدین ہے جو سب کے نزدیک سنت ہے یعنی تکبیر اولیٰ کا رفع یدین، لہذا اس سے رکوع کے رفع یدین پر

استدلال خام ہے۔

(۳) امام بخاری نے ایک حدیث حضرت وائل بن حجر سے روایت کی کہ جس میں انھوں نے اپنی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضری کا ذکر کیا ہے اور آپ کی نماز کا جو طریقہ دیکھا اس کا ذکر کیا ہے، پھر اپنی دوسری دفعہ حاضری کا ذکر کرتے ہوئے صحابہ کے بارے میں کہا کہ اس حاضری کے بعد میں ایک زمانے میں تھا کہ صحابہ پر کپڑے موٹے تھے، کپڑوں کے نیچے سے ہی ان کے ہاتھ حرکت کرتے تھے۔ (جزء رفع الیدین: ۲۱)

اس میں بھی حضرت وائل نے کوئی صراحت نہیں کی ہے کہ یہ رفع یدین رکوع کے وقت کا تھا، بلکہ ابوداؤد کی روایت میں انھوں نے اس کے برخلاف یہ صراحت کی ہے کہ ان کی دوسری مرتبہ حاضری کے موقع پر انھوں نے جو دیکھا تھا وہ صحابہ کرام کا تکبیر اولیٰ کے وقت کا رفع یدین تھا، لیجئے ان کے الفاظ ملاحظہ کیجئے۔ وہ کہتے ہیں کہ: ”ثم أتيتهم فرأيتهم يرفعون أيديهم إلى صدورهم في افتتاح الصلاة“ (میں پھر ان کے یہاں آیا تو میں نے ان کو دیکھا کہ وہ حضرات نماز کے شروع میں اپنے ہاتھ اپنے سینوں تک اٹھاتے ہیں) (ابوداؤد: ۱۰۵/۱)

لہذا یہ استدلال بھی ناقص ہے۔ معلوم ہوا کہ امام بخاری نے تمام صحابہ کرام کے رکوع کے وقت رفع یدین کرنے کے سلسلہ میں کسی مضبوط و بے غبار دلیل سے استدلال نہیں کیا ہے۔

رفع یدین کا ثواب

مؤلف حدیث نماز نے ”رفع یدین کا ثواب“ کا عنوان قائم کر کے لکھا کہ:
 ”علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں لکھا ہے کہ ابن عبدالبر سے منقول ہے کہ حضرت ابن عمر سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ رفع یدین نماز کی

زینت ہے، ہر ایک رفع یدین پر دس نیکیاں ملتی ہیں (یعنی) ہر انگلی پر ایک نیکی ہے۔ اس حساب سے دو رکعت میں رفع یدین کرنے پر پچاس نیکیاں اور زیادہ ملیں گی، اور چار رکعت میں پوری ایک سو نیکیاں زائد لکھی جائیں،..... پھر لکھا کہ..... اتنا ثواب بتاؤ کس کو ملا رفع

یدین کرنے والوں کو یا ترک کرنے والوں کو؟“ (حدیث نماز: ۱۵۶)

راقم کہتا ہے کہ اولاً تو اس کی سند کا کوئی اتنا پتا نہیں کہ کیا ہے اور کیسی ہے؟ دوسرے یہ مؤلف کے قصور فہم کا نتیجہ ہے کہ اس کو رکوع کے رفع یدین پر محمول کیا ہے حالانکہ اس کی کوئی دلیل نہیں؛ کیونکہ یہاں ابن عمر کی مراد تکبیر اولیٰ کی رفع یدین بھی ہو سکتی ہے، اور خود علامہ عینی نے اس اثر کو تکبیر اولیٰ کی رفع یدین ہی کے بیان میں ذکر کیا ہے، اسی طرح علامہ زرقانی نے شرح مؤطا میں اس کو تکبیر اولیٰ کے مسئلہ کے تحت ہی ذکر کیا ہے۔ (دیکھو عمدۃ القاری: ۳۷۹/۴، شرح الزرقانی: ۲۲۸/۱)

اور اس کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ وہ خود اس رکوع والے رفع یدین کے قائل و فاعل نہیں تھے، جیسا کہ اوپر تحقیق گزری ہے، تیسرے اگر مؤلف کے نزدیک مطلق رفع یدین پر ثواب ہے تو کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ سجدے کو جاتے اور اس سے اٹھتے وقت بھی رفع یدین کرو کہ ثواب زیادہ ملے اور اس کی حدیث ثابت بھی ہے اور دس صحابہ سے ثابت ہے، نیز ہر دو رکعت کی ابتداء میں بھی رفع یدین کرو کہ یہ بھی بعض روایات میں ہے، مگر جب اس کے قائل و فاعل کو اس لئے ثواب نہیں ملتا کہ اس کی سنت ثابت نہیں تو اگر رکوع کا رفع یدین بھی سنیت نہیں ہے جیسا کہ صحابہ کے ایک جم غفیر کے ترک رفع یدین سے ظاہر ہے تو اس کو کرنے میں کیوں ثواب ہو؟ الغرض اس اثر سے رکوع کا رفع یدین مراد لینا محل کلام ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں ایک اثر حضرت عقبہ بن عامرؓ سے بھی

روایت کیا گیا ہے، چنانچہ امام طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ مشرح بن عاھان سے روایت کیا کہ انھوں نے کہا کہ میں نے حضرت عقبہ بن عامرؓ سے سنا، وہ کہتے تھے کہ ہر ایک اشارہ پر جو آدمی اپنے ہاتھ سے نماز میں کرتا ہے ہر ایک انگلی کے بدلے ایک نیکی یا ایک درجہ لکھا جاتا ہے۔ (معجم کبیر: ۲۹۷/۱۷، مجمع الزوائد: ۲/۱۰۳)

اس کی سند کو اگرچہ زرقاتی نے شرح مؤطا میں اور علامہ پیشی نے مجمع الزوائد میں حسن کہا ہے لیکن یہ بات قابل اشکال ہے؛ کیونکہ اس میں ایک تو ابن لہیعہ راوی ہیں جن کو بہت سے محدثین نے ضعیف کہا ہے، اور خود علامہ پیشی نے کئی جگہ ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔ دوسرے اس کو حضرت عقبہ سے روایت کرنے والے مشرح بن عاھان ہیں جن کی بعض حضرات نے توثیق کی ہے، مگر امام ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ حضرت عقبہ سے منکر روایات بیان کرتے ہیں جن کی متابعت نہیں کی جاتی۔ لہذا صحیح یہ ہے کہ جب وہ تنہا ہوں تو ان کی روایت ترک کر دی جائے۔ اور عقیلی نے موسیٰ بن داؤد سے نقل کیا کہ یہ حجاج بن یوسف کے لشکر کے ساتھ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے حضرت ابن الزبیر کا محاصرہ کیا تھا، اور کعبہ پر منجیق سے تیر چھینکے تھے۔ (تہذیب التہذیب: ۱۴۱/۱۰، ضعفاء العقلی: ۲۲۲/۴)

اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص قابل اعتماد کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر یہ روایت بھی حضرت عقبہ ہی سے ہے جس کا منکر ہونا ابن حبان کے کلام سے ظاہر ہے۔ اور اگر اس سے صرف نظر کی جائے تو بھی اس سے یہ کہیں ثابت نہیں کہ حضرت عقبہ نے رکوع کے رفع یدین کے بارے میں کہا ہے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ تکبیر اولیٰ کے رفع یدین کے بارے میں ہو۔ الغرض مؤلف حدیث نماز کا اس جگہ اس کو پیش کرنا بے تکی بات ہے۔

رفع یدین کا یہ معرکہ الآراء مسئلہ الحمد للہ یہاں اختتام کو پہنچا۔

❁ رکوع و سجدے و قومہ و جلسہ کا حکم اور ان کی دعائیں ❁

قیام و قرأت کے بعد رکوع کیا جاتا ہے اور اس کے بعد قومہ پھر سجدہ، علماء احناف کے یہاں رکوع کے بعد قومہ اور ایک سجدے کے بعد جلسہ واجب ہے، یہی امام ابو یوسف کا قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، اور علامہ عبدالحی لکھنوی نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ و امام محمد کے نزدیک بھی صحیح یہی ہے، ان کی عبارت ملاحظہ کیجئے، وہ لکھتے ہیں کہ:

”واختار المحققون من المتأخرين وجوب القومة والجلسة مع وجوب الطمانينة فيهما أيضاً عند ابي حنيفة و محمد ، وهو الأصح بالنظر الدقيق“ (متأخرین میں سے محقق حضرات نے ابوحنیفہ و محمد کے نزدیک قومہ اور جلسہ اور ان دونوں میں اطمینان کے واجب ہونے کو اختیار کیا ہے، اور یہی قول نظر دقیق میں اصح ہے) (السعایہ شرح شرح الوقایہ: ۱۴۱/۲)

الغرض قومہ و جلسہ اور ان دونوں کے درمیان سکون و اطمینان علماء حنفیہ کے نزدیک بھی واجب ہے اور یہی ان کا اصح قول و مسلک ہے؛ کیونکہ دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے۔

اور پھر ان مواقع پر احادیث میں دعائیں پڑھنے کی تعلیم ہے، اور رکوع و سجدے میں پڑھنے کی متعدد دعائیں و اذکار احادیث میں وارد ہوئی ہیں، اور ہمارے یہاں اختیار ہے کہ جو دعائیں و اذکار احادیث میں وارد ہوئے ہیں ان میں سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے، البتہ ہمارے نزدیک رکوع میں ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ“ پڑھنا اور سجدے میں ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى“ پڑھنا اولیٰ ہے؛ کیونکہ نبی کریم ﷺ

نے اس کا حکم فرمایا ہے اور خود بھی اس پر عمل کیا ہے۔

چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آیت: ”فسبح باسم ربك العظيم“ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اجعلوها فی رکوعکم“ (کہ اس کو اپنے رکوع میں داخل کرلو) اور جب آیت: ”سبح اسم ربك الأعلى“ نازل ہوئی تو فرمایا کہ: ”اجعلوها فی سجودکم“ (کہ اس کو اپنے سجدے میں داخل کرلو) (ابو داؤد: ۱۲۶۱، ابن ماجہ: ۶۳۱، مسند احمد: ۱۵۵/۳، مستدرک: ۳۳۷/۱، طحاوی: ۱۶۹/۱)

امام طحاوی نے اسی کے مثل حضرت علی سے بھی روایت کیا ہے اور امام عینی نے طحاوی کی شرح ”نخب الافکار“ میں طحاوی کی ان روایات کو صحیح قرار دیا ہے۔ (نخب الافکار: ۶۷۹/۲-۶۸۰)

اس سے معلوم ہوا کہ رکوع و سجود میں ان دعاؤں کے پڑھنے کا حکم اللہ کے رسول ﷺ نے دیا تھا، اور اسی کے ساتھ خود آپ کا اپنی نماز میں ان دعاؤں کو پڑھنا بھی ثابت ہے، چنانچہ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک رات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھا تو آپ نے رکوع میں ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ“ پڑھا اور سجدے میں ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى“ پڑھا۔ (طحاوی: ۱۶۹/۱)

یہ حدیث امام طحاوی نے دو طرق سے روایت کی ہے جن میں سے ایک کو امام عینی نے صحیح علی شرط مسلم کہا ہے، نیز اس حدیث کو امام طحاوی کے علاوہ ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی اپنی اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ (نخب الافکار: ۶۸۱/۲، ترمذی: ۶۱۱، ابوداؤد: ۱۲۷/۱، نسائی: ۱۲۷/۱، ابن ماجہ: ۶۳۱، احمد: ۳۸۲/۵)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ رکوع و سجود میں رسول اللہ ﷺ نے ”سُبْحَانَ

رَبِّي الْعَظِيمِ“ اور ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى“ پڑھنے کا حکم بھی دیا ہے اور خود آپ بھی یہی پڑھتے تھے، لہذا علماء حنفیہ نے اسی کو افضل قرار دیا ہے۔

اور رہا قومہ تو احادیث میں اس میں: ”اللَّهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ“ پڑھنے کا ذکر آیا ہے اور یہ بھی متعدد الفاظ کے ساتھ ثابت ہے اور ان میں سے کسی کو بھی اختیار کیا جاسکا ہے۔

پھر جس طرح قومہ میں دعاء ہے اسی طرح جلسہ میں بھی دعاء احادیث میں آئی ہے، مثلاً حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ: ”كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقُولُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ: اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمْنِي وَعَافِنِي وَاهْدِنِي وَارْزُقْنِي“ (رسول اللہ ﷺ دو سجدوں کے درمیان یہ دعاء پڑھتے تھے: (جس کا ترجمہ یہ ہے): اے اللہ! میرے گناہ بخش دے، رحم فرما دے اور عافیت عطاء کر دے اور ہدایت دے اور رزق عطاء فرما دے)۔ (ابوداؤد: ۱۲۳۱، ترمذی، ۶۳۱، ابن ماجہ: ۶۴۱، مسند احمد: ۳۱۵۱، مستدرک: ۳۹۳۱)

مگر احناف ان کو نوافل اور حالت انفراد پر محمول کرتے ہیں، کیونکہ جماعت کی نماز میں حکم ہے کہ نماز میں تخفیف کی جائے اور مقتدیوں کی رعایت کی جائے اس لئے یہ اذکار و دعائیں اس وقت پڑھی جائیں جب آدمی یا تو نوافل پڑھ رہا ہو یا اس وقت جب وہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو، اور اس وقت ان کے التزام میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (شامی: ۵۰۹/۱) (واللہ اعلم)

رکوع و سجدے کی دعاؤں کا درجہ

اب رہا یہ سوال کہ یہ رکوع اور سجدہ کی دعائیں ضروری ہیں کہ ان کے ترک سے نماز نہ ہوتی ہو؟ یا سنت ہیں کہ نماز تو ہو جاتی ہے مگر خلاف سنت ہونے کی وجہ سے

ناقص ہوتی ہے؟ مؤلف حدیث نماز نے اس مسئلہ کو بھی چھیڑا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

”اطمینان سے سجدہ کر کے دعائیں پڑھنا ضروری ہے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ رکوع و سجدہ میں پڑھنا ضروری نہیں وہ بالکل غلط ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حمد و تسبیح اور قرآن پڑھنے کو نماز کہا ہے، اگر ہم رکوع و سجدہ میں دعائیں اور تسبیحات نہ پڑھیں تو وہ نماز کہاں ہے، وہ تو صرف ٹکریں ہیں۔“ (حدیث نماز: ۱۶۱)

مگر مؤلف حدیث نماز نے یہ بیان نہیں کیا کہ ”ضروری“ کے لفظ سے ان کا مقصود کیا ہے، آیا یہ کہ اس کا پڑھنا نماز میں ضروری ہے کیونکہ سنت ہے یا یہ کہ اس کا پڑھنا فرض ہے کہ ترک موجب بطلان ہے؟ اگر ضروری کے معنی ”فرض“ کے ہیں اور یہ مقصود ہے کہ ان دعاؤں کے چھوڑ دینے سے نماز ہی نہیں ہوتی تو یہ مسلک جمہور کے خلاف ہے، کیونکہ جمہور علماء و فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ یہ دعائیں سنت ہیں، لیکن اگر کوئی ان کو چھوڑ دے تو نماز ہو جاتی ہے فاسد نہیں ہوتی، ہاں ناقص ہوتی ہے۔

صاحب عون المعبود لکھتے ہیں کہ: ”وإلی إيجاب ذلك ذهب إسحاق بن راهويه، ومذهب أحمد قريب منه، وقد روي عن الحسن البصري نحو من هذا، فأما عامة الفقهاء مالك وأصحاب الراي والشافعي فإنهم لم يروا تركه مفسداً للصلاة“ (ان دعاؤں کے واجب ہونے کی طرف اسحاق بن راہویہ گئے ہیں اور امام احمد کا مذہب بھی اسی کے قریب ہے اور حضرت حسن بصری سے بھی اسی جیسی بات نقل کی گئی ہے، رہے جمہور فقہاء امام مالک، اصحاب الرائے اور امام شافعی تو وہ ان کے چھوڑنے کو مفسد نماز نہیں سمجھتے) (عون المعبود: ۸۵/۳)

اور اسی طرح علامہ محمد بن اسماعیل الصنعانی نے ”سبل السلام شرح بلوغ

المرام“ میں لکھا کہ ان دعاؤں کے وجوب کی طرف احمد بن حنبل اور محدثین کی ایک جماعت گئی ہے اور جمہور نے کہا کہ مستحب ہے۔ (سبل السلام: ۱۷۸/۱)

بہر حال احناف اور جمہور علماء وائمہ کہتے ہیں کہ ان دعاؤں کا پڑھنا ضروری ہے کیونکہ سنت ہے اور اس کا تارک قابل ملامت ہوگا، مگر ترک سے بطلان صلوة کا حکم نہیں کہا جائے گا۔ لہذا اس جمہور کے مسلک پر مؤلف کا اعتراض بے جا و بے محل ہے، کیونکہ ان حضرات کے نزدیک احادیث میں وارد امر کا صیغہ استجاب پر محمول ہے

سجدہ کا طریقہ

سجدہ کا طریقہ کیا ہے؟ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ سجدے میں سات اعضاء زمین پر رکھے جاتے ہیں، اور احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”أمرت أن أسجد على سبعة أعظم: على الجبهة، واليدين، والر كبتين، وأطراف القدمين“ (مجھے حکم دیا گیا کہ میں سات ہڈیوں پر سجدہ کروں: پیشانی پر، دونوں ہاتھوں پر، دونوں گھٹنوں پر، اور دونوں قدموں کے کناروں پر) (بخاری: ۱۱۲/۱، مسلم: ۱۹۳/۱)

اس لئے سب علماء کے نزدیک سنت طریقہ سجدے کا یہی ہے کہ ان اعضاء پر سجدہ کیا جائے، بلکہ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان سات اعضاء کا سجدے میں زمین پر رکھنا واجب ہے، امام شامی نے اس سلسلہ میں طویل کلام کے بعد مختلف اقوال میں سے اسی قول کو راجح کہا ہے۔ (ردالمحتار: ۴۹۹/۱)

ہاں امام ابوحنیفہ سے ایک قدیم قول یہ منقول ہے کہ اگر کوئی بلا عذر بھی صرف پیشانی کے بجائے ناک زمین پر رکھدے گا تو سجدہ ادا ہو جائے گا، مؤلف حدیث نماز نے امام صاحب کا نام لئے بغیر اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: یہ

سات ہڈیاں جب تک زمین سے نہیں لگتیں سجدہ باطل ہے اور اس حدیث کے پیش نظر ان لوگوں کا قول بھی باطل ہے جو کہتے ہیں کہ صرف ناک کی ڈنڈی زمین پر ٹک جائے تو سجدہ ہو جائے گا، ایسا سجدہ رسول اللہ ﷺ نے نہیں بتایا۔ (حدیث نماز: ۱۶۲) مگر ہم مؤلف کے علم میں اس سلسلہ کی چند باتیں لانا چاہتے ہیں: ایک تو یہ کہ امام صاحب نے جو یہ فرمایا تھا کہ صرف ناک پر سجدہ کرنا جائز ہے تو اس میں آپ کے ساتھ سلف صالحین میں سے ابن سیرین و طاووس بھی ہیں، یہ حضرات بھی یہی کہتے ہیں کہ ناک پر اکتفاء کرنا جائز ہے، اس کا ذکر علامہ عینی نے شرح ہدایہ میں کیا ہے، اور عمدۃ القاری میں ان دو حضرات کے ساتھ امام ابن جریر کا نام بھی ذکر کیا ہے۔ اور امام نووی اور قاضی عیاض مالکی نے اپنی اپنی شرح مسلم میں یہی قول امام مالک کے اصحاب میں سے ابن القاسم کا ذکر کیا ہے۔ (البنایہ شرح ہدایہ: ۲۳۹/۲، عمدۃ القاری: ۱۵۵/۳، شرح مسلم نووی: ۱۹۳/۱، اکمال المعلم: ۴۰/۳)

دوسری بات یہ ہے کہ امام صاحب کے کلام میں یہاں جائز کے معنی یہ ہیں کہ سجدہ ادا ہو جائے گا، یہ نہیں کہ ایسا کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے، بلکہ خود امام صاحب نے اس صورت کو مکروہ قرار دیا ہے جس کی تصریح امام سرحسی کی مبسوط میں موجود ہے، امام سرحسی کہتے ہیں کہ: وإن سجد علی الأنف دون الجبهة جاز عند أبي حنيفة ويكره ولم يجز عند أبي يوسف ومحمد“ (اگر کسی نے پیشانی چھوڑ کر ناک پر سجدہ کیا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہے مگر مکروہ ہے، اور امام ابو یوسف و امام محمد کے نزدیک جائز نہیں ہے) (المبسوط: ۳۴/۱)

اسی طرح متعدد کتب فقہ میں اس کی تصریح کی گئی ہے کہ جائز ہونے کے باوجود یہ بات مکروہ ہے کہ صرف ناک پر اکتفاء کیا جائے۔ (دیکھو الدر المختار مع شامی

۴۹۸/۱، البحر الرائق: ۳۱۸/۱)

تیسرے یہ کہ اس قول سے امام صاحب نے بعد میں رجوع کر لیا تھا، اور اب آپ کا بھی وہی قول ہے جو جمہور علماء کا ہے کہ صرف ناک رکھنے سے سجدہ جائز نہیں ہوگا، علامہ حصکفی نے ”الدر المختار“ میں لکھا ہے کہ پیشانی اور ناک میں سے ایک پر اکتفاء کرنا مکروہ ہے اور امام ابوسف و امام محمد نے بلا عذر ناک پر اکتفاء کرنے سے منع کیا ہے، اور امام ابوحنیفہ کا اسی قول کی جانب رجوع بھی ثابت ہو چکا ہے اور اسی بات پر فتوے بھی ہے، اور امام شامی اسی کی شرح میں لکھتے ہیں کہ: شرح ملتقی میں مصنف ”الدر المختار“ نے لکھا ہے کہ اسی قول کی جانب امام کا رجوع ثابت ہے، جیسا کہ شرنبلالی کی کتاب میں البرہان سے نقل کیا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے جیسا کہ جمع اور اس کی شروحات میں اور الوقایہ اور اس کی شروحات، اور الجوہرہ اور صدر الشریعہ اور عیون، اور نھر وغیرہ کتب میں ہے۔ (شامی: ۴۹۸/۱)

جب امام صاحب نے اس سے رجوع کر لیا تو اس کا حوالہ دینا ایک بے تکی اور فضول بات ہے، کیونکہ اس قول کی حیثیت اب ایسی ہے جیسے کوئی منسوخ بات ہو، اس کا حوالہ اب نہیں دیا جاسکتا۔

اسی کے ساتھ ایک اور بات بھی ہم بتادینا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ امام صاحب نے جو بات کہی اس سے اگرچہ آپ نے اس لئے رجوع کر لیا کہ ناک پر اکتفاء نہ کرنے کے سلسلہ میں دلائل قوی ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ناک پر اکتفاء کی بات آپ نے بے دلیل کہہ دی تھی، بلکہ آپ نے اس کو بھی دلائل ہی کی بنیاد پر کہا تھا، اور آپ کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ امام مسلم نے اسی حدیث میں جو اوپر سات اعضاء پر سجدے کے بارے میں ذکر کی گئی ہے ایک بات یہ بھی نقل و روایت کی

ہے کہ آپ ﷺ نے جب یہ کہا کہ سات اعضاء پر سجدہ کا حکم دیا گیا ہے، ان میں سے ایک ”الجبہة“ ہے، تو یہ کہتے ہوئے: ”أشار بيده على أنفه“ (آپ نے اپنی ناک کی جانب اشارہ کیا) (مسلم: ۱۹۳/۱)

اس میں اللہ کے نبی ﷺ نے ”الجبہة“ کی تفسیر ”ناک“ سے کی ہے جس سے یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ سات اعضاء میں سے ایک عضو جس پر سجدہ کرنا چاہئے ”ناک“ ہے۔ لیجئے امام حدیث و فقہ قاضی عیاض اسی حدیث کے تحت اپنی کتاب ”اکمال المعلم شرح مسلم“ میں لکھتے ہیں کہ: ”وقد يحتج بذلك من يجعلهما كالعضو الواحد وأن أحدهما يجزى عن الآخر كما يجزى وضع بعض الجبهة ولا يلزم استيعابها وهو قول أبي حنيفة في رواية عنه وحكي عن ابن القاسم من أئمتنا“ (اس سے ان لوگوں نے حجت پکڑی ہے جو پیشانی اور ناک دونوں کو ایک عضو قرار دیتے ہیں اور یہ کہ ان میں سے ایک دوسرے کی بجائے کافی ہو جاتا ہے، جیسے پیشانی کا بعض حصہ زمین پر رکھنا کافی ہو جاتا ہے اور پوری پیشانی رکھنا لازم نہیں، یہی ابوحنیفہ کا ایک روایت میں قول ہے اور ہمارے ائمہ یعنی مالکی ائمہ میں سے ابن القاسم سے بھی یہی نقل کیا گیا ہے) (اکمال المعلم: ۳۰۷/۳)

اس سے معلوم ہوا کہ اس مسئلہ کا مدار بھی دلیل پر ہے اور وہ دلیل مسلم کی صحیح حدیث ہے، لہذا مؤلف کا اس کو بیک جنبش قلم باطل کہہ دینا تجاوز و جرأت بے جا ہے

سجدے میں جانے کی کیفیت

قیام و قرأت و رکوع کے بعد سجدہ کیا جاتا ہے، اور سجدے میں جانے کی کیفیت میں دو طرح کی روایات وارد ہوئی ہیں، مؤلف حدیث نماز نے ”حاشیہ“ پر بیان کیا ہے کہ

”تومہ میں سے سجدہ میں جاتے وقت زمین پر پہلے ہاتھ ٹیکے یا گھٹنے؟ اس کے متعلق دونوں طرح کی روایتیں ہیں، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی میں حضرت وائل کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ پہلے گھٹنے ٹیکتے تھے۔ ابوداؤد، نسائی اور دارمی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اونٹ کی طرح پاؤں ٹیکنے سے منع فرمایا اور فرمایا کہ اپنے ہاتھ زمین پر پہلے رکھے۔ حضرت امام بخاریؒ اسی کے قائل ہیں اور زمین پر ہاتھ پہلے ٹیکنے کے لئے ابن عمرؓ کا اثر بھی لائے ہیں۔ عام اہل حدیث بھی پہلے ہاتھ ٹیکتے ہیں۔ بہر حال دونوں طرح جائز ہے۔ (حدیث نماز: ۱۶۴)

راقم کہتا ہے کہ دونوں طریقے ہمارے یہاں بھی جائز ہیں مگر افضل و بہتر یہ ہے کہ پہلے گھٹنے ٹیکے اور پھر ہاتھ زمین پر رکھے، اور یہی مسلک جمہور علماء کا ہے۔ چنانچہ امام ترمذی نے اپنی سنن میں صراحت فرمائی ہے کہ: ”أَكْثَرُ أَهْلِ الْعِلْمِ يَرَوْنَ أَنَّ يَضَعُ الرَّجُلُ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ“ (اکثر علماء اس کے قائل ہیں کہ ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھے) (ترمذی: ۶۱/۱)

اور علامہ عینی نے لکھا ہے کہ امام ثوری، امام نخعی، امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، امام شافعی، اور اصح قول کے مطابق امام احمد اور مسلم بن یسار اسی کے قائل ہیں، یہ سب حضرات کہتے ہیں کہ ہاتھوں کے رکھنے سے پہلے گھٹنے رکھے، اور یہی بات حضرت عمر بن الخطاب سے بھی روایت کی گئی ہے۔ (نخب الافکار: ۶۶/۳)

اور قاضی شوکانی ”نبیل الاوطار“ میں اور علامہ شرف الدین عظیم آبادی ”عون المعبود“ میں لکھتے ہیں کہ: جمہور علماء اسی طرف گئے ہیں اور قاضی ابوالطیب نے

عامۃ الفقہاء سے اسی کو نقل کیا ہے، اور ابن المنذر نے اس کو حضرت عمر، امام نخعی، مسلم بن یسار، سفیان ثوری، امام احمد، اسحاق بن راہویہ، اور اصحاب الرائے سے نقل کیا ہے۔ (نیل الاوطار: ۲۸۲/۲، عون المعبود: ۳/۲۸)

اور ان حضرات کی دلائل یہ ہیں:

(۱) حضرت وائل بن حجرؓ کہتے ہیں کہ: ”رأیت رسول اللہ ﷺ إذا سجد وضع ركبتيه قبل يديه و إذا نهض رفع يديه قبل ركبتيه“ (میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ نے سجدہ کیا تو اپنے گھٹنوں کو اپنے ہاتھوں سے پہلے رکھا اور جب کھڑے ہوئے تو اپنے ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں سے پہلے اٹھایا۔ (ترمذی: ۶۱/۱، طحاوی: بوداود: ۱۲۲/۱، نسائی: ۱۲۳/۱، بیہقی: ۱۴۲/۲)

اس حدیث کو امام عینی نے ”نخب الافکار“ میں صحیح قرار دیا ہے، اور ابن قدامہ نے ”المعنی“ میں اور علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں نقل کیا ہے کہ علامہ خطابی نے کہا کہ یہ حدیث ابو ہریرہ کی حدیث سے صحیح ہے۔ (نخب الافکار: ۶۹/۳، فتح الباری: ۲۹۱/۲، المعنی: ۳۰۳/۱)

اس حدیث کو بعض محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس کی سند میں یزید بن ہارون نامی راوی اس کو اپنے استاذ شریک سے روایت کرنے میں تھا ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ شریک بھی اس کو اپنے استاذ عاصم سے روایت کرنے میں متفرد ہے اور تفرد کی صورت میں وہ قوی نہیں ہے۔ (نیل الاوطار: ۲۸۱/۲، عون المعبود: ۳/۲۸)

مگر اس میں سے پہلے نقد کا جواب خود علامہ شوکانی نے یعمری سے نقل کیا ہے کہ یزید بن ہارون کی جلالت شان و حفظ اس کو صحیح کے درجہ سے نہیں گھٹاتا۔ اس کا

خلاصہ یہ ہے کہ یزید بن ہارون ثقہ و قابل اعتماد راوی ہیں، اور ثقہ کا تفرّد مضر نہیں ہوتا، بلکہ یہ زیادتی ثقہ ہے جس کا قابل قبول ہونا متعدد مواقع پر گزر چکا ہے۔

اور رہا شریک کا تفرّد تو اس کا جواب علامہ ظفر احمد عثمانی نے دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شریک اس میں متفرّد نہیں ہے کیونکہ ابو داؤد کے یہاں ہمام اور شقیق نے شریک کی متابعت کی ہے، اور اگرچہ کہ ہمام کی حدیث منقطع ہے اور شقیق کی روایت مرسل ہے، مگر اس کے باوجود متابعت میں اس طرح کی روایات کا اعتبار ہوتا ہے۔ پھر شریک اگرچہ کہ حفظ و اتقان کے اعلیٰ درجہ کے حامل تو نہیں ہیں، تاہم وہ حسن کے رجال میں سے ہیں، لہذا ان کی زیادتی کو قبول کیا جائے گا۔ (اعلاء السنن: ۲۶/۳)

(۲) حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ: ”رأيت رسول الله ﷺ كبر ، فحاذى بابهاميه أذنيه ، ثم ركع حتى استقر كل مفصل منه وانحط بالتكبير حتى سبقت ركبتاه يده“ (میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے تکبیر کہی، پھر اپنے انگوٹھوں کو کانوں کے برابر کیا، پھر رکوع کیا یہاں تک کہ تمام جوڑ اپنی اپنی جگہ ٹھیر گئے، پھر آپ تکبیر کے ساتھ (سجدے کے لئے) جھکے، یہاں تک کہ آپ کے گھٹنے آپ کے ہاتھ پر سبقت لے گئے) (مستدرک: ۳۴۹/۱، سنن دارقطنی: ۳۴۵/۱، سنن بیہقی: ۱۴۳/۲)

اس حدیث کے بارے میں امام حاکم نے صحیح علی شرط الشيخین کہا ہے اور امام ذہبی نے ”تلخیص“ میں اس کی توثیق کی ہے، حاکم نے کہا کہ: ”هذا إسناد صحيح على شرط الشيخين ، ولا أعرف له علة ، ولم يخرجاه“ (یہ سند صحیح علی شرط الشيخین ہے، اور میں اس میں کوئی علت و خرابی نہیں جانتا، اس کو شیخین نے روایت

نہیں کیا) (مستدرک: ۳۴۹/۱)

لیکن امام ابن القیم نے اس کے راوی علاء بن اسماعیل کو مجہول کہا ہے اور ابو حاتم سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس حدیث کو منکر قرار دیا ہے۔ (لسان المیزان: ۱۸۲/۴)

اس کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ سے طحاوی اور ابن ابی شیبہ نے ضعیف سند کے ساتھ اسی کو روایت کیا ہے کہ رسول اللہ جب سجدہ کرتے تھے تو ہاتھوں سے پہلے گھٹنوں کے رکھنے سے ابتداء کرتے تھے۔ (طحاوی: ۱۸۱/۱)

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن اوپر کی حضرت وائل کی حدیث کی شاہد ہے، نیز متعدد صحابہ کا بھی یہی عمل تھا، امام ابن القیم نے لکھا ہے کہ صحابہ سے جو محفوظ ہے ان میں حضرت عمر بن خطاب سے یہی محفوظ ہے کہ آپ ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھتے تھے، اور یہی حضرت ابن مسعود سے بھی مروی ہے جس کو طحاوی نے روایت کیا ہے۔ (زاد المعاد: ۲۱۵/۱)

الغرض ان احادیث و آثار کی وجہ سے جمہور نے اس بات کو اختیار کیا ہے کہ سجدے میں جاتے ہوئے پہلے زمین پر گھٹنے رکھے جائیں، پھر ہاتھ رکھے جائیں۔ اب رہی وہ حدیث جس میں اس کے خلاف آیا ہے تو اگر کوئی دوسرے طریقے کے مطابق پہلے ہاتھ زمین پر رکھتا ہے، پھر گھٹنے رکھتا ہے تو اس کی بھی گنجائش ہے اور اس بارے میں بھی بعض احادیث آئی ہیں مگر ان پر کلام ہے۔

مثلاً ایک حدیث حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ: ”إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَبْرُكُ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ، وَلَكِنْ يَضَعُ يَدَيْهِ ثُمَّ رُكْبَتَيْهِ“ (جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو وہ اونٹ کی طرح نہ بیٹھے، بلکہ پہلے ہاتھ رکھے پھر گھٹنے

رکھے) (طحاوی: ۱۸۰/۱، ابوداؤد: ۱۲۲/۱)

مگر اس پر علامہ ابن القیم نے کلام کیا ہے کہ اس حدیث میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ”اونٹ کی طرح نہ بیٹھو“ تو اونٹ سب سے پہلے اپنے ہاتھ ہی رکھتا ہے اور گھٹنے بعد میں زمین پر رکھتا ہے، اس لحاظ سے ”اونٹ کی طرح نہ بیٹھو“ کا مطلب یہ ہوا کہ سجدے میں پہلے ہاتھ نہ رکھو۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسی صورت سے نبی کریم ﷺ نے منع کیا اور خود آپ نے اس صورت کے خلاف عمل کر کے دکھایا، علامہ ابن القیم کا کہنا ہے کہ اس حدیث کے اول و آخر میں تضاد معلوم ہوتا، کیونکہ پہلے جملے میں تو کہا کہ اونٹ کی طرح نہ بیٹھو اور بعد میں کہا کہ ”ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے رکھو“ اگر ہاتھوں کو گھٹنے سے پہلے رکھتے ہیں تو یہی اونٹ کی طرح بیٹھنا ہے، اس لئے علامہ کا خیال ہے کہ اس حدیث میں راوی سے ایک غلطی ہو گئی ہے کہ اللہ کے رسول نے تو یہ فرمایا تھا کہ: ”گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھو“ راوی نے اس کو الٹا کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ ”ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے رکھو“۔ (تفصیل کے لئے دیکھو: زاد المعاد: ۲۱۵/۱)

بہر حال دونوں طرف گنجائش ہے، مسئلہ صرف افضل وغیر افضل کا ہے، اور تائید دونوں کی احادیث سے ہوتی ہے۔

جلسہ استراحت

پہلی اور تیسری رکعت میں دوسرے سجدے کے بعد دوسری اور چوتھی رکعت کے لئے کھڑے ہو جانا چاہئے یا کھڑے ہونے سے پہلے بیٹھنا بھی چاہئے؟ اس بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے اور اس بیٹھنے کو جلسہ استراحت کہا جاتا ہے، علامہ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا کہ: اس کو امام شافعی اور محدثین کی ایک جماعت نے اختیار کیا

ہے، اور اکثر نے اس کو مستحب نہیں قرار دیا ہے۔ (فتح الباری: ۳۰۲/۲)

مؤلف ”حدیث نماز“ نے جلسہ استراحت کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے اور اس پر حضرت مالک بن الحویرثؓ کی حدیث بخاری سے استدلال کیا ہے جس میں ہے کہ حضرت مالک بن الحویرث نے لوگوں کو نماز پڑھ کر دکھائی، اور جب دوسرے سجدے سے سر اٹھایا تو بیٹھ گئے اور پھر زمین پر ہاتھ ٹیک کر (دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے) اس طرح ابو یزید عمرو بن سلمہ نے بھی کیا ہے، نیز امام ترمذیؒ نے بھی مالکؓ کی حدیث کی تخریج کی ہے اور اس کو حسن صحیح کہا ہے۔ اس سے جلسہ استراحت یعنی پہلی رکعت کے بعد اور تیسری رکعت کے بعد کھڑے ہونے سے پہلے بیٹھ کر پھر اٹھنا مشروع اور سنت ہے۔ (ملخصاً حدیث نماز: ۱۶۵-۱۶۶)

راقم کہتا ہے کہ جو حضرات ان احادیث کی بنا پر جلسہ استراحت کے قائل ہیں ان کو برا کہنا اور ان پر طعن و تشنیع کرنا تو ہمارے نزدیک بھی غلط ہے اور ناجائز ہے۔ ہاں اکثر علماء وائمہ کے نزدیک دوسرے دلائل کی وجہ سے اس جلسہ استراحت کو سنت کا درجہ نہیں دیا گیا ہے، بلکہ صرف جواز کا درجہ ہے۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں:

(۱) ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کا طریقہ بیان کرنے والے سینکڑوں صحابہ میں سے صرف حضرت مالک بن الحویرث سے یہ منقول ہے، حالانکہ نماز کا معاملہ روزانہ پانچ وقت پیش آتا ہے، اگر یہ کوئی مستقل سنت ہوتی اور رسول اللہ ﷺ اس کا اہتمام کیا کرتے تھے تو دیگر صحابہ نے اس کو نظر انداز کیوں کیا؟ معلوم ہوا کہ یہ مستقل سنت نہیں تھی، جس کو اہتمام سے رسول اللہ ﷺ ادا کرتے ہوں۔

(۲) دوسرے یہ کہ بعض حضرات محدثین نے حضرت ابو حمید ساعدی سے اور بعض نے حضرت عباس یا عیاش بن سہل الساعدی سے روایت کیا ہے کہ انھوں

نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسرے سجدے کی تکبیر کہی اور سجدہ کیا، پھر تکبیر کہی اور کھڑے ہو گئے اور نہیں بیٹھے۔ (ابوداؤد: ۱۰۷۱، صحیح ابن حبان: ۱۸۰/۵، سنن بیہقی: ۱۳۶/۲، معانی الآثار: ۱۸۵/۱)

امام ابن حبان نے حضرت ابو حمید و حضرت عیاش یا عباس ان دونوں کی روایات کو محفوظ قرار دیا ہے، اور علامہ نیوی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (دیکھو: صحیح ابن حبان: ۱۸۰/۵، آثار السنن: ۱۲۰/۱)

اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کا عمل یہ تھا کہ آپ دوسرے سجدے کے بعد سیدھا کھڑے ہو جاتے تھے اور جلسہ استراحت نہیں کرتے تھے۔

(۳) تیسرے یہ کہ حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا کہ: ”کان النبی ﷺ ینہض فی الصلاة علی صدور قدمیه“ (نبی کریم ﷺ نماز میں قدموں کے بل اٹھ جاتے تھے) (ترمذی: ۶۲/۱، معجم اوسط طبرانی: ۳۲۰/۳، سنن بیہقی: ۱۸۰/۲)

امام ترمذی نے اس کی تخریج کے بعد کہا کہ: ”علیہ العمل عند اهل العلم، یختارون أن ینہض الرجل فی الصلاة علی صدور قدمیه“ (اہل علم کے نزدیک عمل اسی پر ہے کہ وہ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ نماز میں آدمی اپنے قدموں کے بل کھڑا ہو جائے) (سنن الترمذی: ۶۵/۱)

امام ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اس کی سند میں خالد بن ایاس ہیں اور یہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں اور ان پر کلام مشہور ہے جو کتب رجال میں درج ہے، مؤلف نے بھی اس کو نقل کیا ہے کہ امام ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، مگر ہم پہلے بھی یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ جب کسی حدیث ضعیف پر تعامل ہو جائے اور علماء و ائمہ اس کو معمول بہ قرار دیں، پھر صحابہ کا عمل اس

کے موافق ہو تو یہ حدیث کی صحت کی علامت ہے اور خاص وہ طریق سند کا ضعف مضرو قادح نہیں ہوا کرتا بلکہ یہ ضعف منجر ہو جاتا ہے، لہذا یہ حدیث کی اصل کے قوی ہونے کی علامت ہے، اور ابوداؤد کی حدیث مرفوع صحیح جو اوپر ذکر کی گئی وہ بھی احناف اور دیگر علماء کی مؤید ہے اور تعامل کا ذکر تو امام ترمذی نے خود کر دیا ہے جس سے غالباً امام ترمذی اس حدیث کے قوی الاصل ہونے کی جانب اشارہ کرنا چاہتے ہیں، نیز کئی صحابہ کرام سے اسی کے موافق عمل وارد ہے۔ لہذا یہ ضعف ختم ہو کر حدیث کی صحت لوٹ آئی۔

اور صحابہ کرام میں سے حضرت ابن مسعود، حضرت علی بن ابی طالب، وغیرہ سے یہی ثابت ہے:

(۱) حضرت عبدالرحمن بن یزید کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن مسعود کو نماز میں دیکھا کہ وہ اپنے قدموں کے بل کھڑے ہو جاتے تھے بیٹھتے نہیں تھے۔ (سنن بیہقی: ۱۸۰/۲، مصنف عبدالرزاق: ۱۷۸/۲، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۳۶/۱، معجم کبیر: ۲۶۶/۹)

اس کو امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں صحیح قرار دیا ہے، اور ابن حجر نے بھی اس کی سند کو صحیح کہا ہے، اور علامہ پیشی نے کہا کہ اس کے رجال صحیح بخاری کے رجال ہیں۔ (سنن بیہقی: ۱۸۰/۲، فتح الباری: ۳۰۳/۲، مجمع الزوائد: ۱۳۶/۲)

(۲) حضرت وہب بن کیسان کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن الزبیر کو دیکھا کہ جب وہ دوسرا سجدہ کرتے تھے تو اسی حال میں اپنے قدموں کے بل کھڑے ہو جاتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۳۶/۱)

علامہ نیوی نے آثار السنن میں اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ (آثار

السنن: (۱۲۱/۱)

(۳) عبید بن ابی الجعد کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نماز میں اپنے قدموں کے بل کھڑے ہو جاتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۴۶/۱)

(۴) حضرت نافع سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نماز میں اپنے قدموں کے بل کھڑے ہو جاتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۴۶/۱)

(۵) حضرت امام شعی نے کہا کہ: ”أن عمر و علیا وأصحاب رسول اللہ ﷺ كانوا ينهضون في الصلاة على صدور أقدامهم“ (حضرت عمر اور حضرت علی اور رسول اللہ ﷺ کے دیگر صحابہ نماز میں اپنے قدموں کے بل کھڑے ہو جاتے تھے) (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۴۶/۱)

(۶) حضرت نعمان بن ابی عیاش سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ: ”أدرکتُ غیرَ واحدٍ من أصحاب النبي ﷺ، فكان إذا رفع رأسه من السجدة في أول ركعةٍ والثالثة قام كما هو، ولم يجلس“ (میں نے بہت سے صحابہ کرام کو پایا کہ وہ جب اپنا سر پہلی یا تیسری رکعت کے سجدے سے اٹھاتے تو اسی حال میں کھڑے ہو جاتے تھے اور بیٹھتے نہیں تھے) (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۴۷/۱)

اس اثر کو علامہ نیموی نے آثار السنن میں حسن قرار دیا ہے۔ (آثار السنن:

(۱۲۱/۱)

اور یہی جمہور علماء کا مسلک بھی ہے، ابن عبدالبر مالکی نے ”التمہید“ میں لکھا ہے کہ: ”قال مالك والاوزاعي والثوري و أبو حنيفة وأصحابه ينهض على صدور قدميه ولا يجلس، و روي ذلك عن ابن مسعود وابن عمر وابن“

عباس وقال النعمان بن ابی عیاش أدرکت غیر واحد من أصحاب النبی ﷺ يفعل ذلك ، وقال ابو الزناد : تلك السنة ، وبه قال أحمد بن حنبل وإسحاق بن راهويه ، قال أحمد : وأكثر الأحاديث على هذا “ (امام مالک، امام اوزاعی، امام ثوری، وامام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا کہ اپنے قدموں کے بل کھڑے ہو اور نہ بیٹھے، اور یہ بات ابن مسعود، ابن عمر، ابن عباس سے روایت کی گئی ہے اور نعمان بن ابی عیاش نے کہا کہ میں نے بہت سے صحابہ کو اسی طرح کرتے پایا ہے، اور ابو الزناد نے کہا کہ یہی سنت ہے، اور امام احمد اور اسحاق بن راہویہ بھی اسی کے قائل ہیں، امام احمد نے کہا کہ اکثر احادیث بھی اسی کے بارے میں ہیں) (التمہید: ۲۵۵/۱۹)

اور مؤلف نے جو بعض کتب احناف سے جملہ استراحت کے بارے میں ”لا باس بہ“ کا قول نقل کیا ہے، یہ ٹھیک ہے کہ جائز ہے، مگر اس کو صرف جائز کہا گیا ہے، لہذا کوئی اس طرح کر لے تو یقیناً کوئی حرج نہیں۔ مگر سنت وہی ہے جو ابھی عرض کیا گیا۔

رہی حدیث بخاری جو مالک بن الحویرث سے منقول ہے تو اس کو احناف اور مالکیہ اور امام احمد وغیرہ نے عذر پر محمول کیا ہے کہ یہ حالت کبر (بڑھاپے) میں عذر سے آپ نے ایسا فرمایا تھا اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام احمد و امام ابو داؤد اور امام دارمی نے روایت کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رکوع اور سجدہ کرنے میں مجھ پر سبقت نہ کرو کیونکہ جب میں رکوع میں تم سے سبقت کروں گا تو تم مجھے رکوع میں پالو گے جب میں رکوع سے سر اٹھاؤں گا، کیونکہ میرا بدن بھاری ہو گیا ہے۔ (مسند احمد: ۹۲/۴، ابو داؤد: ۹۱/۱،

دارمی: (۳۴۵/۱)

چنانچہ قاضی عیاضؒ نے اکمال المعلم شرح مسلم میں اس کی وضاحت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ: امام مالک سمیت تمام فقہاء، سفیان احمد اور اصحاب الرائے یہ کہتے ہیں کہ نہ بیٹھے اور اپنے حال پر سیدھا کھڑا ہو جائے، اور حضرت مالک بن الحویرث کی حدیث کو اس پر محمول کرتے ہیں کہ ایک بار یہ جواز کے بیان یا آپ ﷺ کی کسی بیماری کے عذر سے ہوا تھا۔ (اکمال المعلم: ۳/۹۸)

اسی طرح ابن بطلال نے شرح بخاری میں اس جلسہ کی نفی میں وہ دلائل ذکر کرنے کے بعد جو ہم نے اوپر ذکر کئے ہیں، لکھا ہے کہ جب یہ حدیث وارد ہے تو یہ احتمال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو جلسہ کیا وہ کسی عذر کی وجہ سے ہو، نہ یہ کہ وہ کوئی سنت نماز ہے۔ (شرح ابن بطلال: ۲/۳۴۹)

اور علامہ محمد بن ابی بکر الزرعی اپنی کتاب ”الصلاة و حکم تارکھا“ میں لکھتے ہیں کہ: ”هذه تسمى جلسة الاستراحة ولا ريب أنه ﷺ فعلها ولكن هل فعلها على أنها من سنن الصلاة وهيئاتها كالتجافي وغيره أو لحاجته إليه لما أسن وأخذ اللحم، وهذا الثاني أظهر لوجهين: أحدهما: أن فيه جمعاً بينه وبين حديث وائل بن حجر وأبي هريرة: أنه كان ينهض على صدور قدميه، الثاني أن الصحابة الذين كانوا أحرص الناس على مشاهدة أفعاله وهيئات صلاته كانوا ينهضون على صدور أقدامهم“

(اس کو جلسہ استراحت کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے کیا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ نے اس کو نماز کی سنت اور اس کا طریقہ ہونے کی بنا پر کیا تھا جیسے سجدوں میں کشادہ ہونا وغیرہ یا بڑھاپے اور فریبی کی

وجہ سے اس کی کوئی ضرورت ہونے کی بنا پر کیا تھا؟ یہ دوسری بات دو وجہ سے زیادہ ظاہر ہے: ایک وجہ یہ کہ اس صورت میں اس جلسہ استراحت کی حدیث اور حضرت وائل بن حجر اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث کہ ”رسول اللہ ﷺ انگلیوں کے بل کھڑے ہو جاتے تھے“ کے مابین تطبیق ہو جاتی ہے، دوسری وجہ یہ کہ صحابہ کرام جو کہ رسول اللہ ﷺ کے افعال اور آپ کی نماز کی ہیئت و طریقوں کو دیکھنے کے سب سے زیادہ مشتاق و حریص تھے، وہ بھی اپنے قدموں کی انگلیوں کے بل کھڑے ہوا کرتے تھے (الصلاة و حکم تار کہا: ۲۴۱-۲۴۲)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ آخری عمر میں ضعف کی وجہ سے یا جسم کے بھاری ہو جانے کی وجہ سے نماز میں ارکان کو دیر سے ادا کرتے تھے اور استراحت کے طور پر کچھ توقف فرماتے تھے، نہ یہ کہ یہ کوئی مستقل سنت نماز ہے۔

علامہ لکھنوی کے ایک حوالے میں خیانت

یہاں مؤلف حدیث نماز نے اپنی محبوب عادت کے مطابق خیانت و دھوکہ سے کام لیتے ہوئے حضرت علامہ عبدالحی لکھنوی کا ایک حوالہ پیش کیا ہے، اور لکھا ہے کہ: مولانا عبدالحی حنفی نے شرح وقایہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اٹھتے وقت زمین پر ہاتھ ٹیک لے تو کوئی حرج نہیں، جیسا کہ محیط میں ہے، آگے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ: جلسہ استراحت اور ہاتھ ٹیکنے کی حدیث مضبوط اور صحیح ہے اور یوں ہی اٹھنے کی حدیث کمزور ہے۔ (حدیث نماز: ۱۶۶)

اس عبارت میں مؤلف حدیث نماز نے جو خیانتیں کی ہیں اس کو سمجھنے کے لئے علامہ عبدالحی لکھنوی کی اصل عبارت پیش نظر ہونا چاہئے، لہذا لیجئے ان کی اصل عبارت ملاحظہ کیجئے، آپ نے زمین پر ہاتھ نہ ٹیکنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ”لا

يعتمد بيديه على الأرض عند القيام كاعتماد العاجز الضعيف لان النبي ﷺ نهى عن ذلك ، أخرجه أبو داود ، ورأوا الكراهة ههنا تنزيهية ، فإن اعتمد فلا بأس به كما في المحيط“ (کھڑے ہوتے وقت عاجز ضعیف آدمی کی طرح زمین پر ہاتھ نہ ٹیکے؛ کیونکہ نبی ﷺ نے اس سے منع کیا ہے، اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے، اور علماء نے اس کراہت کو کراہت تنزیہی سمجھا ہے، لہذا اگر کوئی ٹیک لگالے تو کوئی حرج نہیں، جیسا کہ محیط میں لکھا ہے) (عمدة الرعاية حاشیہ شرح الوقایہ: ۱۴۷/۱)

اس عبارت میں علامہ لکھنوی نے اولاً مسئلہ بیان کیا ہے، پھر اس کی دلیل میں ابوداؤد کے حوالے سے حدیث بتائی ہے اور ایک لفظ بھی اس حدیث کے ضعیف ہونے کے بارے میں نہیں لکھا ہے، مگر ہمارے مؤلف صاحب صریح جھوٹ کا بدترین جرم انجام دیتے ہوئے علامہ کی جانب یہ منسوب کر رہے ہیں کہ انھوں نے ہاتھ ٹیکنے کی حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

اب لیجئے اس کے بعد کا حوالہ، علامہ لکھنوی جلسہ استراحت نہ کرنے کے متعلق دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ”ولنا ما أخرجه الترمذي عن أبي هريرة أن النبي ﷺ كان ينهض في الصلاة على صدور قدميه ، وفي سننه ضعف يسير ينجبر بعمل أكابر الصحابة كابن مسعود ، وابن عمر ، وابن زبير ، وعمر ، وعلي ، وابن عباس ، وأبي سعيد الخدري ، وغيرهم ؛ فإنهم كانوا لا يجلسون جلسة الاستراحة ، كما أخرجه ابن أبي شيبه والبيهقي - وحديث مالك محمول على بيان الجواز أو حالة العذر و نحو ذلك، كما حققه ابن القيم في زاد المعاد في هدي خير العباد“ (اور ہماری دلیل وہ حدیث ہے جس کی تخریج امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے کی ہے کہ نبی

ﷺ نماز میں اپنے انگلیوں کے بل کھڑے ہو جاتے تھے، اس کی سند میں معمولی سا ضعف ہے جو اکابر صحابہ کے عمل سے ختم ہو جاتا ہے، جیسے ابن مسعود، ابن عمر، ابن زبیر، عمر، علی، ابن عباس، ابوسعید خدری وغیرہ حضرات کہ یہ جلسہ استراحت نہیں کرتے تھے، جیسا کہ ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت مالک بن الحویرث کی حدیث بیان جواز یا حالت عذر وغیرہ پر محمول ہے جیسا کہ ابن القیم نے ” زاد المعاد فی ہدی خیر العباد میں اس کی تحقیق کی ہے) (عمدة الرعاۃ حاشیہ شرح الوقایہ: ۱۴۷/۱)

اس عبارت کو پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا اس میں کوئی بات اس طرح کی ہے جو مؤلف حدیث نماز نے علامہ لکھنوی کی جانب منسوب کرتے ہوئے لکھی ہے؟ یا اس کے خلاف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترمذی کی حدیث کا معمولی سا ضعف صحابہ کے عمل سے ختم ہو کر وہ حدیث قابل عمل و لائق احتجاج ہے۔ کیا اب مؤلف کے جھوٹ و افترا میں کوئی شک و شبہ باقی رہ جاتا ہے؟ انتہائی حیرت و تعجب ہے ان پر جو حدیث و سنت کا نام لیتے تھکتے نہیں اور علماء کی عبارات میں قطع و برید کر کے لوگوں کو مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن حقیقت ہمیشہ چھپی نہیں رہتی بلکہ ایک نہ ایک دن اس سے پردہ اٹھ جاتا ہے:

آخر شب تو نے دیکھا ظلمت شب کا مال

یوں ہی مٹ جاتی ہے اک دن گرمی کا رحیات

اب ان کے دئے ہوئے دوسرے حوالوں کی حقیقت خود سمجھ میں آ جاتی ہے اور ان میں بھی وہی جھوٹ و افتراء کا کھیل کھیلا گیا ہے، لہذا ہم ان کو پیش کر کے تضحیح اوقات کرنا نہیں چاہتے۔

سجدے کے بعد کھڑے ہونے کا طریقہ

جب دوسرا سجدہ کر لیں تو اٹھ کر کھڑے ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ کیا ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر کھڑے ہوں یا اپنے گھٹنوں پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوں؟ اس میں بھی اختلاف ہے، ہمارے مؤلف حدیث نماز نے بھی جلسہ استراحت کے مسئلہ کے ضمن میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ: دوسرا سجدہ دعا پڑھ کر کیجئے، اور پھر بدستور سر اٹھا کر ”اللہ اکبر“ کہہ کر بیٹھ جائیے..... پھر زمین پر ہاتھ ٹیک کر دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہو جائیے۔ (حدیث نماز: ۱۶۵)

راقم کہتا ہے کہ ہاتھ ٹیک کر اٹھنے کے سلسلہ میں ایک روایت حضرت مالک بن الحویرثؓ کی بخاری وغیرہ میں ہے، یہ وہی روایت ہے جس میں جلسہ استراحت کا ذکر بھی انہوں نے کیا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ: ”فإذا رفع رأسه من السجدة الثانية جلس و اعتمد على الارض، ثم قام“ (جب آپ ﷺ نے دوسرے سجدہ سے سر اٹھایا تو بیٹھ گئے اور زمین پر ٹیک لگا لیا پھر کھڑے ہوئے) (بخاری: ۱۱۴۱، نسائی: ۱۲۹۱)

اس سے بعض علماء نے اٹھنے کا طریقہ یہ اخذ کیا ہے کہ زمین پر ہاتھوں کو ٹیک کر اٹھے، اور یہی امام مالک اور امام شافعی کا مسلک ہے، لیکن دیگر علماء کے نزدیک اٹھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں پر ٹیک کر اٹھے، اور زمین پر نہ ٹیکے۔ اور یہی امام احمد بن حنبل اور امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے۔

امام ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ: ”وعلى كلتا الروایتين ينهض إلى القيام على صدور قدميه معتمدا على ركبتيه، ولا يعتمد على يديه، قال القاضي لا يختلف قوله أنه لا يعتمد على الأرض سواء قلنا يجلس“

للاستراحة أو لا يجلس وقال مالك والشافعي السنة أن يعتمد على يديه في النهوض“ (اور امام احمد کی دونوں (جلسہ استراحت کے سنت ہونے اور نہ ہونے کی) روایات پر اپنے قدموں کے بل گھٹنوں پر ٹیک لگاتے ہوئے کھڑا ہو جائے، اور اپنے ہاتھوں کو نہ ٹیکے، قاضی نے کہا کہ امام احمد کے اس قول میں اختلاف نہیں ہے کہ زمین پر ٹیک نہ لگائے خواہ ہم یہ کہیں کہ جلسہ استراحت کرے یا یہ کہیں کہ نہ کرے، اور امام مالک و امام شافعی نے کہا کہ سنت یہ ہے کہ اٹھتے وقت ہاتھوں پر ٹیک لگائے) (المغنی لابن قدامة: ۳۱۱/۱)

اس سے معلوم ہوا کہ دونوں جانب ائمہ ہیں، اور امام احمد و ابوحنیفہ کے نزدیک زمین پر ٹیک نہیں لگانا چاہئے، اور اس کی دلیل میں متعدد احادیث موجود ہیں (۱) حضرت وائل بن حجر کہتے ہیں کہ: ”رأيت رسول الله ﷺ إذا سجد وضع ركبتيه قبل يديه و إذا نهض رفع يديه قبل ركبتيه“ (میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ نے سجدہ کیا تو اپنے گھٹنوں کو اپنے ہاتھوں سے پہلے رکھا اور جب کھڑے ہوئے تو اپنے ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں سے پہلے اٹھایا۔) (ابوداؤد: ۱۲۲/۱، ترمذی: ۶۱/۱، نسائی: ۱۲۳/۱)

اس حدیث پر سند کی حیثیت سے کلام اوپر قریب میں گزر چکا ہے، یہ روایت بتا رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول سجدے میں جاتے وقت اول گھٹنے رکھنے کا اور سجدے سے اٹھتے وقت اول ہاتھ اٹھانے کا تھا، اس سے علامہ زین العرانی نے یہ بات بھی اخذ کی ہے کہ آپ ﷺ جب اٹھتے وقت پہلے ہاتھ اٹھاتے تھے تو آپ زمین پر ہاتھ کا ٹیک نہیں لگاتے تھے۔ (عون المعبود: ۴۹/۳)

(۲) حضرت وائل ہی سے ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ: ”وإذا نهض

نہض علی رکتیہ واعتمد علی فخذہ “ (جب اٹھتے تو گھٹنوں کے بل اٹھتے، اور اپنی ران پر ٹیک لگاتے) (ابوداؤد: ۱۲۲/۱)

اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں، مگر اس میں انقطاع ہے کیونکہ اس کے راوی عبد الجبار بن وائل کا سماع ان کے والد حضرت وائل بن حجر سے ثابت نہیں، مگر اس کی تائید میں دیگر روایات موجود ہیں۔

(۳) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ: ”نہی رسول اللہ ﷺ أن يعتمد الرجل علی یدیه إذا نهض فی الصلاة“ (رسول اللہ ﷺ نے منع کیا کہ آدمی نماز میں اپنے ہاتھوں پر ٹیک لگائے جب وہ کھڑا ہو) (ابوداؤد: ۱۲۲/۱، سنن بیہقی: ۱۹۴/۲)

اس کو ابوداؤد نے روایت کر کے سکوت کیا ہے اور اس کے تمام راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں، سوائے محمد بن عبد الملک الغزالی کے، اور وہ بھی ثقہ ہیں۔ (اعلاء السنن: ۴۱/۳)

علامہ نووی نے ”المجموع شرح المہذب“ اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور اس کی دو وجہ بیان کی ہیں: ایک یہ کہ محمد بن عبد الملک الغزالی مجہول ہے، دوسری یہ کہ یہ روایت دوسرے ثقات کی روایت کے خلاف ہے، کیونکہ امام احمد بن حنبل جو محمد بن عبد الملک کے ساتھ ہیں وہ اس میں یہ روایت کرتے ہیں کہ: ”نہی أن یجلس الرجل فی الصلاة وهو معتمد علی یدیه“ (رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے بیان کیا کہ آدمی نماز میں اس حال میں بیٹھے کہ ہاتھوں پر ٹیک لگایا ہو) اور دوسرے دو حضرات نے بھی الغزالی کے خلاف روایت کیا ہے۔ لہذا یہ روایت شاذ ہے۔ (المجموع: ۴۰۸/۳)

اور صاحب عون المعبود نے بھی اس حدیث پر بعینہ یہی دو اعتراضات علامہ ابن رسلان کے حوالے سے نقل کئے ہیں۔ (عون المعبود: ۱۹۸/۳)

مگر یہ دونوں اعتراضات صحیح نہیں ہیں، کیونکہ جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے تو یہ محمد بن عبد الملک ثقہ ہیں، اور ان سے بڑے بڑے ائمہ نے روایت کیا ہے، جیسے ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن ابی الدنیا، ابویعلیٰ وغیرہ، اور نسائی نے ان کو ثقہ کہا، اور ابن ابی حاتم نے کہا کہ صدوق ہیں اور ابن حبان نے ان کو ثقافت میں ذکر کیا ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۲۸۱/۹)

کیا ایسا شخص جس سے اتنے ائمہ و محدثین روایت کریں مجہول ہوتا ہے؟ لہذا یہ غلط فہمی ہے، اس اشتباہ کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ علامہ ظفر احمد عثمانی نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ ان حضرات کو محمد بن عبد الملک بن ابی محذورہ سے اشتباہ ہو گیا ہو جن کو ابن القطان نے مجہول کہا ہے، لیکن یہ بھی مجہول نہیں کیونکہ ابن حبان نے ان کو ثقافت میں شمار کیا ہے جس سے جہالت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر لکھا کہ صاحب عون المعبود نے کچھ آگے چل کر کہا ہے کہ محمد بن عبد الملک بن مروان الواسطی کے بارے میں تقریب میں ہے کہ وہ صدوق ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جن کی حدیث کی تصحیح یا تحسین متابعت و شواہد سے کی جاتی ہے۔ علامہ ظفر احمد نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ ان کو محمد بن عبد الملک الغزالی اور محمد بن عبد الملک الواسطی میں اشتباہ ہو گیا۔ علامہ ظفر احمد کہتے ہیں کہ اس کے باوجود ان کا اس کو مجہول کہنا صحیح نہیں، کیونکہ ان محمد بن عبد الملک الواسطی سے بھی بہت سے لوگوں نے روایت کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے ان کو ثقہ کہا ہے اور دارقطنی نے بھی ثقہ کہا ہے۔ (اعلاء السنن: ۴۲/۳)

راقم کہتا ہے کہ علامہ ظفر احمد صاحب نے جو یہ کہا کہ صاحب عون المعبود کو

محمد بن عبد الملک الواسطی سے اشتباہ ہو گیا، یہ اصل اشتباہ عبد اللہ الامیر کو ہوا ہے اور صاحب عمون المعبود نے یہ بات ان ہی کے حوالے سے نقل کی ہے، مگر علامہ نووی نے بھی محمد بن عبد الملک کو مجہول کہا ہے اور انھوں نے یہ تصریح بھی کی ہے کہ یہ الغزالی ہیں اور امام احمد کے رفیق ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نووی کو ان کے بارے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوا، وہ ان محمد بن عبد الملک کو الغزالی سمجھتے ہوئے بھی ان کو مجہول کہتے ہیں، لہذا اس کو علامہ نووی کی غلط فہمی کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں؟

اب رہا دوسرا اعتراض کہ محمد بن عبد الملک نے ثقات کی مخالفت کی ہے تو اس کا ایک جواب علامہ ظفر احمد صاحب نے دیا ہے کہ یہاں مخالفت کچھ نہیں ہے کیونکہ ابن رافع اور ابن شہویہ کی روایت میں تو صرف یہ ہے کہ آپ ﷺ نے نماز میں ہاتھ پر ٹیک لگانے سے منع کیا، لہذا یہ روایت تو مطلق ہے، اور محمد بن عبد الملک نے اپنی روایت میں یہ بات بھی مزید بیان کر دی کہ: ”إِذَا نَهَضَ الرَّجُلُ“ (نماز میں کھڑے ہونے کے وقت) تو یہ مخالفت کہاں ہوئی؟ رہی امام احمد کی روایت جس میں انھوں نے یہ کہا ہے کہ ”إِذَا جَلَسَ“ (بیٹھتے وقت) تو یہ بظاہر اس روایت کے مخالف ہے مگر حقیقت میں کوئی مخالف نہیں کیونکہ امام احمد کی روایت کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے منع کیا کہ آدمی جلسہ استراحت کرے اور کھڑے ہونے کے وقت ہاتھ سے ٹیک لگائے، لہذا امام احمد نے ایک بات روایت کی اور محمد بن عبد الملک نے دو باتیں روایت کیں۔ (اعلاء السنن: ۴۲/۳)

میں کہتا ہوں کہ اس سے بھی واضح بات یہ ہے کہ جب دونوں حضرات ثقہ ہیں، امام احمد بھی اور محمد بن عبد الملک بھی، تو یوں کہا جائے کہ حدیث میں دو باتوں کا ذکر تھا، ان میں سے ایک بات امام احمد نے اور ایک بات محمد بن عبد الملک نے بیان

کی، ایک تو یہ کہ آپ ﷺ نے نماز میں بیٹھتے ہوئے ہاتھ پر ٹیک لگانے سے منع کیا، اور دوسری یہ کہ آپ ﷺ نے نماز میں کھڑے ہونے کے وقت ٹیک لگانے سے منع کیا۔ لہذا دونوں باتیں صحیح ہیں، ایک کی وجہ سے دوسری کو گرانا مناسب بات ہے، جبکہ دونوں میں کوئی تضاد و تخالف نہیں ہے۔ لہذا ہمیں دونوں باتوں کو ماننا چاہئے

(۴) حضرت علی نے کہا کہ: ”إن من السنة في الصلاة المكتوبة

إذا نهض الرجل في الركعتين الأوليين أن لا يعتمد بیده علی الأرض إلا أن يكون شيخاً كبيراً لا يستطيع“ (فرض نماز میں سنت یہ ہے کہ جب آدمی پہلی دو رکعتوں میں کھڑا ہو تو اپنے ہاتھوں سے زمین پر ٹیک نہ لگائے مگر یہ کہ وہ بوڑھا ہو جو طاقت نہ رکھے) (مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۴۷/۱، السنن الکبریٰ بیہقی:

(۱۳۶/۲)

اس روایت کے بارے میں علامہ نووی نے ”المجموع شرح المہذب“ میں کہا ہے کہ اس کو امام یحییٰ بن معین و امام احمد نے ضعیف کہا ہے۔ (المجموع: ۴۰۸/۳) اس ضعیف کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں عبدالرحمن بن اسحاق الواسطی ایک راوی ہے جس کے بارے میں بعض محدثین کہتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے مگر یہ راوی سب کے نزدیک ضعیف نہیں ہے، اس پر ہم نے نماز میں ہاتھ باندھنے کی بحث میں کلام کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ حسن الحدیث ہیں۔ لہذا اس حدیث کا ضعیف ہونا متفق علیہ نہیں ہے۔ اور اس حدیث میں حضرت علی کا یہ کہنا کہ یہ سنت ہے، محدثین کے نزدیک مرفوع حدیث کے حکم میں ہے، لہذا یہی بات سنت ہوگی۔

الغرض نماز میں زمین پر ہاتھوں کو نہ ٹیک کر اپنی رانوں پر ٹیک کر اٹھنا ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ لہذا اس پر عمل کرنا سنت کی اتباع ہے۔

اب رہا حضرت مالک بن الحویرث کا حدیث میں یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین پر ٹیک لگایا تو اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گزرا کہ یہ کسی عذر پر محمول ہے، کیونکہ حضرت مالک آخری دور میں حضور کی خدمت میں آئے تھے، اور اس زمانے میں آپ پر ضعف غالب تھا، چنانچہ امام ابن قدامہ حنبلی نے ”المغنی“ میں لکھا ہے کہ: ”حضرت مالک بن الحویرث کی حدیث اس پر محمول ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ نے ضعف و بڑھاپے کی وجہ سے کھڑے ہونے کی مشقت کی بنا پر کیا تھا“۔ (المغنی: ۳۱۲/۱)

عورت کی نماز

مؤلف حدیث نماز نے عورت اور مرد کی نماز کا ایک ہی حکم بیان کیا ہے کہ: سجدہ عورت اور مرد دونوں ایک ہی طرح کریں، اس کے بعد پھر لکھا کہ اگر کوئی عورت زمین سے ملکر اور پیٹ رانوں سے ملا کر سجدہ کرے (جیسا کہ حنفیہ کا طریقہ ہے) تو اجازت ہے، ابوداؤد میں ایک مرسل روایت اور بیہقی میں ایک مرفوع روایت اس طرح کی بھی ہے۔ (حدیث نماز: ۱۶۶-۱۶۷)

راقم کہتا ہے کہ احادیث سے عورت کے لئے سجدہ کا حکم یہ ہے کہ زمین سے لپٹ کر ملکر سجدہ کیا کرے اور یہ جیسا کہ مؤلف نے کہا ہے مرسل ابی داؤد سے ثابت ہے، اس میں ہے کہ یزید بن ابی حبیب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا دو عورتوں پر گزر ہوا جو نماز پڑھ رہی تھیں، آپ نے فرمایا کہ جب تم سجدہ کرو تو اپنا کچھ حصہ زمین سے ملا دیا کرو، کیونکہ عورت اس معاملہ میں مرد کی طرح نہیں ہے۔ اس کو بیہقی نے موصولاً دو طریق سے بیان کیا ہے، مگر دونوں طریقوں میں

ایک ایک راوی متروک ہے، مگر ظاہر ہے کہ مرسل جب ضعیف روایت سے تقویت پا جائے تو بالاتفاق سب کے نزدیک قابل قبول ہو جاتی ہے اور پھر جبکہ دو موصول سے یہ مؤید ہو تو قوت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، لہذا یہ مرسل اور موصول عورت کے حق میں مرد کے خلاف سجدہ کا حکم کر رہے ہیں۔ اس مسئلہ پر بھی اور ان روایات پر بھی پیچھے تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

نماز میں بیٹھنے کا طریقہ

نماز میں بیٹھنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے، بعض نے پہلے اور دوسرے دونوں قعدوں میں افتراش کو اختیار کیا ہے، یہی امام ابوحنیفہ، امام سفیان ثوری و اسحاق بن راہویہ کا مسلک ہے اور بعض نے دونوں قعدوں میں تورک کو پسند کیا ہے، اور یہ امام مالک کا مسلک ہے اور بعض نے اول قعدہ میں افتراش اور دوسرے میں تورک کو لیا ہے۔ یہ امام شافعی کا مختار ہے، اور امام احمد نے دو رکعت والی نماز میں افتراش کو اور تین و چار رکعت والی میں امام شافعی کی طرح تورک کو اختیار فرمایا ہے۔ (دیکھو: المجموع: ۴۱۲/۳-۴۱۳، المغنی: ۳۱۳/۱ و ۳۱۶)

اور امام ترمذی کہتے ہیں کہ: افتراش والے طریقے پر اکثر اہل علم کے نزدیک عمل ہے اور یہی سفیان ثوری، ابن المبارک، و اہل کوفہ کا قول ہے۔ (سنن ترمذی: ۶۵/۱)

افتراش یہ ہے کہ بائیں پیرز میں پر بچھا کر اسی پر بیٹھ جائے اور دایاں پیر کھڑا رکھے اور انگلیوں کو قبلہ رخ کر دے، اور تورک یہ ہے کہ دونوں پیروں کو دہنی طرف نکال دے اور اپنی بائیں سرین پر بیٹھ جائے۔ (المجموع: ۴۱۲/۳)

علماء حنفیہ کی اس سلسلہ میں دلیل یہ احادیث ہیں:

(۱) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا طریقہ نماز منقول ہے اس میں وہ یہ بھی فرماتی ہیں کہ: ”وكان إذا رفع رأسه من السجدة لم يسجد حتى يستوي جالساً وكان يقول في كل ركعتين التحية وكان يفرش رجله اليسرى وينصب رجله اليمنى وكان ينهى عن عقبة الشيطان“ (اور آپ ﷺ اپنا سر سجدہ سے اٹھاتے تو دوسرا سجدہ اس وقت تک نہ کرتے جب تک کہ ٹھیک طور پر نہ بیٹھ جاتے، اور آپ ﷺ دونوں رکعتوں میں ”التحيات“ پڑھتے تھے، اور اپنا بائیں پیر بچھا دیتے اور دایاں پیر کھڑا رکھتے تھے اور شیطان کی طرح بیٹھنے سے منع کرتے تھے) (مسلم: ۱۹۴۱، سنن ابوداؤد: ۱۱۴۱، مسند ابوداؤد طیالسی: ۲۱۷، مسند احمد: ۳۱۶، صحیح ابن حبان: ۶۴۵)

(۲) حضرت وائل بن حجر سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ: ”صليت خلف رسول الله ﷺ ، فلما قعد و تشهد فرش قدمه اليسرى على الأرض وجلس عليها“ (میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، پس جب آپ بیٹھے اور تشهد پڑھا تو اپنا بائیں پیر زمین پر بچھا دیا اور اسی پر بیٹھ گئے) (طحاوی: ۱۸۴۱، معجم کبیر طبرانی: ۳۴۲۲)

امام عینی نے ”نخب الافکار“ میں فرمایا کہ اس کو امام طحاوی نے دو صحیح سندوں سے روایت کیا ہے، اور علامہ نیوی نے آثار السنن میں اس حدیث کو ذکر کر کے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (نخب الافکار: ۹۵۳، آثار السنن: ۱۲۳)

(۳) حضرت وائل ہی سے ایک روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں کہ: ”فلما جلس ”يعني للشهد“ افترش رجله اليسرى و وضع يده اليسرى على فخذيه اليسرى ، ونصب رجله اليمنى“ (پس جب آپ ﷺ تشهد میں بیٹھے تو اپنا بائیں پیر بچھا دیا اور اپنا بائیں ہاتھ بائیں ران پر رکھا اور داہنا پیر کھڑا کر دیا)

(ترمذی: ۶۵/۱، نیز دیکھو صحیح ابن خزیمہ: ۳۴۳/۱)

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔

(۴) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ: ”من سنة الصلاة أن تُنصَبَ القدمُ الیمنی و استقباله بأصابعها القبلة، والجلوسُ علی اليسری“ (نماز کی سنت یہ ہے کہ دایاں قدم کھڑا کیا جائے اور اس کی انگلیوں کو قبلہ رخ کر دیا جائے اور بائیں قدم پر بیٹھا جائے) (سنن النسائی: ۱۳۰/۱)

یہ حدیث بھی صحیح ہے، علامہ نیوی نے آثار السنن میں اس کی سند کو صحیح کہا ہے، اور اس میں حضرت عبداللہ بن عمر کا یہ کہنا کہ سنت یہ ہے، اس سے مراد سنت رسول ہی عموماً مراد ہوتی ہے، لہذا یہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہے، جیسا کہ اس سلسلہ میں محدثین سے نقل کر چکا ہوں۔

الغرض ان سب احادیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نماز میں بیٹھنے کا طریقہ یہ ہے کہ بائیں پیرزمین پر بچھا کر اسی پر بیٹھ جائے اور دایاں پیر کھڑا کر کے اس کی انگلیاں قبل رو کر دے۔

تشہد میں انگلی کا اشارہ

تشہد کے وقت شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنا اور دوسری انگلیوں کا حلقہ بنانا سب کے نزدیک سنت یا مستحب ہے، مؤلف حدیث نماز نے بھی اس مسئلہ کو بیان کیا ہے۔ لیکن شہادت کی انگلی کے اٹھانے کا کیا طریقہ ہے؟ اس کے بارے میں علماء حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ ”أشهد أن لا إله إلا الله“ کہتے ہوئے انگلی اٹھائے اور ”إلا الله“ کہہ کر انگلی کو چھوڑ دے۔

اس کے متعلق مؤلف حدیث نماز نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ ”ہم نے حدیثوں میں جہاں بھی دیکھا تو یہی ملا کہ شہادت کی انگلی کا اشارہ شروع التحیات سے سلام پھیرنے تک کرے، ”أشهد أن لا إله إلا الله“ سے اٹھا کر ”إلا الله“ پر گرانے کی صریح روایت اب تک سامنے نہیں آئی۔ نواب وحید الزماں مرحوم نے بھی اسی طرح لکھا ہے (حدیث نماز: ۱۶۷)

راقم کہتا ہے کہ جس طرح کسی حدیث میں ”أشهد أن لا إله إلا الله“ پر انگلی اٹھانا اور ”إلا الله“ پر گرانے کا صریح طور پر وارد نہیں، اسی طرح کسی روایت میں انگلی کا اخیر تک اٹھائے رکھنا بھی صراحت کے ساتھ ثابت نہیں، بلکہ دونوں باتیں ممکن و محتمل ہیں؛ کیونکہ احادیث میں صرف یہ آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا، مگر یہ تو کہیں نہیں آیا کہ اس اشارہ کو آپ نے سلام تک باقی بھی رکھا۔

ہاں ترمذی و طبرانی کی ایک روایت سے بعض لوگ یہ بات اخذ کرتے ہیں کہ یہ اشارہ اخیر نماز تک باقی تھا، مگر یہ حدیث اس سلسلہ میں صریح نہیں ہے، چنانچہ اس میں عاصم بن کلیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ: ”دخلت على النبي ﷺ وهو يصلي وقد وضع يده اليسرى على فخذه اليسرى ووضع يده اليمنى على فخذه اليمنى وقبض أصابعه وبسط السبابة - وفي رواية الطبراني: يشير بالسبابة - وهو يقول: يا مقلب القلوب ثبت قلبي على دينك“ (میں رسول اللہ ﷺ کے پاس داخل ہوا جبکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے، اور آپ نے اپنی انگلیوں کو بند فرمایا تھا اور سبابة (شہادت کی انگلی) کو کھول دیا جبکہ آپ یہ دعا کر رہے تھے کہ: ”يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ“ (ترمذی: ۱۹۹/۲، معجم کبیر طبرانی: ۳۱۳/۷)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں دعا کرتے ہوئے اشارہ کا ذکر آیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ دعا آخر نماز میں سلام کے وقت پڑھی جاتی ہے تو آخر نماز تک اشارہ کرنا صاف معلوم ہوا۔ مگر اولاً تو یہ حدیث منکر ہے، جیسا کہ خود امام ترمذی نے فرمادیا ہے، دوسرے یہ اپنے مدعی پر صریح بھی نہیں ہے کیونکہ حدیث کے اصل الفاظ: ”بسط السبابة“ (انگلی شہادت کی کھولی) ہیں، اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جس وقت وہ صحابی حضور کے پاس پہنچے تو انھوں نے آپ کو اس حالت میں دیکھا کہ آپ نے نماز میں اپنی انگلیوں کو بند کر لیا تھا، مگر شہادت کی انگلی کو کھلا ہی رکھا تھا، اور یہ بھی دیکھا کہ اس وقت آپ مذکورہ دعا پڑھ رہے تھے، اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ آپ اس وقت اشارہ بھی کر رہے تھے؟ لہذا اس سے دعا کے وقت اشارہ ثابت نہیں ہوتا، بلکہ انگلیوں کا حلقہ آخری تک باقی رکھنے کا ثبوت ہوتا ہے۔ اور جس روایت میں ”بَسَطَ“ کی جگہ ”يُشِيرُ“ کا لفظ ہے یہ روایت بالمعنی ہے، اور یہ تاویل اس لئے لازم ہے تاکہ دونوں روایات میں تضاد نہ رہے اور ظاہر ہے کہ بسط عام ہے اشارہ سے، کیونکہ بسط تو بلا اشارہ بھی ہو سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

الغرض اس سلسلہ میں بھی کوئی صریح و صحیح روایت نہیں ہے کہ آپ ﷺ شہادت کی انگلی سے اشارہ نماز کے اختتام تک فرماتے رہتے تھے بلکہ احادیث میں تو بس اشارہ کرنے کا ذکر ملتا ہے۔

اور علماء حنفیہ جو یہ کہتے ہیں کہ ”أشهد أن لا إله“ کہتے ہوئے انگلی اٹھائے اور ”إلا الله“ کہہ کر انگلی کو چھوڑ دے، ان کے پاس اس کی دلیل میں چند حدیثیں ہیں: (۱) ایک تو حضرت معاذ بن جبل کی حدیث ہے جس میں وہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کا تفصیلی حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ”وكان إذا جلس في

آخر صلاتہ اعتمد علی فخذہ الیسری و یدہ الیمنی علی فخذہ الیمنی و یشیر یاصبعہ إذا دعا“ (اور آپ ﷺ جب نماز کے آخر میں بیٹھتے تو اپنی بائیں ران پر ٹیک لگاتے اور آپ کا داہنا ہاتھ دہنی ران پر ہوتا اور آپ اپنے انگلی سے اشارہ کرتے جبکہ دعا کرتے) (مجم کبیر طبرانی: ۷۴/۲۰)

اس حدیث میں ہے کہ جب دعا کرتے تھے تو انگلی سے اشارہ کرتے تھے، یہاں دعا سے تشہد مراد ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا یہ اشارہ تشہد پڑھتے وقت ہوتا تھا، لہذا اس کے بعد اس اشارہ کا باقی نہ رہنا ہی ظاہر ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ”امداد الفتاویٰ“ میں فرمایا کہ ”دعاء کی تفسیر تشہد کے ساتھ مسلم میں ہے اور ظاہر ہے کہ کلمہ ”اذا“ توقيت کے لئے ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشارہ صرف تہلیل کے وقت تھا، پس تہلیل کے ختم پر اشارہ بھی ختم ہو جائے گا۔ (امداد الفتاویٰ: ۲۰۹/۱)

(۲) حضرت عبداللہ بن الزبیر کہتے ہیں کہ: ”أن النبی ﷺ کان یشیر یاصبعہ إذا دعا لایحور کھا“ (نبی کریم ﷺ اپنی انگلی سے اشارہ کرتے تھے جبکہ دعا کرتے، اس حال میں کہ انگلی کو حرکت نہیں دیتے تھے) (ابوداؤد: ۱۴۲/۱، صحیح ابوعوانہ: ۵۳۹/۱، سنن بیہقی: ۱۸۹/۲، مصنف عبدالرزاق: ۲۴۹/۲)

امام نووی نے ”المجموع“ میں اس کی سند کو صحیح کہا ہے، اور امام ابن الملقن نے ”خلاصة البدر المنیر“ میں کہا کہ اس کو ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (المجموع: ۴۱۷/۳، خلاصة البدر المنیر: ۱۳۹/۱)

اس حدیث میں بھی وہی بات ہے کہ دعا کے وقت اشارہ کیا کرتے تھے، لہذا جب دعا ختم ہوگی تو اشارہ بھی ختم ہو جانا چاہئے، رہا انگلی کو حرکت دینے کا مسئلہ، یہ ہم

آگے پیش کریں گے۔

(۳) حضرت مالک بن نمیر خزاعی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نماز میں قاعدے میں تھے، ”واضعاً ذراعہ الیمنی علی فخذہ الیمنی ، رافعاً إصبغہ السبابة قد أحناها شیئاً وهو یدعو“ (اس حال میں کہ آپ اپنے داہنے ہاتھ کو اپنی دہنی ران پر رکھے ہوئے، اپنی شہادت کی انگلی کو اٹھائے ہوئے تھے اور دعا کرتے ہوئے کچھ جھکا دیا تھا) (سنن نسائی صغریٰ: ۱۴۲/۱، سنن نسائی کبریٰ: ۳۷۷/۱، صحیح ابن خزیمہ: ۳۵۴/۱، صحیح ابن حبان: ۲۷۲/۵، سنن بیہقی: ۱۸۹/۲)

اس حدیث میں غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ اللہ کے نبی ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی کو اشارہ کے لئے اٹھایا، اور دوسرے یہ کہ جب دعا کر رہے تھے تو اس وقت انگلی کو جھکا دیا تھا۔ اور یہ واضح بات ہے کہ اشارہ کے وقت انگلی سیدھی رہتی ہے، پس یہ انحاء (جھکانا) اس وقت ہو سکتا ہے کہ اشارہ تو باقی نہ رہے لیکن ہیئت عقد باقی رہے، یہی حنفیہ کا مسلک ہے۔

(۴) حضرت خفاف بن ایماہ بن رضہ الغفاری سے مروی ہے کہ: ”کان رسول اللہ ﷺ إذا جلس فی آخر صلاتہ یشیر بإصبغہ السبابة ، وکان المشرکون یقولون : یسحر بها“ وکذبوا ، ولکنہ التوحید“ (رسول اللہ ﷺ جب نماز کے اخیر میں بیٹھتے تو اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے تھے اور مشرکین یہ کہتے تھے کہ آپ اس سے جادو کرتے ہیں، حالانکہ یہ جھوٹے ہیں، بلکہ یہ تو توحید کا اشارہ تھا) (مسند احمد: ۵۴/۴، معجم طبرانی کبیر: ۲۱۷/۴، سنن بیہقی: ۱۹۱/۲)

علامہ بیہقی نے اس کو ”مجمع الزوائد“ میں روایت کر کے فرمایا کہ: ”رجالہ ثقات“

(اس کے راوی ثقافت ہیں) (مجمع الزوائد: ۲/۱۴۰)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ اشارہ دراصل توحید کا اشارہ تھا، اور توحید تشہد کا نام ہے؛ کیونکہ اس میں اللہ کی وحدانیت کا اقرار و شہادت ہے، اور توحید میں ایک تو غیر اللہ سے الوہیت کی نفی ہے اور دوسرے اللہ کی الوہیت کا اقرار و اثبات ہے تو اشارہ میں بھی نفی و اثبات ہونا چاہئے، اس لئے علماء حنفیہ نے اثبات کے لئے انگلی اٹھانا اور نفی کے لئے انگلی کو گرانا تجویز کیا ہے۔ جس کی تائید اوپر کی حدیث سے ہوتی ہے۔

الغرض علماء حنفیہ نے جو کہا ہے اس کی تائید کے لئے احادیث موجود ہیں، اگرچہ کہ وہ صریح نہ ہوں، لیکن یہ سب کو معلوم ہے کہ مسئلہ صرف صریح دلیل ہی کی بنیاد پر اخذ نہیں کیا جاتا، بلکہ بہت سے مسائل و دلائل کے اشارات و دلالات سے بھی لئے جاتے ہیں، لہذا ان اشارات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ”أشهد أن لا إله“ پر انگلی اٹھانا اور ”إلا الله“ پر گرا دینا چاہئے۔

انگلی کے حرکت دینے کا مسئلہ

اس کے بعد ایک اور مسئلہ اسی سے متعلق بیان کر دینا ضروری ہے، جسے مؤلف حدیث نماز نے ذکر نہیں کیا ہے، وہ یہ کہ بعض غیر مقلدین شہادت کی انگلی سے اشارہ کے وقت اس کو حرکت دینے پر بہت زور دیتے ہیں، گویا کہ یہ بہت ہی اہم ترین فرض ہے، حالانکہ جمہور علماء کے نزدیک شہادت کی انگلی سے صرف اشارہ کرنا ہے اس کو حرکت دیتے رہنا کوئی سنت نہیں ہے۔

امام نووی نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ: ”انگلی کو اٹھاتے

وقت کیا اشارہ میں حرکت دیتا رہے؟ اس میں کئی اقوال ہیں، صحیح قول جس پر جمہور نے فیصلہ کیا ہے یہ ہے کہ انگلی کو حرکت نہ دے، پس اگر اس کو حرکت دیگا تو مکروہ ہوگا، نماز باطل نہ ہوگی۔ (دیکھو مجموع: ۳/۴۱۷)

جو لوگ انگلی کو حرکت دینے کے قائل ہیں ان لوگوں نے ایک حدیث سے استدلال کیا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت وائل بن حجرؓ نے رسول اللہ ﷺ کی نماز کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا ہے کہ: ”ثم رفع إصبعه، فرأيتَه يحركها يدعو بها“ (پھر آپ نے اپنی انگلی اٹھائی، پس میں نے دیکھا کہ آپ اس کو حرکت دیتے ہوئے دعا فرما رہے تھے) (سنن بیہقی: ۱۸۹/۲، المنشی لابن الجارود: ۶۲/۱، سنن دارمی: ۳۶۲/۱، صحیح ابن خزیمہ: ۳۵۴/۱، صحیح ابن حبان: ۱۷۰/۵)

اس کی سند کو امام نووی نے مجموع میں صحیح قرار دیا ہے، اس سے بظاہر ان لوگوں کی تائید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اشارہ کے وقت انگلی کو حرکت دیتے رہنا چاہئے، مگر ایک روایت اس کے بالکل خلاف بھی ثابت ہے، جیسا کہ ابھی اوپر ہم نے امام عبدالرزاق و امام ابوداؤد وغیرہ کے حوالے سے اس کو پیش کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن الزبیر کہتے ہیں کہ: ”أن النبي ﷺ كان يشير بإصبعه إذا دعا لا يحركها“ (نبی کریم ﷺ اپنی انگلی سے اشارہ کرتے تھے جبکہ دعا کرتے، اس حال میں کہ انگلی کو حرکت نہیں دیتے تھے)

اس کی سند کو بھی امام نووی نے صحیح کہا ہے، جب دونوں حدیثیں صحیح ہیں تو ان دونوں میں تطبیق کی صورت پیدا کرنا چاہئے، اس کی صورت امام بیہقی نے اس طرح بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ: ”يحتمل أن يكون المراد بالتحريك الإشارة بها لا تكرير تحريكها، فيكون موافقاً لرواية ابن الزبير“ (ممکن ہے کہ حرکت

دینے سے مراد اشارہ کرنا ہو، نہ کہ بار بار اس کو حرکت دینا، لہذا یہ حضرت ابن الزبیر کی روایت کے موافق ہو جائے گا) (سنن بیہقی: ۱۸۹۲)

خلاصہ یہ کہ حضرت وائل بن حجر نے جو یہ کہا کہ آپ ﷺ انگلی کو حرکت دیتے تھے، تو اس سے مراد اشارہ کی حرکت ہے، کیونکہ جب انگلی سے اشارہ کریں گے تو انگلی کو حرکت ہوتی ہی ہے، یہ مراد نہیں کہ آپ بار بار اس کو حرکت دیتے رہتے تھے، اس صورت میں یہ روایت حضرت ابن الزبیر کی روایت کے موافق ہو جائے گی، جس میں ہے کہ آپ انگلی کو حرکت نہیں دیتے تھے۔

یہاں ایک سوال ہے، وہ یہ کہ اس میں ابن جریج راوی ہیں، یہ اگر چہ ثقہ عدل ہیں، مگر مدلس ہیں، بلکہ فتیح التذلیس ہیں، اور اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ مدلس اگر عنعنہ کرے تو مقبول نہیں، ہاں وہ سماع اور تحدیث کی تصریح کر دے تو اس کی روایت مقبول ہوتی ہے، اور ابوداؤد میں ابن جریج نے زیاد سے ”عن“ سے اس کو روایت کیا ہے، لہذا یہ روایت ضعیف ہونا چاہئے، اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح ابوعوانہ میں اور سنن بیہقی میں ابن جریج نے اس کو زیاد سے ”أخبرني“ کہہ کر روایت کیا ہے، لہذا یہ علت ختم ہوگئی۔ (دیکھو: صحیح ابوعوانہ: ۵۳۹/۱، سنن بیہقی: ۱۸۹۲)

یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ شیخ ناصر الدین الالبانی نے ”تمام الممنہ“ میں اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی محمد بن عجلان پر کلام کیا گیا ہے، اور ان سے چار ثقہ راویوں نے اس حدیث کو ”لَا يُحَرِّكُهَا“ کی زیادتی کے بغیر روایت کیا ہے، اسی طرح دو ثقہ حضرات نے ابن عجلان کے شیخ عامر بن عبداللہ سے اس کو اس زیادتی کے بغیر روایت کیا ہے، لہذا یہ زیادتی شاذ ہے۔ (تمام الممنہ: ۲۱۸)

میں کہتا ہوں کہ شیخ الالبانی کی یہ بات متعدد وجوہ سے صحیح نہیں، ایک تو اس لئے کہ محمد بن عجلان کو جمہور علماء نے ثقہ قرار دیا ہے، ابن حجر نے ان کو ”أحد العلماء العاملين“ کہا ہے، اور امام احمد، سفیان بن عیینہ، ابن معین، ابو زرہ، نسائی، ابو حاتم وغیرہ نے ان کو ثقہ کہا ہے، اور یعقوب بن شیبہ نے ان کو صدوق کہا ہے، ابن سعد نے کہا کہ یہ عابد و فقیہ تھے اور مسجد میں ان کا ایک حلقہ تھا اور فتویٰ دیا کرتے تھے، اور عجلان نے بھی ان کو ثقہ کہا ہے۔ (تہذیب الکمال: ۱۰۲۲۶-۱۰۸، تہذیب التہذیب: ۳۰۳۹-۳۰۴)

یہ ہے ان کے بارے میں جمہور کا فیصلہ، ہاں ایک دور بیمارک ان پر کئے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان پر سعید المقبری کی حضرت ابو ہریرہ سے روایات مختلط ہو گئی تھیں، سعید بعض احادیث حضرت ابو ہریرہ سے، بعض اپنے باپ کے واسطے سے حضرت ابو ہریرہ سے اور بعض روایات ایک اور شخص کے واسطے سے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے تھے، محمد بن عجلان پر یہ الگ الگ احادیث مختلط ہو گئیں، اور انہوں نے ان سب کو سعید المقبری کے حوالہ سے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث قرار دے دیا۔ مگر ابن حبان نے اس واقعہ کا ذکر کر کے فرمایا ہے کہ یہ کوئی ایسی کمزوری نہیں کہ اس کی وجہ سے آدمی کو ضعیف قرار دیا جائے، کیونکہ کتاب جس سے یہ حدیثیں بیان کرتے تھے وہ تو سب کی سب صحیح ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۳۰۴۹)

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ محمد بن عجلان پر صرف سعید المقبری کی احادیث میں اختلاط ہوا تھا، تمام احادیث میں نہیں، چنانچہ تہذیب الکمال میں ہے کہ ”کان داؤد بن قیس یجلس إلی ابن عجلان، یتحفظ عنہ، ویقول: إنها اختلطت علی ابن عجلان یعنی فی حدیث سعید المقبری۔ (تہذیب

(الکمال: ۱۰۶/۲۶)

لہذا اس کو تمام احادیث میں اختلاط پر محمول کرنا غلط ہے، اور اس کی بنا پر حدیث کو ضعیف کہنا محدثین کے طریقہ پر درست نہیں۔

دوسرے اس وجہ سے کہ جس طرح اس زیادتی کو شاذ شیخ الالبانی نے کہا ہے اسی طرح بعض حضرات نے وائل بن حجر کی حدیث میں ”يُحَرِّكُهَا“ کی زیادتی کو شاذ قرار دیا ہے، امام ابن خزیمہ نے اس حدیث وائل کو اپنی صحیح میں روایت کرنے کے بعد اس کے شاذ ہونے کی جانب اشارہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ: ”احادیث میں سوائے اس حدیث کے کسی میں ”يُحَرِّكُهَا“ نہیں ہے۔ (صحیح ابن خزیمہ: ۳۵۴/۱) اور خود شیخ البانی صاحب نے اسی جگہ ”تمام المنہ“ میں ذکر کیا ہے کہ ایک یمانی طالب العلم نے ”البشارة في شدوذ تحريك الإصبع في التشهد وثبوت الإشارة“ نامی ایک رسالہ میں اس زیادتی کو شاذ قرار دیا ہے۔ تو اگر یہ شاذ ہے تو وہ بھی شاذ ہے لہذا دونوں سے احتجاج ساقط ہونا چاہئے۔

اور تیسرے اس وجہ سے کہ شیخ البانی نے ”يُحَرِّكُهَا“ کی زیادتی کو حدیث وائل میں شاذ تسلیم کرنے سے اس لئے انکار کیا ہے کہ اس زیادتی کو علماء نے قبول کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر حدیث وائل اس وجہ سے شاذ نہیں رہی کہ اس کو علماء نے قبول کیا ہے تو کیا حضرت ابن الزبیر کی حدیث میں ”يُحَرِّكُهَا“ کی زیادتی کو علماء نے رد کیا ہے یا قبول کیا ہے؟ ذرا انصاف تو کیجئے کہ ایک طرف امام نووی تصریح کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، دوسری جانب جمہور علماء اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں اور انگلی کو حرکت دینے سے منع کرتے ہیں۔ کیا یہ قولی و علمی طور پر حضرت ابن الزبیر کی حدیث کو قبول کرنا نہیں ہوا؟ اور اس کی تصحیح نہیں ہوئی؟ پھر یہ تو شاذ ہی رہ

جائے کیونکہ شیخ البانی کا مسلک یہ نہیں، اور حدیث وائل علماء کے قبول کرنے کی وجہ سے شاذ نہ رہے، کیونکہ یہ ان کے مسلک کے موافق ہے۔ کیا یہی انصاف و دیانت ہے؟ حق یہ ہے کہ یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں اور ان میں تطبیق کی صورت وہی ہے جو امام بیہقی نے بیان کی ہے۔

نماز کے بعد اور اذکار کب کریں

نماز کے بعد دعا و ذکر کا موقعہ ہوتا ہے، اور احادیث میں اس سلسلہ میں مختلف اذکار و ادعیہ منقول ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ یہ اذکار و دعائیں پڑھنے کا موقعہ کونسا ہے، آیا فرض نماز کے فوری بعد یا سنت و نوافل کے بعد؟ ہمارے علماء نے تصریح کی ہے کہ جن نمازوں کے بعد سنتیں نہیں ہیں وہاں تو فرض کے بعد ہی ان اذکار و اوراد کو پورا کیا جائے اور جن نمازوں کے بعد سنن و نوافل نہیں ہیں وہاں سنن و نوافل کے بعد ان اذکار کو ادا کیا جائے۔

مگر مؤلف حدیث نماز نے فرض کے فوری بعد ان اوراد کو پڑھنے پر زور دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

”ان تمام اوراد اور دعاؤں کا وقت فرض نماز کے بعد کا ہے تاکہ دعا کی قبولیت جلد ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ فرض نماز کے بعد دعا قبول ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ نماز میں فاصلہ بھی ہو جاتا ہے، لیکن بعض لوگ فرض پڑھ کر فوراً سنت پڑھنے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور سنتوں کے بعد ان تسبیحات اور دعاؤں کو پڑھتے ہیں تو نہ مقبولیت والا موقعہ ملتا ہے اور نہ فرض و نوافل میں فاصلہ ہوتا ہے، اپنی من مانی کرنے سے بھلا نہیں ہو سکتا۔“ (حدیث نماز: ۱۷۳)

راقم کہتا ہے کہ مؤلف حدیث نماز کی یہ بات علی الاطلاق درست نہیں، کیونکہ احادیث سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ فرض کے بعد رسول اللہ ﷺ ذکر کرتے تھے مگر اس سلسلہ میں منقول تمام اذکار ہر فرض نماز کے بعد آپ پڑھتے تھے اس کا کوئی ثبوت نہیں، بلکہ ظاہر یہی ہے کہ کبھی کوئی ذکر و دعا کرتے اور کبھی دوسرا ذکر و دعا کرتے تھے، لہذا مؤلف حدیث نماز کا ان تمام اوردوا اذکار کو فرض کے بعد پڑھنے کو ضروری قرار دینا بے بنیاد بات ہے، دوسرے خود احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لمبے اور طویل اذکار و کثیر دعائیں فرض کے بعد پڑھنا اور سنتوں میں تاخیر کرنا پسندیدہ امر نہیں، اور نہ یہ اللہ کے رسول ﷺ کا معمول تھا۔ چنانچہ:

(۱) حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ: ”کان رسول اللہ ﷺ إذا سلم مکث قليلاً“ (نبی کریم ﷺ جب سلام پھیرتے تھے تو اس جگہ میں کچھ ہی دیر ٹھہرتے تھے) اس حدیث کے آخر میں ابن شہاب نے کہا کہ ہمارا خیال - واللہ اعلم - یہ ہے کہ یہ (ٹھہرنا) اس لئے تھا تا کہ عورتیں لوٹ جائیں۔ (بخاری: ۱۱۷۱، ابو داؤد: ۱۴۹۱، مسند احمد: ۳۱۰۶، مصنف عبدالرزاق: ۲۳۵۲، سنن بیہقی: ۲۶۰۲)

اس میں غور کیجئے کہ جب آپ ﷺ نماز کے بعد تھوڑی ہی دیر ٹھہرتے تھے تو طویل ذکر و اذکار فوراً بعد نماز فرض کہاں ہوتے تھے؟

(۲) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ: ”کان النبی ﷺ إذا سلم لم يقعد إلا مقدار ما يقول : اللهم أنت السلام ومنك السلام ، تباركت يا ذا الجلال والإكرام“ (نبی کریم ﷺ جب سلام پھیرتے تو صرف ”اللهم أنت السلام ومنك السلام ، تباركت يا ذا الجلال والإكرام“ پڑھنے کی مقدار بیٹھتے تھے) (مسلم: ۲۱۸، ترمذی: ۶۶۱، ابن ماجہ: ۶۶۱، مسند احمد: ۲۳۵۶، سنن بیہقی: ۲۶۰۲، سنن دارمی: ۳۵۸، صحیح ابن

خزیمہ: ۳۶۲/۱، صحیح ابن حبان: ۳۴۰/۵)

اس کا ظاہری مطلب یہی ہے کہ فرض کے بعد صرف ”اللہم انت السلام الخ کے بقدر ذکر کرتے تھے اور سنتوں میں مشغول ہو جاتے تھے، پھر حضرت ام سلمہ کی حدیث تو صاف بتا رہی ہے کہ مکث اور ٹہرنا ہی تھوڑی دیر ہوتا تھا، معلوم ہوا کہ فرض کے بعد طویل اذکار کا معمول نہیں تھا۔

اور اسی سے ایک بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ آپ ﷺ ہر نماز کے بعد یہی ایک ذکر نہیں کرتے تھے، اسی لئے حضرت عائشہ نے یہ کہا کہ ”إلا مقدار ما يقول“ کہ یہ کہنے کی مقدار بیٹھتے تھے۔ لہذا اتنے وقت میں جو بھی ذکر مناسب سمجھتے کرتے تھے، کبھی کوئی اور کبھی کوئی اور۔

(۳) حضرت انس سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ: ”صلیت مع رسول اللہ ﷺ، فكان ساعة يسلم يقوم، ثم صليت مع أبي بكر رضی اللہ عنہ، فكان إذا سلم وثب مكانه كأنه يقوم عن رصف“ (میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، پس آپ جب سلام پھیرتے اسی گھڑی کھڑے ہو جاتے تھے، پھر میں نے ابو بکر صدیق کے ساتھ نماز پڑھی، پس وہ جب سلام پھیرتے تو اپنی جگہ سے اس طرح جلدی سے اٹھ جاتے گویا کہ وہ کسی گرم پتھر سے اٹھتے ہوں) (سنن بیہقی: ۲۵۹/۲، صحیح ابن خزیمہ: ۱۹۷/۳، مستدرک: ۳۳۶/۱، معجم کبیر: ۲۵۲/۱، مصنف عبدالرزاق: ۲۴۶/۲)

جب یہ حضرات اس قدر جلدی سے نماز کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ جاتے تھے تو طول طویل ذکر وہیں بیٹھ کر کس طرح ہوتا تھا؟ معلوم ہوا کہ نماز کے بعد مختصر ذکر کرتے تھے جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے بتایا ہے، اور دیگر اذکار اس وقت نہیں

کرتے تھے، بلکہ سنتوں کے بعد کرتے تھے۔

علامہ ظفر احمد صاحب کہتے ہیں کہ: ”قلت: والظاهر أنه ﷺ كان يأتي دبر الصلاة بواحد من الأذكار، فروى كل راو بما سمع، وأما احتمال أنه كان يأتي بجميع الأذكار الواردة في دبر الصلاة كل يوم بعد كل صلاة فبعيد جداً كما لا يخفى على من له ادنى فهم“ (میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہی ہے کہ آپ ﷺ نماز کے بعد ان اذکار میں سے کوئی ایک ذکر کرتے تھے، پس ہر روایت کرنے والے نے وہ بات بیان کی جو اس نے سنی تھی، پس یہ احتمال کہ آپ ﷺ ان تمام اذکار کو ہر نماز کے بعد روزانہ پڑھتے تھے بہت ہی بعید بات ہے، جیسا کہ معمولی فہم والے پر بھی یہ بات محض نہیں) (اعلاء السنن: ۱۵۴/۳)

الحاصل احادیث میں اگر ایک جانب فرض کے بعد اذکار کا ثبوت ہے تو دوسری جانب یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ فرض کے بعد جلدی سے اٹھ کھڑے ہوتے تھے، اور صرف ”اللهم انت السلام“ والی دعا کے بقدر ہی بیٹھتے تھے، اس سے زیادہ نہیں بیٹھتے تھے۔ ان دونوں باتوں کو ملانے سے ایک بات یہ واضح ہو جاتی ہے کہ نمازوں کے بعد کے اذکار سب کے سب ایک دن نہیں پڑھے جاتے تھے، بلکہ کبھی کوئی ذکر اور کبھی دوسرا ذکر پڑھنے کا معمول تھا۔

پھر فرض کے بعد کی سنتوں میں جلدی کرنے کا حکم بھی وارد ہے، جس سے فرض اور سنن کے درمیان طویل فصل کا ناپسندیدہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ایک روایت میں حضرت حذیفہؓ سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”عجلوا الركعتين بعد المغرب، لِتُرْفَعَا مع العمل“ (مغرب کے بعد دو رکعت (سنت) پڑھنے میں جلدی کرو تا کہ وہ اس عمل کے ساتھ اٹھالی جائیں)

(شعب الایمان: ۱۲۱/۳)

(۲) حضرت حذیفہ ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ”عجلوا
الركعتين بعد المغرب ، فإنهما تُرْفَعَان مع المكتوبة“ (مغرب کے
بعد دو رکعت (سنت) پڑھنے میں جلدی کرو کیونکہ یہ دو رکعتیں فرض کے ساتھ ساتھ
اٹھائی جاتی ہیں) (الجامع الصغیر:)

علامہ سیوطی نے اس کو الجامع الصغیر میں ابن نصر کے حوالے سے روایت
کیا ہے، اور اس پر حسن کی علامت لگائی ہے۔ مگر علامہ مناوی نے اس کو ضعیف قرار دیا
ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک تو سوید بن سعید راوی ضعیف ہے اور دوسرا عبد الرحمن
العمی متروک ہے۔ (فیض القدر: ۳۰۸/۳)

(۲) حضرت مکحول سے مرفوعاً روایت ہے کہ: ”من صلی بعد
المغرب رکعتين قبل أن يتكلم كتبنا - أو رفعنا - في عليين“ (جس نے
مغرب کے بعد دو رکعتیں کلام کرنے سے پہلے پڑھیں وہ علیین میں لکھی جاتی ہیں یا یہ
کہا کہ وہ علیین میں اٹھالی جاتی ہیں) (مصنف عبدالرزاق: ۷۰۳، واللفظ له، ابن
ابی شیبہ: ۱۶۲)

یہ حدیث بھی سند کے لحاظ سے ضعیف ہے، جیسا کہ مناوی نے لکھا ہے۔
(فیض القدر: ۱۶۷/۶)

یہ روایات اگرچہ کہ ضعیف ہیں مگر ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں، ان
روایات سے معلوم ہوا کہ مغرب کی سنتوں کے پڑھنے میں تعجیل کرنا چاہئے، کیونکہ یہ
فرض نماز کے ساتھ اللہ کے دربار میں اٹھالی جاتی ہے، اور ایسی نماز علیین میں لکھی
جاتی ہے۔ اس میں بیان کردہ یہ علت کہ سنت مغرب جلدی پڑھنے سے علیین میں اٹھا

لی جاتی ہیں، یہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ بات سنت مغرب کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر نماز کا یہی معاملہ ہونا چاہئے؛ کیونکہ ہر سنت و نفل نماز فرض نماز کے تابع ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اٹھائی جاتی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ جن نمازوں کے بعد سنتیں ہیں ان کو جلدی ادا کرنا چاہئے، اور جلدی سے مراد یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے جو ذکر کی مقدار بیان کی ہے اس قدر دیر کی جائے، اس سے دیر کرنا مناسب نہیں۔ ہاں جن نمازوں کے بعد سنت نہیں ہے جیسے صلاۃ عصر و صلاۃ فجر تو ان کے بعد طویل اذکار و دعائیں پڑھنا چاہئے اور اس طرح تمام احادیث میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ (دیکھو اعلیٰ السنن: ۱۵۴/۳-۱۵۷)

علامہ ابن بطال نے شرح بخاری میں حضرت ام سلمہ کی حدیث کے تحت لکھا ہے کہ: ”وَأَمَّا مَكْتُبُ الْإِمَامِ فِي مَضَاهِ بَعْدَ السَّلَامِ ، فَقَدْ كَرِهَهُ أَكْثَرُ الْعُلَمَاءِ إِذَا كَامَ إِمَامًا رَاتِبًا إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَكْتَنًا لِعَلَّةٍ . هَذَا قَوْلُ الشَّافِعِيِّ وَأَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ . وَقَالَ مَالِكٌ : يَقُومُ وَلَا يَقْعُدُ فِي الصَّلَاةِ كُلِّهَا إِذَا كَانَ إِمَامًا مَسْجِدَ جَمَاعَةٍ ، وَإِنْ كَانَ إِمَامًا فِي السَّفَرِ فَإِنْ شَاءَ قَامَ وَإِنْ شَاءَ قَعَدَ . وَقَالَ أَبُو حَنِيفَةَ : كُلُّ صَلَاةٍ بَعْدَهَا نَافِلَةٌ فَإِنَّهُ يَقُومُ لَهَا ، وَمَا لَا نَافِلَةَ بَعْدَهَا كَالْعَصْرِ وَالْفَجْرِ ، فَإِنْ شَاءَ قَامَ وَإِنْ شَاءَ قَعَدَ ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي مَجْلَزٍ“ . (رہا امام کا اپنے مصلے پر سلام کے بعد ٹھیرنا تو اس کو اکثر علماء نے مکروہ کہا ہے، جبکہ وہ مقرر امام ہو مگر یہ کہ کسی ضرورت سے ٹھیرے، یہی امام شافعی و امام احمد کا قول ہے۔ اور امام مالک نے کہا کہ امام تمام نمازوں میں سلام کے بعد اٹھ جائے بیٹھانہ رہے جبکہ وہ جماعت والی مسجد کا امام ہو، اور اگر وہ سفر میں امام ہو ہے تو چاہے تو اٹھ جائے، اور چاہے تو بیٹھا رہے۔ اور امام ابو حنیفہ نے کہا کہ ہر وہ نماز جس کے بعد سنن و نوافل ہیں

امام ان سنن و نوافل کے لئے کھڑا ہو جائے اور جس نماز کے بعد سنن و نوافل نہیں ہیں جیسے فجر و عصر تو اگر چاہے تو اٹھ جائے اور چاہے تو بیٹھا رہے، اور یہی ابو جکڑ کا قول ہے) (شرح بخاری لابن بطلال: ۴۶۱/۲-۴۶۲)

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ جو لوگ فرض کے بعد ہی اور ادو و نوافل کو ضروری قرار دیتے ہیں اور اسی پر جمود کرتے ہیں ان کی بات صحیح نہیں بلکہ دونوں قسم کی احادیث میں جمع و تطبیق کی صورت اختیار کر کے مذکورہ طریقہ اختیار کرنا نہایت ہی انصاف اور غایت اعتدال کی بات ہے، اور اس کو من مانی کہنا مؤلف کے قصور فہم و نظر کا نتیجہ ہے۔

رہی وہ حدیث جو حضرت عبدالرحمن بن غنم نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس نے مغرب اور فجر کی نماز سے اپنے پیر موڑنے اور گھومنے سے پہلے پہلے دس مرتبہ یہ پڑھا: ”لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد بيده الخير، يحيى و يميت وهو على كل شىء قدير“ تو اس کے لئے ہر مرتبہ پر دس نیکیاں لکھی جاتی اور دس گناہ مٹائے جاتے اور دس درجات بلند کئے جاتے ہیں اور یہ اس کے لئے ہر برائی سے اور شیطان مردود سے آڑ ہوگا، اور اس کو سوائے شرک کے کوئی گناہ ہلاک نہیں کرے گا اور یہ عمل کے لحاظ سے سب سے افضل ہوگا مگر وہ شخص جو اس سے بھی افضل کوئی عمل کرے۔ (مسند احمد: ۲۲۷/۴)

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ کی جو حدیث اوپر گزری اس کے برابر کی یہ حدیث نہیں؛ کیونکہ اس میں ایک راوی شہر بن حوشب کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ راوی ثقہ ہے یا نہیں؟ دوسرے اس میں شہر بن حوشب نے سند و

متن میں اختلاف کیا ہے کبھی اس کو حضرت عبدالرحمن بن غنم سے روایت کرتے ہیں اور کبھی حضرت ابو ذر سے اور کبھی حضرت معاذ سے اور کبھی حضرت فاطمہ سے، اسی طرح متن میں کبھی ”مغرب“ کا ذکر کرتے ہیں، اور کبھی مغرب کے بجائے عصر کا ذکر کرتے ہیں، اور کبھی فجر کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل ”تمام الممتہ“ میں شیخ البانی نے کی ہے۔ (تمام الممتہ: ۲۲۸-۲۲۹)

تیسرے جن احادیث میں فرض کے بعد اذکار پڑھنے کا ذکر ہے ان میں فرض کے بعد سے مراد متصل فرض ہونا کوئی ضروری نہیں بلکہ فرض کے بعد کا حکم اس وقت بھی متحقق ہو سکتا ہے کہ سنت و نوافل سے فارغ ہو کر یہ اور ادا دعوایہ پڑھے؛ کیونکہ توابع (سنت و نفل) متبوع کے ساتھ ضمناً داخل ہو جایا کرتے ہیں۔

اور رہا یہ مسئلہ کہ فرض و سنن میں فصل ہونا چاہئے، اس لئے سنتوں سے قبل اذکار ضروری ہیں تو عرض ہے کہ اس کے لئے طویل ذکر و دعاء کی کوئی ضرورت نہیں، اور نہ یہ فصل اس پر موقوف ہے، بلکہ جس قدر فصل حضرت عائشہ و ام سلمہ کی روایات سے ثابت ہے وہ اس کے لئے کافی ہے، لہذا اس سے تمام احادیث جمع ہو گئیں۔ (واللہ اعلم)

❁ اوقاتِ صلوٰۃ ❁

مؤلف حدیث نماز نے آخر میں اوقاتِ صلوٰۃ پر بھی نظر ڈالی ہے مگر دلائل وغیرہ سے کوئی بحث نہیں کی، اس لئے ہم بھی محض مذہبِ احناف کی نشاندہی کرتے ہیں۔

فجر کا مستحب وقت

فجر کی نماز کا وقت تمام علماء و ائمہ کے نزدیک طلوع فجر سے شروع ہو کر طلوع آفتاب رہتا ہے، یہ اس کا وقت جواز ہے، رہا فجر کا مستحب وقت تو اس میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے، بعض کے نزدیک غلَس یعنی اندھیرے میں پڑھنا مستحب ہے، اور بعض کے نزدیک غلَس کے بجائے اسفار (یعنی اجالا پھیلنے پر) پڑھنا اولیٰ و افضل ہے، اور حنفیہ اسی کے قائل ہیں، اور ان کی دلیل وہ حدیثیں ہیں جن میں فجر کو اسفار میں پڑھنے کا امر بھی ہے اور فضیلت بھی وارد ہوئی ہے۔

ایک حدیث میں حضرت رافع بن خدیج سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”أسفروا بالفجر - وفي رواية - أصبحوا بالصبح؛ فإنه أعظم للاجور“ (فجر کو اسفار (یعنی خوب اجالا ہو جانے کے بعد) پڑھو؛ کیونکہ یہ زیادہ اجر کا باعث ہے) (ابوداؤد: ۶۱/۱، ترمذی: ۴۰/۱، نسائی: ۶۴/۱، ابن ماجہ: ۴۹/۱)

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا، اور امام زیلعی نے نقل کیا ہے کہ ابن القطان نے ابوداؤد کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ (نصب الراية: ۲۳۵/۱) اس کے علاوہ یہ حدیث انہی الفاظ کے ساتھ یا ذرا تغیر کے ساتھ متعدد صحابہ سے آئی ہے، حضرت بلال، حضرت انس، حضرت قتادہ بن النعمان، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو ہریرہ، و حضرت حواء انصاریہ۔ (نصب الراية: ۲۳۵/۱)

اگر سنت فجر چھوٹ جائے تو!

مؤلف حدیث نماز نے یہاں ایک مسئلہ لکھا کہ:

”اگر فجر کی سنتیں پہلے نہ پڑھ سکے تو بعد جماعت فوراً پڑھ سکتا ہے
تاخیر کرنے اور طلوع شمس کے انتظار کی کوئی ضرورت نہیں، حدیث میں
تو اس کی اجازت ہے ہی مگر عین الہدایہ میں بھی اجازت ہے۔“ (حدیث
نماز: ۱۷۷)

راقم کہتا ہے کہ ہمارے علماء کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ اگر سنت فجر چھوٹ
جائے تو طلوع شمس کے بعد اس کی قضاء کرے، اور یہی مسلک امام شافعی، امام احمد،
اسحاق بن راہویہ، سفیان ثوری، ابن المبارک وغیرہ حضرات کا ہے۔ (دیکھو سنن
الترمذی: ۹۶/۱)

مؤلف حدیث نماز نے جو لکھا ہے کہ فوراً بعد جماعت کے اس کو پڑھ سکتے
ہیں اور اس کی اجازت ہے، اس کی حدیث ترمذی اور ابوداؤد میں ہے جس میں ہے
کہ حضرت قیسؓ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز فجر پڑھی، پھر سنت پڑھنے لگے تو
نبی کریم ﷺ نے ان کو دیکھ کر فرمایا کہ دو نمازیں ایک ساتھ؟ تو قیس نے جواب دیا کہ
میری سنت فجر رہ گئی تھی، اس پر آپ نے (ابوداؤد کی روایت کے مطابق) سکوت
فرمایا (اور ترمذی کے مطابق فرمایا کہ) اس وقت کوئی حرج نہیں۔ (ابوداؤد: ۱۸۰
ترمذی: ۹۶/۱)

اس سے بعض ائمہ استدلال کرتے ہیں کہ سنت فجر رہ جائے تو جماعت کے
بعد طلوع شمس سے قبل بھی پڑھ سکتے ہیں، مگر اس میں کلام ہے، کیونکہ اولاً تو یہ الفاظ
اجازت میں صریح نہیں، اگرچہ محتمل ہیں؛ کیونکہ ہر سکوت تقریر نہیں ہوتا بلکہ سکوت مع
رضاء تو تقریر ہے، سکوت بلا رضاء کو تقریر نہیں کہہ سکتے، اور یہاں آپ کا سوال کہ کیا
دو نمازیں ایک ساتھ؟ یہ بتا رہا ہے کہ آپ اس وقت حالت رضاء میں نہیں تھے۔ پھر

ترمذی کے الفاظ ” فلا اذن “ میں دو احتمال ہیں کہ یا تو اس کے معنی یہ ہے کہ اس وقت پڑھ لو کوئی حرج نہیں، یا یہ معنی ہیں کہ اس وقت نہیں یعنی اب نہ پڑھو، لہذا اجواز میں یہ روایت بھی صریح نہیں۔

دوسرے یہ روایت ضعیف ہے جس سے اس مسئلہ پر استدلال ہی سرے سے درست نہیں، اور خود امام ترمذی نے حدیث پر کلام کیا ہے اور اس کو منقطع قرار دیا ہے کیونکہ اس کے راوی محمد بن ابراہیم نے قیس بن فہد سے سماعت نہیں کی، امام ترمذی کہتے ہیں کہ بعض حضرات نے اس حدیث کو محمد بن ابراہیم سے بلا واسطہ قیس کے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، یعنی یہ روایت مرسل ہے۔ (ترمذی: ۱/۹۶)

اور علامہ شوکانی نے جو یہ کہا کہ امام ترمذی کا یہ قول جید نہیں ہے کیونکہ یہ متصل بھی آئی ہے، اس پر مولانا ظفر احمد صاحب نے اعلاء السنن میں تعقب کیا ہے کیونکہ اس حدیث کے تمام طرق منقطع ہیں۔ (دیکھئے اعلاء السنن: ۷۳/۷)

اور احناف کی دلیل یہ ہے کہ ترمذی ہی میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ” من لم یصل رکعتی الفجر فلیصلہما بعد ما تطلع الشمس “ (جو شخص سنت فجر نہ پڑھا ہو وہ بعد طلوع شمس کے پڑھے) (ترمذی: ۱/۹۶)

اس روایت کو بقول ابن تیمیہ امام ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے، اور حاکم نے مستدرک میں صحیح قرار دیا ہے اور حافظ ذہبی نے تلخیص مستدرک میں اس کا اقرار و اعتراف کر لیا ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۳/۹۰)

امام ترمذی نے اس حدیث پر کلام کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اس سند سے ہمام سے روایت کرنے والوں میں سے سوائے عمرو بن عاصم کے کسی نے حدیث

کو اس طرح بیان نہیں کیا، اور قنادہ سے معروف حدیث اسی طرح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ”جس نے صبح کی نماز میں سے ایک رکعت پالی سورج کے طلوع ہو نے سے پہلے تو اس نے صبح کی پوری نماز پالی۔ (ترمذی: ۹۶۱/۱)

مگر اس کا جواب علماء نے دیا ہے کہ حاکم نے اور ذہبی نے اس کی صحت کو تسلیم کر لیا ہے، اور امام ترمذی کا یہ کلام اس میں قاصر نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ عمرو بن عاصم ثقہ ہیں اور ثقہ کا تفرؤ مقبول ہوتا ہے۔ لہذا اس حدیث کو قبول کیا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حنفیہ کے پاس کی دلیل مضبوط ہے جس میں بعد طلوع شمس سنت فجر کی قضاء کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

قبل فجر لیٹنے کا حکم

مؤلف حدیث نماز نے اسی جگہ ایک مسئلہ یہ بھی لکھا ہے کہ: فجر کی سنتیں پڑھ کر دہنی کروٹ پر ذرا لیٹنے کا حکم ہے (بخاری)۔ (حدیث نماز: ۱۷۷)

راقم کہتا ہے کہ بخاری میں اور دیگر کتابوں میں حضرت عائشہؓ سے صرف یہ مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ فجر کی سنتیں پڑھ کر مؤذن کے آنے تک اپنی دہنی کروٹ پر لیٹتے تھے، اور ایک روایت میں حضرت عائشہؓ ہی سے یہ بھی ہے کہ اگر میں بیدار ہوتی تو آپ مجھ سے باتیں کرتے اور اگر میں سوئی ہوتی تو لیٹ جاتے۔ (بخاری: ۱۵۵/۱)

مگر کسی حدیث میں بخاری کے اندر اس کا حکم نہیں ہے، یہ مؤلف حدیث نماز کا وہم ہے، ہاں ایک حدیث حضرت ابو ہریرہ سے ابو داؤد، ترمذی وغیرہ میں حکم کی آئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ”إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ الرُّكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ فَلْيُضْطَجِعْ عَلَى جَنْبِهِ الْأَيْمَنِ“ (جب تم میں سے کوئی

نماز صبح کی دو رکعتیں پڑھنے تو اپنے داہنے پہلو پر لیٹ جائے (ابوداؤد: ۱۷۹/۱، احمد: ۴۱۵/۲، ترمذی: ۹۶/۱)

مگر اس روایت کو امام احمد بن حنبل نے اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ، علامہ ابن القیم وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے، اور اس کی کئی وجوہات ہیں:

ایک یہ کہ اس کے ایک راوی عبد الواحد بن زیاد میں یحییٰ بن سعید القطان وغیرہ نے کلام کیا ہے، مگر ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں؛ کیونکہ عبد الواحد کو جمہور نے ثقہ تسلیم کیا ہے، بلکہ ابن عبد البر نے کہا کہ اس پر اجماع ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۳۸۵/۶)

دوسرے یہ کہ عبد الواحد بن زیاد کے استاذ امام اعظم نے اس کو عنعنہ سے روایت کیا ہے اور وہ مدلس تھے، لہذا اس وجہ سے بھی یہ روایت ضعیف ہے۔

تیسرے یہ کہ راویوں نے اس حدیث میں اختلاف کیا ہے، بعض نے حضرت ابو ہریرہ سے اس کو رسول اللہ ﷺ کے فعل کی حیثیت سے روایت کیا ہے، چنانچہ ابن ماجہ میں شعبہ نے اس حدیث کو سہیل بن صالح سے اور انھوں نے اپنے باپ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور بعض نے اس کو امر بنا کر پیش کیا ہے، جیسا کہ اوپر نقل کیا گیا، اسی لئے امام بیہقی نے کہا کہ اس کا فعل رسول ہونا زیادہ محفوظ ہے۔ لہذا یہ امر والی حدیث ثابت نہیں، بلکہ یہ دراصل فعل رسول ہے، جس کو بعض راویوں نے کسی غلط فہمی کی وجہ سے امر بنا دیا ہے۔

چنانچہ علامہ ابن القیم نے خلال کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ مروزی نے کہا کہ امام احمد نے حضرت ابو ہریرہ کی اس حدیث کے بارے فرمایا کہ: ”لیس بذلك“ اور اس کو عبد الواحد کا تفرّد قرار دیا۔ نیز ابن القیم ہی نے اولاً امام ترمذی کا قول اس حدیث کے بارے میں نقل کیا کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے، پھر اس کا رد

حافظ ابن تیمیہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ: ”وہذا باطل، لیس بصحیح وإنما الصحیح الفعل، لا الأمر بہا، والأمر تفرّد بہ عبد الواحد بن زیاد وغلط فیہ“ (یہ بات باطل ہے، صحیح تو صرف رسول اللہ ﷺ کا فعل ہے نہ کہ حکم، اور حکم کی بات عبد الواحد بن زیاد کا تفرّد ہے اور اس میں ان سے غلطی ہوئی ہے) (زاد المعاد: ۱/۲۸۹)

اس سے معلوم ہوا کہ بڑے بڑے ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ کی حکم والی حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، اور صحیح اس بات کو قرار دیا ہے کہ یہ فعل رسول ہے، مگر یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ہمیشہ ایسا نہیں کرتے تھے، بلکہ کبھی سنت فجر کے بعد لیٹ جاتے اور کبھی حضرت عائشہؓ سے باتیں فرماتے، جیسا کہ اوپر بخاری کے حوالے سے ذکر کیا گیا۔ اور اسی سے جمہور علماء نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ یہ لیٹنا واجب و سنت مؤکدہ نہیں ہے۔ چنانچہ امام قرطبی نے المفہم شرح مسلم میں اور قاضی عیاض نے اکمال المعلم شرح مسلم میں اور ابن بطلال نے اپنی شرح بخاری میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (اکمال المعلم: ۳/۲۲۳، المفہم شرح مسلم: ۱۶۹/۲، شرح ابن بطلال: ۱۵۲/۳)

علامہ ابن بطلال کی عبارت حضرت عائشہ کی حدیث کے تحت یہ ہے کہ: ”

هذا الحديث يبين أن الضجعة ليست بسنة، وأنها للراحة، فمن شاء فعلها و من شاء تركها، ألا ترى قول عائشة: فإن كنت مستيقظة حدثني وإلا اضطجع، فدل على أن اضطجاعه ﷺ إنما كان يفعله إذا عدم التحدث معها ليستریح من تعب القيام“ (یہ حدیث واضح کر رہی ہے کہ لیٹنا کوئی سنت نہیں ہے اور یہ کہ یہ آرام پانے کے لئے تھا، لہذا جو چاہے وہ کرے اور جو نہ چاہے ترک کر دے، کیا حضرت عائشہ کا قول دیکھتا نہیں کہ فرمایا کہ ”اگر میں بیدار

ہوتی تو آپ مجھ سے باتیں کرتے ورنہ لیٹ جاتے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ یہ اس وقت کرتے تھے جب حضرت عائشہ کے ساتھ بات چیت نہ رہتی، تاکہ رات کے قیام نماز کے تھکان سے آرام پاسکیں) (شرح ابن بطلال: ۱۵۲/۳)

الغرض سنت فجر کے بعد سونا کوئی سنت نہیں، بلکہ آپ کی ایک ضرورت تھی کیونکہ آپ رات میں زیادہ تر عبادت کرتے تھے لہذا آپ کو تھکان ہو جاتا تھا اس لئے کچھ دیر آرام کرنے کبھی کبھی لیٹ جاتے تھے۔

اور اس کی تائید حضرت عائشہ ہی کی ایک اور روایت سے ہوتی ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں کہ: ”إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمْ يَضْطَجِعْ لِسُنَّةٍ ، وَلَكِنَّهُ كَانَ يَدَأُبْ لَيْلَتَهُ ، فَيَسْتَرِيحُ“ (نبی کریم ﷺ سنت کی وجہ سے نہیں لیٹتے تھے، لیکن آپ رات میں تھک جاتے تھے، لہذا کچھ آرام لیتے تھے) (مصنف عبدالرزاق: ۴۳۳/۳)

اس حدیث کے بارے میں شوکانی ”نیل الاوطار“ میں کہتے ہیں کہ یہ حجت نہیں بن سکتی؛ کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے، دوسرے یہ کہ یہ بات حضرت عائشہ نے اپنے گمان سے فرمائی ہے، اور وہ حجت نہیں، حجت تو ان کی روایت میں ہے۔ (نیل الاوطار: ۲۷۳/۳)

مگر شوکانی کا یہ اعتراض صحیح نہیں؛ کیونکہ اس میں ابن جریج نے اپنے استاذ کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ: ”أخبرني من أصدق“ (مجھے اس آدمی نے خبر دی جس کو میں سچا سمجھتا ہوں) اور محدثین کے درمیان اس جملے کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ توثیق و تعدیل قابل اعتبار ہے یا نہیں؟ اس میں اکثر علماء محدثین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس کا اعتبار نہیں؛ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جس کو یہ ثقہ کہہ رہا ہے وہ دوسروں کے نزدیک ثقہ نہ ہو اور اگر وہ اس راوی کا نام لیتا تو پتہ چلتا کہ یہ کون ہے اور کیا دوسرے

بھی اس کو ثقہ سمجھتے ہیں یا نہیں، اس لئے محض یہ کہہ دینا کہ مجھ سے ایک ثقہ شخص نے بیان کیا، کافی نہیں۔ مگر امام ابوحنیفہ اور بعض محققین کے نزدیک یہ جملہ توثیق کے لئے کافی مانا جاتا ہے بشرطیکہ یہ کہنے والا اس فن جرح و تعدیل کا ماہر و عالم ہو۔ (الشذائذ الفیاح: ۲۴۴/۱-۲۴۵، الممتع: ۲۵۴-۲۵۵)

امام ابن الصلاح نے ”مقدمہ“ میں اور امام نووی نے ”ارشاد طلاب الحقائق“ میں یہ دوسرا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ”فإن كان القائل عالماً أجزأ ذلك في حق من يوافق في مذهبه على ما اختاره بعض المحققين“ (اگر یہ کہنے والا ماہر فن ہے تو یہ بات اس شخص کے حق میں کافی ہے جو اس کے مسلک میں اس سے موافقت رکھتا ہو، جیسا کہ بعض محققین نے اختیار کیا ہے) (مقدمہ ابن الصلاح: ۶۱، ارشاد طلاب الحقائق: ۲۸۹/۱)

اور خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن مہدی، امام مالک بن انس اور یحییٰ بن سعید القطان کا بھی یہی مسلک ہے۔ (الشذائذ الفیاح: ۲۴۵/۱، توضیح الافکار: ۱۷۱/۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے اور محققین کی ایک جماعت اس میں اس طرف ہے کہ اس جملہ سے تعدیل ہو جائے گی۔ لہذا اس قول پر یہ حدیث قابل قبول ہوگی۔

رہا علامہ شوکانی کا دوسرا اعتراض کہ یہ بات حضرت عائشہ نے محض اپنے گمان سے فرمائی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ شوکانی کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ انھوں نے محض گمان سے فرمایا، یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے سنا ہو اور اس کو وہ بیان فرماتی ہوں؟ دوسرے اگر اس کو ان کا

گمان ہی مان لیں تب بھی حضرت عائشہ سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کے معمولات سے واقفیت رکھتی تھیں، انہوں نے آپ کے معمولات میں اس لیٹنے کے بارے میں جو محسوس کیا وہ بیان کیا ہے، اور ان کا یہ احساس و اندازہ امید ہے کہ صحیح ہی ہوگا، اور اس کے غلط ہونے کی کوئی دلیل نہیں، لہذا اس کو قابل قبول ہی سمجھا جائے گا۔

الغرض اس حدیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ نہ ہمیشہ کا معمول تھا اور نہ ہی سنت کے طور پر تھا بلکہ رات کی عبادت کا تعب و تھکان اتارنے کے لئے ذرا سا کبھی کبھی لیٹ جاتے تھے۔ اس لئے اگر کوئی رات میں عبادت کا عادی ہو تو اس کے لئے بھی یہ مستحب ہوگا، اور جو رات بھر سو کر اٹھا ہو اس کے لئے مستحب نہ ہوگا۔

علامہ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا کہ: ”وفائدة ذلك الراحة والنشاط لصلاة الصبح وعلى هذا فلا يستحب ذلك إلا للمتهدد ، وبه جزم ابن العربي ، ويشهد له ما أخرجه عبد الرزاق أن عائشة كانت تقول : إن النبي ﷺ لم يضطجع لسنة ولكنه كان يدأب ليلته فيستريح “ (اس لیٹنے کا فائدہ راحت پانا اور صبح کی نماز کے لئے نشاط حاصل کرنا ہے، اور اس بنا پر یہ صرف عبادت میں مجاہدہ کرنے والے کے لئے مستحب ہوگا، اور علامہ ابن العربی نے اسی پر جزم کیا ہے، اور اس کی شہادت وہ حدیث دیتی ہے جسے عبد الرزاق نے حضرت عائشہ سے روایت کیا کہ انہوں نے کہا کہ حضرت نبی کریم ﷺ سنت کی وجہ سے لیٹتے نہیں تھے بلکہ رات میں آپ تھک جاتے تھے تو آرام لیتے تھے) (فتح الباری: ۴۳/۳)

باقی اس کا حکم کیا ہے اس میں علماء کے خیالات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ علامہ شوکانی نے اس مسئلہ میں علماء کے چھ اقوال نقل کئے ہیں: (۱) استحباب (۲) وجوب (۳) خلاف اولی (۴) کراہت، اور اس قول کے بارے میں قاضی عیاض

سے نقل کیا ہے کہ جمہور علماء کا یہی قول ہے (۵) رات میں عبادت کرنے والے کے لئے استحباب، اور دوسروں کے لئے غیر مشروع (۶) لیٹنا مقصود نہیں بلکہ سنت و فرض میں فرق کرنا مقصود ہے لہذا وہ لیٹنے سے یا کلام سے یا کسی اور طریقہ سے ہو سکتا ہے۔
(نیل الاوطار: ۲۷/۳)

علامہ ابن بطل شرح بخاری میں لکھتے ہیں کہ: ”وذهب جمہور العلماء إلى أن هذه الضجعة إنما كان يفعلها للراحة من تعب القيام، وكرهوها“ (جمہور علماء اس طرف گئے ہیں کہ یہ لیٹنا رات کے قیام کی تھکان سے راحت پانے کے لئے آپ ﷺ نے کیا تھا، لہذا ان حضرات نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے) (شرح بخاری: ۱۵۱/۳)

لہذا جمہور کے قول کے مطابق سنت فجر کے بعد لیٹنا مکروہ ہوگا، اور اس کی تائید بعض صحابہ و تابعین کے اقوال سے ہوتی ہے۔ چنانچہ ابن ابی شیبہ نے حضرت سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ابن عمر نے ایک شخص کو دیکھا جو سنت فجر کے بعد لیٹا ہوا ہے تو فرمایا کہ اس کو کنکریاں مارو، یا یہ فرمایا کہ کیوں نہیں کنکریاں مارتے؟۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۵۴/۲)

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس روایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کو صحیح قرار دیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں: ”وقد صح عن ابن عمر أنه كان يحصب من يفعله في المسجد، أخرجه ابن أبي شيبة“۔ (فتح الباری: ۴۴/۳)

اور حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ آپ نے کہا کہ: ”مابال الرجل إذا صلى الركعتين يتمعك كما يتمعك الدابة والحصان، إذا سلم قعد، فصلی“ (آدمی کو کیا ہوا کہ دو رکعتیں پڑھ کر اس طرح زمین پر لوٹتا ہے جیسے جانور اور گدھا لوٹتا ہے، جب سلام پھیر دے تو بیٹھ جائے پھر نماز پڑھ لے)

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۵۵/۲)

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کی جانب اشارہ کر کے اس پر سکوت کیا ہے جو ان کے نزدیک اس کے صحیح یا حسن ہونے کی علامت کہا ہے۔ (دیکھو: فتح الباری: ۲/۲۳۳)

ابن ابی شیبہ ہی نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو جہل نے حضرت ابن عمر سے سنت فجر کے بعد دہنی کروٹ پر لیٹنے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ”یتلعب بکم الشیطان“ (تم سے شیطان کھیل رہا ہے) (مصنف ابن ابی شیبہ: ۵۵/۲)

ایک روایت میں ہے کہ ابن عمر نے کچھ لوگوں کو سنت فجر کے بعد لیٹا ہوا دیکھا تو لوگوں کو بھیج کر ان کو منع کیا، انہوں نے کہا کہ ہم اس سے سنت کا ارادہ کرتے ہیں، ابن عمر نے قاصد سے کہا کہ انہیں جا کر کہہ دو کہ یہ بدعت ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۵۵/۲)

اور خود حضرت ابن عمر بھی سنت فجر کے بعد لیٹتے نہیں تھے، حضرت مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے سفر و حضر میں حضرت ابن عمر کی صحبت اٹھائی ہے، میں نے ان کو سنت فجر کے بعد لیٹتے نہیں دیکھا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۵۴/۲)

اور ابن ابی شیبہ ہی نے حضرت ابراہیم نخعی، حضرت سعید بن المسیب اور حضرت حسن بصری وغیرہ سے بھی اس کی کراہت نقل کی ہے۔

وقت ظہر

ظہر کی نماز کا وقت سورج کے ڈھل جانے کے بعد شروع ہو جاتا ہے اور اس میں سب کا اتفاق ہے، مگر اس کا وقت کب تک رہتا ہے اس میں اختلاف ہے، جمہور

علماء کا مذہب یہ ہے کہ ظہر کی نماز ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہونے تک رہتا ہے پھر ختم ہو جاتا ہے اور امام ابوحنیفہ کا ایک قول بھی یہی ہے، اور ان کا دوسرا قول اور مذہب یہ ہے کہ ہر چیز کا سایہ دو مثل ہونے تک رہتا ہے، مگر حنفی علماء نے بیان کیا ہے کہ اختلاف سے نکلنے کے لئے ایک مثل پر ہی پڑھ لینا چاہئے، الا یہ کہ کوئی عذر ہو جیسے شدید گرمی وغیرہ تو پھر امام صاحب کے قول پر عمل کرے۔

امام ابوحنیفہ نے اس سلسلہ میں جن دلائل سے استدلال کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، مؤذن نے اذان دینا چاہا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اُبرد“ (یعنی وقت ٹھنڈا ہونے دو)، پھر کچھ دیر بعد مؤذن نے اذان دینا چاہا تو فرمایا کہ ”اُبرد“ (یعنی وقت ٹھنڈا ہونے دو) پھر کچھ دیر بعد مؤذن نے اذان دینا چاہا تو فرمایا کہ ”اُبرد حتی ساوی الظل التلول“ (یعنی وقت ٹھنڈا ہونے دو) یہاں تک کہ سایہ ٹیلوں کے برابر ہو جائے۔ (بخاری: ۸۷۱/۱، ترمذی: ۴۱/۱، ابوداؤد: ۵۸/۱)

اس حدیث میں قابل غور یہ ہے کہ مؤذن نے پہلی بار اذان کا ارادہ کیا تو ظاہر ہے کہ وقت ظہر یقیناً شروع ہو چکا تھا، مگر آپ نے فرمایا کہ وقت میں ٹھنڈک آنے دو، پھر مؤذن نے انتظار کیا اور کچھ دیر بعد اذان کا ارادہ کیا تو آپ نے وہی فرمایا، مؤذن نے پھر انتظار کیا، اور کچھ دیر بعد تیسری دفعہ اذان کا ارادہ کیا تو آپ نے اس دفعہ بھی یہی فرمایا، اور ایک بات یہ بھی فرمائی کہ جب تک چیزوں کا سایہ ٹیلوں کے برابر نہ ہو انتظار کرو، اس میں ایک تو تین تین دفعہ ارادے کے باوجود مؤذن کو انتظار کرانا بتا رہا ہے کہ ظہر کا وقت ہو جانے کے باوجود کافی دیر تک اللہ کے رسول ﷺ نے نماز ظہر نہیں پڑھی اور اذان بھی نہیں دی گئی، دوسرے یہ جو فرمایا کہ ”

سایہ ٹیلوں کے برابر ہو جائے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک مثل کے بعد دوسرے مثل میں نماز ظہر پڑھی گئی؛ کیونکہ ٹیلوں کے برابر سایہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ وہ ایک مثل سے بڑھ جائے۔

علامہ نووی شرح مسلم میں اسی حدیث کے تحت لکھتے ہیں کہ: ”أنه أخر تأخيراً كثيراً حتى صار للتلول فيء ، والتلول منبطحة غير منتصبه ، ولا يصير لها فيء في العادة إلا بعد زوال الشمس بكثير“ (یعنی آپ ﷺ نے بہت زیادہ تاخیر کی حتیٰ کہ ٹیلوں کا بھی سایہ ہونے لگا، حالانکہ وہ دبے ہوئے پھیلے ہوئے ہوتے ہیں کھڑے ہوئے نہیں، اور عادتاً ان کا سایہ زوال شمس کے بہت بعد ہی ہوتا ہے) (شرح مسلم: ۲۲۴/۱)

اور علامہ شوکانی نے بھی اسی کے مثل لکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: ”والمراد أنه أخر تأخيراً كثيراً حتى صار للتلول فيء ، وهي منبطحة لا يصير لها فيء في العادة إلا بعد زوال الشمس بكثير“ (مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بہت زیادہ تاخیر کی حتیٰ کہ ٹیلوں کا بھی سایہ ہونے لگا، حالانکہ وہ پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور عادتاً ان کا سایہ زوال شمس کے بہت بعد ہی ہوتا ہے) (نیل الاوطار: ۳۸۶/۱)

نیز علامہ ابن حجر اسی حدیث پر بحث کے دوران تصریح کرتے ہیں کہ: ”ظاہرہ يقتضي أنه أخرها إلى أن صار ظل كل شيء مثله“ (اس حدیث کا ظاہر تقاضا کرتا ہے کہ آپ ﷺ نے نماز ظہر کو ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہونے تک مؤخر کیا) (فتح الباری: ۲۱/۲)

جب ایک مثل تک مؤخر کیا تو معلوم ہوا کہ دوسرے مثل میں نماز ظہر ادا فرمائی، اور یہ بات واضح ہے کہ اگر اس وقت تک ظہر کا وقت باقی نہ ہوتا تو آپ مؤخر

کر کے نماز کو قضاء ہرگز ہرگز نہ فرماتے، یہی امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے کہ نماز ظہر کا وقت دو مثل تک رہتا ہے۔

اس سلسلہ میں مجتم اوسط میں طبرانی نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے اوقات نماز کا سوال کیا، تو آپ ﷺ نے دو دنوں تک وقت و وقت پر نماز پڑھ کر دکھایا، اس میں ظہر و عصر کے بارے میں دوسرے دن کی نمازوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت جابر کہتے ہیں کہ: ”ثم أذن بلال الغد للظھر حين دلکت الشمس ، فأخرا رسول اللہ ﷺ حتى صار مثل کل شیء مثله ، فأمره ، فأقام و صلی ، ثم أذن للعصر فأخرا رسول اللہ ﷺ حتى صار ظل کل شیء مثليه ، فأمره ﷺ ، فأقام و صلی“ (پھر حضرت بلال نے دوسرے دن ظہر کی اذان سورج ڈھل جانے کے بعد دی، پس اللہ کے رسول ﷺ نے اس نماز کو مؤخر کیا حتیٰ کہ ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہو گیا، تو ان کو حکم دیا، پس اقامت کہی اور نماز پڑھی، پھر حضرت بلال نے عصر کی اذان دی پس آپ ﷺ نے اس کو بھی مؤخر کیا حتیٰ کہ ہر چیز کا سایہ دو مثل ہو گیا، تب آپ نے ان کو حکم دیا، پس اقامت کہی اور نماز پڑھی) (مجمع الزوائد: ۳۰۴/۱)

اس حدیث کو امام پیشی نے مجمع الزوائد میں ذکر کر کے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ ایک مثل ہونے کے بعد ظہر کا وقت رہتا ہے اور دو مثل ہو جانے کے بعد عصر کا وقت ہوتا ہے، ورنہ رسول اللہ ﷺ ظہر کو مؤخر کر کے دوسرے مثل میں کیوں پڑھتے؟

اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ابو ہریرہ، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے الفاظ کے ذرا سے فرق کے ساتھ

مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَأَبْرِدُوا بِالصَّلَاةِ ، فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ“ (جب گرمی شدید ہو تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو؛ کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی لپٹ سے ہوتی ہے) (بخاری: ۷۶۱، مسلم ۲۳۴۱، ترمذی: ۴۰۱، ابوداؤد: ۵۸۱، نسائی: ۵۹۱، ابن ماجہ: ۴۹۱)

اور حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”أَبْرِدُوا بِالظُّهْرِ ، فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ“ (نماز ظہر کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو، کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی لپٹ سے ہوتی ہے) (بخاری: ۷۷۱، ابن ماجہ: ۴۹۱)

الغرض ان احادیث سے معلوم ہوا کہ نماز ظہر کا وقت سایہ کے دو مثل ہونے تک باقی رہتا ہے، اور حضرت ابو ہریرہ نے بھی یہی بات فرمائی ہے۔ چنانچہ عبد اللہ بن رافع سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت ابو ہریرہ سے نماز کے اوقات کا سوال کیا، تو آپ نے کہا کہ: ”صَلِّ الظُّهْرَ إِذَا كَانَ ظِلُّكَ مِثْلَكَ وَالْعَصْرَ إِذَا كَانَ ظِلُّكَ مِثْلِيكَ الْخ“ (نماز ظہر اس وقت پڑھ جب تیرا سایہ ایک مثل ہو جائے اور عصر اس وقت پڑھ جب سایہ دو مثل ہو جائے) (موطا مالک: ۳)

اس کی سند کو علامہ نیوی نے آثار السنن میں صحیح قرار دیا ہے۔ (آثار السنن: ۴۲۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہ نے ایک مثل ہو جانے کے بعد ظہر پڑھنے کا حکم دیا ہے اور دو مثل ہو جانے کے بعد عصر پڑھنے کا حکم دیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مثل کے بعد دوسرے مثل میں ظہر کا وقت رہتا ہے اور دوسرے مثل کے بعد عصر کا وقت ہوتا ہے۔

نماز عصر

نماز عصر کا ابتدائی وقت ظہر کے ختم پر شروع ہوتا ہے، اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اوپر ذکر کردہ دلائل کی وجہ سے ظہر کا وقت دو مثل تک رہتا ہے، لہذا عصر کا وقت دو مثل کے بعد شروع ہوگا۔ جیسا کہ حضرت جابر بن عبد اللہ کی حدیث اور حضرت ابو ہریرہ کے اثر سے معلوم ہوا۔

نماز مغرب

یہ وقت سب کے نزدیک متفق علیہ ہے، اگرچہ شفق کی تفسیر میں اختلاف ہے بعض حضرات نے شفق اس سرخی کو قرار دیا ہے جو بعد غروب آفتاب آسمان پر دکھائی دیتی ہے، اور بعض نے کہا کہ شفق وہ سفیدی ہے جو سرخی کے غروب ہو جانے کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ جو لوگ شفق کی تفسیر سرخی سے کرتے ہیں ان کے نزدیک مغرب کا وقت اس کے ختم ہو جانے پر ختم ہو جاتا ہے، یہی مسلک امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق بن راہویہ اور داؤد ظاہری کا ہے، اور جو لوگ سفیدی کو شفق کہتے ہیں ان کے نزدیک اس سفیدی کے ختم ہونے تک مغرب کا وقت باقی رہتا ہے۔ اور یہی امام ابوحنیفہ، امام عبد اللہ بن المبارک، ایک روایت میں امام اوزاعی و امام مالک، نیز امام زفر، ابو ثور، وغیرہ کا مسلک ہے۔ اور یہی بات حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عائشہ، ابو ہریرہ، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، عبد اللہ بن الزبیر سے مروی ہے۔ (عمدة القاری: ۵۶۶/۲)

قبل مغرب نفل کا حکم

مؤلف حدیث نماز نے لکھا ہے کہ: ”مغرب کی اذان ہونے پر دو رکعت

نفل پڑھ سکتے ہیں، لیکن ہمیشہ عادت بنا لینا ٹھیک نہیں ہے، حنفی مذہب کی کتاب غایتہ الاوطار اردو ترجمہ درمختار میں ہے کہ مغرب سے پہلے دو رکعت ثابت ہیں۔ (حدیث نماز: ۱۸۰)

میں کہتا ہوں کہ یہ بات صحیح ہے کہ حدیث میں مغرب سے پہلے نماز نفل کا ذکر آیا ہے، چنانچہ حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ جب مؤذن اذان دیتا تو صحابہ میں سے کچھ لوگ ستونوں کی طرف جلدی کرتے اور رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے تک دو رکعتیں نماز مغرب سے پہلے پڑھ لیتے۔ اور مسلم میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی اجنبی مسجد میں داخل ہوتا تو کثرت کے ساتھ اس نماز کو پڑھنے والوں کی وجہ سے یہ گمان کرتا کہ نماز ہو چکی ہے۔ (بخاری: ۸۷۱، مسلم: ۲۷۸)

مگر یہ سنت نہیں ہے اسی لئے ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن مغفل سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”صلوا قبل المغرب، صلوا قبل المغرب“ (مغرب سے پہلے نماز پڑھو مغرب سے پہلے نماز پڑھو) اور تیسری دفعہ فرمایا کہ: ”صلوا قبل المغرب لمن شاء“، (مغرب سے پہلے نماز پڑھو یہ حکم اس کے لئے ہے جو چاہے) حضرت عبداللہ بن مغفل کہتے ہیں کہ یہ آپ نے اس لئے فرمایا کہ کہیں لوگ اس کو سنت نہ بنالیں۔ (بخاری: ۱۵۷۱، ابوداؤد: ۱۸۲۱)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی مستقل سنت نہیں ہے بلکہ کوئی چاہے تو پڑھ سکتا ہے، کیونکہ یہ اولاً تو رسول اللہ ﷺ کا معمول نہیں تھا، جیسا کہ حضرت انس کی اوپر ذکر کردہ حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہ میں سے کچھ حضرات تو اس کو پڑھتے تھے مگر رسول اللہ ﷺ تشریف لا کر نماز پڑھاتے تھے، پھر صحابہ میں سے بھی کچھ لوگ تو اس کو پڑھتے تھے، سب کا پڑھنا ثابت نہیں، بلکہ حضرت طاوس سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر

سے اس نماز کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ: ”ما رأیت أحدا یصلیہا علی عہد رسول اللہ ﷺ“ (میں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کسی کو یہ نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا) (ابوداؤد: ۱۸۲۱)

الغرض مغرب سے پہلے دو رکعت نماز نفل ثابت ہے مگر عادت کے طور پر نہیں، بلکہ کوئی کبھی موقعہ پا کر پڑھ لے تو گنجائش ہے۔

نمازِ عشاء

عشاء کا وقت شروع ہوتا ہے جب مغرب کا وقت ختم ہوتا ہے اور مغرب کا وقت غروب شفق پر ختم ہوتا ہے اس لئے عشاء کا وقت شفق کے غروب ہو جانے کے بعد شروع ہوگا، اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ شفق کی تفسیر میں اختلاف ہے، لہذا اس اختلاف کی وجہ سے یہاں عشاء کے ابتدائی وقت میں بھی اختلاف ہے، جو حضرات شفق سرخی کو قرار دیتے ہیں ان کے پاس سرخی ختم ہونے کے بعد عشاء کا وقت شروع ہو جائے گا اور جو حضرات شفق کے معنی سفیدی قرار دیتے ہیں ان کے پاس سفیدی کے ختم ہونے پر عشاء کا وقت شروع ہوگا۔

اور عشاء کا وقت کب تک باقی رہتا ہے اس میں بھی اختلاف ہے، امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ ایک تہائی رات تک نماز عشاء کا وقت رہتا ہے اور ایک قول میں نصف رات تک رہتا ہے، اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک عشاء کا وقت پوری رات رہتا ہے، ہاں افضل یہ ہے کہ ایک ثلث تک پڑھ لے۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل ایک تو حضرت عائشہ کی حدیث ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ: ”اعتم رسول اللہ ﷺ ذات لیلة حتی ذہب عامة اللیل وحتى نام أهل المسجد ثم خرج فصلی ، فقال: إنه لوقتہا“ (ایک رات رسول اللہ

ﷺ نے تاخیر کر دی یہاں تک کہ رات کا اکثر حصہ گزر گیا اور یہاں تک کہ مسجد والے سو گئے، پھر آپ تشریف لائے اور نماز پڑھی، اور فرمایا کہ یہ اس کا وقت ہے) (مسلم: ۲۲۹/۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے رات کا اکثر حصہ گزرنے کے بعد نماز عشاء پڑھی، لہذا نصف رات کے بعد بھی اس کا وقت باقی رہنا اس سے مفہوم ہوتا ہے۔

امام طحاوی نے حضرت نافع بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے حضرت ابو موسیٰ کو خط لکھا کہ: ”وَصَلِّ الْعِشَاءَ أَيَّ اللَّيْلِ شِئْتُمْ وَلَا تَغْفُلْهَا“ (عشاء کے نماز رات کے کسی بھی حصہ میں پڑھ لے اور اس میں غفلت نہ کر) (طحاوی: ۱۱۸/۱)

اور امام طحاوی ہی نے حضرت عبید بن جریج سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے حضرت ابو ہریرہ سے کہا کہ: ”مَا أَفْرَاطُ الْعِشَاءِ“ (عشاء کی نماز میں حد سے بڑھ جانا کیا ہے) تو کہا کہ ”طُلُوعُ الْفَجْرِ“ (طلوع فجر) (طحاوی: ۱۱۸/۱) علامہ شوق نیوی نے ان کو نقل کیا ہے اور پہلی روایت کے بارے میں کہا کہ اس کے رجال ثقہ ہیں اور دوسری کے بارے میں کہا کہ اس کی سند صحیح ہے۔ (آثار السنن: ۴۴۱/۱)

ان سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عشاء کی نماز کا انتہائی وقت فجر تک رہتا ہے، مگر ایک ثلث یا نصف رات تک پڑھ لینا چاہئے، اور نصف رات کے بعد کا وقت کراہت سے خالی نہیں۔

رکعات وتر

مؤلف نے اس میں وتر کا مسئلہ بھی بیان کیا ہے کہ وتر کی رکعات ایک یا تین یا پانچ ہیں اور محدثین کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا کہ انہوں نے ایک وتر کو پسند کیا ہے اور عین الہدایہ کے حوالے سے لکھا کہ ایک وتر پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ (حدیث نماز: ۱۸۱)

راقم کہتا ہے کہ وتر کی مختلف رکعتوں کا احادیث میں ذکر ہے، مگر حنفی مذہب میں تین کو ترجیح دی گئی ہے، اور اس کے دلائل یہ ہیں:

(۱) حضرت ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز رمضان میں کیسی ہوتی تھی؟ حضرت عائشہ نے کہا کہ: ”ماکان رسول اللہ ﷺ یزید فی رمضان و لا فی غیرہ علی إحدی عشرة رکعة ، یصلي أربعاً ، فلا تسأل عن حسنہم و طولہن ، ثم یصلي أربعاً ، فلا تسأل عن حسنہم و طولہن ، ثم یصلي ثلاثاً“ (رسول اللہ ﷺ نہ رمضان میں گیارہ رکعتوں پر زیادہ کرتے تھے اور نہ غیر رمضان میں، پس آپ چار رکعت پڑھتے، ان کے حسن اور ان کی لمبائی کو نہ پوچھو، پھر چار رکعت پڑھتے ان کے حسن و لمبائی کو نہ پوچھو، پھر تین رکعت پڑھتے) (بخاری: ۱۵۴۱، مسلم: ۲۵۴۱)

اس میں نماز تہجد اور اس کے بعد وتر کا ذکر ہے، اور وتر کی تین رکعتیں بتایا ہے، معلوم ہوا کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں۔

(۲) حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سوئے، تو آپ رات میں بیدار ہوئے اور مسواک کی، اور وضو فرمایا، پھر آگے آپ کی نماز کا ذکر فرماتے ہوئے کہتے ہیں..... پھر آپ نے تین رکعت وتر پڑھیں۔ (مسلم: ۲۶۱۱)

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس سے ہی مروی ہے کہ: ”أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يُوتِرُ بِسَبْحِ اسْمِ رَبِّكَ الْأَعْلَى، وَقَالَ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ، وَقَالَ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ“ (رسول اللہ ﷺ وتر ان سورتوں سے پڑھتے تھے، ایک ”سبح اسم ربك الأعلى“ اور ”قل يا أيها الكافرون“، اور ”قل هو الله أحد“ سے) (ترمذی: ۱۰۶۱، نسائی: ۱۹۱، ابن ماجہ: ۸۲، طحاوی: ۲۰۲)

اسی طرح حضرت عائشہ اور حضرت ابی بن کعب سے بھی روایت موجود ہے، اس سے معلوم ہوا کہ وتر تین رکعتیں ہیں، اور رسول اللہ ﷺ اسی طرح عام طور پر پڑھتے تھے۔

اور صحابہ کا بھی یہی معمول تھا جس کا ذکر متعدد آثار میں ہے۔

(۱) حضرت مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت ابو بکر کو دفن کیا تو حضرت عمر نے کہا کہ میں نے وتر نہیں پڑھی ہے، پھر وتر پڑھنے کھڑے ہو گئے، اور ہم نے ان کے پیچھے صفیں بنالیں، پس آپ نے ہمیں تین رکعت وتر پڑھائی جن میں صرف اخیر میں سلام پھیرا۔ (طحاوی: ۲۰۶)

(۲) نیز حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ: ”الوتر ثلث کوتر النهار صلاة المغرب“ (وتر تین رکعات ہیں جیسے دن کی وتر مغرب ہے) (طحاوی: ۲۰۶)

(۳) حضرت ابو خالدہ نے کہا کہ میں نے ابو العالیہ سے وتر کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ: ”علمنا أصحاب محمد ﷺ أن الوتر مثل صلاة المغرب، غير أنا نقرأ في الثالثة، فهذا وتر الليل وهذا وتر النهار“ (ہمیں صحابہ کرام نے سکھایا کہ وتر مغرب کی نماز کی طرح ہے، مگر یہ کہ ہم

اس کی تیسری رکعت میں قرأت کرتے ہیں، پس یہ رات کی وتر ہے اور یہ دن کی وتر ہے) (طحاوی: ۲۰۶/۱)

(۴) حضرت انس سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ ”الوتر ثلاث رکعات، وکان یوتر بثلاث رکعات“ (وتر تین رکعات ہیں اور وہ خود بھی تین رکعات وتر پڑھتے تھے) (طحاوی: ۲۰۶/۱)

اوپر کی تین روایات کو علامہ نیوی نے آثار السنن میں صحیح کہا ہے، اور اس آخری روایت کے بارے میں حافظ ابن حجر نے الدرایہ میں کہا کہ اس کی سند صحیح ہے، اسی طرح علامہ مہدی حسن نے ان سب آثار کو صحیح قرار دیا ہے۔ (آثار السنن: ۱۲۲-۱۳، الدرایہ: ۱۹۲/۱، قلاندالازہار: ۱۵۴/۲)

عین الہدایہ کا حوالہ

مؤلف نے جو اس موقع پر عین الہدایہ کا حوالے دیکر لکھا ہے کہ ”ایک وتر پر مسلمانوں کا اجماع ہے، مجھے عین الہدایہ میں تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا، ہاں اس کے خلاف اس میں ایک عبارت یہ ملی کہ حضرت حسن بصری نے تین رکعات وتر پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے اور اس پر ابن ابی شیبہ کا حوالہ دیا ہے، پھر اس کو ضعیف الاسناد کہا ہے۔ (عین الہدایہ: ۶۷۵/۱)

مگر ایک وتر پر اجماع کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا، بلکہ اس میں پوری بحث کے دوران تین رکعات وتر کو ثابت کیا گیا ہے اور اس پر متعدد احادیث سے استدلال پیش کیا گیا ہے۔ لہذا مؤلف کے ذمہ ہے کہ وہ عین الہدایہ سے ان کی اصل عبارت لکھ کر مع قید صفحہ بتائیں۔

دعاء قنوت

نماز وتر میں قنوت کن الفاظ سے پڑھیں؟ اس میں دودعائیں معروف ہیں

ایک یہ ہے:

(۱) حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے چند کلمات سکھائے جنہیں میں وتر میں قنوت میں پڑھوں، وہ یہ ہیں: اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِيْ فِيمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنِيْ فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لِيْ فِيمَا اَعْطَيْتَ ، وَ قِنِيْ شَرَّ مَا قَضَيْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضَى عَلَيْكَ وَ اِنَّهُ لَا يَدُلُّ مَنْ وَّالَيْتَ ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَ تَعَالَيْتَ۔ (ترمذی: ۱۰۶۱، نسائی: ۱۹۵/۱)

اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن کہا ہے۔

(۲) حضرت خالد بن ابی عمران تابعی سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ قبیلہ مضر پر بدعا کر رہے تھے، اسی درمیان میں حضرت جبریل آئے اور آپ کو اشارہ کیا کہ سکوت فرمائیں، آپ خاموش ہو گئے تو فرمایا کہ اے محمد! اللہ تعالیٰ نے آپ کو لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا بلکہ آپ کو رحمت بنا کر بھیجا ہے پھر آپ کو یہ قنوت سکھایا: اللھم انا نستعینک و نستغفرک و نؤمن بک و نخنع لک و نخلع و نترک من یکفرک، اللھم ایاک نعبد و لک نصلی و نسجد و ایلک نسعی و نحفد و نرجو رحمتک و نخشی عذابک الجد، ان عذابک بالکافرین ملحق۔ (سنن بیہقی: ۲/۲۹۸، المدوۃ الکبریٰ: ۱۰۰/۱)

یہ حدیث مرسل ہے؛ کیونکہ اس کے راوی خالد بن ابی عمران صحابی نہیں، بلکہ تابعی ہیں اور انھوں نے اس میں کسی صحابی کا حوالہ نہیں دیا ہے، مگر جمہور علماء فقہ

کے نزدیک مرسل حدیث مقبول ہے، ہم نے اس مسئلہ پر بہت تفصیل کے ساتھ ”فاتحہ خلف الامام“ کے تحت کلام کر دیا ہے، لہذا اعادہ کی ضرورت نہیں، بس یاد دہانی کے لئے ایک دو حوالے ذکر کرتے ہیں۔

امام ابوداؤد نے اہل مکہ کے نام خط میں لکھا ہے کہ:

”اما المراسیل فقد کان یحتج بہا العلماء فی ما مضی مثل سفیان الثوری ومالك والاوزاعي حتی جاء الشافعی، فتکلم فیہ وتابعه علی ذلك أحمد بن حنبل وغيره“۔ (رسالة ابی داؤد الی اهل مكة: ۲۴)

اور امام ابن جریر الطبری نے کہا کہ:

”وأجمع التابعون بأسرهم علی قبول المرسل ولم یأت عنہم إنکاره ولا عن أحد من الائمة بعدهم إلی رأس المأتین، قال ابن عبدالبر: كأنه یعنی أن الشافعی أول من رده۔“ (تدریب الراوی: ۱۰۴/۱)

حاصل ان کا یہ ہے کہ مرسل کے قابل قبول ہونے کا نظریہ امام شافعی سے پہلے تقریباً سبھی ائمہ و علماء کا تھا، اس میں سب سے پہلے امام شافعی نے کلام کیا ہے۔ اور یہ مرسل کی حجیت و مقبولیت کا سلسلہ دو سو سال تک چلتا رہا۔ معلوم ہوا کہ سلف صالحین کا یہی مسلک ہے کہ مرسل حدیث مقبول ہے۔ ہاں امام شافعی نے سب سے پہلے اس میں کلام کیا اور پھر ان کی اقتداء میں محدثین نے بھی اسی کو قبول کر لیا کہ حدیث مرسل ضعیف و ناقابل حجت ہے، لیکن خود امام شافعی کے پاس بھی حدیث مرسل اس وقت مقبول ہو جاتی ہے جبکہ اس کی تائید صحابہ کے قول و عمل یا علماء کے فتویٰ یا کسی اور حدیث سے ہوتی ہو۔

امام نوویؒ مقدمہ ”شرح مسلم“ میں لکھتے ہیں:

”ومذهب الشافعی أنه إذا انضم إلى المرسل ما يعضده احتج به ،

وذلك بأن يُروى أيضاً مُسنَداً أو مرسلًا من جهة أخرى أو يعمل به بعض الصحابة أو أكثر العلماء۔“ (مقدمہ شرح مسلم: ۱۷/۱)

اور اس زیر بحث حدیث مرسل کی تائید حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم اجمعین کے قول یا عمل سے ہوتی ہے۔ لہذا اس کے مقبول ہونے میں پھر کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔

چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن ابزی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن الخطاب کے پیچھے نماز صبح پڑھی، جب وہ دوسری رکعت میں سورت پڑھ کر فارغ ہوئے تو رکوع سے پہلے یہ دعا پڑھی: (پھر وہی اوپر والی دعا کا ذکر کیا ہے) (مصنف ابن ابی شیبہ: ۹۰۶/۶، سنن بیہقی: ۲۹۹/۲، شرح معانی الآثار: ۱۷۷/۱)

یہی بات عبد الرزاق نے مصنف میں حضرت ابن عباس سے اور طحاوی و ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباس سے اور حضرت عبید بن عمیر کے حوالے سے ذکر کی ہے۔ (مصنف عبد الرزاق: ۱۱۴/۳، شرح معانی الآثار: ۱۷۷/۱، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۰۶/۲)

حضرت عبدالرحمن بن الاسود کا اہلی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ دو سورتیں (یعنی دعائیں) فجر میں پڑھتے تھے، مگر بعد کے جملوں کو وہ مقدم کرتے تھے، اور کہتے تھے: ”اللهم إياك نعبد و لك نصلي و نسجد و إليك نسعى و نحفد و نرجو رحمتك و نخاف عذابك، إن عذابك بالكافرين ملحق، اللهم إنا نستعينك و نستغفرك و نؤمن بك و نشني عليك الخير و نشكرك و لا نكفرك و نؤمن بك، و نخلع و نترك من يفجرک۔“ (مصنف عبد الرزاق: ۱۱۴/۳، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۰۶/۲، مگر ابن ابی شیبہ میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے)

حضرت حصینؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے نماز فجر پڑھی اور میرے پیچھے حضرت عثمان بن زیاد بھی تھے، میں نے قنوت پڑھی، نماز کے بعد عثمان بن زیاد نے پوچھا کہ آپ نے قنوت میں کیا پڑھا تو میں نے کہا کہ: ”(پھر وہی اوپر والی دعاء

پڑھی) تو عثمان بن زیاد نے کہا کہ: ” کذا کان یصنع عمر بن الخطاب و عثمان بن عفان “ (حضرت عمر و حضرت عثمان بھی اسی طرح کرتے تھے) (ابن ابی شیبہ: ۱۰۶/۲)

حضرت ابو عبد الرحمن کہتے ہیں کہ: ” علمنا ابن مسعود أن نقرأ فی القنوت: اللهم إنا نستعينك و نستغفرك و نؤمن بك و نشي عليك الخير و لا نكفرك و نخلع و نترك من يفجرك ، اللهم إياك نعبد و لك نصلي و نسجد و إليك نسعى و نحفد و نرجو رحمتك و نخشى عذابك ، إن عذابك الجد بالكفار ملحق . “ (ہمیں ابن مسعود نے قنوت میں یہ پڑھنا سکھایا، پھر وہی دعاء قنوت بتائی) (مصنف ابن ابی شیبہ: ۹۵/۲)

حضرت میمون بن مہران سے مروی ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بھی یہی دعا پڑھتے تھے۔ (عبدالرزاق: ۱۱۲/۳)

ان سب روایات سے متعدد صحابہ کا اس دعاء پر عمل معلوم ہوتا ہے، لہذا اس کو پڑھنا بھی ثابت ہے، اور اگر دونوں دعاؤں کو ملا لیا جائے تو افضل و بہتر ہے، جیسا کہ شرح المہنیہ کے حوالے سے اعلاء السنن میں نقل کیا گیا ہے۔ (اعلاء السنن: ۹۱/۶)

اب ایک شبہ کا ازالہ بھی یہاں ضروری ہے وہ یہ کہ جب حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن درجہ کی موجود ہے اور اس میں وتر میں پڑھنے کی دعاء قنوت خود اللہ کے نبی ﷺ نے حضرت حسن کو سکھائی ہے تو اس کو کیوں اختیار نہیں کیا گیا، اور اس کے مقابلے میں یہ دوسری دعائے قنوت حدیث مرسل سے آئی ہے، اور مرسل کے مقابلے میں موصول اعلیٰ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک افضل یہ ہے کہ دونوں کو پڑھ لیا

جائے جیسا کہ اوپر نقل کر چکا ہوں، اور حنفیہ نے جو دوسری دعاء قنوت کو اختیار کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دعا کا متعدد صحابہ سے بھی ثبوت ہے کہ وہ پڑھا کرتے تھے یا لوگوں کو اس کی تعلیم دیتے تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ کبھی موصول حدیث پر وہ حدیث فوقیت لے جاتی ہے جو مرسل ہونے کے باوجود صحابہ کے قول و عمل سے مؤید ہو۔ دوسرے حضرت حسن کی حدیث جس کو امام ترمذی نے حسن کہا ہے اس پر متعدد اشکالات ہیں: ایک یہ کہ اس کے راوی ابوالحوراء کون ہیں اس میں اختلاف کیا گیا ہے، بعض نے ان کو ربیعہ بن شیبان قرار دیا ہے اور امام احمد کہتے ہیں کہ یہ ان کے علاوہ کوئی اور ہیں۔ (دیکھو تہذیب التہذیب: ۲۲۱/۳، تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱۶۵/۱۳)

دوسرے یہ کہ اس حدیث کی سند میں اختلاف و اضطراب ہے، کیونکہ اس کو بعض نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے اور بعض نے حسن کی جگہ حسین کہا، یہ سند کا اضطراب ہے۔ (دیکھو تہذیب التہذیب: ۲۲۱/۳، تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱۶۵/۱۳)

تیسرے یہ کہ متن میں بھی اضطراب یہ ہے کہ اس حدیث میں ” فی قنوت الوتر “ کے الفاظ ابواسحاق السبئی کا تفرّد ہے، اور امام شعبہ نے اس حدیث میں نہ تو وتر کا ذکر کیا ہے اور نہ یہ کہا کہ یہ دعاء قنوت ہے، بلکہ انھوں نے یوں نقل کیا کہ: ”کان یعلمنا هذا الدعاء“ (اللہ کے نبی ہمیں یہ دعا سکھاتے تھے)۔ (تلخیص الحجیر: ۲۴۷/۱، نیل الاوطار: ۵۲/۳)

اسی لئے علامہ ابن حزم نے ان کی اس حدیث کی صحت میں توقف کیا ہے، اور ضعیف قرار دیا ہے، جیسا کہ تہذیب میں حافظ نے ذکر کیا ہے۔ لہذا ہمارے

علماء نے اس دعاء کو قنوت وتر کے بجائے قنوت نازلہ پر محمول کیا ہے۔

قنوت رکوع سے پہلے یا بعد؟

مؤلف حدیث نماز نے اسی موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ قنوت رکوع کے بعد پڑھے، مگر یہ مسئلہ بھی علماء کے مابین اختلافی ہے، اور جس طرح اس میں بعض ائمہ رکوع کے بعد قنوت پڑھنے کے قائل ہیں اسی طرح دوسرے ائمہ جیسے امام مالک اور امام ابوحنیفہ اس کے برخلاف رکوع سے پہلے قنوت پڑھنے کے قائل ہیں، اور ان حضرات ائمہ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت انس بن مالک سے عاصمؓ نے قنوت کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا کہ ہاں قنوت ہے، عاصم کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ رکوع کے پہلے یا بعد؟ تو فرمایا کہ رکوع سے پہلے، انہوں نے کہا کہ فلاں شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ آپ نے رکوع کے بعد بتایا، تو حضرت انس نے کہا کہ اس نے غلط کہا، بس رسول اللہ ﷺ نے رکوع کے بعد صرف ایک ماہ قنوت پڑھا جس میں قراء صحابہ کو قتل کرنے والوں پر بددعا کی تھی۔ (بخاری: ۱۳۶۱، مسلم: ۲۳۷۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر رسول اللہ ﷺ کا قنوت رکوع سے پہلے ہوتا تھا، صرف ایک ماہ کفار و مشرکین پر بددعا کے لئے جو قنوت پڑھا تو وہ رکوع کے بعد پڑھا تھا۔ علامہ ابن بطلال کہتے ہیں کہ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس بات پر رسول اللہ ﷺ نے مداومت فرمائی تھی وہ رکوع سے پہلے قنوت پڑھنا تھا۔ (شرح بخاری: ۵۸۸/۲)

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: ”آن رسول اللہ ﷺ کان یوتر بثلاث رکعات، کان یقرأ فی الأولى

بسیح اسم ربك الأعلى ، وفي الثانية بقل يا أيها الكافرون و في الثالثة بقل هو الله أحد ويقنت قبل الركوع “ (رسول اللہ ﷺ تین رکعات وتر پڑھتے تھے اور پہلی رکعت میں ”سیح اسم ربك الأعلى“، اور دوسری میں ”قل يا أيها الكافرون“ اور تیسری میں ”قل هو الله أحد“ پڑھتے تھے اور رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے) (نسائی: ۱۹۱/۱، سنن کبریٰ للنسائی: ۴۲۸/۱)

نیز حضرات صحابہ سے بھی یہی بات مروی ہے، حضرت ابراہیم نخعی نے حضرت علقمہ سے روایت کیا کہ: أن ابن مسعود وأصحاب النبي ﷺ كانوا يقنتون في الوتر قبل الركوع “ (حضرت ابن مسعود اور رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے) (ابن ابی شیبہ: ۹۷/۲)

حافظ ابن حجر نے الدرایہ میں اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، اور اعلیٰ السنن میں ہے کہ علامہ ابن الترمذی نے ”الجوہر النقی“ میں کہا کہ اس کی سند صحیح علی شرط مسلم ہے۔ (الدرایہ: ۱۹۳/۱، اعلیٰ السنن: ۶۵/۶)

حضرت اسود سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ: ”كان عبد الله لا يقنت في شيء من الصلوات إلا في الوتر قبل الركعة“ (حضرت عبد اللہ بن مسعود کسی نماز میں قنوت نہیں پڑھتے تھے، مگر وتر میں رکوع سے پہلے پڑھتے تھے) (ابن ابی شیبہ: ۹۶/۲، طحاوی: ۱۷۹/۱، معجم کبیر طبرانی: ۲۳۸/۹)

حافظ ابن حجر نے ”الدرایہ“ میں طبرانی کے حوالے سے اس کا ذکر کر کے اس کو صحیح کہا ہے، اور علامہ پیشی نے ”مجمع الزوائد“ میں اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ (الدرایہ: ۱۹۳/۱، مجمع الزوائد: ۱۹۶/۱)

اور حضرت عمر کا قبل الركوع قنوت پڑھنا اور حضرت عبد الرحمن بن ابزی کی

روایت سے گزرا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن الخطاب کے پیچھے نماز صبح پڑھی، جب وہ دوسری رکعت میں سورت پڑھ کر فارغ ہوئے تو رکوع سے پہلے یہ دعاء قنوت پڑھی۔

اس پر امام بیہقی نے جو یہ کہا ہے کہ یہ سند تو اگرچہ صحیح ہے مگر حضرت عمر سے رکوع کے بعد قنوت اکثر ہے، اس کا جواب ابن الترمذی نے ”الجوہر النقی“ میں یہ دیا ہے کہ ابن ابی شیبہ نے زید بن وہب سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے فجر میں قبل رکوع قنوت پڑھا، اور ابو عثمان سے بھی روایت کیا کہ آپ نے قبل رکوع قنوت پڑھا، اور نیز دو طرق سے عبید بن عمیر سے بھی یہی بات حضرت عمر سے روایت کی، اور ابن معقل سے روایت کیا کہ حضرت عمر اور حضرت علی اور حضرت ابو موسیٰ نے فجر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھی۔ لہذا حضرت عمر سے اس کو روایت کرنے والا ایک نہیں، جیسا کہ امام بیہقی نے گمان فرمایا، بلکہ وہ پانچ حضرات ہیں، ایک کا ذکر تو خود امام بیہقی نے کیا ہے اور باقی چار کا ذکر ابن ابی شیبہ نے کیا ہے، اور یہ امام بیہقی کے ذکر کردہ لوگوں سے اکثر ہیں۔ (الجوہر النقی: ۲/۲۹۹)

الغرض ان سب دلائل سے مسلک احناف واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ قنوت رکوع سے پہلے پڑھنا چاہئے۔

عشاء سے قبل نفل نماز

مؤلف حدیث نماز نے یہاں ایک مسئلہ یہ بھی لکھا ہے کہ عشاء سے پہلے چار رکعت نہ سنت ہیں، نہ مستحب۔ (حدیث نماز: ۱۸۱)

راقم کہتا ہے کہ خاص عشاء سے پہلے کی نماز نفل کے بارے میں کوئی صریح حدیث نہیں ہے، جیسا کہ جماعت علماء نے تصریح کی ہے۔ البتہ حضرت عبداللہ بن

مغفلؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ”بین کل اذانین صلوة ، بین کل اذانین صلوة ، ثم قال في الثالثة: لمن شاء“ (ہر دو اذانوں (اذان و اقامت) کے درمیان میں نماز ہے، ہر دو اذانوں (اذان و اقامت) کے درمیان میں نماز ہے، اور تیسری دفعہ فرمایا کہ یہ اس کے لئے ہے جو چاہے) (بخاری: ۸۷۱/۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر اذان و اقامت کے درمیان ایک نماز مشروع ہے، لہذا عشاء کے مابین بھی مشروع ہوگی، مگر یہ نفل و مستحب ہوگی، کیونکہ خود اللہ کے نبی ﷺ نے اس میں اختیار دیدیا ہے کہ جو چاہے وہ اس کو پڑھے۔

اور ایک حدیث حضرت عبداللہ بن الزبیر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”ما من صلاة مفروضة إلا وبين يديها ركعتان“ (کوئی فرض نماز نہیں مگر اس سے پہلے دو رکعتیں ہیں) (صحیح ابن حبان: ۲۰۸/۶)

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز سے پہلے بھی ایک نماز ہے، اب رہا یہ کہ وہ کتنی رکعات ہوں؟ ابن حبان کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دو رکعتیں ہیں، لہذا کم از کم دو رکعات عشاء سے پہلے اس کی رو سے مشروع ہیں، اور وہ چار رکعات بھی ہو سکتی ہیں؛ کیونکہ اوپر والی حدیث میں یہ ہے کہ ہر اذان اقامت کے درمیان نماز ہے اور نماز کا اطلاق چار رکعتوں پر بھی ہوتا ہے، چنانچہ ظہر سے پہلے اور عصر سے پہلے چار رکعات حدیث سے ثابت ہیں، لہذا اس پر نظر کرتے ہوئے اگر یہ سمجھا جائے کہ نماز سے مراد چار رکعات ہیں تو درست ہے۔ اور ابن حبان کی حدیث میں دو کا ذکر کم از کم بتانے کے لئے ہے، واللہ اعلم۔

نماز تراویح اور اس رکعات

مؤلف حدیث نماز نے اپنے اس رسالہ کے اخیر حصہ میں تراویح کی رکعات کا مسئلہ چھیڑا ہے کہ وہ کتنی ہیں بیس ہیں یا آٹھ ہیں؟ کیونکہ بقول مؤلف ہسور والوں نے بھی اس کو چھیڑا تھا۔

مؤلف حدیث نماز کی الزام تراشی

مؤلف نے لکھا کہ ہسور والوں نے ہمارے خلاف سب سے بڑا مضمون یہی تراویح کا دیا ہے اور مضمون مفتی عبدالرحیم صاحب لاچپوری کے فتویٰ سے لیا ہے حالانکہ میں گجراتی زبان میں دس برس پہلے جواب لکھ چکا ہوں کیونکہ یہ مفتی صاحب ہمارے گجرات کے ہیں، ہسور والوں نے ان کے مضمون کو زبردست تحقیق لکھا ہے حالانکہ مفتی صاحب کا مضمون زبردست چوری کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ (حدیث نماز: ۱۸۲)

راقم کہتا ہے کہ مؤلف نے حضرت مفتی صاحب کے مضمون کو جو چوری سے تعبیر کیا ہے، اس کی وجہ خود مؤلف نے آگے چلکر بیان کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مفتی صاحب نے ایک حدیث بیس رکعت کی بیان کی اور دوسری حدیث آٹھ رکعت والی بیان نہیں کی، اور یہ کہ بعض علماء کے آدھے بیان کو اڑا دیا اور آدھا بیان کر دیا، لہذا یہ چوری ہے۔

میں مؤلف سے کیا یہ پوچھنے کا مجاز ہوں کہ مفتی صاحب نے کیا اس بات کا التزام کیا تھا کہ تمام لوگوں کے دلائل بیان کریں گے یا یہ التزام کیا تھا کہ جمہور امت

کے دلائل بیان کریں گے، اور کیا اپنے دلائل یا جمہور علماء کے دلائل کا بیان کرنا چوری کہلاتا ہے؟ مؤلف نے جو یہ لکھا ہے کہ آدھا بیان اڑا دیا اور آدھا لے لیا، یہ صریح جھوٹ اور الزام تراشی ہے، اور مؤلف اس کو کبھی ثابت نہیں کر سکتے، کیونکہ مفتی صاحب نے کہیں ایسا نہیں کیا کہ آدھا بیان لیکر آدھا چھوڑ دیا ہے۔ ہاں مفتی صاحب کو صرف فتویٰ دینا تھا کہ حکم کیا ہے، اس کے لئے انھیں جس قدر ضرورت علماء کی کتابوں کی پڑی ان کی طرف رجوع کیا اور ان کا حوالہ دیا، اس کو دنیا کی کسی زبان میں چوری نہیں کہتے، مگر جو لوگ خود چوری کرتے ہیں وہ دوسروں کو بھی ویسا ہی سمجھتے ہیں، جیسا کہ اس کتاب حدیث نماز میں مؤلف نے صریح چوری اور دھوکہ دہی کی ہے، جیسا کہ ناظرین نے گذشتہ صفحات سے معلوم کر لیا ہے کہ کسی کا قول کسی کے سر تھوپ دیا اور خواہ مخواہ کوئی بات جو ان کی نہیں تھی ان کی جانب منسوب کر کے نقل کر دی، یہ ہے اصل میں چوری۔

آٹھ رکعت کی روایت کی تنقید

مؤلف حدیث نماز نے مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحب کے متعلق لکھا

ہے کہ:

”انھوں نے دعویٰ تو یہ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بیس رکعات کا حکم دیا ہے لیکن حضرت عمرؓ کے حکم والی حدیث تو چھوڑ دی اور اس زمانے کے لوگوں کا جو عمل تھا وہ روایت نقل کر دی حالانکہ موطا میں وہ دونوں روایتیں ایک ہی جگہ پر ہیں، ملاحظہ فرمائیے: ”عن سائب بن یزید قال : أمر عمر بن الخطاب أبي بن كعب وتميم الداري أن يقوموا للناس بإحدى عشر ركعة“ (موطا: ۵۸) (سائب بن یزید کہتے ہیں کہ

عمر بن خطابؓ نے ابی بن کعبؓ اور تمیم داریؓ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو گیارہ رکعت وتر کے ساتھ پڑھائیں (مزے کی بات یہ ہے کہ یہی روایت حنفی مذہب کی کتاب طحاوی میں بھی ہے۔ (حدیث نماز: ۱۸۲)

مؤلف نے اس عبارت میں مفتی صاحب پر دو نقد کئے ہیں، ایک تو یہ کہ دعویٰ اور دلیل میں مطابقت نہیں کہ دعویٰ امر کا ہے اور دلیل میں لوگوں کا عمل بتایا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ عقلمندوں کے لئے اشارہ کافی ہوا کرتا ہے، اس لئے جب حضرت عمر کے زمانہ کا عمل بیس رکعت کا بیان ہوا تو معلوم ہوا کہ حکم آپ نے یہی دیا تھا، رہا لوگوں کا اس سے زائد رکعات پڑھنا تو وہ اس لئے کہ درمیان میں جو وقفہ ملتا تھا اس میں بجائے خاموش بیٹھنے کے وہ حضرات اس میں بھی نوافل پڑھتے تھے، جیسا کہ مکہ والے طواف کیا کرتے تھے، یہ زیادتی لوگ اپنی جانب سے بطور نفل ادا کرتے تھے۔ اور اس کی صریح دلیل یہ ہے کہ ابن ابی شیبہ نے حضرت یحییٰ بن سعید سے مرسل روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعت پڑھائے۔ (ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲)

یہ حدیث مرسل ہے کیونکہ یحییٰ بن سعید کو حضرت عمر سے ملاقات و سماع حاصل نہیں، اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، لہذا یہ مرسل قوی ہے۔ (آثار السنن مع التعلیق الحسن: ۵۵/۲)

دوسرا اعتراض مؤلف نے یہ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابی بن کعبؓ اور تمیم داریؓ کو آٹھ رکعات پڑھانے کا حکم دیا تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ مؤلف نے حدیث کے فن سے کوئی واقفیت حاصل نہیں کی ہے ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ یہ روایت مضطرب المتن ہے جس سے احتجاج درست نہیں، کیونکہ اس روایت میں موطا مالک میں امام مالک نے اور مصنف ابن ابی شیبہ میں یحییٰ بن القطان نے اور سنن سعید بن منصور

میں عبدالعزیز بن محمد نے گیارہ رکعت روایت کیا ہے اور محمد بن نصر نے ”قیام اللیل“ میں بطریق محمد بن اسحاق، محمد بن یوسف سے روایت کیا ہے جس میں تیرہ رکعت بیان کیا ہے اور عبدالرزاق نے ایک دوسرے طریق سے روایت کیا ہے جس میں محمد بن یوسف نے اکیس رکعات بیان کیا ہے۔ (فتح الباری: ۴/۲۵۳)

زرقانی نے لکھا ہے کہ حافظ ابن عبدالبر نے کہا کہ امام مالک کے علاوہ دوسروں نے اس حدیث میں اکیس رکعات روایت کیا ہے اور یہی صحیح ہے اور میں نے سوائے مالک کے کسی اور کو اس حدیث میں گیارہ رکعات روایت کرتے نہیں دیکھا، اور کہا کہ مر غالب گمان یہ ہے کہ گیارہ رکعت کا قول وہم ہے۔ (زرقانی علی المؤمنین: ۳۴۱/۱)

علامہ نیوی نے کہا کہ ابن عبدالبر نے جو ”گیارہ“ والی روایت کو امام مالک کا وہم قرار دیا ہے، یہ غلط ہے؛ کیونکہ امام مالک کی عبدالعزیز بن محمد نے سنن سعید میں اور یحییٰ بن سعید القطان نے مصنف ابن ابی شیبہ میں متابعت کی ہے، اور گیارہ والی بات روایت کی ہے اور اس کو محمد بن نصر مروزی نے قیام اللیل میں محمد بن یوسف سے تیرہ رکعت نقل کیا ہے۔ اور علامہ ظفر احمد نے کہا کہ میرے نزدیک وہم محمد بن یوسف کو ہوا ہے، کیونکہ وہی کبھی گیارہ کہتا ہے اور کبھی تیرہ کہتا ہے، لہذا محفوظ وہ ہے جو یزید بن خصیفہ نے سائب بن یزید سے روایت کیا ہے کہ لوگ حضرت عمر کے زمانے میں رمضان میں بیس رکعت پڑھتے تھے، اس کو بیہتی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ (اعلاء السنن: ۷۳/۷)

اس روایت کی مزید تفصیل و تحقیق دیکھنا ہو تو رکعات تراویح مؤلفہ علامہ شیخ حبیب الرحمن محدث اعظمی کی طرف رجوع کیا جائے، اس کے علاوہ آپ نے اپنے

مقالات میں بھی اس پر روشنی ڈالی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان روایت میں اضطراب پایا جاتا ہے، اس لئے یہ احتجاج کے قابل نہیں، اور اگر ان روایات میں ترجیح قائم کی جائے تو یزید بن حصیفہ کی سائب بن زید سے روایت کو ترجیح ہونا چاہئے، کیونکہ ان یزید بن حصیفہ کے تین شاگرد ہیں، ایک مالک، دوسرے ابن ابی ذئب اور تیسرے محمد بن جعفر بن ابی کثیر اور یہ تینوں کے تینوں ایک ہی بات یزید سے روایت کرتے ہیں کہ سائب بن یزید نے کہا کہ حضرت عمر کے زمانے میں رمضان میں لوگ بیس رکعت پڑھتے تھے، اس کے برخلاف سائب بن یزید ہی کے دوسرے شاگرد محمد بن یوسف کے شاگردوں میں اختلاف ہے، جیسا کہ گزرا، لہذا اگر ترجیح دی جاسکتی ہے تو اس روایت کو دینا چاہئے جس میں ایک ہی بات بلا اختلاف روایت کی گئی ہے۔ (دیکھو مقالات ابوالمآثر: ۱: ۲۳۷-۲۳۸)

اس لئے مؤلف حدیث نماز کا اس روایت کو پیش کرنا بے سود ہے اور پھر حضرت مفتی صاحب کے اس کو نقل نہ کرنے پر اور اس سے احتجاج نہ کرنے پر نقد و اعتراض بھی بے جا اور غلط ہے۔ اور ہاٹھویں میں اس روایت کا ہونا تو یہ کوئی دلیل نہیں کہ یہ صحیح ہے۔

حضرت عمرؓ اور بیس رکعات تراویح

آگے مؤلف حدیث نماز نے لکھا ہے کہ:

”جو یہ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لوگ مع وتر بیس رکعت پڑھتے تھے، تو ہمیں اس روایت کی ضرورت نہیں؛ کیونکہ لوگ تو ۲۸-۳۰-۴۰ تک رکعتیں اس زمانے میں پڑھا کرتے تھے، علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری میں لکھا اور اس کے باوجود یہ روایت منقطع ہے؛ کیونکہ

حضرت عمرؓ کے زمانہ کی خبر دینے والا یزید بن رومان حضرت عمرؓ کے زمانہ

میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ (حدیث نماز: ۱۸۱-۱۸۲)

راقم کہتا ہے کہ اولاً تو مؤلف کا یہ کہنا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں گستاخی ہے، کیا آپ کو صحابہ کا طریقہ نہیں چاہئے؟ اگر مؤلف کو اس کی ضرورت نہ ہو تو نہ ہو لیکن ہمیں تو اس کی ضرورت ہے کیونکہ سلف کو چھوڑ دینا اور ان کے تعامل سے قطع نظر کر لینا کوئی ہدایت کا راستہ نہیں ہے۔ (فافہم)

اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جو مختلف رکعات لوگ پڑھتے اس کی وجہ اوپر مذکور ہو چکی کہ یہ بطور نفل وقت کو کام میں لانے کے لئے ہوتا تھا، اور حضرت عمرؓ کا بیس رکعت تراویح پڑھنے کا حکم دینا ابن ابی شیبہ کی روایت سے اوپر معلوم ہو گیا کہ حضرت عمرؓ نے بیس رکعات پڑھانے کا ایک آدمی کو حکم دیا، ہم نے بتایا تھا کہ یہ روایت مرسل قوی ہے۔ (آثار السنن: ۵۵/۲)

اور اس کی تائید و تقویت مزید روایات سے ہوتی ہے:

(۱) یزید بن رومان کہتے ہیں کہ ”کان الناس یقومون فی زمان عمر بن الخطاب فی رمضان بثلاث و عشرين رکعة“ (حضرت عمرؓ کے زمانے میں لوگ رمضان میں بیس رکعتیں پڑھتے تھے) (موطا مالک: ۴۰، سنن بیہقی: ۶۹۹/۲)

(۲) عبدالعزیز بن رفیع سے روایت ہے کہ: ”کان ابي بن کعب یرسل بالناس فی رمضان بالمدينة عشرين رکعة ، یوتر بثلاث“ (حضرت ابی بن کعبؓ مدینہ میں ماہ رمضان میں لوگوں کو بیس رکعت نماز پڑھاتے تھے، تین رکعت وتر پڑھتے تھے) (ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲)

یہ دونوں روایات مرسل ہیں کیونکہ یزید بن رومان کی حضرت عمر سے اور عبد العزیز بن محمد کی حضرت ابی بن کعب سے ملاقات نہیں ہے، لیکن ان کے رجال سب ثقہ ہیں، اس لئے علامہ نیوی نے کہا یہ مرسل قوی ہیں۔ (آثار السنن: ۵۵۲/۲)

حضرت علی اور بیس رکعات

حضرت عمر کے علاوہ حضرت علی سے بھی منقول ہے کہ آپ نے بھی بیس رکعت تراویح کا حکم دیا تھا:

(۱) ابی الحسناء سے مروی ہے کہ: ”أن علیا أمر رجلا یصلی بهم فی رمضان عشرين رکعة“ (حضرت علی نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو رمضان میں بیس رکعت نماز پڑھائے) (ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲، سنن بیہقی: ۶۹۹/۲) امام بیہقی نے اس کو روایت کر کے فرمایا کہ اس سند میں ضعف ہے، علامہ ابن الترمذی نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی سند میں ابوسعید البقال راوی ہیں، ان میں کلام کیا گیا ہے، اگر یہی بات ہے تو ان کی متابعت مصنف ابن ابی شیبہ میں عمرو بن قیس نے کی ہے، اور یہ عمرو بن قیس میرا خیال ہے کہ ملائی ہے اور اس کی امام احمد، یحییٰ بن معین، ابو حاتم، ابوزرعہ وغیرہ نے توثیق کی ہے، اور اس سے امام مسلم نے تخریج کی ہے۔ (الجوهري: ۷۰۰/۲)

میں کہتا ہوں کہ ابوسعید البقال کے بارے میں ہم نے اوپر آمین والے مسئلہ کے تحت بحث کر کے بتایا تھا کہ ان کی اگرچہ جمہور علماء نے تضعیف کی ہے، مگر تمام محدثین ان کو ضعیف نہیں کہتے، اور ہم نے علامہ بنوری کے حوالے سے بتایا تھا کہ ابوسعید کی امام بخاری، ترمذی، ابن جریر نے، بیہقی نے ”مجمع الزوائد“ میں، اور حافظ ابن حجر نے ”فتح الباری“ میں توثیق کی ہے، بلکہ ابوزرعہ کا کلام بھی اسی طرف

اشارہ کرتا ہے۔ لہذا اس لحاظ سے اگر یہ متابعت نہ ہوتی تب بھی یہ لائق قبول ہوتی، چہ جائیکہ اس کی متابعت بھی پائی جا رہی ہے۔ مگر اس میں ایک اور علت ہے، جس کی طرف علامہ نیموی نے نشاندہی کی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کا مدار ابوالحسناء پر ہے اور وہ معلوم نہیں کون ہے؟ (التعلیق الحسن: ۵۴/۲)

مگر اس کی تائید میں ایک شاہد بھی موجود ہے، جس سے اس علت کا تدارک ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

(۲) ابو عبد الرحمن السلمی سے مروی ہے کہ حضرت علی نے رمضان میں قراء کو بلایا اور ان میں سے ایک کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعت نماز پڑھائے۔ (سنن بیہقی: ۶۹۹/۲)

اس سند میں حماد بن شعیب ضعیف راوی ہے جس کو یحییٰ بن معین وغیرہ نے ضعیف کہا ہے، مگر شواہد میں چل جاتی ہے۔

بہر حال ان شواہدات کے ہوتے ہوئے یہ حضرت عمر اور حضرت علی کا بیس رکعت تراویح کا امر ثابت ہو جاتا ہے اور حجت کو پہنچ جاتا ہے۔

دیگر صحابہ سے بیس رکعت کا ثبوت

ان دو جلیل القدر صحابہ و خلفاء کے علاوہ اور بھی صحابہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے:

(۱) ابوالخصیب سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ: ”کان یؤمننا سوید

بن غفلة في رمضان فيصلي خمس ترويحاً عشرين ركعة“ (

حضرت سوید بن غفلة رضی اللہ عنہ رمضان میں ہماری امامت کیا کرتے تھے، پس وہ

پانچ ترویحے بیس رکعت پڑھتے تھے) (سنن بیہقی: ۶۹۹/۲، علامہ نیموی نے کہا کہ یہ

حدیث حسن ہے، آثار السنن: ۵۵/۲)

(۲) نافع بن عمر کہتے ہیں کہ: ”کان ابن ابی ملیکہ یصلی بنا فی رمضان عشرين رکعة“ (ابن ابی ملیکہ ہمیں رمضان میں بیس رکعت پڑھاتے تھے) (ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲، علامہ نیوی نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے، آثار السنن: ۵۵/۲)

(۳) حضرت سعید بن عبید کہتے ہیں کہ: أن علي بن ربيعة كان يصلی بهم فی رمضان خمس ترویحات و یوتر بثلاث“ (علی بن ربیعہ لوگوں کو رمضان میں پانچ تروتکے اور تین رکعات وتر پڑھاتے تھے) (ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲، علامہ نیوی نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے، آثار السنن: ۵۶/۲)

(۴) حضرت عطاء بن ابی رباح مشہور و جلیل القدر تابعی کہتے ہیں کہ: ”أدرکت الناس وهم یصلون ثلاثاً و عشرين رکعة بالوتر“ (میں نے لوگوں کو اس حال میں پایا کہ وہ تینتیس رکعت وتر کے ساتھ پڑھتے تھے) (ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲، علامہ نیوی کہتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے، آثار السنن: ۵۵/۲)

یہ چند آثار صحابہ ہیں جن سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عمر و حضرت علی و دیگر صحابہ کے دور میں ان حضرات کا معمول بیس رکعت تراویح کا تھا۔ اسی کو مفتی عبدالرحیم لاچپوریؒ نے لکھا ہے، اس میں آخر چوری کی کیا بات ہے جس کا الزام مؤلف حدیث نماز نے ان پر لگایا ہے؟

بعض علماء کے حوالے اور مؤلف کی خیانت

مؤلف حدیث نماز نے مزید لکھا ہے کہ:

”ابن الہمام، محدث عبدالحق دہلوی، علامہ سندھی، ملا علی قاری، اور

علامہ کشمیریؒ وغیرہ بالاتفاق لکھتے ہیں کہ یہ مانے بغیر چھٹکارا ہے ہی نہیں کہ تراویح آٹھ رکعت ہی سنت ہے اور بیس رکعت کی روایت ضعیف ہے، پھر اس کے بعد عین الہدایہ اور نور الہدایہ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔
(حدیث نماز: ۱۸۲)

راقم کہتا ہے کہ یہ سراسر جھوٹ اور ان علماء پر بہتان ہے؛ کیونکہ مؤلف نے جن حضرات کے حوالے دیئے ہیں ان حضرات نے صرف یہ بات کہی ہے کہ بیس رکعت کے سلسلہ میں ابن عباس کی مرفوع روایت ضعیف ہے، (اس کا ذکر ہم آگے چلکر کریں گے) مگر یہ نہیں کہا کہ بیس رکعت کی حدیث ضعیف ہے، ان دو باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ایک تو کسی خاص حدیث کو ضعیف کہنا ہے اور ایک یہ ہے کہ اس سلسلہ کی حدیث ہی کو ضعیف کہہ دیا جائے، ان حضرات نے صرف ایک حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اسی لئے یہ حضرات بیس رکعت تراویح ہی کے قائل ہیں، اگر ان کے نزدیک بیس رکعت والی حدیث مطلقاً ضعیف ہوتی تو وہ اس کے قائل کیوں ہوتے؟ معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف حدیث نماز نے یہاں خیانت ودھوکہ دہی سے کام لیا ہے۔

دوسرے یہ کہ ان حضرات نے یہاں دو باتوں سے بحث کی ہے کہ ایک یہ کہ تراویح کی بیس رکعتوں کا ماخذ کیا ہے؟ اور دوسرے یہ کہ بیس رکعت تراویح کا حکم کیا ہے؟ ہمارے مؤلف نے دونوں کو خلط ملط کر کے پیش کیا ہے، ان حضرات نے بیس رکعت تراویح کا ماخذ بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس کا ماخذ مرفوع حدیث نہیں کیونکہ وہ ضعیف ہے، بلکہ اس کا ماخذ حضرت عمر کا حکم ہے، مؤلف نے ان کی یہ بات تو نقل کر دی کہ حدیث ضعیف ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ حضرت عمر کا حکم ثابت ہے، کیا یہ

خیانت نہیں؟

رہا یہ مسئلہ کہ تراویح کی بیس رکعتوں کا کیا حکم ہے؟ اس میں ان حضرات نے یہ بتایا ہے کہ یہ سنت ہیں، کیونکہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کی سنت سنت ہے، اسی طرح خلفاء راشدین کی سنت بھی سنت ہے اور اس پر عمل بھی ضروری ہے۔ ہاں علامہ ابن الہمام کی اس سلسلہ میں رائے یہ ہے کہ بیس میں سے آٹھ رکعتوں کو سنت کہا جائے اور باقی بارہ کو مستحب قرار دیا جائے، کیونکہ بیس کا ماخذ صحابہ کا امر و عمل ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ اس کو سنت نہیں کہا جاتا، لہذا یہ بیس رکعتیں مستحب ہیں۔ اب بتائیے کہ کیا ان حضرات نے بیس رکعت تراویح کا انکار کیا ہے یا مطلقاً بیس رکعت تراویح کی حدیث کو ضعیف کہا ہے؟ ہرگز نہیں، لہذا یہ بھی مؤلف حدیث نماز کی کھلی ہوئی بددیانتی و خیانت ہے۔

اب ان حضرات میں سے بعض کے حوالے سنتے چلے، مؤلف نے ایک حوالہ دیا ہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا، علامہ عبدالحق لکھنوی اپنی کتاب ”تختہ الاخیار“ میں ان کی کتاب ”فتح المنان“ سے ان کی یہ عبارت نقل کرتے ہیں کہ: ”فالظاهر أنه قد ثبت عندهم صلاة النبي ﷺ عشرين ركعة كما جاء في حديث ابن عباس“ (ظاہر یہی ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی بیس رکعت نماز کا ثبوت ہو گیا تھا، جیسا کہ ابن عباس کی روایت میں آیا ہے) (بحوالہ تختہ الاخیار: ۲۱۱)

یہ لیجئے، شیخ عبدالحق تو بیس رکعات تراویح کو بھی رسول اللہ ﷺ سے مان رہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ صحابہ کے پاس کوئی دلیل اس کی ضرور ثابت ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ان حضرات نے بیس تراویح کا سلسلہ جاری کیا، اور مؤلف حدیث نماز

ان کی جانب اس کے خلاف کا قول منسوب کر رہے ہیں، یا للعجب! مؤلف نے ایک حوالہ امام زیلعی کا دیا ہے۔ امام زیلعی نے نصب الراية میں صرف یہ کہا ہے کہ ابن عباس کی روایت ضعیف ہے اور صحیح حدیث کے خلاف ہے، پھر انھوں نے بیس رکعت تراویح کے سلسلہ میں متعدد آثار حضرت عمر سے نقل کئے ہیں اور ان میں ایک بیہقی کے حوالے سے سائب بن یزید کی یہ روایت نقل کی کہ ہم حضرت عمر کے زمانے میں بیس رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے، اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ (نصب الراية: ۱۵۴/۲)

اب فرمائیے کہ امام زیلعی نے یہ کہاں کہا ہے کہ بیس رکعت کی حدیث ضعیف ہے، اور یہ کہ سنت صرف آٹھ ہی رکعت ہیں، اس قسم کا کوئی جملہ امام زیلعی نے نہیں لکھا ہے، یہ سراسر جھوٹ و خیانت ہے۔

ایک حوالہ ملا علی قاری کا دیا ہے، ملا علی قاری نے شرح مشکاۃ میں متعدد جگہ اس مسئلہ پر کلام کیا ہے، ایک جگہ علامہ ابن عبدالبر سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ”والذي صح عنهم أنهم كانوا يقومون على عهد عمر بعشرين ركعة“ (جو بات ان حضرات سے صحیح ثابت ہے وہ یہ ہے کہ وہ حضرت عمر کے دور میں بیس رکعت پڑھتے تھے) (مرقات: ۱۹۲/۳)

اور اس کے دو ہی صفحات کے بعد لکھتے ہیں کہ: ”وأجمع الصحابة على أن التراويح عشرون ركعة“ (اور صحابہ کا اس پر اجماع ہے کہ تراویح بیس رکعت ہیں) (مرقات: ۱۹۲/۳)

اور علامہ ابن الہمام نے جو یہ کہا کہ سنت آٹھ رکعت ہیں اور باقی مستحب ہیں، اس پر ملا علی قاری نے رد کیا ہے اور کہا کہ سنت خلفاء پر سنت کا اطلاق اقویٰ ہے

لہذا اس کو سنت کہنا ہی بہتر ہے۔ (خلاصہ از مرقات: ۱۹۴/۳)

اس بیان میں اور مؤلف کے نقل کردہ بیان میں کس قدر تضاد ہے، دیکھ لیجئے، اور فیصلہ کیجئے کہ کیا اس کا نام خیانت و دھوکہ نہیں؟

مؤلف حدیث نماز نے ایک حوالہ علامہ انور شاہ کشمیری کا دیا ہے، آپ نے العرف الشذی میں جو لکھا ہے اس کو ملاحظہ کیجئے، وہ فرماتے ہیں کہ اس کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی تراویح آٹھ رکعت تھی اور ائمہ اربعہ کا ماخذ بیس رکعت میں وہ حضرت عمر فاروق کا عمل ہے، اور رسول اللہ ﷺ کا عمل تو وہ آٹھ کا ہے اور آپ ﷺ سے بیس رکعت سند ضعیف سے آئی ہیں، اور رہا حضرت فاروق کا عمل تو اس کو امت نے قبول کیا ہے اور حضرت عمر کے عہد کے دوسرے سال سے اسی پر تراویح کا معاملہ قائم ہے، اور ابن الہمام نے کہا کہ آٹھ رکعت سنت مؤکدہ ہیں اور بارہ مستحب ہیں، مگر یہ بات کسی نے نہیں کہی، میں کہتا ہوں کہ سنت خلفاء راشدین بھی سنت شریعت ہے۔ (العرف الشذی مع سنن الترمذی: ۱۶۶/۱)

غور کیجئے کہ علامہ کشمیری کیا کہہ رہے ہیں، وہ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے بیس کا ثبوت ضعیف ہے لیکن حضرت عمر سے اس کا ثبوت ہے اور ائمہ کرام نے اسی سے اس کو لیا ہے اور اس کا ماخذ عمل فاروق ہے، اور اس کو امت نے قبول کیا ہے، اور اس پر بھی سنت کا اطلاق کیا جاتا ہے، علامہ ابن الہمام نے جو صرف آٹھ رکعت کو سنت، اور باقی کو مستحب کہا ہے آپ اس کی تردید بھی کر رہے ہیں اور بیس کی بیس رکعتوں کو سنت کہہ رہے ہیں۔

مؤلف حدیث نماز نے ایک حوالہ عین الہدایہ ترجمہ ہدایہ کا دیا ہے، مگر یہاں بھی حسب عادت صریح دھوکہ کا ارتکاب کیا ہے، عین الہدایہ کے مؤلف جسٹس سید

امیر علی نے اس موقع پر علامہ ابن الہمام کی رائے جو اوپر گزری اس کا ذکر کیا ہے پھر وہ کہتے ہیں کہ:

”مترجم کہتا ہے کہ اعداد رکعات جبکہ امر تو قیفی ہے تو لامحالہ حضرت عمر کا ۲۰ پر جمع کرنا ابی بن کعب و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا قبول کرنا بدون اس کے نہ ہوگا کہ یہ حضرت ﷺ سے پایا گیا ہے، اور اس وقت میں ابن ابی شیبہ و طبرانی کی روایت ابن عباس کہ حضرت ﷺ نے ۲۰ پڑھائیں قوی ہو جاوے گی اور حدیث ام المؤمنین عائشہؓ کہ رمضان و غیر رمضان میں گیارہ پر زیادہ نہیں کیا اس سے مخالفت نہیں، جبکہ تہجد و تراویح علیحدہ ہوں اور طاہر کلام مشائخ حنفیہ یہی ہے۔ پس تراویح ۲۰ پڑھائیں اور تہجد میں ۱۱ پر زیادہ نہیں کیا۔ پھر ذرا آگے چل کر کہتے ہیں کہ: محصل یہ ضرور نکلا کہ ۲۰ رکعات میں حضرت ﷺ کی سنت قولی و فعلی اور خلفائے راشدین کی سنت اور مسلمانوں کا اتفاق سب جمع ہیں اور اگر کسی نے ۸ پر اقتصار کیا تو حضرت ﷺ کے ارشاد اور سنت خلفاء راشدین و جماعت مسلمین سے مخالفت لازم ہے اور ادنیٰ درجہ اس کا کراہت و اساءت ہے۔ (عین الہدایہ: ۲۲۱-۲۲۳)۔“

اس میں علامہ ابن الہمام کے نظریے کی تردید کے ساتھ بیس رکعت کا سنت ہونا اور اس پر اہل اسلام کا اجماع ہونا بیان کر کے اس کے خلاف کرنے والوں اور آٹھ رکعت پر اکتفاء کرنے والوں کے عمل کو کم از کم مکروہ قرار دیا ہے۔ کیا اس کے بعد کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ ہمارے مؤلف حدیث نماز نے ان بزرگوں کا نام لیکر لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے؟

مؤلف نے یہاں ایک نام علامہ ابو سعود مصری کا اور ایک علامہ ابو الطیب سندھی کا بھی لیا ہے مگر اس وقت ان کی کتابیں موجود نہ ہونے سے اس پر تبصرہ نہیں کر

سکتا، تاہم اغلب یہی ہے کہ مؤلف نے جس طرح اور علماء کے حوالوں میں دھوکہ سے کام لیا ہے اور ان کے مقصد کے بالکل برخلاف ان کی عبارات کو پیش کرنے کی جسارت کی ہے اسی طرح کا معاملہ یہاں بھی ہوگا۔

علامہ ابن الہمام کی رائے پر نقد

اب رہا یہ مسئلہ جو ابن الہمام نے بیان کیا ہے کہ صحابہ کرام کے تعامل اور حضرت عمر کے امر کو سنت کا درجہ نہیں دیا جائے گا، بلکہ یہ مستحب امر ہوگا، تو عرض ہے کہ یہ ان کی اپنی رائے ہے جو جمہور محققین کے خلاف ہے، کیونکہ محققین نے صحابہ کے عمل کو بھی سنت مؤکدہ ہی کہا ہے، لہذا یہ بات قابل رد ہے۔ کیونکہ خود حدیث میں ارشاد ہے کہ: ”علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدين المہدیین، عضوا علیہا بالنواجذ“ (تم پر میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے، اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لو) (ترمذی: ۹۲۲۲)

معلوم ہوا کہ خود اللہ کے رسول ﷺ نے خلفاء راشدین کی سنت کو سنت کہا ہے۔ لہذا حضرت عمر و حضرت علی کی سنت کو بھی سنت ہی کہا جائے گا، یہی محققین کا فیصلہ ہے۔ اور اسی لئے محققین نے علامہ ابن الہمام کا رد بھی کیا ہے، علامہ نور شاہ کشمیری سے ہم نے ابھی ان کی تردید نقل کی ہے، اسی طرح ملا علی القاری نے ان کی تردید کی ہے جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، اسی طرح علامہ ظفر احمد عثمانی نے اعلاء السنن میں لکھا ہے کہ: ابن الہمام نے جو کہا ہے وہ روایت و درایت دونوں طرح ساقط الاعتبار ہے، درایت تو اس لئے کہ ان کی بات کا بنی اس پر ہے کہ سنت وہی ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے پابندی کی ہو، اور جس پر آپ کے خلفاء نے بعد میں پابندی کی وہ مستحب ہے، مگر یہ بات فقہاء و اصولیین میں سے محققین حضرات کے خلاف ہے،

کیونکہ ان کے نزدیک سنت وہ ہے جس پر اللہ کے رسول ﷺ اور خلفاء راشدین نے پابندی کی ہے۔ پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ: اور روایت اس لئے ساقط ہے کہ ابن الہمام کے کلام کا مبنی حضرت عائشہ کی حدیث ہے جس میں انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان وغیر رمضان میں آٹھ سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، علامہ ابن الہمام نے اس کو رسول اللہ ﷺ کی رمضان وغیر رمضان کی کل نماز پر محمول کیا ہے حالانکہ حق یہ ہے کہ یہ آپ ﷺ کی کل تہجد کی نماز ہے، کیونکہ احادیث بتاتی ہیں کہ رمضان میں آپ کی نماز غیر رمضان کی نماز سے بڑھ جاتی تھی۔ (اعلاء السنن: ۶۹/۷-۷۰)

اس سے معلوم ہوا کہ علامہ ابن الہمام کی بات کا بہت سے علماء نے رد کیا ہے، اور مؤلف حدیث نماز نے جن لوگوں کا حوالہ دیا ہے ان میں سے بھی بعض نے ان کا رد کیا ہے، مگر ان سب سے آنکھیں بند کر کے کچھ کا کچھ نقل کر دیا اور یہ سمجھ گئے کہ ہماری جیت ہوگئی۔ لاجول ولاقوة الا باللہ۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا

مؤلف نے مزید لکھا ہے کہ رئیس التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ اپنی مشہور کتاب ”حیاء الصحابة“ پر تراویح کا مضمون لکھا ہے، اس کے آخر میں آٹھ رکعت ہی کی ایک روایت لائے ہیں، بیس رکعت کا اس میں کہیں پتہ بھی نہیں ہے۔ (حدیث نماز: ۱۸۲)

میں کہتا ہوں کہ یہ حوالہ ”ڈوبتے کو تنکے کا سہارا“ کا مصداق نظر آتا ہے افسوس کہ مؤلف کو یہ بھی معلوم کہ یہ کتاب ”حیاء الصحابة“ کس موضوع کی کتاب ہے؟ یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے صحابہ کے حالات پر لکھی ہوئی ہے، اس کا موضوع نہ فقہ ہے اور نہ مسائل کی تحقیق، بلکہ یہ صحابہ کے مختلف واقعات

وحالات کو جمع کرنے کے لئے لکھی گئی ہے جس میں صحیح روایات بھی ہیں اور ضعیف بھی ہیں، اس میں مؤلف کتاب حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے نہ یہ التزام کیا ہے کہ موضوع سے متعلق تمام روایات جمع کروں گا اور نہ اس کا التزام کہ صحیح روایات ہی درج کروں گا، لہذا اگر اس میں کوئی روایت درج نہ ہو تو اس سے یہ استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ غلط ہے اور اس میں کسی روایت کے درج ہو جانے سے یہ کیسے سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ صحیح ہے؟

لہذا یہ حوالہ محض طفل تسلی کی قبیل سے ہوگا یا حسب عادت دھوکہ و فریب ہوگا، لہذا یہ کوئی علمی چیز نہیں کہ اس کو پیش کیا جائے۔

اس کے بعد ہمیں دو باتیں بیان کرنا ہے، ایک تو یہ کہ بیس رکعت تراویح کی مرفوع حدیث جس کی جانب مؤلف حدیث نماز نے اشارہ کیا ہے وہ کیا ہے؟ تاکہ حقیقت واضح ہو جائے اور دوسرے آٹھ رکعت کے قائلین کی دلیل کیا ہے؟

بیس رکعت کی مرفوع حدیث

لہذا عرض ہے کہ بیس رکعت کی مرفوع حدیث وہ ہے جس کو حضرت عبداللہ بن عباس نے روایت کیا ہے کہ: ”أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَصَلِّي فِي رَمَضَانَ عَشْرِينَ رَكْعَةً وَالْوَتْرَ“ (رسول اللہ ﷺ رمضان میں بیس رکعتیں اور وتر پڑھتے تھے) (ابن ابی شیبہ: ۱۶۳/۲، سنن بیہقی: ۶۹۸/۲)

اس کو اکثر علماء نے ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اس کے ایک راوی ابراہیم بن عثمان ہیں، ان کو جمہور نے ضعیف قرار دیا ہے، مگر ابن عدی نے کہا کہ ان کی احادیث صالح ہیں اور یہ ابراہیم ابن ابی حبیہ سے اچھے و بہتر ہیں اور یزید بن ہارون نے کہا کہ ان کے زمانہ میں ان سے زیادہ قضاء میں کوئی عادل نہیں تھا۔ (تہذیب: ۱۲۵/۱)

صاحبِ اعلاء السنن نے کہا کہ ابراہیم بن ابی حنیہ مختلف فیہ ہے اور مختلف فیہ حسن الحدیث ہوتا ہے، عثمان دارمی نے یحییٰ بن معین سے نقل کیا ہے کہ یہ ابراہیم بن ابی حنیہ شیخ ثقہ ہیں۔ (لسان المیزان) پس جو شخص اس ابراہیم ابن ابی حنیہ سے زیادہ بہتر ہو وہ حسن الحدیث سے کم نہیں ہو سکتا۔ (اعلاء السنن: ۷/۷۱)

لہذا یہ روایت ابن عباس بھی حسن ہوگی اور حسن سے احتجاج بالکل درست اور صحیح ہے اور یہ روایت عائشہؓ جو بخاری اور مسلم میں ہے اس کے خلاف نہیں جیسا کہ آگے آئے گا۔ لہذا جب نبی کریم ﷺ کا عمل بیس رکعت تراویح کا ہو اور پھر حضرت عمر کا اس کو مقرر کرنا اور لوگوں کو اس کا پابند بنانا معلوم ہو گیا تو پھر اس کی سنیت میں کیا شبہ رہا؟

اور جن حضرات نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اول تو ان کا قول سب پر حجت قاطعہ و لازمہ نہیں، ثانیاً ضعیف روایت اگر عمل صحابہ و علماء سے مؤید ہو جائے تو پھر اس کا ضعف ختم ہو جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی مع حوالہ علماء اس کو ثابت کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ کا ایک استدلال

اسی سے امام ابوحنیفہ اور آپ کی اتباع میں دوسرے حضرات نے ایک نکتہ کی بات کہی ہے، وہ یہ کہ جب امام ابوحنیفہ سے امام ابو یوسف نے پوچھا کہ: ”هل كان لعمر رضی اللہ عنہ عہد من النبی ﷺ فی عشرين رکعة؟“ (کیا حضرت عمر کے پاس بیس رکعت تراویح کے بارے میں کوئی علم تھا؟) تو امام ابوحنیفہ نے بڑے ہی پتہ کی بات فرمائی کہ: ”لم یکن عمر رضی اللہ عنہ مبتدعاً“ (حضرت عمر کوئی

بدعتی نہیں تھے) (طحاوی: ۲۴۶/۱)

اس سے امام ابوحنیفہ نے اسی دلیل کی جانب اشارہ کیا ہے کہ حضرت عمر اور صحابہ کے پاس کوئی دلیل ضرور تھی جس کی وجہ سے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ تراویح کی بیس رکعتیں ہیں، اور اس کا حکم دیا اور عمل جاری کیا، اگر ان کی پاس کوئی دلیل نہ ہوتی تو وہ کوئی بدعتی تو نہیں تھے کہ اپنی جانب سے بے دلیل کوئی بات جاری کر دیتے۔ لہذا سند کے لحاظ سے ابن عباس کی حدیث ضعیف ہونے کے باوجود عمل صحابہ سے قوی ہو جاتی ہے، اور اس کی قوت کی جانب صحابہ کا عمل نشاندہی کرتا ہے۔

آٹھ رکعت کی دلیل اور اس کا جواب

دوسری بات یہ عرض کرنا ہے کہ آٹھ رکعت کے قائلین کی دلیل کیا ہے؟ ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو بخاری و مسلم وغیرہ نے حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمن سے روایت کی ہے کہ: ”سألت عائشة كيف كانت صلاة رسول الله ﷺ في رمضان؟ فقالت: ما كان يزيد في رمضان ولا في غيره على إحدى عشرة ركعة، يصلي أربعاً، فلا تسأل عن حسنهم و طولهن، ثم يصلي أربعاً فلا تسأل عن حسنهن و طولهن، ثم يصلي ثلاثاً“ (میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کی رمضان میں نماز کی کیفیت کیا تھی؟ حضرت عائشہ نے بتایا کہ آپ ﷺ رمضان ہو یا غیر رمضان آٹھ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ پس چار رکعت پڑھتے تھے، ان کے حسن و طول کو نہ پوچھو، پھر چار رکعت پڑھتے تھے، ان کے حسن و طول کو نہ پوچھو، پھر تین رکعت پڑھتے تھے) (بخاری: ۱۵۴/۱، مسلم: ۲۵۴/۱)

راقم کہتا ہے کہ اس حدیث کو بعض لوگوں نے مطلق رات کی نماز کے لئے

مان کر یہ سمجھا کہ اس میں تراویح و تہجد سب داخل ہیں، لہذا رمضان میں بھی آٹھ سے زیادہ تراویح پڑھنا سنت نہیں، بلکہ آٹھ ہی سنت ہیں۔ مگر یہ بات متعدد وجوہات سے صحیح نہیں:

(۱) ایک تو اس لئے کہ خود حضرت عائشہ سے بھی اور دیگر صحابہ سے بھی رسول اللہ ﷺ کا آٹھ سے زیادہ رکعتیں پڑھنا بھی ثابت ہے۔

(۱) حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ: ”کان رسول اللہ ﷺ یصلی باللیل ثلاث عشرة رکعة ثم یصلی إذا سمع النداء بالصبح رکعتین خفیفین“ (رسول اللہ ﷺ رات میں تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے، پھر جب صبح کی اذان سنتے تو دو رکعت ہلکی پھلکی پڑھتے تھے) (بخاری: ۱۵۶۱، مالک: ۴۲، ابوداؤد: ۱۸۹/۱)

اس میں خود حضرت عائشہ نے آپ ﷺ کی رات کی نماز تیرہ بتائی ہے، ان میں سے تین وتر کے ہوں تو دس رکعت نفل ہوئیں، اور اگر وتر ایک رکعت ہے تو نفل بارہ ہوئیں۔

(۲) حضرت عائشہ ہی کہتی ہیں کہ: ”کانت صلاة رسول اللہ ﷺ من اللیل عشر رکعات ویوتر بسجدة ویرکع رکعتی الفجر، فتلک ثلاث عشرة رکعة“ (رسول اللہ ﷺ کی نماز رات میں دس رکعتیں تھیں، اور ایک رکعت وتر پڑھتے تھے اور دو رکعت فجر کی سنتیں، یہ سب تیرہ رکعتیں ہوئیں) (مسلم: ۲۵۵۵/۱، ابوداؤد: ۱۸۸/۱)

اس میں حضرت عائشہ ہی نے وضاحت کی ہے کہ دس رکعت نفل ہوتی تھیں اور ایک رکعت وتر اور دو رکعت سنت فجر ہوتی تھیں۔

(۳) حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ: ”کانت صلاة النبی ﷺ

رکعتین ، و هما دون اللتين قبلهما ، ثم أوتر ، فذلک ثلاث عشرة رکعة، (میں نے رسول اللہ ﷺ کی رات میں نماز دیکھی، آپ نے دو رکعتیں ہلکی پھلکی پڑھیں، پھر دو رکعتیں لمبی لمبی پڑھیں، پھر دو رکعتیں پڑھیں اور وہ پہلی والی سے ہلکی تھیں، پھر دو رکعتیں پڑھیں اور یہ اس سے پہلی والی سے ہلکی تھیں، پھر دو رکعتیں پڑھیں اور یہ اس سے پہلی والی سے ہلکی تھیں، پھر دو رکعتیں پڑھیں اور یہ اس سے پہلی والی سے ہلکی تھیں، پس یہ تیرہ رکعتیں ہوئیں) (مسلم: ۲۶۲۱، ابوداؤد: ۱۹۳۱، ابن ماجہ: ۱۷۹۷)

اس میں تصریح ہے کہ دس رکعتیں پڑھیں اور تین رکعات، اس طرح متعدد صحابہ سے یہ بات منقول ہے کہ آپ آٹھ سے زیادہ رکعتیں بھی پڑھتے تھے، دس، بارہ، چودہ وغیرہ، لہذا حضرت عائشہ کی زیر بحث حدیث سے یہ اخذ کرنا کہ آپ ﷺ کبھی آٹھ سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے اور یہ کہ آٹھ رکعت تراویح کا اس میں بیان ہے، صحیح نہیں ہو سکتا ورنہ ان تمام صحیح احادیث کا انکار لازم آئے گا۔

(۲) دوسرے اس وجہ سے کہ جمہور علماء نے اس کو تراویح پر نہیں بلکہ تہجد کی نماز پر محمول کیا ہے، اسی لئے متعدد محدثین نے حضرت عائشہ کی اس حدیث کو صلاۃ اللیل کے باب میں ذکر کیا ہے، قیام رمضان میں اس کا ذکر نہیں کیا، ان میں امام مسلم امام ابو داؤد، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن خزیمہ، وغیرہ حضرات بھی شامل ہیں، اور عملاً بھی تمام ائمہ و علماء نے اس کو قیام اللیل سے متعلق رکھا اور تراویح میں بیس پر اجماع کیا ہے، یہ خود بھی اس کی دلیل ہے کہ علماء و ائمہ کرام نے اس حدیث کو تہجد سے متعلق قرار دیا ہے۔ لہذا اس میں تہجد کا بیان ہے، تراویح کا نہیں، اگر اس کو تراویح کے لئے مانا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آپ نے آٹھ سے زیادہ بھی پڑھی ہیں حالانکہ یہ غیر مقلد لوگ آٹھ سے زیادہ کو بدعت کہتے ہیں، کیا رسول اللہ ﷺ

کا فعل بھی بدعت ہے؟

اس تقریر و تحقیق کے بعد مؤلف حدیث نماز کی یہ بات کہ ”حضرت عائشہؓ والی حدیث کو مفتی عبدالرحیم صاحب نے تہجد کے متعلق کہا ہے حالانکہ تمام حنفی بزرگوں نے بخاری کی اس حدیث کو تراویح اور تہجد دونوں کے لئے تسلیم کیا ہے“ کس قدر بودی اور بے حقیقت ہے اس کا اندازہ ہر کوئی لگا سکتا ہے۔

کیونکہ اگر ایک دو حضرات نے حدیث عائشہ کو تراویح کے لئے بھی مانا ہے تو ان کے خلاف بہت سے علماء نے اس کو تراویح کے لئے نہیں مانا، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اس حدیث عائشہ کو تراویح کے لئے نہیں مانا، مولانا ادیس کاندھلویؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب، مولانا مہدی حسن صاحب، ان تمام بزرگوں نے نہیں مانا، بلکہ ہزاروں علماء نے نہیں مانا تو کیا ان بزرگوں کا قول حجت نہیں؟

(۳) تیسرے اس لئے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ”مجموع الفتاویٰ“ اور الفتاویٰ الکبریٰ میں اور علامہ شوکانی ”نیل الاوطار“ میں اور دیگر حضرات یہ تصریح کرتے ہیں کہ تراویح کا کوئی عدد رسول اللہ ﷺ سے منقول نہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ: ”من ظن أن قیام رمضان فیہ عدد معین مؤقت عن النبی ﷺ لایزاد علیہ ولا ینقص فقد أخطأ“ (جس نے یہ گمان کیا کہ قیام رمضان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی عدد معین ایسا منقول ہے جس پر نہ زیادتی کی جاسکتی ہے اور نہ اس میں کوئی کم کی جاسکتی ہے تو اس نے غلطی کی) (مجموع الفتاویٰ: ۲۲۲/۲، الفتاویٰ الکبریٰ: ۱۱۴/۲)

اور شوکانی لکھتے ہیں کہ: ”والحاصل أن الذی دلت علیہ أحادیث

الباب وما يشابهها هو مشروعية القيام في رمضان والصلاة في جماعة وفرادى فقصر الصلاة المسماة بالتراويح على عدد معين وتخصيصها بقراءة مخصوصة لم ترد به سنة“ (حاصل یہ ہے کہ اس باب کی احادیث اور اس جیسی احادیث جس بات پر دلالت کرتی ہیں وہ رمضان میں جماعت کے ساتھ یا بغیر جماعت تنہا نماز پڑھنا ہے، لہذا اس نماز کو جو تراویح کہلاتی ہے کسی معین عدد پر منحصر کرنا اور مخصوص قرأت کے ساتھ اس کو خاص کرنا کسی حدیث میں نہیں آیا) (نیل الاوطار: ۶۴۳)

یہ حضرات جب یہ کہہ رہے ہیں اور ان کے علاوہ بھی متعدد حضرات علماء و محققین نے یہ بات کہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی معین عدد ثابت نہیں تو آٹھ کو ثابت ماننا غلط ہے۔ لہذا آٹھ والی حدیث ان علماء کے نزدیک تراویح سے متعلق ہے ہی نہیں، ورنہ وہ ایسی بات ہرگز نہیں کہہ سکتے تھے۔

رمضان میں رسول اللہ ﷺ کی نماز

(۴) چوتھے اس لئے کہ خود حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ: ”کان رسول اللہ ﷺ يجتهد في العشر الأواخر ما لا يجتهد في غيره“ (نبی کریم ﷺ رمضان کے اخیر عشرے میں اتنا جدوجہد (عبادت میں) فرماتے تھے کہ غیر رمضان میں اتنا نہیں کرتے تھے) (مسلم: ۳۷۲۱)

اسی طرح ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ”إذا دخل العشر شد منزره و أحیی ليله و أيقظ أهله“ (نبی کریم ﷺ جب آخری عشرہ داخل ہوتا تھا تو کمر بستہ ہو جاتے اور رات بھر جاگتے اور اپنے اہل و عیال کو جگاتے تھے) (بخاری: ۲۷۱۱، مسلم: ۳۷۲۱)

بیہتی نے حضرت عائشہؓ سے ہی روایت کیا ہے کہ: ”کان إذا دخل رمضان تغیر لونه و کثرت صلاته و ابتهل في الدعاء و أشفق لونه“ (جب رمضان کا مہینہ داخل ہوتا تھا تو آپ ﷺ کا رنگ متغیر ہو جاتا اور آپ کی نماز زیادہ ہو جاتی اور دعائیں گڑ گڑاتے اور آپ کا رنگ سرخ ہو جاتا)۔ (شعب الایمان: ۳۱۰/۳)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان میں نماز میں زیادتی کرتے تھے، اسی لئے اس قدر اوقات بھی لگاتے تھے اور پہلی روایات میں اگر یہ تاویل کی جائے کہ اس سے مراد کیفیت کی زیادتی ہے تو اس اخیر حدیث میں اس تاویل کی بھی کوئی گنجائش نہیں؛ کیونکہ اس میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ آپ کی نماز میں زیادتی ہو جاتی تھی۔ پھر آٹھ کا عدد ہی رمضان میں بھی کیسے ہو سکتا ہے؟ الایہ کہ تاویلات رکیکہ کئے جائیں اور ہمیں ان تکلفات بعیدہ کی ضرورت نہیں، پس معلوم ہوا کہ جو حضرت عائشہؓ نے آٹھ رکعات کا ذکر فرمایا یہ تہجد کا عدد ہے تراویح کا نہیں۔

بیس رکعت تراویح سنت مؤکدہ ہے

بہر حال بیس رکعت تراویح کا سنت مؤکدہ ہونا مرفوعاً بروایت حسن اور موقوفاً حضرت عمر و حضرت علی وغیرہ سے ثابت ہوا، اس سے کم کرنا سنت مؤکدہ کا ترک کرنا ہے اور تمام علماء وائمہ نے بیس یا اس سے زیادہ کو اپنایا ہے۔ علامہ عبدالحی لکھنوی نے اپنے رسالہ ”تحفۃ الاخیار“ میں لکھا ہے کہ:

”إن مجموع عشرين ركعة في التراويح سنة مؤكدة ؛ لأنه مما واطب عليه الخلفاء وإن لم يواظب عليه النبي ﷺ ، وقد سبق أن سنة

الخلفاء أيضاً لازم الاتباع و تاركها آثم ، وإن كان إثمهُ دون إثم تارك السنة النبوية ، فمن اكتفى على ثمان ركعات يكون مسيئاً لتركه سنة الخلفاء“ (تراویح میں بیس رکعت کا مجموعہ سنت مؤکدہ ہے؛ کیونکہ یہ ان چیزوں میں سے ہے جن پر خلفاء راشدین نے پابندی کی ہے، اگرچہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر پابندی نہیں کی، اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ خلفاء راشدین کی سنت بھی لازم الاتباع ہے اور اس کا تارک گنہگار ہے اگرچہ کہ اس کا گناہ سنت نبوی کے تارک سے کم ہو، لہذا جو شخص آٹھ رکعات پر اکتفاء کرتا ہے وہ سنت خلفاء کو چھوڑنے کی وجہ سے غلط کار ہے) (تحفۃ الاخیار: ۲۰۹)

بیس رکعت پر اجماع صحابہ و اجماع امت

اوپر معلوم ہو چکا کہ حضرات صحابہ حضرت عمر کے دور میں اور اس کے بعد بھی بیس رکعت تراویح پڑھتے تھے، لہذا ان سب کا اس کو اس طرح قبول کر کے عمل کرنا اجماع کے حکم میں ہے، اسی طرح ان کے بعد بھی پوری امت اسی کے مطابق عمل کرتی رہی ہے، لہذا یہ اجماع امت ہوا، علامہ ابن قدامہ حنبلی نے المغنی میں اور علامہ ملا علی قاری نے شرح النقایہ میں اور علامہ قسطلانی نے شرح بخاری میں اس اجماع کا ذکر کیا ہے۔ (المغنی: ۴۵۶/۱، شرح النقایہ: ۲/۲۴۱، ارشاد الساری: ۳/۵۱۵)

اور یہی ائمہ اربعہ کا مسلک ہے کہ بیس رکعت یا اس سے زائد تراویح کی رکعتیں ہیں، بیس سے کم کسی کے پاس نہیں، امام ترمذی نے تراویح کے سلسلہ میں ایک قول اہل مدینہ کا اکتالیس رکعات کا ذکر کیا ہے اور ایک قول بیس کا، اور اس قول کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

”وأكثر أهل العلم على ما روي عن عمر وعلي وغيرهما من أصحاب النبي ﷺ عشرين ركعة ، وهو قول الثوري وابن المبارك ، والشافعي وقال الشافعي : وهكذا أدركت ببلدنا مكة يصلون عشرين ركعة“ (اکثر اہل علم اس بات پر قائم ہیں جو صحابہ میں سے حضرت عمر و حضرت علی وغیرہ سے مروی ہے کہ بیس رکعت ہیں، اور یہی سفیان ثوری، ابن المبارک، اور امام شافعی کا قول ہے، اور امام شافعی نے کہا کہ: میں نے ہمارے شہر مکہ میں اسی طرح پایا کہ لوگ بیس رکعت پڑھتے ہیں) (سنن ترمذی: ۱۶۶/۱)

امام ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ: ”والمختار عند أبي عبد الله فيها عشرون ركعة، وبهذا قال الثوري و أبو حنيفة، والشافعي ، وقال مالك: ستة و ثلاثون“ (امام ابو عبد اللہ یعنی احمد بن حنبل کے نزدیک پسندیدہ بیس رکعتیں ہیں، اور یہی امام سفیان و ابو حنیفہ و امام شافعی کا قول ہے، اور امام مالک نے کہا کہ چھتیس رکعات ہیں) (المغنی: ۴۵۶/۱)

امام نووی شافعی فرماتے ہیں کہ: ”مذهبنا أنها عشرون ركعة بعشر ترويحات ، هذا مذهبنا وبه قال أبو حنيفة ، وأصحابه ، وأحمد ، وداود ، وغيرهم ، ونقله القاضي عياض عن جمهور العلماء ، وقال مالك : الترويح تسع ترويحات ، وهي ست و ثلاثون“ (ہمارا مذہب یہ ہے کہ تراویح دس ترویحوں سے بیس رکعات ہیں، یہ ہمارا مذہب ہے اور یہی ابو حنیفہ، ان کے اصحاب، امام احمد اور داؤد وغیرہ کا قول ہے، اور اس کو قاضی عیاض نے جمہور علماء کی طرف سے نقل کیا ہے، اور امام مالک نے کہا کہ وہ نو ترویحتے ہیں اور وہ چھتیس رکعات ہیں) (المجموع: ۲۸/۴)

امام ابن عبد البر کہتے ہیں کہ: ”واختلف العلماء في عدد قيام رمضان،

فقال مالك: تسع وثلاثون بالوتر ، وقال الثوري و أبو حنيفة والشافعي و داؤد و من تبعهم :عشرون ركعة سوى الوتر “ (علماء کا قیام رمضان کے عدد میں اختلاف ہے، امام مالک نے کہا کہ وتر کے ساتھ انتالیس (۳۹) رکعات ہیں اور ثوری، ابوحنیفہ و شافعی نے کہا کہ سوائے وتر کے بیس رکعات ہیں) (التمہید: ۱۱۳۸)

اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اکثر علماء بیس رکعت تراویح کے قائل ہیں اور امام مالک بیس سے زائد چھتیس رکعات کے قائل ہیں، اور آٹھ رکعات کا کوئی قائل نہیں۔ اور اسی لئے ہم نے کہا کہ بیس پر اجماع ہے کیونکہ سب کے سب بیس پر متفق ہیں، اختلاف اس سے زائد کے بارے میں ہے کہ امام مالک نے اس سے زائد کو اختیار کیا اور جمہور علماء نے بیس کو اختیار کیا۔

لہذا کوئی غیر مقلد و سوسہ ڈالنے کی کوشش نہ کرے کہ اس میں تو علماء کا اختلاف بتایا جا رہا ہے اور اس اختلاف کا ذکر کر کے اجماع کا دعویٰ کیسے کر دیا؟ بات وہی ہے جو عرض کر چکا ہوں کہ اختلاف بیس سے کم میں نہیں ہے بلکہ بیس سے زائد میں ہے، لہذا بیس تک کی بات پر اجماع ہے۔

اہل حدیث کون؟

کتاب کے اخیر میں مؤلف حدیث نماز نے لکھا کہ:

”اہل حدیث کو نیا فرقہ شمار کیا جاتا ہے حالانکہ غایۃ الاوطار میں ہے کہ امام اعظمؒ جب بغداد تشریف لائے تو ایک اہل حدیث نے بھی آپ سے فتویٰ پوچھا، امام ترمذیؒ کو دیکھو ہر جگہ اہل حدیث اور اہل رائے کا تذکرہ کرتے ہیں، ہم لکھ چکے کہ امام اعظمؒ نے سب سے پہلے سفیان بن عیینہ کو اہل حدیث بنایا، آپ کے بعد ہی امام شافعیؒ کا زمانہ ہے، آپ

نے بھی اہل حدیث کا مذہب پسند کیا اور اختیار کیا ہے۔“ (حدیث

نماز: ۱۸۳)

راقم کہتا ہے کہ یہ مؤلف حدیث نماز کا عجیب کرشمہ ہے کہ اپنی کتاب کی ابتداء کی تو دھوکہ سے کی اور اب انتہاء پر آئے ہیں تو دھوکہ سے ہی انتہاء کرنا چاہتے ہیں، معلوم ہونا چاہئے کہ لفظ ”اہل حدیث“ یا ”اصحاب الحدیث“ جو علماء نے کتابوں میں استعمال کئے ہیں اور کرتے ہیں اس سے مراد ”علماء کا وہ طبقہ ہے جس کو ”محدثین“ کہا جاتا ہے، اس سے آجکل کے اہل حدیث کہلانے والوں کو مراد لینا سوائے دھوکہ کے کچھ نہیں، کیا امام ترمذی جو کہتے ہیں کہ اہل الحدیث نے یہ کہا ہے اور یہ بات اختیار کی ہے اس سے موجودہ اہل حدیث لوگوں کا طبقہ مراد ہے، جس میں ہزاروں بلکہ لاکھوں جہلاء ہیں جن کو کوئی ایک حدیث بھی نہیں آتی، بلکہ بہت سے وہ ہیں جن کو قرآن پڑھنا بھی نہیں آتا؟ کیا یہ سب لوگ اس سے مراد ہیں؟ افسوس کہ اس قدر واضح بات میں دھوکہ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی اہل قرآن کہلانے والا منکر حدیث کہنے لگے کہ ہمارا فرقہ کوئی نیا فرقہ نہیں، لوگ ہمیں غلط سمجھتے ہیں، ہمارا ذکر تو حدیث میں بھی ہے کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ نے کہا ہے کہ: ”

أهل القرآن أهل الله“ لہذا اس جگہ اہل قرآن سے ہم ہی مراد ہیں تو کیا یہ بات باور کی جائے گی یا اس کو فریب و دھوکہ پر محمول کیا جائے گا، اگر اس کو دھوکہ سمجھا جائے گا تو کیوں؟ اسی لئے نا کہ اس حدیث میں اہل القرآن سے حفاظ و علماء مراد ہیں جو قرآن پڑھتے اور سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں، اور اس لئے کہ اس سے جاہل منکر حدیث مراد نہیں، اسی طرح یہاں بھی اہل الحدیث کا لفظ ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو علم حدیث حاصل کرتے اور دن رات اس کی خدمت کرنے میں اپنے اوقات

مصروف رکھتے ہیں، لہذا اس کو آجکل اہل حدیث نام رکھ لینے والے جاہلوں کے لئے استعمال کرنا یا اس سے ان کو مراد لینا محض دھوکہ وابلہ فریبی ہے۔

نوٹ: یہ رسالہ جلال آباد میں بعد ظہر بتاریخ ۲۱ شعبان ۱۴۰۳ھ بتوفیق اللہ تعالیٰ ختم ہوا تھا، اور اس کے تقریباً چھبیس سال کے بعد آج بتاریخ: ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ شب کے ایک بجے اس کتاب کی تہنیت کا کام محمد اللہ مکمل ہوا۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

(مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

مست